طلسمِ زندگی

یعنی

جناب میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا۔ مدیر "ہمایوں"

کے

ادبی مضامین کا دلکش مجموعہ

عنقریب شائع ہو رہا ہے طلسمِ زندگی میاں صاحب کی پندرہ سال کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس میں تقریباً سو چھوٹے چھوٹے مضمون اور پونے دو سو چھوٹے چھوٹے نثر پارے ہیں۔ مناظر، صدائے روح، آئینۂ دل، جدوجہد، سرگوشیاں، خیالاتِ پریشاں، چھ مختلف باب ہیں جن میں مضامین تقسیم کئے گئے ہیں۔ طلسمِ زندگی حسنِ فطرت، اخلاق، تصوف، نفسیات اور محبت کے پاکیزہ جذبات کا ایک بوقلموں نگار خانہ ہے جس میں زندگی کے صحیح اور فلسفیانہ مطالعہ کے بدیع المثال اور دلآویز مرقعے پیش کئے گئے ہیں۔ کتاب کا ایک حصہ لطیف لطیف مزاحیہ مضامین کے لئے بھی وقف کیا گیا ہے جو گویا ملح فی الطعام کا کام دیتا ہے۔

اس مجموعے میں "ہمایوں" کے مطبوعہ مضامین کے علاوہ جدید مضامین بھی شامل ہیں بلکہ مطبوعہ مضامین بھی تغیر و تبدل اور ترمیم و تنسیخ کے بعد بالکل ایک نئے قالب میں ڈھل گئے ہیں +

بخلافِ اعلانِ سابق طلسمِ زندگی میں اکیس ۲۱ بلاک ہوں گے جن میں سے چودہ سہ رنگ ہیں۔ یہ تصویریں بھی ایسی ہیں جو اپنی جگہ استادانِ فن کے بہترین مصورانہ کمالات کا نمونہ سمجھی گئی ہیں +

کتابت پنجاب کے ایک بہترین خوشنویس کے سپرد کی گئی ہے۔ طباعت اعلیٰ درجے کے اہتمام سے ہوگی۔ اس کے علاوہ کتاب کی آرائش کے لئے ماہرِ فن مصوروں کے مشورے سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ غرضکہ "طلسمِ زندگی" کی معنوی صورت کی ط[illegible] صورت کو بھی دلکش بنانے کے لئے تجارتی مصالح کو نظر انداز کرتے ہوئے بے دریغ روپیہ صرف کیا گیا ہے +

حجم ۲۵۳ صفحات کے قریب ہوگا اور جلد بہت خوبصورت ہوگی۔ کاغذ دبیز ولایتی آرٹ پیپر۔ کتاب کی آرائش میں اس قدر مزید اہتمام کیا گیا ہے کہ شاید اردو میں پہلے کسی ادبی کتاب کے لئے نہیں کیا گیا۔ اس لئے طلسمِ زندگی کی قیمت تقریباً چار روپے ہوگی کہ یہی کتاب کی اصلی لاگت ہے + ایک زیادہ قیمتی ایڈیشن بھی شائع ہوگا جس کی جلد زیادہ نفیس ہوگی۔ اس کی قیمت فی الحال مقرر نہیں کی گئی +

یہ مجموعہ محدود تعداد میں شائع ہو رہا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے ایڈیشن تک انتظار کی زحمت برداشت نہ کرنی پڑے تو فی الفور اپنی فرمائش دفتر "ہمایوں" میں بھیج دیجئے۔ جن حضرات کی فرمائشیں پہلے پہنچیں گی اُن کا حق فائق سمجھا جائے گا +

مینجر رسالہ "ہمایوں" ۳۔۲۳ لارنس روڈ لاہور

ترانۂ انجم

(۱)

کس نور سے جگمگا رہے ہیں تارے
کس ساز پہ گنگنا رہے ہیں تارے
دوری ہوتی ہے کون و مکاں میں کیا کیا
اس امر سے تلملا رہے ہیں تارے

(۲)

جھلمل جھلمل جو کر رہے ہیں تارے
ظلمت سے نکل ابھر رہے ہیں تارے
آمد آمد ہے شاہد معنی کی
اس واسطے بن سنور رہے ہیں تارے

(۳)

ساز اپنا جو یوں بجا رہے ہیں تارے
کس رت کی کوئی سنا رہے ہیں تارے
کچھ اور ہے سب سے الگ کا پا دھانی ہے
کیا آگ ہے یہ جو لگا رہے ہیں تارے

(۴)

مدت سے جو جھلملا رہے ہیں تارے
کیا جانے کہ کیا بتا رہے ہیں تارے
جس افسانے کی جان ہے ذات قدر
ایسا افسانہ سنا رہے ہیں تارے

ا ب

جذباتِ ہمایوں

کیوں مُشتِ خاک پر کوئی دِلِ داغدار ہو
مر کر بھی یہ ہوس کہ ہمارا مزار ہو!

ہو کر جو ذرّہ ذرّہ عناصر میں جائے رل
یکساں ہے گردِ راہ بنے یا غبار ہو

کیوں بیٹھے گرد آئینۂ دل پہ مثلِ خاک
کیوں ذرّہ ہائے خاک سے دِل سنگسار ہو

آواز کی طرح جو جہاں سے نکل گیا
پتھر کی طرح سینے پہ پھر کیوں وُہ بار ہو

انسان کو بے ثباتی پہ بھی اپنی ناز ہے
نقشِ قدم کی طرح یہ کیوں خاکسار ہو

گھوڑے اڑائے کیوں نہ وہ سرپٹ غرور کے
مر کر بھی جس کی رُوح ہوا پر سوار ہو

اُس بوالہوس کی موت پہ قربان جائیے
جو پھر دوبارہ جینے کا اُمیدوار ہو

لہروں میں ڈوب مرنے کا پھر کیوں کرے وہ شوق
اک بار غرق ہو کے جو دریا کے پار ہو

ہستی کا طوق تو ہی قیامت پسِ وفات
یارب کہیں یہ میرے گلے کا نہ ہار ہو

کملانا ہی تھا پھول کو۔ کر غم نہ عندلیب
کیوں داغِ دل سے سینہ ترا لالہ زار ہو

یکساں ہیں اہلِ دل کے لئے انبساط و غم
باغِ جہاں میں آئے خزاں یا بہار ہو!

دونوں کی مثلِ نقطۂ موہوم ہے بساط
عشرت میں خوش ہو غم میں کوئی بیقرار ہو

اے مادرِ شفیق! قضا کا لگے جو تیر
مرگِ جواں کے غم سے نہ تو دلفگار ہو

اس صید گاہ میں وُہی نکلے گا بچ کے صاف
جو صید رب سے پہلے اجل کا شکار ہو!

جاں بر نہ ہوگا کوئی بھی تیغِ فنا سے یاں
گو لاکھ سخت جاں ہو۔ توانا ہزار ہو!

بڑھ جائے غم کا سلسلہ کہسار کی طرح — طولانی گریہ زندگیٔ مستعار ہو
دُنیا مقام رہنے کے قابل تو ہو۔ اگر — بیگانہ ہو نہ اپنا۔ عدو ہو نہ یار ہو
گُل ہو نہ برگِ خشک ہو۔ بلبل ہو اور نہ زاغ — غم کی خزاں نہ ہو نہ خوشی کی بہار ہو
جوہر نہ ہو۔ نہ عرض۔ نہ کُل ہو۔ نہ جُزوِ کُل — کون و مکان نہ ہو۔ نہ یہ لیل و نہار ہو
حد ہو نہ جسم کی۔ نہ کوئی رُوح کی ہو قید — مجبور ہو نہ کوئی۔ نہ با اختیار ہو!
آزاد بندِ شوق سے۔ آلائشوں سے پاک — بندہ بھی پھر تو بندۂ پروردگار ہو!
ہُو کا ہو عالم اور نہ کچھ ہو سوائے نور — اور تیر بن کے وہ مرے سینے کے پار ہو
اے ہستی! سختیاں تری کب تک سہے بشر! — کر دوں فنا تجھے جو مرا اختیار ہو!
کیوں غم کا ڈر۔ خوشی سے ہمایوں لگاؤ کیوں — ہاں یہ بھی نذرِ عالمِ ناپائدار ہو
رکھتی ہے اپنا لُطف ہر اک طرزِ کیفیت — غم کا نشہ ہو یا کہ خوشی کا خُمار ہو!
کیا لُطفِ دیدِ گُل ہو تو ہی کہہ دے ہمصفیر! — گلزار میں خزاں جو نہ بعدِ بہار ہو!
ہے رہنمائے خلق عمل جس کے نیک ہوں — کافر ہو وہ عقیدہ میں یا دیندار ہو
مے خانہ ایسا چاہئے ہم مشربو! جہاں — کوئی نہ مست ہو نہ کوئی ہوشیار ہو!
پیمانۂ شکستہ کے ٹکڑے ہوں منتشر — مے ہو نہ ساقی ہو۔ نہ کوئی بادہ خوار ہو
پیرِ مغاں کے گرد ہو اک انجمن لگی۔ — عقلِ جواں بھی جان سے جس پر نثار ہو
روشن ہو نُور سینے میں اک شمع کی طرح — قربان اُس پہ دل مرا پروانہ وار ہو
ہاں صاف صاف کہہ دو ہمایوں جو دل میں ہے — ہونٹوں میں بڑبڑانے یہ کیا بار بار ہو

دسمبر سنہ ۱۹۰۶ء

بزمِ ہمایوں

گزشتہ سال ہمایوں کی دسویں سالگرہ کے موقع پر بہت خوشیاں منائی گئی تھیں۔ نہیں معلوم گیارھویں بارھویں تیرھویں سالگرہ میں کیا بات ہے کہ دل میں وُہ جذبات پیدا نہیں ہوتے۔ جب تک بیسویں سالگرہ نہ آئے گویا کوئی شاندار سالگرہ نہ آئے گی۔ یہ سب بنی بنائی ہوئی باتیں ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ بارھویں سال میں قدم رکھنے والا وجود خاصا عقلمند کم از کم معتبر ہو جاتا ہے۔

گزشتہ سال ہُمایوں کا سب سے بڑا سالگرہ نمبر نکالا گیا۔ سال بھر میں نو سو چھتیس صفحات پیش کئے گئے۔ معمول کے خلاف عموماً ایک سے زیادہ تصویریں شائع کی گئیں۔ چندہ بہت کم کر دیا گیا۔ مضامین میں تنوع اور دلچسپی کا خاص خیال رکھا گیا۔ شکر ہے کہ ان سب باتوں کو پبلک نے بنظرِ استحسان دیکھا اور خریداروں کی تعداد میں بقدر ایک ہزار کے اضافہ ہو گیا۔

ہمایوں کا مطمحِ نظر باقاعدگی۔ میانہ روی۔ تنوع۔ سودمندی اور دلچسپی ہے۔ اس مطمح کے حصول میں ہمیں ہمیشہ اپنے معاونین کی اعانت اور ہمدردانہ رہبری کی ضرورت رہتی ہے۔ ہماری درخواست ہے کہ وہ بدستورِ سابق بلکہ بیش از بیش اپنی سرپرستی کا حق ادا کر کے ہمیں ممنون فرماتے رہیں کیونکہ کوئی صحیح اور بلند مطمحِ نظر بغیر مسلسل جدوجہد اور معاونت کے نہ ممکن الحصول ہوتا ہے نہ قابلِ حصول۔

اپنے قلمی معاونین میں مفصلۂ ذیل اصحاب کی توجہ کے ہم خاص طور پر ممنون ہیں:۔

حضراتِ فلک پیما، محمد حسین ادیب، فرحت اللہ بیگ بلیدرم، حسن نظامی، پریم چند، محمد عمر نور آلٰہی، راس مسعود، عظیم بیگ چغتائی، حمید احمد خاں، منظور حسین ماہر، عاشق بٹالوی، فیاض محمود، منصور احمد، احسان احمد، منظور سروش، حامد حسن بلگرامی، مظہر انصاری، سید محمد کرمانی۔ آرزو جلیلی، نشتر جالندھری، قرہ خاں، مہر محمد خاں شہاب، ظفر واسطی، معین الحق حقی، سید محمد عبداللہ، تقی علی یاسمی، شمیم، مہدی، عبدالعزیز کلیم، لطیف الرحمن۔ احمد الدین مارہروی۔ احمد علی۔ شعرا میں حضرات جوش، احسن، اصغر، اثر، اکبر، وحشت، تاجور، اختر۔ عدم، راشد، ممتاز حسن نجیب، مقبول حسین احمد پوری، آزاد انصاری، امجد، جگر بریلوی، عابد، شاد عارفی، سیفی نوگانوی۔ ذوقی، صدق جائسی، محمد جمیل خاں راز، حفیظ ہوشیارپوری۔ زیبا، جاذب، لطیف انور، ریاض عباسی، علی منظور، مجاز۔ اسد، ملال۔ اور نسوانی مضمون نگاروں میں جناب اصغری خانم، ح ب صاحبہ۔ زب صاحبہ، بیگم شاہ نواز۔ بیگم بشیر احمد خاص طور پر قابلِ شکریہ ہیں۔

ب ا

جہاں نُما

۱۹۳۲ء بھی اُسی طرح رواروی میں گزر گیا جس طرح ہر سال حال کی اِس متمدن بے تاب دُنیا میں گزر جایا کرتا ہے اور حق یہ ہے کہ گزرے ہوئے سال نے کسی طرح دُنیا کو بڑے پیمانے پر فائدہ نہ پہنچایا۔ یوں تو یہ اپنے اپنے نقطۂ نظر پر منحصر ہے کہ کوئی گزرا ہوا سال ہمیں کیسا نظر آئے، اپنی اپنی قسمت اپنی اپنی ہمت پر منحصر ہے کہ وُہ ہمارے لئے اچھا ہو یا بُرا یا پھر اپنے اپنے اعتقاد و عزم پر اس کا دارومدار ہے۔ کوئی سمجھتا ہے کہ دنیا ہمیشہ ترقی پر ہے، کوئی کہتا ہے کہ وہ جوں کی توں اپنی قدیم حالت پر قائم رہتی ہے اور تبدیلیاں اور انقلاب محض ایک ظاہری حیثیت رکھتے ہیں اور کوئی باآوازِ بلند چلاتا ہے کہ بھائیو بیدار ہو جاؤ اور ہشیار کہ یہ ذلیل دُنیا سیدھی جہنم کو جا رہی ہے۔ یہ تباہ ہونے والی ہے اور ہمیں بھی جلد اپنے ساتھ تباہ کر دینے والی ہے +

بہتر ہے کہ ہم اِس عمومی مسئلے کا کہ دنیا ترقی پر ہے یا تنزل پر جواب ہی نہ دیں بلکہ ۱۹۳۲ء کے بعض واقعات پر ایک چھچھلتی ہوئی نظر ڈالیں اور جن حالات سے ہم عارضی طور پر متاثر ہیں اُن کا خاص طور پر ذکر کر دیں۔

یہ ظاہر ہے کہ معاشی حیثیت سے دُنیا وہیں ہے جہاں سال بھر ہُوا تھی۔ "سرد بازاری" میں کوئی گرم رَو پیدا نہیں ہوئی کاروبار اُسی طرح مندا پڑا ہُوا ہے۔ ملازم نوکریوں سے معزول ہو رہے ہیں۔ مشاہرے گھٹ رہے ہیں۔ منافع کم ہو رہے ہیں اور چوری سینہ زوری کچھ بڑھ ہی رہی ہے۔ قاعدہ ہے کہ بھوکے آدمی کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے سو قومیں اور افراد جہاں لڑتے نہیں بھی وہاں کم از کم ایک دوسرے پر دانت ضرور پیستے رہتے ہیں یا بُرا منہ بنا کر ایک دوسرے سے رُوٹھے رہتے ہیں۔ متمدن انسان کی بھوک پیاس محض کھانے پینے کے لئے نہیں ہوتی + وہ محض روٹی بوٹی یا کیک مٹھائی اور شراب کباب کا مشتاق نہیں بلکہ جب تک وہ دوسرے تیسرے سینما نہ دیکھ لے چوتھے پانچویں ناٹک کا مزا نہ لے، مہینے میں دو بار موٹر میں سو میل فراٹے بھرتا کہیں کو نہ نکل جائے، جب تک اُس کا مکان "اپ ٹو ڈیٹ" پوشاک "فیشن ایبل" سواری تیز رفتار اور معاشری حلقہ حسبِ دلخواہ نہ ہو وہ گویا بھوکا پیاسا رہتا ہے اور دوست دشمن ہر ایک کو کھاؤں پھاڑوں کرتا رہتا ہے +

رُوس والے تمدن کی انہیں متلون مزاجیوں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور موجودہ دُنیا کو سرمایہ داروں کا قمار خانہ پکار کر حال کے تمدن اور طرزِ معیشت کو دُنیا کی ساری مصیبتوں کا سبب قرار دیتے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں کہ موجودہ کساد بازاری اس تمدن کو پاش پاش کر دینے میں ایک عظیم الشان عالمگیر زلزلے کا کام دے رہی ہے +

لیکن ہونے نہ ہونے والا کچھ بھی ہو ظاہر ہے کہ دُنیا کی موجودہ معاشی و سیاسی حالت کسی طرح زیادہ تسلی بخش نہیں ہے۔

رُوس کا حال بہت اچھا ہو نہایت بُرا ہو یا اچھا خاصا ہو اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ رُوس کی انقلابی حکومت قائم ہے اُس کے متزلزل ہوجانے کی بالفعل کوئی صورت نظر نہیں آتی، وہاں بہت سے نئے تجربے ہو رہے ہیں، کم از کم شہروں کے مزدور پیشہ لوگ بہت خوش ہیں اور رُوس کی ان تبدیلیوں کا کم و بیش اکثر ممالک پر اثر پڑ رہا ہے۔ پُرلطف بات یہ ہے کہ وہ شخص بھی جو رُوس کے ذکر سے فوراً پیچ بیچ ہوجاتے ہیں عموماً اُس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رُوس ایک طرف ہے اور باقی ماندہ دُنیا دوسری طرف۔ وہاں ایک طرح کا نظام جاری ہے یہاں دوسری طرح کا۔ وہاں ایک نئے تجربے پر جوش اور شور و غوغا ہے یہاں ایک بگڑتی ہوئی کل کی درستی میں مصروفیت اور آپس میں تُو تُو میں میں۔ لیکن غور سے دیکھیں تو بیچارا رُوس بھی اپنی نئی مشکلات میں گرفتار ہے۔ لائحہ عمل بنانے آسان ہوتے ہیں لیکن اُن پر عمل درآمد مشکل ہوتا ہے۔ نئے رُوس کے اربابِ حل و عقد اپنے تجربے سے دیکھ رہے ہیں کہ سرمایہ داری کی ہر ادا اتنی بُری نہیں جتنی اُنہیں پہلے معلوم ہوئی تھی۔ اسی لئے گزشتہ سال رُوس کی اشتراکیت نے اپنی حکمتِ عملی کو کامیاب بنانے کے لئے اپنے بعض طے شدہ اصولوں میں تبدیلی کرلی ہے مثلاً اب وہاں بعض کارخانوں کا انتظام بجائے ایک کمیٹی کے ایک ہی منتظم کے ہاتھ میں دیا جانے لگا ہے اور مزدوروں کو اُجرت اچھے کام کے مطابق دی جانے لگی ہے۔ نیز انفرادی تجارت اور انفرادی منافع کو اب اتنی بُری نظر سے نہیں دیکھا جاتا جتنا پہلے دیکھا جاتا تھا۔ ہر انتہائی و انقلابی نوع کی تحریک میں بتدریج اعتدال پیدا ہو کر دُنیا کی نظروں میں وہ زیادہ قابلِ قبول ہوجاتی ہے۔

۱۹۳۲ء عالمگیر کانفرنسوں کا سال تھا۔ لوزان کانفرنس میں یہ طے پایا کہ جرمنی سے یہ توقع کہ وہ اور نصف صدی تک تاوانِ جنگ دئے چلا جائے محض لغو ہے۔ آفت زدہ یورپ کی "مرمت" کے لئے ایک فنڈ تجویز کیا گیا جس میں جرمنی نے ایک مقررہ رقم دینے کا وعدہ کیا۔ وسطی و شرقی یورپ اور بالخصوص غریب آسٹریا کو مالی امداد دینے کی تجویز ہوئی اور سب سے اہم یہ کہ ایک عالمگیر معاشی کانفرنس مدعو کرنے پر اتفاق رائے ہوگیا۔ اس کے مقابل میں جینوا میں جو تخفیفِ اسلحہ کی کانفرنس منعقد ہوئی وہ ناکام رہی اور اس ناکامی کو چھپانے کے لئے دُنیا کو یہ بتا دیا گیا کہ ہم نے "ہوائی گولہ باری اور کیمیائی جنگ" کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔ جہازوں کی جسامت کو کم کردیا ہے اور اس بات میں ایک دوسرے کی تائید کردی ہے کہ واقعی جنگی سامان پر خرچ کم کرنا چاہئے۔ اٹاوا میں برطانوی سلطنت کے تمام مقبوضات و نوآبادیات کا اجتماع ہُوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُدھر برطانیۂ عظمے نے اپنی ساری سلطنت کے اردگرد ایک قسم کی محصولی دیوار کھڑی کردی کہ ہم اس احاطے کے اندر رہی اندر خوب مزے سے ایک دوسرے سے تبادلۂ اشیا کیا کریں گے اور یوں اوروں کے مقابلے میں روز بروز زیادہ متمول و مضبوط ہوتے جائیں گے۔

بین قومی حیثیت سے سال کا دوسرا بڑا سلسلۂ واقعات مانچوریا کے قضیے پر مشتمل تھا جس کی لاٹھی

اُس کی بھینس - اِس اندوہ ناک واقعے میں لاٹھی والا جاپان تھا اور بھینس چینی بھینسوں میں سے ایک موٹی تازی بھینس مانچوریا - ایک عرصے سے جاپان مانچوریا سے لَو لگائے بیٹھا تھا - جاپانیوں نے وہاں مُلک کے طول و عرض میں مدتوں سے اپنے معاشی "مفاد" پھیلا رکھے تھے - اب ان کی حفاظت لازم تھی - جاپان اُستادِ مغرب کا ایک ہوشیار شاگرد ہے - اُس نے اپنی سب چالیں اُسی گرگِ باراں دیدہ سے سیکھی ہیں - جب موقع دیکھا اچھائی برائی کو پس پشت ڈالا اور اپنا اُلّو سیدھا کر لیا - مغرب سارے کا سارا معاشی سرد بازاری کا شکار ہو رہا تھا - سب جنگ سے تنگ آئے ہوئے تھے - انگلستان ہندوستان کی بلبل میں پھنسا ہُوا تھا - جاپان نے چپکے سے جاکر مانچوریا پر قبضہ کر لیا اور وہاں ایک نام نہاد "مانچوکُوؤ" حکومت قائم کرا دی - چین نے بہتیرا شور مچایا کہ اِس بانی کار بیڑے کو روکو پکڑو سنبھالو مگر وہاں کس میں زور تھا کہ ہمت کرتا - بیچاری معصوم نیک نیت مجلسِ اقوام نے ایک کمیشن بٹھا دی - انہوں نے تھوڑی مدت ہوئی ایک رپورٹ شائع کی جس میں جاپانیوں پر نکتہ چینی کی گئی اور ایک ایسی منصفانہ تجویز پیش کی جو کمیشن کے نزدیک دونوں ملکوں کے لئے سود مند ثابت ہو سکتی ہے - مگر جاپان نے اِس رپورٹ کو اپنے غرورِ قوت میں ٹھکرا دیا - چین مجلسِ اقوام، متمدن دُنیا کی رائے عامہ یہ سب ایک طرف ہیں اور حضرت جاپان اور اُن کی بحری و برّی طاقت دوسری طرف - وہ پڑے چلّایا کریں یہ مانچوری گٹھڑی کو بغل میں دبائے مزے سے خراٹے لے رہے ہیں - اِس زبردستی اور ستم رانی سے مجلسِ اقوام کی رہی سہی آبرو بھی جاتی رہی ہے اور ساری دُنیا پر ظاہر ہو گیا ہے کہ بغیر فوجی قوت کے مجلسِ اقوام محض بھلے مانس لوگوں کی ایک بحث گاہ ہے اور کچھ نہیں -

تیسرا قابلِ غور امر دُنیا کی معاشی سرد بازاری ہے جو ہنوز جاری ہے - لوزان کانفرنس نے فرانس اور جرمنی کی گتھی کو ایک حد تک سلجھا دیا - یورپ نے بیٹھ کر آپس میں صلح کر لی لیکن اِن مفلسوں کو یہ یاد نہ رہا کہ اِن کا قرض خواہ، امریکہ اِن کے سمجھوتے کو خاطر میں نہ لائے گا اور اپنا آدھ سیر گوشت" برابر طلب کرے گا - وہی ہُوا - امریکہ نے انگلستان اور فرانس دونوں کو گویا نوٹس دے دیا کہ میرا قرضہ اور سُود تیار رکھو، ادائیگی کا وقت قریب آگیا ہے - اب یہ گھبراتے ہیں اور بڑے بڑے عقلمندانہ جواب اختراع کرتے ہیں کہ ہم تو اصل سے بہت زیادہ ادا کر چکے - اب آپ کیوں خواہ مخواہ دُنیا کے معاشی توازن کو بگاڑتے ہیں -

ان بین قومی مسائل کے بعد مختلف قوموں پر نظر ڈالو تو سب سے پہلے اپنے وطن کی عجیب حالت نظر

آتی ہے۔ برطانوی سلطنت میں جابجا آسٹریلیا میں، نیوزی لینڈ میں، انگلستان میں پُرانی مزدور پارٹی کی طاقت خاک میں مل چکی ہے اور انگلستان میں تو قدامت پسند لوگ اپنے پورے زوروں میں ہیں۔ اِس کا سب سے زیادہ اثر ہندوستان میں محسوس ہو رہا ہے۔ کہاں وہ دن کہ اروِن گاندھی جی کو دیوتا سمجھ کر ہر طرح اُن کی خاطر مدارات کرتا تھا اور کہاں یہ دن کہ جو حکومتِ ہند کو کرنا ہوتا ہے اُس کے لئے ہر بار لندن سے بڑے پُر زور حکم آتے ہیں۔ حکومت حکومت کرنے اور زور دکھانے اور سیاسی شورش کا مُنہ خاک سے بھر دینے کی قائل ہے۔ کانگریسی تحریک دب رہی ہے۔ انگلستان کے رُعب کا ڈنکا بج رہا ہے۔ فضائے ہند تاریک ہو رہی ہے۔ دیکھئے کیا ہو؛ سال کے شروع میں گاندھی جی گرفتار ہوئے، اور پھر اِدھر آرڈی نینسوں کے پٹاخے ایک ایک کرکے چھوٹے گئے۔ اِدھر بم اندازوں نے اپنے کرتب دکھانے شروع کئے۔ فرقہ وار تصفیے کا پتھر پھینکا گیا جس سے سیاسی تالاب میں کچھ مچھلیاں اُچھلیں اور کچھ مینڈک ٹرائے۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوئے۔ سال بھر میں الہ آبادی کانفرنس کی مشکوک کامیابی کے علاوہ صرف دو دل خوش کن باتیں ہوئیں۔ ایک گاندھی جی کی فاقہ کشی سے اچھوتوں اور ہندوؤں کا ملاپ اور دوسرے ہندوستانی کرکٹ اور ہاکی کے کھلاڑیوں کا بیرونی ممالک میں اپنا سکّہ جمانا، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، یہی غنیمت ہے۔

دوسرے ملکوں میں سب سے زیادہ شورش جرمنی میں برپا رہی۔ صدرِ جمہوریہ ہنڈن برگ کی پیرانہ سال سرد مزاجی نازیوں کی جوان بے تابی سے برسرِ پیکار ہے۔ نوجوان جرمن تاوانِ جنگ، الزامِ جنگ اور اس قسم کی ہر ہتک پر برافروختہ ہو رہے ہیں اور دُنیا کی مجلس میں دوسروں کے برابر بیٹھنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ فرانس نے جرمن بے صبری سے خائف ہو کر رُوس تک سے پُر امن معاہدہ کر لیا ہے۔ آئرلینڈ باوجود اپنی کمزوری کے ڈی ولیرا کی قیادت میں انگلستان سے لڑ جھگڑ رہا ہے اور اپنی آزادی کو پوری طرح استعمال کرنا چاہتا ہے۔ سیام نے اپنے بادشاہ کو ترغیب دے کر دستوری بادشاہ بنا دیا ہے۔

غرض ۱۹۳۲ء کچھ صلح و امن کی کوششوں اور کچھ جوش اور جبر کے مظاہروں میں گزرا لیکن اگر اِس اُبال اُچھال کے بعد ۱۹۳۳ء میں نوعِ انسان کے لئے کوئی معجونِ مرکب تیار ہو جائے تو یہ ساری مصیبت کسی کام آجائے۔

ب ا

بھولے ہوئے افسانے

بھولے ہوئے افسانے اے دوست سنائے جا
سازِ دلِ وحشی کے
ٹوٹے ہوئے تاروں پر
پھر چوٹ لگائے جا، رو رو کے رُلائے جا
اے دوست سنائے جا بھولے ہوئے افسانے

بھولے ہوئے افسانے اے دوست سنائے جا
انجام سے بے پروا
آغاز کی باتیں کر،
معصومیٔ الفت کے انجان اشاروں پر،
نیک و بدِ عالم سے
بیگانہ بنائے جا
اے دوست سنائے جا بھولے ہوئے افسانے

بھولے ہوئے افسانے اے دوست سنائے جا
مجبوریٔ الفت کے،
اندوہِ محبت کے
دن یاد دلائے جا، رو اور رُلائے جا
اے دوست سنائے جا بھولے ہوئے افسانے

بھولے ہوئے افسانے اے دوست سنائے جا
مرگِ دلِ غمگیں کے
افسانۂ خونیں کا
ہر باب سنائے جا، مٹ اور مٹائے جا
اے دوست سنائے جا بھولے ہوئے افسانے

بھولے ہوئے افسانے اے دوست سنائے جا
پھر اُس کی محبت کا دیوانہ بنائے جا
اُس حسنِ فروزاں کا پروانہ بنائے جا
جل اور جلائے جا،
جی اور جِلائے جا،
اے دوست سنائے جا بھولے ہوئے افسانے

حامد علی خاں

خوشی کی تسخیر

اکثر لوگ خوشی کے طلب گار نظر آتے ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ اس طلب میں عموماً کامیاب نہیں ہوتے۔ لوگ ناخوش کیوں ہیں؟ کیا اس کی وجہ قسمت ہے؟ بہت سے مذہبی لوگوں کو اس بات کا پورا یقین ہے یا کیا اس کی وجہ معاشری نظام ہے؟ مغربی حکمار روز بروز اس عنصر کی اہمیت پر زور دے رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے اور بہترین فطرت شناس اس امر پر متفق ہیں کہ انسان کی ناخوشی بہت کچھ اُس کی اپنی ناسمجھی اور کم ہمتی کے سبب سے ہے اور اگر ہر انسان اپنی اپنی جگہ ضبطِ نفس اور دُور اندیشی سے کام لے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ تھوڑے عرصے میں پہلے سے بہت زیادہ خوش اور مطمئن نہ ہو جائے۔

اس موضوع پر پرانے اور نئے زمانے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اُن مسائل میں جو صدیوں سے انسان کے دماغ میں چکر لگاتے رہے ہیں یہ مسئلہ بھی شامل ہے کہ میں کیا کروں جس سے میری زندگی زیادہ مسرور اور میرے اور دوسروں کے لئے زیادہ تسلی بخش ہو جائے۔ جنگِ عظیم کے بعد جہاں لُطف اندوزی کے مختلف پہلوؤں پر غور اور بحث کی گئی ہے وہاں خوشی کے مسئلے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ افراط تفریط کو چھوڑ کر اگر ہم یورپ کے موجودہ اعتدال پسندوں کو لیں تو ہمیں مُتمدن دُنیا کے مستقل میلانات کا پتہ چلتا ہے۔ سڈنی ڈارک نے چند سال ہوئے ایک مختصر کتاب لکھی تھی "زندگی سے کس طرح لُطف اُٹھایا جائے"۔ حال میں شہرۂ آفاق انگریز فلسفی برٹرنڈ رسل نے اس موضوع پر ایک معرکۃ الآرا عام فہم تصنیف پیش کی ہے "خوشی کی تسخیر"۔ رسل ایک اشتراکیت پسند حُریت پرست مفکر ہے لیکن نہ اتنا جتنے یورپ اور امریکہ کے بعض اَور مفکرین اور غالباً اتنا بھی نہیں جتنی اُس کی موجودہ بیوی ڈورا رسل جس نے پانچ سال ہوئے ایک کتاب تصنیف کی تھی "خوش رہنے کا حق"۔

مضمونِ ہٰذا زیادہ تر رسل کی کتاب سے ماخوذ ہے۔ جہاں بعض خیالات کو اس سے تعلق نہیں وہاں کسی نہ کسی طرح اس امر کا اظہار کیا گیا ہے۔ مثلاً کہیں تو سین میں کچھ عبارت ہے اور کہیں فٹ نوٹ ہیں۔ یہ فٹ نوٹ تمام تر سڈنی ڈارک کے خیالات کا عکس ہیں۔ عموماً یہ متن سے تطابق رکھتے ہیں، لیکن گاہے گاہے ان میں اختلاف کی جھلک نظر آتی ہے۔

How to Enjoy Life by Sydney Dark (1924)

The Conquest of Happiness by Batrand Russell (1930)

The Right to be Happy by Dora Russell (1927).

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے موخر الذکر کتاب میں ایک زیادہ جنگجویانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ وہ زیادہ تر قدیم رسم و رواج اور قدیم خیالات کی مخالفت پر مشتمل ہے اور نئی آزادی کے نئے پُرجوش خیالات کی ترجمان ہے۔ اس کے برعکس خوشی کی تسخیر کو معاشری اِدارات سے واسطہ نہیں۔ رسل نے معاشرہ کی خرابیوں اور اُن کے انسداد کے متعلق اپنی دوسری تصانیف میں اظہارِ خیالات کیا ہے، موجودہ تصنیف میں وُہ صرف اس بات پر غور کرتا ہے کہ ہر فرد البشر بحالاتِ موجودہ کس حد تک از خود اپنی زندگی کو خوش تر بناسکتا ہے۔ مرقومۂ ذیل مضمون زیادہ تر اسی تصنیف پر مبنی ہے +

خوشی کی تسخیر! ہاں خوشی بڑی حد تک انسان کی انفرادی کوشش سے حاصل ہو سکتی ہے، مُسخر کی جا سکتی ہے، ایک ناخوش آدمی اگر دل سے چاہے اور خُوب غور کرے اور مُسلسل کوشش کرے تو اپنی زندگی کو بجائے دُکھ کی ایک کہانی کے ایک پُرلطف داستان بنا سکتا ہے۔

ہم ایک معمولی اوسط آدمی کا ذکر کریں گے۔ دُنیا میں غیر معمولی آدمی کم ہیں معمولی آدمی زیادہ ہیں۔ ابراہیم لنکن کا قول ہے خدا معمولی مردوں عورتوں سے ضرور محبت رکھتا ہے دیکھو تو اُس نے کتنے معمولی آدمی بنائے ہیں۔ پس ہمیں یہاں غیر معمولی انسانوں سے تعلق نہیں جو یا خوش نہ رہنا چاہیں یا جو ایسی چیزوں سے خوشی حاصل کر سکیں جس سے عام نوعِ انسان استفادہ نہ کر سکے۔ نہ یہاں اُن لوگوں کا بیان مقصود ہے جن کے پاس پیٹ بھرنے کو کھانا، تن ڈھکنے کو کپڑا یا آندھی اور بارش سے بچنے کو ایک اندھیری کوٹھڑی بھی نہیں یا جن کی صحت اس قدر خراب ہے کہ زندگی اُن کے لئے ایک مسلسل عذاب ہے یا جنہیں ظُلم کرنے میں مزا ملتا ہے، یا بچوں سے نفرت ہے یا بجائے محبت کئے جانے کے نفرت کئے جانے میں لُطف آتا ہے۔ یہ نہیں کہ ان بدبختوں کا مرض لاعلاج ہے۔ لیکن ہم اس مضمون میں اِن مریضوں سے مُنہ پھیر کر ایسے ہم جنسوں کی طرف توجہ کریں گے جن کی کمزوریاں اور غلطیاں نہ غیر معمولی قسم کی ہیں اور نہ محض غلط قسم کے معاشری اِدارات کا نتیجہ ہیں بلکہ جو اپنی خرابیوں کو اُن عام اصُولوں کی پیروی سے خود دُور کر سکتے ہیں جو مشترک انسانی تجربے سے حاصل ہو چکے ہیں۔

آؤ پہلے دیکھیں کہ لوگوں کی ناخوشی کے کیا اسباب ہیں؟ پھر ہم غور کریں گے کہ اُن کی خوشی کے کیا ذرائع ہو سکتے ہیں؟ انسانی ناخوشی کے دو بڑے سبب ہیں۔ اول نامناسب بیہودہ اور غلط نوع کے معاشری اِدارات مثلاً دنیاوی رسم و رواج، بے معنی مذہبی توہمات، عالمگیر معاشی اِدارے جن کے طفیل نوعِ انسان کے کمزور اور اسفل طبقے صدیوں سے مقتول

خوش قسمتی سے مافوق البشر انسان عنقا ہے۔

خوشی کے لئے نہ دولت لابدی ہے نہ صحت۔ اطمینان کی شاہراہ سوائے چند اشخاص کے باقی سب نوعِ انسان کے لئے کھلی ہے۔

قومی تعصبات کی بیخ کنی دائمی عالمگیر صلح کا اولیں لازمہ ہے۔

اور برسرِ اقتدار اشخاص کے ظلم و ستم سہتے رہے ہیں اور گاہے گاہے بغاوتوں اور انقلابوں میں اپنے جی کا بخار نکال کر دادِ خواہی اور آزادی کی تحریکات کو تقویت دیتے رہے ہیں۔ ڈور آرسل کہتی ہے کہ انسانی خوشی زیادہ تر دُنیا کے متعلق اُن نظریات پر منحصر ہے جن پر نوعِ انسان وقتاً فوقتاً یقین رکھتی اور عمل کرتی رہی چینیوں نے انسانی جبلت کی ضروریات کو بہت کچھ سمجھا، یونانیوں نے نفسی و جسمانی فعلیت میں تطابق پیدا کیا لیکن عیسائیت نے آ کر ممنوعات و نواہی پر زندگی کی بنیاد ڈالی اور انسان کے فطری میلانات کا گلا گھونٹ کر نوعِ انسان کو نیم مُردہ کر دیا۔ یونانیوں اور رومیوں کا تمدن فطرت کے زیادہ قریب تھا، عیسائیت کی غیر فطری پاکبازی نے انسان کو فطرت اور صحیح زندگی سے دُور جا پھینکا۔ ملحدین اور طبیعین نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی لیکن وہ دوسری طرف حد سے بڑھ گئے یعنی انہوں نے صرف عقل کے بت کی پرستش کو اپنا شعار ٹھہرایا اور یہ نہ سمجھا کہ عقل اور جبلت دونوں ہی کے مناسب امتزاج سے زندگی اصلی معنوں میں زندگی بن سکتی ہے۔ اور زندگی محض جہد للبقا نہیں بلکہ جب تک اس میں امن ترغیب آہستگی بھی مدد نہ دیں وہ کبھی صحیح زندگی نہیں کہلا سکتی۔ ہر حکومت کا فرض ہے کہ وہ عوام کے لئے نئے میدان عمل تیار کر کے اُنہیں آزاد چھوڑ دے، وہ نئی قسم کے انسان پیدا کرے، اور محض نئی قسم کے مرد اور عورتیں ہی نہیں بلکہ وہ پیدا کرے بہتر صحت بہتر قوت بہتر زوجی اتحاد تاکہ ان نئے سانچوں میں ڈھل کر نوعِ انسان خود بخود بہتر و مضبوط تر ہوتی جائے۔ اس نتیجے تک پہنچنے کے لئے متعدد معاشرتی تغیرات کی ضرورت ہے کچھ اُس قسم کے سیاسی و معاشی زلزلے جیسے فرانس اور امریکہ اور حال میں ٹرکی اور چین اور رُوس میں برپا ہوتے رہے ہیں +

ہمارے پاس گنجائش نہیں کہ ہم ان عام معاشرتی تبدیلیوں پر روشنی ڈالیں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، ہم یہاں صرف ناخوشی کے انفرادی وجوہ پر غور کریں گے اور یہ ہے انسانی ناخوشی کا دوسرا سبب اور یہی ہے جس کی مختلف صورتوں کا ہم بتفصیل ذکر کریں گے۔

جسمانی صحت دنیاوی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ انسان جسم و روح سے مرکب ہے۔ وہ محض ایک فرشتہ یا ایک روحانی ہستی نہیں بلکہ ایک جسم رکھتا ہے جس کی درستی کے بغیر وہ اس دنیا میں کوئی بڑا مفید کام نہیں کر سکتا۔ رُوح یا نفس کی قوت کے لئے عموماً جسم کی قوت درکار ہوتی ہے۔ انسان کا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ اس کا جسم صحت مند اور قوی ہو اور اس میں ایک صحت مند اور قوی رُوح آباد ہو۔ ہر چند تمدن کی پیچیدہ طرزِ زندگی نے اس کو ایک مشکل کام بنا دیا ہے۔ تاہم ایک معمولی آدمی اگر سمجھداری سے کام لے تو اپنی ذرا ذرا سی جسمانی ضروریات کی طرف توجہ کر کے وہ اپنے جسم کو درست حالت میں رکھ سکتا ہے۔ بالعموم جسم کے

ہر پرانی شئے کو لغو جاننا اتنا ہی فضول ہے۔ جتنا ہر نئی شئے کو بیہودہ سمجھنا +

جسمانی تسکین کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم دیکھیں کہ اس کا مسرت اور تخیل پر کیا اثر پڑا +

جسم کا کام ہے کہ وہ اس دربار تخت کے سامنے جس پر روحِ انفرادی زندگی کی حکمران ملکہ بن کر بیٹھتی ہے ایک تابع ملازم کی طرح ہمہ تن خدمت کو تیار کھڑا رہے۔

تمام اعضا کی روزانہ ورزش فطرت کا تقاضا ہے۔ جہاں ان میں سے کسی کی طرف غفلت برتی گئی وہ تھوڑے ہی عرصے میں گویا زنگ آلود ہوگیا۔ مختلف کھیل جن میں ہاتھ پاؤں ہلیں جلیں ٹہلنا دوڑنا تیرنا گھوڑے کی سواری وغیرہ وغیرہ مہذب آدمی کے لئے ان میں سے ایک نہ ایک بلکہ چند اقسامِ ورزش کا اختیار کرلینا ضروری ہے۔ کھانے پینے کا مسئلہ بغایت اہم ہے۔ معدہ جسم کا انجن ہے۔ جہاں یہ رکا۔ سب کی سب گاڑیاں آپ سے آپ رُک گئیں۔ جہد للبقا کے معنی سیدھی سادھی زبان میں پیٹ بھرنے کے لئے ہیں لیکن پیٹ کو مناسب طرح بھرنا ایک نہایت دقیق سوال ہے۔ کیا چیز کس طور پر کتنی کھائی جائے اس معاملے میں عقلمند سے عقلمند آدمی غلطی کرجاتے ہیں۔ بچوں میں ادب آداب کا اور بڑوں میں ضبطِ نفس کا پہلا سبق کھانے پینے سے شروع ہوتا ہے۔ خواہ یہ مضحکہ خیز ہی کیوں نہ معلوم ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ معدے کی نگہداشت روحانی ترقی کا پہلا قدم ہے۔ ورزش، خورد و نوش، سیر و تفریح، سکون و حرکت جسمانی صحت کے لئے ہر کام اور ہر شے میں اعتدال کی ضرورت ہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ جیسا کہ ہم دیکھیں گے راہِ اعتدال ہی عام طور پر جسم و روح کے لئے صحیح راہِ زندگی ہے۔

اپنی نگہداشت ضروری ہے جسمانی و نفسی نگہداشت لیکن اعتدال کے ساتھ کہ جو اپنا بھی حد سے زیادہ نگہدار بن گیا۔ جو صرف اپنے آپ میں مستغرق ہوگیا اور دوسروں سے بےتعلق وہ پھر صحیح آزاد زندگی سے بھی بےتعلق ہوگیا۔ ناخوشی کے وجوہ میں رسل سب سے پہلے خود اندیشی کا ذکر کرتا ہے خود اندیشی ایک خطرناک مرض ہے۔ جس کا اگر جلد سدّباب نہ کیا جائے تو وہ شخصیت کے لئے مہلک ثابت ہوتا ہے۔ خود اندیش آدمیوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک ہے وہ گناہ گار یا گناہ اندیش آدمی جس کے سر پر ہمیشہ گناہ سوار رہتا ہے۔ بچپن میں پاکبازی کی غلط تعلیم نے اُسے ہزارہا گناہوں کی دلدل میں دھکیل دیا۔ اب اُسے ہر بے ضرر شے میں بھی گناہ ہی گناہ نظر آتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی کسی چیز سے لطف نہیں اٹھا سکتا۔ ایک اور قسم ہے وہ خود پسند نرگسی جو آپ اپنی تعریف کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہر کہ ومہ اس کی تعریف ہی کیا کرے۔ وہ دنیا بھر کو اپنا حاضر و غائب عاشق بنانا چاہتا ہے۔ خود کسی سے محبت نہیں کرتا لیکن خواہشمند ہے کہ دوسرے اسے دل و جان سے چاہیں اور روز و شب اس کے کارناموں کی داد دیں۔ اس کا سبب کسی خاص قسم کی کوتاہی ہے۔ اور اس کا علاج صحیح قسم کی خودداری و مشغولیت ہے + ان کے علاوہ قوت جو شخص ہے جو دنیا بھر پر اپنی طاقت کا سکہ جا لینے کا آرزومند ہے۔ تمام دیوانے اور اکثر اکابرِ عالم اس نوع کی مثالیں ہیں۔ سکندرِ اعظم نپولین اعظم قیصر ولیم مسولینی وغیرہ سحر اپنا لوہا منوالنے پر مصر نظر آتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ بیشک ایسے ہی بڑے آدمیوں نے بعض باتوں میں دنیا کو ترقی دی لیکن اکثر ایسے لوگوں کے ہاتھوں قومیں اور نوعِ انسانی تباہ بھی ہوئی۔ خود اندیشی اور استغراقِ ذات

دورِ حاضر میں معدے کی اہمیت زیادہ ہے ضمیر و روح کی کم۔
زندگی کا لطف زیادہ تر ضبطِ نفس اور عام فہم پر منحصر ہے۔
ہم اپنی تنگ اندھیری کوٹھریوں میں بھاری بھرکم پردے چھوڑے پڑے رہتے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ کیسی کیسی خوبصورتیاں ہمارے ارد گرد منڈلا رہی ہیں۔ اپنے آپ سے گریز کی آرزو لغو ہے۔ ہم اپنے آپ سے گریز نہیں کرسکتے ہاں ہم یہ کرسکتے ہیں کہ اپنے نفس کو بیرونی روشنی سے منور ہوجانے دیں

کا علاج معروضی زندگی ہے یعنی اپنے آپ سے زیادہ دلچسپی کم کر کے دوسرے اشخاص اور اشیا میں دلچسپی لینا۔ رسل کہتا ہے جب میں ابھی پانچ برس کا تھا تو میں اس خیال سے کانپ جاتا تھا کہ مجھے ستر برس تک زندہ رہنا ہے جب میں جوان ہوا تو صرف ریاضی کے مسائل کی لطف اندوزی نے مجھے خودکشی کرنے سے روکا۔ اب ادھیڑ عمر میں میں زندگی سے بہت زیادہ لطف اُٹھاتا ہوں جس کا سبب کچھ تو یہ ہے کہ میں نے بہت سی اُن چیزوں کو حاصل کیا جن کی مجھے خواہش تھی، کچھ یہ کہ میں نے بعض فضول خواہشات کو چھوڑ دیا لیکن زیادہ تر میری بڑھتی ہوئی خوشی کا باعث یہ ہوا کہ میں نے فقط اپنی ذات میں منہمک رہنا چھوڑا اور خارجی دنیا کی مختلف اشیا میں روز بروز بیش از بیش دلچسپی لینی شروع کی۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ناخوش آدمی وہ ہے جو کسی فطری تسکین سے محروم ہو کر ظاہر یا باطن اُسی تسکین کے لئے بیقرار رہتا ہے اور اپنی زندگی کو صرف ایک ہی سمت میں دھکیلے لئے جاتا ہے اور یوں باقی دُنیا و ما فیہا سے علیحدہ و منقطع ہو جاتا ہے +

للّٰہی ناخوشی ناخوشی کی ایک شکل ہے جس کا شکار عموماً بعض عقلمند لوگ ہوتے ہیں یعنی یہ خیال اور احساس کہ ہم نے چیزوں کی ماہیت کو خوب پرکھ لیا ہے اور زندگی میں کوئی شئے نہیں رہی جس کے لئے آدمی جئے جائے۔ یقینی خوشی دنیا میں کوئی نہیں ہر جگہ شک وشبہ کی گنجائش ہے، ہمدردانہ محبت ڈھونڈے سے نہیں ملتی، بلند علم ادب کا وجود کالعدم ہے۔ چیزیں فضول ہیں دُنیا فانی ہے زندگی بے معنی ہے + ایسے خیالات کا سبب بالعموم مادی ضروریات کا آسانی سے پورا ہو جانا ہے اور اُن خیالات میں دو عنصر ہوتے ہیں تلونِ مزاج اور غلط توجیہ۔ تلونِ مزاج کے دورے یا طبیعت کی ترنگ کا تو دُنیا میں کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ آدمی دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہو اور کسی مفید کام میں مصروف ہو جائے لیکن نام نہاد وجوہ کا صحیح جواب یہ ہے کہ یقین و اعتقاد کے پیچھے پڑے رہنا اور اُن کے بغیر بچوں کی طرح چلاّتے پھرنا کوئی عقلمندی کی نشانی نہیں، شکوک و شبہات زندگی کا جزو ہیں اور ایک صحیح الدماغ شخص کو ان سے عہدہ برا ہو سکنا چاہئے۔ اور محبت کی ہمدردی دوسرے کی نکتہ چینی سے کم نہیں ہوتی بلکہ صحیح محبت وہی ہے جس میں سچی نکتہ چینی کام کرے۔ باقی رہا علم ادب سو علما و فضلا اگر بجائے اپنے دائرے میں گھومنے کے لوگوں سے واسطہ پیدا کریں باہر دُنیا میں جا نکلیں اور بلا تکلف زندگی سے دوچار ہوں تو وہ دیکھیں کہ اُن

مختلف لوگوں کے کارناموں سے واقفیت حاصل کرو اور دیکھو کہ انہوں نے زندگی کو کس کس مختلف طرح دیکھا اور بسر کیا ہے۔

اچھی زندگی کا مقصد انسانی مسرتوں میں اضافہ کرنا ہے۔

جو اس زندگی میں خوش رہنا چاہے اسے یقین رکھنا چاہئے کہ یہ زندگی واقعی جینے کے قابل ہے۔

اکثر اپنے جی کی لہر پر ہی کام کرنا جہالت ہے۔

ہر قسم کے سچے لگاؤ میں درست قسم کی نکتہ چینی شامل ہوتی ہے۔

کے تخیلات و تصورات و افکار میں ایک زیادہ زندہ قوت رونما ہو جائے۔ اور دُنیا فانی ہے تو یہ کوئی رونے کا مقام نہیں، عقلمند آدمی مستقبل بعید سے ڈر ڈر کر نہیں مرتا بلکہ حال ہی میں کمال پیدا کرتا ہے اور جن چیزوں سے اور جن واقعات سے مفر ممکن نہیں اُنہیں خندہ پیشانی سے قبول کر لیتا ہے۔ یہاں یہ ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عشق و محبت میں ناخوش رہنے والے بہت بے انصافی کرتے ہیں جب وہ یہ کہتے ہیں کہ محبت کے لُطف میں بھی ایک خلش ہے حالانکہ محبت کی مسرت دُنیا جہان کی مسرتوں سے زیادہ مسرت خیز ہے۔ محبت میں کیوں اتنا لُطف ہے اس کا جواب ذرا مشکل ہے لیکن اول تو ظاہر ہے کہ محبت بجائے خود اور گویا بلا وجہ لُطف کا اک سرچشمہ ہے اور دوسرے یہ کہ محبت سے دُنیا کے سارے دوسرے لُطف مثلاً موسیقی، طلوعِ آفتاب، شبِ ماہتاب دوبالا ہو جاتے ہیں۔ جس شخص نے اپنی محبوبہ کے ساتھ مل کر خوبصورت اشیا سے لُطف نہیں اُٹھایا اُس نے زندگی کی اِن خوشیوں کا پُورا بھید نہیں سمجھا۔ علاوہ بریں محبت انانیت کے خول کو توڑ دیتی ہے کیونکہ اس کا لُطف محض تعاون اور تعاون سے حاصل ہو سکتا ہے۔ محبت اشتراکِ عمل ہے اس اشتراکِ عمل میں بعض خاص قدروں کا پتہ چلتا ہے جن سے بغیر اس اشتراک کے مکمل طور پر لُطف اندوزی ناممکن ہے۔

موجودہ مغربی تمدن کو ایک اور گھُن لگا ہُوا ہے مقابلہ۔ آج کل یہ کہنے سننے کا فیشن ہے کہ زندگی جہد للبقا ہے۔ یہ بقا کے لئے جدوجہد دراصل کامرانی کے لئے جدوجہد ہے ورنہ صحیح جہد للبقا تو وُہ ہے جو ایک جنگلی درندہ یا ایک وحشی انسان یا ایک نہایت ہی غریب آدمی اپنا پیٹ پالنے کے لئے کرے۔ زمانۂ حال کے انسان کی بے کلی اور تڑپ اور کوششیں زیادہ تر مسابقت کے خیال کا نتیجہ ہیں۔ یورپ یا امریکہ کے کسی بڑے یا معمولی کاروباری آدمی کی مصروفیتوں کا عالم دیکھو صبح اُٹھتا ہے جلد جلد تیار ہو کر ناشتہ کر کے سیاہ لباس پہن کر ریل یا موٹر میں بیٹھ کر اپنے دفتر میں وارد ہوتا ہے اور ایک نہایت متین اور درشت سا رویہ اختیار کر کے اپنے کارکنوں سے کام لیتا ہے۔ اخبار اٹھاتا ہے اور تازہ ترین کاروباری معاملات سے واقفیت حاصل کر کے مختلف اجناس و حصص کی بڑھتی گھٹتی قیمتیں جانچ کر بیوپار کا جائزہ لیتا ہے۔ کسی بڑے ساہوکار کے ساتھ کسی پبلک طعام گاہ میں کھانا کھاتا ہے اور سارا وقت کاروباری گفتگو کرتا ہے۔ شام کو تھکا ماندہ گھر آتا ہے بیوی نے غالباً کسی دور دراز رہنے والے دوست کو شام کے کھانے پر مدعو کیا ہوتا ہے اور پھر سب کو مل کر تھیٹر جانا ہے لیکن یہاں میاں کے دماغ میں وہی نرخ کا چڑھ جانا بازار کا گر جانا قیمتوں کا اندازہ اجناس کا موازنہ چکر لگائے ہوتے ہیں وہ جمائیاں لیتا ہے اور نصف شب کے قریب جا کر اپنے بستر پر دراز ہو جاتا ہے اور سونے میں بھی انہیں باتوں کے خواب دیکھتا ہے۔ بھلا ایسی زندگی میں خواہ وہ کامران ہو یا ناکام خوشی کو کس قدر دخل ہو سکتا ہے، خانگی خوشیاں اور دوستانہ تعلقات بھی مشین کے پرزوں

، ہر ایک کا انحصار سب پر ہے اور سب کا انحصار ہر ایک پر۔

ہر شخص جبھی مطمئن رہ سکتا ہے کہ وہ زندگی کے عام امور و واقعات اور اپنے انفرادی حالات کو خوشی کے ساتھ قبول کرے۔

کی طرح چلتے رہتے ہیں جن سے کام کرنے والے کو کسی طرح کی دلی خوشی حاصل نہیں ہوسکتی۔ دمقابلے کی یہ بلا مشرقی ملکوں میں بھی لوگوں کے سر پر سوار ہوتی چلی جارہی ہے، آج کل کی زندگی میں ترقی اسی کا نام ہے کہ موازنہ ہو مجادلہ ہو مقابلہ ہو۔ ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی خواہش نے انسانی نفس کو اوندھے منہ گرا دیا ہے۔ ہر متمدن شخص کو یہی دُھن لگی ہے یہی گھن لگ چکا ہے کہ فلاں اور فلاں شخص مجھے مات نہ کردے میں سوسائٹی کا سب سے روشن تارا ہو کر چمکوں۔ یہ جنون یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ مقابلہ کی عادت ایسی باتوں میں بھی اپنا رنگ دکھانے لگی ہے جن سے اُسے تعلق نہ ہونا چاہیئے مثلاً کتابوں کا مطالعہ۔ کتاب پڑھنے کے آج کل دو مقصد ہوتے ہیں ایک اس سے لطف اُٹھانا دوسرے اُس کے متعلق ڈینگ مارنا۔ کسی کتاب کو بعض لوگ تو ساری کی ساری پڑھتے ہیں بعض اس کا پہلا باب اور بعض فقط اُس کے متعلق تبصرے پڑھ لیتے ہیں لیکن یوں وہ ان سب کی میزوں پر برابر پڑی نظر آتی ہے۔ اس طرح کے پڑھنے والے عموماً علم ادب کے شاہکاروں سے واسطہ نہیں رکھتے بلکہ تازہ ترین تصنیفات کو جلد جلد اُگلتے نگلتے رہتے ہیں۔ یہ ہے نتیجہ مقابلے کا اور کامران سمجھے جانے کے بے پناہ شوق کا۔ کامرانی بے شک زندگی کی مسرت کا ایک جزو ہی اور ایک نہایت اہم جزو لیکن دھیان رکھو کہ وُہ تمہارے اجزائے مسرت کا صرف ایک جزو ہو اور بس۔ یہ نہ ہو کہ تمہاری کامرانی تمہارے نفس میں اپنی تکمیل ڈال کر بدھر چاہے جہاں تک چاہے تمہیں گھسیٹتی پھرے۔ یہ خیال کہ زندگی محض ایک مقابلہ ہو انسانی پہلوانوں کا کشتی لڑنا اور ایک دوسرے کو پچھاڑنا ہے اور دُنیا محض حریفوں کی مسابقت کا میدان ہے بلا شبہ ایک جنون ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے نفس میں قوتِ ارادی تو نشوونما پاتی ہے لیکن حواس اور عقل کی بیخ کنی ہوتی ہے اور انسان قوت کو فہم پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ اس سے نہ صرف کام کے اوقات بلکہ آرام اور فرصت کی گھڑیاں بھی بے لُطف ہو جاتی ہیں اور نفس ایک نوع کی بےتابی سے مضطرب رہنے لگتا ہے۔ اس کا علاج فقط یہ ہے کہ کاروباری آدمی اپنے اصول و خیالات کو بدلے، متمدن انسان اپنے نصب العین میں ہر بات کے اعتدال سے تبدیلی پیدا کرے اور پھر آہستگی اور اطمینان کے ساتھ کاموں کا سر انجام دینا اور زندگی سے لُطف اندوز ہونا سیکھے۔

بیزاری اور ہنگامہ پسندی بھی متمدن انسان کی ناخوشی کے اسباب ہیں۔ بیزاری زراعت کے زمانے سے شروع ہوئی، جب انسان محض ایک شکاری تھا تو اُسے اپنے شکار کے لئے ہمہ وقت ہوشیار رہنا پڑتا تھا۔ جب وہ کسان بنا تو فراغت کے اوقات میں وہ پہلے پہل فرصت کی بیزاری سے دوچار ہوا۔ مشینوں نے آکر اسی بیزاری کے احساس کو کم کیا ہے اگرچہ یہ درست ہے کہ حال کا متمدن آدمی اپنے بزرگوں کی بہ نسبت بیزاری سے زیادہ خائف ہے۔ پڑے پڑے یا اُٹھتے بیٹھتے انگڑائیاں لیتے رہنا گزرے وقتوں میں زیادہ دیکھنے میں آتا تھا آج کل تو بھاگ دوڑ اور ہنگامہ پسندی کا دور دورہ ہے۔

عقلمند آدمی کبھی ناقابلِ حصُول شے کی تلاش میں ٹامک ٹوئیے نہیں مارتا۔

ناقابلِ حصول شے کے لئے آہیں نہ بھرو اور نہ بہت سی اشیاء کے لئے بے تاب رہو۔

عصبی ہنگامہ پسندی ایک حد تک لطف اندوزی کی معاون ہے۔ وہ انہماک کی نشانی ہے لیکن جہاں وہ ذرا حد سے بڑھی جان کا عذاب بن گئی۔ پھر شراب کی طرح اس کے سوا اطمینان نہیں۔ اس بے چینی کے بغیر چین کی صورت ممکن نہیں ہوتی۔ بیزاری بُری شے ہے لیکن اک ذرا سی بیزاری اتنی جتنی آٹے میں نمک زندگی کے لئے کارآمد ہے۔ غالباً بیزاری بھی زندگی کے مرکب کا ایک لاینفک جزو ہے اور جو شخص بیزاری کو مطلق برداشت نہیں کرسکتا وہ زندگی کی مسرتوں سے کماحقہ بہرہ اندوز بھی نہیں ہوسکتا۔ بیزاری کو برداشت کرسکنے کی عادت بچپن ہی میں ڈالنی چاہئے۔ بچے کو عموماً بے چین کرنے والی مصروفیتوں میں حصہ نہ لینے دینا چاہئے۔ زمین کے رہنے والوں کو زمین کی حرکت کی طرح زمین کے سکون سے بھی واسطہ ہے۔ ہم زندگی سے پوری طرح لطف نہیں اُٹھا سکتے۔ جب تک ہم تحریک کے ساتھ تسکین کا سبق بھی نہ سیکھیں جب تک "جلد جلد" کے ساتھ "آہستہ آہستہ" سے بھی آشنا نہ ہوجائیں جب تک ہم یہ نہ سمجھ لیں کہ سرما و خزاں بھی حیاتِ ارضی کے لئے اتنی ہی ضروری ہیں جتنی گرما و بہار۔

انسانی جسم و نفس بھی اس زمین ہی کی پیداوار ہیں اور اگر یہ زمینی خصوصیات سے قطعاً بے تعلق ہوجائیں گے تو یہ پوری طرح نشوونما نہ پاسکیں گے۔ ہمارا مصنف کہتا ہے کہ ایک دفعہ مجھے ایک ایسے دو سالہ بچے کو دیکھنے کا اتفاق ہُوا جو شروع سے لندن ہی میں رکھا گیا تھا۔ جب اُسے پہلی بار ہرے بھرے کھیتوں کی سیر کو لے گئے تو گو سردیوں کے دن تھے اور زمین بھیگی ہوئی تھی اور جا بجا کیچڑ تھی اور ایک جوان آدمی کے لئے خوش ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی لیکن یہ دو سالہ بچہ خوشی سے بے تاب ہُوا جاتا تھا۔ کبھی وہ گیلی زمین پر گھٹنے ٹیک کر گھاس میں منہ ڈالتا تھا اور کبھی وہ خوشی کے مارے بے تحاشا چیختا تھا۔ اُس کی خوشی ایک سادہ غیر متمدن آدمی کی فطری خوشی تھی، جس سے اکثر متمدن لوگ زمینی زندگی سے بے تعلق ہوجانے کے باعث محض بے بہرہ ہو چکے ہیں اور ایک نوع کی دلچسپ بے چینی کے خوگر ہو گئے ہیں۔ بہترین انسانی مساعی میں عموماً فطرت کی سادہ جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اچھی سے اچھی کتابوں میں دلچسپ حصوں کے ساتھ سادہ اور غیر دلچسپ حصے بھی ہوتے ہیں۔ اور بڑے سے بڑے آدمیوں کی زندگی میں بجائے بے چینی کے چین اور اطمینان کا پرتو نظر آتا ہے۔ اسی لئے ایک مسرور زندگی کے لئے ایک مطمئن اور تسکین یافتہ نفس کا وجود لابُدی ہے۔

تھکن ناخوشی کا ایک سبب ہے یعنی وہ اعصابی تھکن جو بالعموم متمدن انسانوں کی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ شہروں کے اعصاب کُش شور و غل، اجنبیوں کی تکلیف دہ موجودگی، عجلت جسم و جان کو تباہ کرنے والی آدابِ مجلس جن کے بار کے نیچے ہر وقت طبیعت دبی رہتی ہے خوف مالک کی ناراضی کا، تعطل کا، دیوالیہ ہوجانے کا، کوئی نہ کوئی فکر غریبوں اور متوسط درجے کے لوگوں کو کھانے پینے اور رہنے سہنے کی، امیروں کو اپنا وقت کاٹنے کی یا اپنی غلطیاں اور بے اعتدالیاں چھپانے کی۔ ان سب کا نتیجہ اعصابی تھکن کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جس کا عارضی علاج یا شراب خواری ہے یا کوئی اور ایسی ہی حیات کُش عادت۔ اکثر یہ تھکن فکر و تشویش کا نتیجہ ہوتی ہے اور یہ تشویش دُور ہوسکتی ہے اگر ہم اپنی زندگی کا ایک بہتر فلسفہ وضع کریں، اگر ہم اپنے خیالات پر زیادہ قابو رکھنا سیکھیں ہمیں چاہئے

عقلمندی سرگوشی کرتی ہے بیوقوفی شور مچادیتی ہے۔

کہ ہم کسی چیز کے متعلق ٹھیک وقت پر خیال کریں جب خیال کرنے کی ضرورت ہو اور اُس سے کچھ فائدہ ہو۔ جن لوگوں کو اپنے خیالات پر پورا قابو حاصل نہیں وہ بے وقت غور و فکر کرتے رہتے ہیں، باتوں کو آنے والے واقعات کے خیال سے پڑے پڑے اپنے بستر میں کروٹیں لیتے ہیں اور مفت میں بے خوابی کا شکار ہوتے ہیں۔ اور بعض قسم کی فکریں تو محض اس ترکیب سے دُور ہو جاتی ہیں کہ ہم ذرا سوچیں کہ معاملات جن سے وہ پیدا ہوتی ہیں کس قدر غیر اہم ہیں۔ رسل کہتا ہے کہ پہلے پہل جب مجھے تقریر کرنی پڑتی تھی تو اس کا خیال مجھے گھنٹوں بے چین رکھتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح میری ٹانگ ہی ٹوٹ جائے کہ میں اس خوفناک امتحان سے رہائی پاؤں اور جب میں تقریر کر چکتا تھا تو میں اعصابی بار سے مضمحل ہو جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ کچھ مضائقہ نہیں خواہ میں اچھی تقریر کروں یا بُری۔ کائنات بدستور سابق چلی چلے گی۔ میں نے دیکھا کہ میری اس بے پروائی سے میری تقریر میں روانی اور عمدگی پیدا ہوتی گئی اور اس کے بعد اس سے میری طبیعت پر بہت کم بوجھ پڑتا تھا۔ انسان اپنے افعال اور دُنیا کے واقعات کو ضرورت سے زیادہ اہمیّت دے کر اپنے لئے انہیں ایک مصیبت بنا لیتا ہے۔ وُہ شخص جو ذاتی اُمور اور دُنیاوی حادثات سے بالا بالا رہتا ہے نشیب و فرازِ زمانہ سے محفوظ رہتا ہے۔ مصائب کے اوقات میں اُس کی وُہ ناگفتہ بہ حالت نہیں ہوتی جو ایک خود اندیش شخص کی ہوتی ہے۔ بقولِ رسل ہر اُس شخص کو جو اپنے کام کو لغایت ضروری سمجھے زبردستی چھٹی لینے پر مجبور کرنا چاہیئے۔ دراصل ایسا شخص کسی جذباتی تکلیف سے بچنے کے لئے کام میں پناہ ڈھونڈتا ہے اُس کا مداوا کام نہیں بلکہ کام کے متعلق قدرے بے پروائی جس کے لئے ایسی حالت میں ضبطِ نفس کی ضرورت پڑتی ہے۔ ضبطِ نفس سے تضیعِ خیالات میں کمی ہوتی ہے نیند بہتر آتی ہے توانائی بڑھتی ہے اور کام کی صلاحیت میں دن دونی ترقی ہوتی ہے۔ فکر و تشویش کا دوسرا علاج نفس کے غیر شعوری حصّے کی اصلاح ہے۔ بہت سے خیال جو شعوری نفس سے خارج ہو چکے ہوتے ہیں غیر شعوری نفس میں پناہ ڈھونڈتے ہیں اور رہ رہ کر ہمیں تنگ کرتے رہتے ہیں۔ عقلمند آدمی کو چاہیئے کہ وہ درست قسم کے خیالات کو بزور اپنے غیر شعوری نفس میں جگہ دے۔ رسل کہتا ہے کہ جب مجھے کسی ادق مضمون پر طبع آزمائی کرنی ہوتی ہے تو میں چند دنوں یا گھنٹوں اُس پر پُوری توجہ کے ساتھ غور کرتا ہُوں اور پھر گویا ہدایت کر دیتا ہوں کہ اب یہ کام اندر ہی اندر ہوتا رہے۔ کچھ عرصے کے بعد جب میں پھر اُس کام کو کرنے لگتا ہُوں تو میں دیکھتا ہوں کہ کام کا بہت سا حصہ گویا ہو چکا ہوتا ہے۔

تھکن اکثر کسی نہ کسی قسم کے خوف سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ کسی کو دِق کا خطرہ ہے کسی کو افلاس کا کسی کو کسی بھید کے کھُل جانے کا اسی طرح کسی کو شبہات کا گھُن لگا ہے اور کسی کو راتوں کے وقت دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ کا ڈر لگا رہتا ہے۔ لوگ عموماً اس قسم کے خوفوں سے بچنے کے لئے اپنے جی کو دوسرے خیالوں میں لگائے رکھتے ہیں۔ لیکن خوف کے مرض کا یہ علاج مرض سے بدتر ہے۔ ہر خوف زیادہ خوفناک ہو جاتا ہے اگر انسان اُس سے خوف زدہ ہو کر اُس سے گریز کرے۔ خوف کے دُور کرنے کی ایک

زندگی ایک نازک سا رشتہ ہے۔ اُس کی اُلجھنوں کو احتیاط اور صبر اور باقاعدگی سے سُلجھاؤ۔

ہی ترکیب ہے اور وہ یہ ہے کہ تم اُس پر ٹھنڈے دل سے غور کرو اور بات کو خوب سمجھو یہاں تک کہ تم پر اُس کے تمام پہلو روشن ہو جائیں۔ اِس طرح معاملۂ زیرِ غور سے پوری واقفیت حاصل ہو کر اُس کا ہَول جاتا رہے گا اور نفس اُس پر قابو پائے گا۔ اگر نوجوانوں کو شروع سے بے باکی کی تعلیم دی جائے، اُن کی دلیری کو سراہا جائے، رائے عامہ کی طرف سے اُن کی بے پروائی کو مذموم قرار دیا جائے تو نوعِ انسان کے فکر و تشویش گھٹ کر آدھے رہ جائیں۔ تھکن کا ایک اور سبب بے چین کرنے والی تفریحات کا شوق ہے۔ کام کرنے والا کام سے واپس آتا ہے اور پھر کسی ایسی تفریح میں مصروف ہو جاتا ہے جو کام ہی کی طرح تھکانے والی ثابت ہوتی ہے۔ رسل سے آزاد خیالوں کا نظریہ ہے کہ اگر اخلاقِ عامہ میں مردوں عورتوں کے آزاد اختلاط کو اس قدر غیر پسندیدہ نہ سمجھا جائے تو لوگوں کو تفریح کا ایک آسان اور فطری ذریعہ میسر ہو جائے۔

اعصابی تھکن ایک پردہ ہے جو انسان اور دُنیا کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ محسوسات براہِ راست اُس تک نہیں پہنچتے اور اُس کی توجہ صرف چند اشیا کی طرف مبذول ہو جاتی ہے جس کا لازمی نتیجہ بے چینی اور تھکن ہوتا ہے۔ یہ ہے سزا فطرت سے بے تعلق ہو جانے کی پس اگر تم زندگی سے متمتع ہونا چاہتے ہو تو ایک فطری زندگی بسر کرنا شروع کرو۔

حسد انسانی جذبات میں ایک نہایت راسخ جذبہ ہے بچوں میں، نوکروں میں، صاحبِ اقتدار آدمیوں میں، شریف متمول خواتین میں، ہم پیشہ مردوں میں یہ جذبہ ہر جگہ کار فرما نظر آتا ہے۔ جہاں بچہ ایک برس کا ہوا اور اُس نے دیکھا کہ تم نے دوسرے بچے کو زیادہ پیار کیا کہ وہیں اُس کے دل میں حسد پیدا ہو گیا۔ عورتوں میں حسد اور غیبت کی عادت کس کثرت سے پائی جاتی ہے شرفا کے کسی مجمع میں دیکھو کہ ایک عورت زرق برق لباس پہنے ہو تو کتنی عورتیں جل بھُن کر کوئلہ ہوئی جاتی ہیں۔ مشاعروں میں شاعروں کے مقابلے مشہور ہیں، ذوق غالب کے سہرے اِسی ضمن میں منظرِ عام پر آئے، حسد خاص طور پر جمہوری حکومتوں میں پایا جاتا ہے انسانوں کی برابری ایک نہایت بلند و پاکیزہ نظریہ ہے لیکن اسی سے حسد و مسابقت کا بازار گرم ہوتا ہے۔ حسد کی بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ خود حاسد کو بے حد نقصان پہنچاتا ہے۔ حاسد حسد سے جلا مرتا ہے۔ مثلاً میں ایک دستکار ہوں اور دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر اور وکیل اپنی اپنی کاروں میں اپنے کام پر جاتے ہیں اور مجھے پیدل جانا پڑتا ہے سو میں ان سے حسد کرتا ہوں اور اپنی تھکن میں اور زیادہ تھک جاتا ہوں۔ فلاں شخص کے پاس فلاں شے ہے میرے پاس کیوں نہیں؛ اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ حسد کا ایک ہی کارگر علاج ہے کہ ہم نوعِ انسان میں تعریف و تحسین کی عادت کو بڑھائیں اور حسد کو گھٹائیں۔ کوئی زاہد یا ولی ایثار و بے غرضی سے شاید حسد سے پاک ہو جائے تو ہو جائے لیکن عام مردوں عورتوں کے لئے حسد کا سدِباب صرف خوشی کے حصول سے ہو سکتا ہے۔ حسد بچپن میں غلط تربیت سے پیدا ہوتا ہے۔ جس بچے کے سامنے اُس کے بہن بھائی کو ترجیح دی جائے یا جو بچہ دیکھے کہ اُس کے والدین اُس سے اتنی شفقت کا سلوک نہیں کرتے جتنے اور بچوں کے والدین، وہ بچہ یقینی طور پر حاسد بن جائے گا۔ ایک حاسد شخص ہم سے کہے گا کہ تم وعظ کر رہے ہو کہ حسد خوشی سے مٹتا ہے لیکن مجھے تو یہ مصیبت پڑی ہے کہ جب تک حسد میرے دل میں جاگزیں ہے خوشی وہاں داخل نہیں ہو سکتی میں تمہاری نصیحتوں پر کیسے عمل کروں۔ آج موسم خوب ہے سُورج چمک رہا ہے ہوا چل رہی ہے مگر میں سنتا ہوں کہ فرانس میں یا کشمیر میں جنت کی سی

بہار ہے۔ میری معشوقہ خوبصورت ہے اور باوفا مگر کاش وہ لیلیٰ یا شیریں کی سی ہوتی تو میں اپنی ساری زندگی اُس پر قربان کر دیتا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب ہم اس بات کو خوب ذہن نشین کر لیں کہ ہماری ناخوشی کا کیا سبب ہے تو ہمارے لئے اُس کا انسداد آسان ہو جاتا ہے۔ نفسی انضباط جس سے انسان فضول خیالات کو بے وقت نہیں سوچتا از بس ضروری ہے۔ آخر ایک حاسد کو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ میں جو کسی پر حسد کر کے مر رہا ہوں اگر اپنی ہی خوشی سے خوش ہو جاؤں تو کتنا اچھا ہو۔ خوشی سے زیادہ قابلِ رشک اور کون سی شے ہے۔ اگر میں خوش ہو جاؤں اور خوش رہوں تو وہی لوگ جن پر اب مجھے حسد آتا ہے پھر مجھ پر حسد کرنے لگیں۔ تم اگر عالمگیر شہرت کے تمنائی ہو تو ممکن ہے تم نپولین سے حسد کرنے لگو۔ لیکن غریب نپولین سیزر سے حسد رکھتا تھا اور سیزر کا دل سکندرِ اعظم کے کارناموں سے جلتا تھا اور سکندر ممکن ہے ہرقل پر جو ایک فرضی شخص تھا رشک کرتا ہو۔ پس حسد سے کامیابی کے ذریعے سے بچ نکلنا ممکن نہیں۔ حسد کا انسداد صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ جو خوشیاں تمہارے نصیب میں ہوں اُن سے لُطف اٹھاؤ، جو کام تمہیں کرنے ہیں کرو اور دوسروں سے بے فائدہ مقابلہ کرنا چھوڑ دو۔

حسد کا ایک باعث انکسار بھی ہے۔ انکسار مشرق میں قابلِ تعریف سمجھا جاتا ہے لیکن حال کے مغربی مفکرین عموماً اسے لائقِ تحسین نہیں سمجھتے۔ منکسر المزاج آدمی خیال کرتا ہے کہ اُس کے ساتھی اُس سے بڑھ گئے ہیں اس لئے اُس کے دل میں حسد بھی جاگزیں ہوتا ہے۔ رسل کہتا ہے کہ اپنے لڑکے کو یہ سکھاؤ کہ وہ اپنے آپ کو ایک اچھا اور ہوشیار لڑکا سمجھے۔ کوئی مور دوسرے مور کے پروں سے حسد نہیں رکھتا کیونکہ ہر مور کو اس کا یقین ہے کہ میرے پر دُنیا میں سب سے خوبصورت ہیں۔ اسی لئے مور امن پسند جانور ہے۔ اگر کسی مور کو یہ سکھایا جائے کہ تم اپنے پروں کو بہترین پر نہ سمجھا کرو تو نتیجہ یہ ہو کہ جب کبھی وہ کسی اور مور کو ناچتے دیکھے تو وہ جی میں یوں خیال کرے کہ "مجھے ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ میرے پر اس سے بہتر ہیں کیونکہ یہ ہوگا تکبر لیکن آہ کاش کہ میرے پر بھی ایسے ہی خوبصورت ہوتے۔ ذرا دیکھو یہ کم بخت جانور پھُولا نہیں سماتا۔ میں اس کے کچھ پر نوچ نہ ڈالوں؟ پھر مقابلے کی بلا میرے سر پر سوار نہ رہے" یا شاید "نیک" مور خوبصورت مور کے لئے ایک جال پھیلائے اور ثابت کرے کہ خوبصورت مور کمینہ ہے اور موروں کے اخلاق کا پابند نہیں اور یوں وہ اُسے موروں کی محفل میں بدنام کرے۔ یہاں تک کہ یہ امر مسلمہ سمجھا جائے کہ پروں والے مور بدتمیز ہوتے ہیں اور موروں کے راجہ کو چاہئے کہ وہ تمام ایسے موروں کے پر نچوا ڈالے اور انہیں مروا ڈالے۔ اس ساری "نیک نفسی" کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خوبصورت پروں والے مور تقریباً ناپید ہو جائیں گے اور صرف دُم کٹے مور بھاگتے دوڑتے نظر آئیں گے۔ یہ ہے حسد کی فتح اور اُس کا انجام۔

زمانۂ حال کی پُرمقابلہ جمہوری زندگی حسد کی ذمہ دار ہے۔ تھکن سے بھی حسد بڑھتا ہے۔ تھکا ماندہ آدمی جب اپنا کام بخوبی

خلوص کا یہ مُدعا نہیں کہ تم دُوسروں کی پسند و رجحان کو بُرا سمجھو اور بُرا کہو بلکہ اُس کا یہ تقاضا ہے کہ تم اپنے رجحان و پسند کا دلیری کے ساتھ اظہار کیا کرو۔

ہر شخص میں بے غرضی اور نیکی کی ممکنات موجود ہیں۔

سرانجام نہیں دے سکتا تو اُس کے دل میں ایک عام بیزاری سی پیدا ہوتی ہے اور یہ چپکے چپکے حسد کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔

حسد کی بلا بڑی حد تک دُور ہوجائے اگر نوعِ انسان کی زندگی اُس کی جبلت کے زیادہ مطابق گزاری جاسکے چنانچہ جنسی اشتہا سے حسد پیدا ہوتا ہے اور جو شخص اپنی بیوی اور بال بچوں میں خوش ہے اُسے حسد کا مرض بہت کم لاحق ہوتا ہے۔ انسانی خوشی کی ضروریات نہایت سادہ اور سہل الحصول ہیں جو جذبات فطرت نے انسانی نفس میں رکھے ہیں اگر اُن کی ایک حد تک تسلی ہوتی رہے تو انسان بغیر دقت کے خوش اور مطمئن رہ سکتا ہے۔ حال کے تمدن کی بدبختی ہے کہ متمدن آدمی بجائے دوستی کا جذبہ محسوس کرنے کے رقابت اور دشمنی کا جذبہ زیادہ محسوس کرتا ہے اور یہ اس لئے کہ اُس کا دل بے تاب رہتا ہے، وہ دل کے اندر ہی اندر محسوس کرتا ہے کہ وہ زندگی کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکا اور اِس لئے کچھ اُداس سا ہوجاتا ہے، کچھ اس طرح جیسے چڑیا گھر میں لنگور ہمیں دیکھ کر اور شاید یہ خیال کرکے کہ کاش ہم بھی انسان ہوتے لیکن انہیں پتہ نہیں چلتا کہ انسان کس طرح بنیں۔ یہی حال متمدن آدمی کا ہے۔ ارتقا کی منزل میں متمدن آدمی کھویا سا گیا ہے۔ ہم آج کل ایک ایسے مرحلۂ تمدن میں ہیں جس سے ہمیں جلد گزر جانا چاہئے۔ متمدن انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے دل کو وسعت دے جیسے اُس نے اپنے نفس کو وسعت دی ہے اور نری خودی سے بلند تر ہونا سیکھے تاکہ وہ کائنات کی صحیح آزادی کا اہل ہوسکے۔

گناہ احساسی بھی ناخوشی کا منبع ہے۔ حال کے مغربی ماہرینِ علم النفس گناہ احساسی کو مذہب سے منسوب کرتے ہیں کہ مذہب نے آکر انسان میں ضمیر کا خیال پیدا کیا۔ اُن کے نزدیک ضمیر بعض وقت محض بھید کھل جانے کے ڈر کا نام ہے، بعض وقت برادری سے خارج ہوجانے کے ڈر کا، بعض وقت محض اُن غلط اجتنابی خیالات کا جو ایک غلط پا کبازی نے مُدتوں سے نوعِ انسان کے دل میں ٹھونسے ہیں۔ ہم بچپن میں اپنے ماں باپ سے سُنتے ہیں کہ قسم کھانا گناہ ہے، بعض اعضاءِ جسمانی کا ذکر گناہ ہے، بعض فطری رجحانات گناہ ہیں، تمباکو نوشی گناہ ہے، مرد کے لئے عورت کی خواہش عورت کے لئے مرد کی طرف میلان گناہ ہے یہ گناہ ہے وہ گناہ ہے، غرض انسان کا سارا ماحول گناہ کی نجاست سے غلیظ ہوجاتا ہے وہ گناہ ہی گناہ دیکھتا ہے گناہ ہی گناہ کا خیال کرتا ہے اور گناہ ہی گناہ کا احساس کرتا ہے۔ یہ سب غلط اور محض غلط ہے اُس کا لازمی نتیجہ خوشیوں کا بے مزہ ہوجانا اور زندگی کا ناخوش اور کمزور ہوجانا ہے اور کچھ نہیں۔ فی الحقیقت نیک آدمی وہ ہے جو کسی شے سے لطف اُٹھانے کو بُرا نہ سمجھے جب تک اِس لطف اندوزی کا نتیجہ صریح طور پر نقصان دہ نہ ہو۔ رسل کہتا ہے جھوٹ بولنا عموماً ایک نہایت بُری بات ہے لیکن میں یہ نہ مانوں گا کہ جھوٹ بولنا ہمیشہ ہر حال میں بُرا ہے۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ میں کھیتوں میں ٹہلنے کو نکل گیا۔ کچھ شکاری لوگ اپنے کتوں کو لئے ہوئے ایک غریب لومڑی کا پیچھا کررہے تھے۔ وہ جان بچائے آگے آگے دوڑی جاتی تھی پیچھے پیچھے مار دھاڑ کرتے چلے آتے تھے کہ اتنے میں وہ اُن کی نظر سے

انسانی تجربے سے عام طور پر ثابت ہے کہ نیک ہونا خوش ہونا ہے۔

حد سے بڑھی ہوئی نیکی گستاخ اور بے لحاظ ہوتی ہے۔ ایک تنگ کرنے والے ملاقاتی سے کہلوانا کہ وہ گھر میں نہیں" یا کہنا کہ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" یہ کوئی برائی نہیں حسنِ ادب ہے۔

سے اوجھل ہو کر کسی طرف کو چل دی۔ مجھ سے آ کر انہوں نے پوچھا کہ وہ کدھر گئی مجھے معلوم تھا لیکن میں نے سچ کو چھپایا اور میں نہیں سمجھتا کہ اگر میں سچ بول دیتا تو اس سے کیونکر میں ایک زیادہ نیک آدمی بن جاتا"جنسیت کے معاملے میں جدید مفکرین کے خیالات خاص طور پر قابل غور ہیں کیونکہ وہ ہمارے خیالات سے بغایت مختلف بلکہ اُن کے عین متضاد ہیں)۔ وہ کہتے ہیں کہ عورت مرد کے باہمی تعلقات کو مذموم سمجھا جاتا ہے حالانکہ اگر انسان اعتدال پر قائم رہے تو وہ اُس کے لئے بالکل فطری چیز ہیں + ایک غلط قسم کی حیاداری اور پاکبازی نے اس مسرت کو مکدر کر دیا ہے اور اسے گناہ اور غلاظت سے تعبیر کیا جاتا ہے منچلے کو ان پُرانے خیالات سے بچانا چاہئے اور بڑوں کو جن کے دل میں یہ خیالات مدت سے بیٹھ گئے ہیں اپنے غیر شعوری نفس کو اس زہر سے پاک وصاف کرنا چاہئے متمدن آدمی کو چاہئے کہ وہ تلون مزاج کا شکار نہ ہوتا ہے کہ کبھی کچھ خیال کرے کبھی کچھ بلکہ جس نئی بات کو اُس کی عقل مان لے اُسے بزور اپنے نفس میں جگہ دے + گناہ کا احساس تھکن یا علالت کے وقتوں میں خاص طور پر زور پکڑتا ہے لیکن اگر انسان کے نفس شاعرہ میں خیالات پوری طرح راسخ کئے جائیں اور وہ گھڑی کے لنگر کی طرح اِدھر سے اُدھر گردش نہ کرتا ہے تو پُرانی عادات وخیالات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا کوئی مشکل کام نہیں + اپنی قوت ارادی کو مضبوط بناؤ۔ دھمل یقین نہ ہو کہ کبھی عقل کے پیچھے ہو لو اور کبھی توہمات کے پیچھے دوڑتے پھرو۔ بزرگوں کے قول وعمل کی پیروی محض اس لئے کہ وہ تمہارے بزرگوں کے قول وعمل ہیں جہالت ہے۔ خود غور کرو کہ واقعی بُرے فعل کون سے ہیں۔ کاروبار میں چالاکی، اپنے ملازمین سے درشتی کا سلوک، بیوی اور بچوں پر ظلم، اپنے ہم پیشہ لوگوں سے دشمنی، سیاسی مقابلوں میں ایک نوع کی خونخواری، یہ ہیں واقعی بُرے فعل جن کی قانون میں سزا نہیں لیکن جن سے نوع انسان تباہ حال وبرباد ہو رہی ہے + جو کچھ تمہاری عقل کہے جو کچھ تم غور وخوض کے بعد سمجھو اُسے انتہائی احساسیت کے ساتھ محسوس کرو اُسی کو سچ جانو اور سچ مانو اور اُسی پر مسلسل طور سے عمل پیرا ہوتے رہو + جب کبھی تم سے ایسی غلطی یا گناہ سرزد ہو جسے تم خود بھی غلطی یا گناہ سمجھتے ہو اُس حالت میں بھی گناہ احساسی تمہاری ترقی یا بہبود کا ذریعہ نہیں بن سکتی کیونکہ گناہ احساسی خودداری کے خلاف ہے اور خودداری گئی تو سمجھ لو کہ بہت کچھ جاتا رہا۔ گناہ احساسی سے آدمی کو ناخوشی اور ہیچ میرزی کا احساس ہونے لگتا ہے اور پھر ناخوش ہونے کی وجہ سے وہ دوسروں سے بڑی بڑی توقعات رکھتا ہے اور زیادہ ہی زیادہ ناخوش ہوتا جاتا ہے۔ ہیچ میرزی کے احساس سے وہ دل ہی دل میں ان لوگوں کی بڑائی پر پیچ وتاب کھاتا ہے جو اُس سے زیادہ بلند مرتبہ ہیں اور دوسروں کی تحسین کرنا اُس کے لئے مشکل اور حسد کرنا آسان ہو جاتا ہے + دوسروں کی طرف ایک وسیع اور فیاضانہ رویہ نہ صرف دوسروں کے لئے خوشی کا موجب ہوتا ہے بلکہ انسان کے اپنے لئے سچی خوشی کا سبب بن جاتا ہے لیکن ایسا رویہ صرف قلبی توازن اور خود اعتمادی سے پیدا ہوتا ہے صرف اُس ذہنی

صرف امر واقع کو مانو اور گمان ووہم سے یکسر منہ پھیر لو +

ایک بار کوئی بے معنی کام کر دیا کوئی بے معنی سی بات مان لو تو اُس سے تمہاری ساری عمر پر بُرا اثر پڑے گا

مسلسل ہیچ میرزی ایک قسم کا غرور معکوس ہے + •

ترتیب وترکیب سے جو شعوری نیم شعوری اور غیر شعوری نفس تینوں کے مکمل اتحاد سے ظہور میں آسکتی ہے + ہر انسان کو چاہئے کہ وُہ اپنے آپ کو نفسی تخریب سے روکے جو ایک نوع کی خانہ جنگی ہے، نفس کے اندر ہی اندر۔ اِس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہر روز گھنٹہ دو گھنٹہ اپنا امتحان لیا کرے کہ اس سے محض خود اندیشی میں اضافہ ہوگا بلکہ بہترین طریقہ یہی ہے کہ انسان عزمِ مصمم کرلے کہ اُس کے لئے عقلاً کونسی بات صحیح ہے اور کون سی لغو اور اس کے بعد وہ اپنے نامعقول اعتقادات و توہمات کی یکسر بیخ کنی کردے + بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ عقل کی زیادہ پیروی اچھی نہیں، اس سے اچھے جذبات کا قلع قمع ہوتا ہے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ نفرت یا حسد یا ایسے ہی مذموم جذبات کی سرکوبی سے زندگی غیر دلچسپ ہوجائے بشرطیکہ انسان عقل کے ساتھ ساتھ اپنی جبلت پر بھی نظر رکھے اور اپنی جائز فطری ضروریات کو پورا کرتا رہے + بلاشبہ اس قسم کی جبلت آشنا عقلیت زندگی کو بہتر اور خوش تر بنائے گی اور جو شخص نفس کی پُرانی بیماریوں کا عقل کے ذریعے سے علاج کرنے کی طرف متوجہ ہوگا وہ یقیناً ایک ایسے شخص سے بھی زیادہ صحت مند ہوجائے گا جسے ان بیماریوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا + عقل اور غور وخوض کے استعمال سے کبھی کوئی شخص زیادہ ناخوش نہیں ہوتا۔ کیونکہ خوشی اُسی وقت مکمل ہوتی ہے جب انسان کے سب قوا پوری طرح کام کریں اور جب نفس ہمہ تن مصروف ہو اور کوئی شے بھی بھولی ہوئی نہ ہو۔ وہ خوشی جو کسی نشے کی محتاج ہو کبھی پوری تسلی نہیں دے سکتی بلکہ وہی خوشی پوری تسلی دے گی جو ہمارے قوا کے پورے استعمال اور دنیا و مافیہا کی پوری واقفیت کے ساتھ حاصل ہو +

بعض لوگوں کو یہ خبط ہوتا ہے کہ ساری دُنیا ہماری ہی ایذا رسانی پر تُلی ہوئی ہے + یہ ایذا رسانی کا خبط ایک نوع کا مرض ہے جس کی انتہائی شکل دیوانگی ہے + بعض اشخاص ہمارے پاس ہمیشہ اپنی شکایتوں کا چٹھا لے کر آتے ہیں فلاں ہم سے حسد رکھتا ہے فلاں کا سر آسمان پر ہے فلاں نے مجھے دھوکا دیا فلاں نے بے وفائی کی فلاں نے بے اعتنائی کی + دُنیا کی رنگارنگ زندگی میں حسد اور غرور اور جفا کی بے انتہا مثالیں ہیں اور بے شمار مواقع۔ لیکن ایک شخص جب یہی کہے اور سمجھے کہ اُس کے ساتھ ساری دُنیا نے صرف بُرائی کی تو ہمیں شبہ ہونے لگتا ہے کہ قصور اُس شخص کے نفس بلکہ دماغ میں ہو باقی اہلِ دُنیا میں نہیں۔ اِس مرض کا مداوا از بس مشکل اِس لئے ہے کہ یہ اگر ایک طرف زیادہ اظہارِ ہمدردی سے بڑھتا ہے تو دوسری طرف ناہمدردی سے بھی اس کا زور کم نہیں ہوتا۔ غیبت اِسی نوع کے خیالوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ہر شخص اپنی چُغلی کا حال سُن کر غصے میں آجاتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ اُس نے بھی کبھی نہ کبھی بالکل اِسی طرح دوسروں کی بُرائی کی ہے اور اِس سے لطف اُٹھایا ہے +

✓ مشق جس قدر حصُول کے لئے ضروری ہے اُتنی ہی لُطف اندوزی کے لئے بھی ضروری ہے +

خوشی صرف مکمل تسکینِ ذات سے حاصل ہوسکتی ہے اور تسکینِ ذات ہزاروں لاکھوں کے اژدہام میں بھی صرف اپنی رُوحانی آزادی کے برقرار رکھنے سے ممکن ہے + ایمرسن کا قول ہے کہ نقل خودکشی ہے +

✓ روزمرّہ کی اصلی زندگی فرضی قصے کہانیوں سے کہیں زیادہ دلچسپ و دل آویز ہے +

خوشی شخصیت کے نشو ونما اور ذاتی قوا کے مکمل استعمال سے حاصل ہوتی ہے +

ایذارسانی کے مرض کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی خوبیوں کے تصور میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور اپنے آپ کو اصلیت سے زیادہ نیک یا زیادہ قابل یا زیادہ بہادر سمجھتے ہیں + ایک مصنف کو یقین ہے کہ وہ بہترین لکھنے والا ہے لیکن جب اُس کی تصنیف کو کوئی ناشر دس ہزار روپے میں خریدنے پر آمادہ نہیں ہوتا تو اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ دُنیا ناقدر دان ہے حاسد ہے بے سمجھ ہے۔ ایک مخیّر ہزاروں آدمیوں پر بے مانگے روز و شب خیرات کیا کرتا ہے اور جب اس پر بھی ناقدر شناسی اور نا احسان مندی پاتا ہے تو اس کے دل کو سخت صدمہ پہنچتا ہے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کارِ خیر میں اُس کی نیت کیا ہے۔ ایک شخص دوسروں کا بھلا چاہتا ہے دوسروں کو کسی بُرے کام سے روکتا ہے، وہ یہ نہیں سمجھتا کہ عموماً دوسروں کو ایک شخص اُن کے بُرے کاموں سے اس لئے روکتا ہے کہ وہ خود ایسے کاموں کے لُطف سے محروم ہے۔ ملازموں اور مفلسوں کو ہم اکثر بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور اپنی بُری باتوں کو یاد نہیں کرتے۔ ایک سیاست دان یا خادمِ قوم جو برسوں کی محنت و توجہ سے عزت و طاقت کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہُوا ہے جب دیکھتا ہے کہ دُنیا اُس پر نکتہ چینی کرتی ہے اور تشکر گزار نہیں تو وہ غم و غصے سے بے تاب ہو جاتا ہے وہ اتنا نہیں سمجھتا کہ ممکن ہے اس کی نیت محض خدمتِ قوم کی نہ ہو بلکہ خود نمائی اور ہوس اور طاقت اُس کی رہنما و معاون ہوں یا محض سب سے بڑا بننے کی خواہش نے اُسے سب سے بڑا بننے پر آمادہ کیا ہو + برسوں کی محنت کے بعد وہ عوام الناس سے بیزار ہو کر علیحدگی اختیار کر لیتا ہے اور افسوس ظاہر کرتا ہے کہ میں نے کیوں تمام عمر ناحق سر مغزن کی اور یہ معاوضہ پایا۔ ایذارسانی کا یہ خبط ذیل کی چار باتوں کے سمجھنے سے کم ہو سکتا ہے اول یاد رکھو کہ تمہاری نیت عموماً اتنی صاف نہیں ہوتی جتنی تم سمجھتے ہو۔ انسان کوئی فرشتہ نہیں وہ ایک خود غرض وجود ہے اور خود غرضی ایک حد تک بُرا وصف بھی نہیں بلکہ زندگی کے لئے ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص تمام وقت محض دوسروں کو کھلانے پلانے میں مصروف رہے تو خود بھوک سے مر جائے گا اور ظاہر ہے کہ اس طرح مرجانا کوئی تعریف کی بات نہیں واقعہ یہ ہے کہ انہماک کے بغیر کوئی بڑا کام سرانجام نہیں ہو سکتا اور بغیر تھوڑی سی خود غرضی کے انہماک ناممکن ہے۔ دوم اپنی خوبیوں پر اتنے حاشیے نہ چڑھاؤ بلکہ جان لو کہ اگر تم میں کوئی غیر معمولی خوبی موجود ہے تو اس کی قدر ہو کے رہے گی۔ تمہاری خوبی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ تم اپنے آپ سے سوال کرو کہ جو کچھ میں کرتا ہوں یا بناتا ہوں یا لکھتا ہوں وہ میں اس لئے کرتا ہوں کہ میں اسے کرنے پر مجبور ہوں یا محض اس لئے کہ دنیا میرے کام کی داد دے۔ داد کی یہ خواہش ایک واقعی بڑے آدمی میں بھی ہوتی ہے لیکن کم + سوم۔ دوسروں سے یہ توقع نہ رکھو کہ وہ بھی تمہاری زندگی میں اتنی ہی دلچسپی لیں جتنی تم خود لیتے ہو۔ بعض والدین اپنے بچوں سے امید رکھتے ہیں کہ وُہ اپنی جوانی ان کے بڑھاپے کے لئے وقف کر دیں یا اپنے خیالات کو اُن کی خاطر ترک کر دیں کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے کی زندگی کو اُس کی اختیار کردہ یا فطری راہ سے ہٹا کر اپنی راہ پر لگا لے۔ چہارم۔ یہ خیال نہ کرو کہ لوگوں کو تمہارا اس قدر خیال لگا رہتا

✓ اپنی کمیوں کی پہچان اتنی ہی ضروری ہے جتنی اپنی خوبیوں کا احساس۔

اگر ہر شخص اپنے آپ کو صحیح طور پر جانچے اور اپنے نفس کو روکے تو تیس برس کے عرصے میں نوعِ انسان کہیں سے کہیں ترقی کر جائے +

ہے کہ وہ تمام وقت تمہاری ایذا رسانی کے درپے ہیں۔ اگر تم کوئی بڑے آدمی ہوتے (مثلاً لینن یا گاندھی) اور ہزاروں لاکھوں آدمی تمہاری برائیاں کرتے اور تمہیں نقصان پہنچانے کے درپے رہتے تو یہ بات کچھ مانی جاسکتی تھی لیکن جب تم کروڑوں میں سے ایک عام انسان ہو تو اس وہم و خیال کو دل سے نکال دو کہ کل جن لوگوں نے پبلک میں تقریریں کیں اور اُن میں سے بعض کی تصویریں اخباروں میں شائع ہوئیں اور تمہاری شائع نہ ہوئی تو وجہ یہی تھی کہ لوگ تمہاری بڑائی سے جل گئے۔ اپنے آپ کو اس طرح بڑا بنانا اور بڑا سمجھنا چھوڑ دو کہ اس سے تمہاری خوشی نہیں بلکہ ناخوشی میں اضافہ ہوگا۔ کسی قسم کی تسکین دہی بالیقین یا وہم یا خیال جو خود بینی پر مبنی ہو پائدار نہیں ہوتا اور نہ مسرت آفریں ہو سکتا ہے پس بہتر ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے تم حق بات کو جان لو اور مان لو اور جس قدر جلد ممکن ہو تم اپنی زندگی کو اس اعتراف کی پختہ بنیاد پر تعمیر کرنا شروع کر دو۔

رائے عامہ کا ڈر متمدن انسان کے لئے بھوت پریت کے ڈر سے کچھ کم نہیں۔ اکثر لوگ خوش نہیں رہ سکتے جب تک اُن کی طرزِ زندگی اور طرزِ خیال کو اُن کی معاشرہ یا اُن کے میل جول کے لوگ درست نہ سمجھیں۔ موجودہ زمانے میں آزادی کی وجہ سے آرا کا اختلاف عام ہو گیا ہے اور زیادہ عام ہوا جاتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ سوائے چند افراد کے بہت کم ہیں جو لوگوں کے اختلاف اور نکتہ چینی کو آسانی سے برداشت کر سکیں۔ اسی لئے آج کل کے اکثر نوجوان مرد اور عورتیں جن کے خیالات میں حریت اور مساوات کی بجلی دوڑ گئی ہے اپنی نوجوانی کے زمانے میں نہایت ناخوش اور مشوش رہتے ہیں۔ جب یہ لوگ کسی کالج یا دارالعلوم میں چند برس کے لئے جاتے ہیں تو انہیں بعض ہم خیال مل جاتے ہیں لیکن دنیا میں واپس آکر یہ پھر ویسے کے ویسے مصیبت زدہ ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں ماسوا اُن کے جن کی سیرت غایت درجہ مضبوط و مستحکم ہو باقی سب بے انتہا کرب و اندوہ میں زندگی کے دن کاٹتے ہیں۔ کئی اشخاص رائے عامہ سے ضرورت سے زیادہ ڈرتے رہتے ہیں۔ رائے عامہ ایسے لوگوں پر جو اُس سے ڈریں زیادہ ستم ڈھاتی ہے بہ نسبت اُن لوگوں کے جو اس سے بے پروا ہیں۔ اگر تم رائے عامہ سے اختلاف رکھتے ہو تو یہ اختلاف خوش مزاجی اور مسخرے پن کے ساتھ کرو یہاں تک کہ تم ایک ہر دلعزیز خبطی کا درجہ حاصل کر لو جو نہ کسی سے لڑتے جھگڑتے اور نہ اپنی ہی بات سے ہٹے۔ یہ ظاہر نہ کرو کہ تم لوگوں کے قول و فعل کے خدائی نقاد ہو۔ لوگ اُن شخصوں کی آرا کو زیادہ برا نہیں مانتے جن کے مذاق اور دوست داری سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی نکتہ چینی کے اجارہ دار نہیں لیکن جہاں ذوق و رائے کے اختلاف کی وجہ سے ناہمدردی اپنا کام کرنے لگے وہاں اکثر ایسا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ پھر نوک جھوک شروع ہوتی ہے

جو شے ایک بڑے آدمی کے لئے اچھی ہے ضروری نہیں کہ وہ ایک چھوٹے آدمی کے لئے بھی اچھی ہو اور جو کچھ بڑے بڑے واقعات میں ضروری ہے ضروری نہیں کہ وہ روزمرہ کی زندگی میں بھی ضروری ہو۔

اپنے اصول پر قائم رہنے میں کسی قسم کی درشتی کی ضرورت نہیں مسکرا کر کہی ہوئی "نہیں" اتنی ہی پُر اثر ہو سکتی ہے جتنی منہ بنا کر کہی ہوئی "نہیں"۔

لوگوں کو خواہ مخواہ تنگ کرنے والی بہادریاں دکھانا پاگل پن کی نشانیاں ہیں۔

ہر شے کا ایک وقت ہوتا ہے اور موقع۔

یا اندر ہی اندر ایک جلن اور غصہ۔ لہٰذا جہاں بھی ممکن ہو ایسے نوجوانوں کو جو اپنے ماحول میں ناخوش ہوں اس قسم کے پیشے یا کام اختیار کرنے چاہئیں جہاں انہیں ہم خیالی کی نعمت دستیاب ہو سکے گو اس میں اُن کے لئے مادی خسارہ ہی کیوں نہ ہو۔ دنیا کا تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے اکثر نوجوان اس بات کو نہیں سمجھتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ برسوں ناخوش رہتے ہیں اور آخر کار مُدت کے بعد اگر حُسنِ اتفاق سے یا کوشش کے بعد انہیں اپنے کام کے لئے ایک بہتر ماحول حاصل ہو جائے تو اُن کی توانائی اس قدر کم اور اُن کا دل اس قدر بیزار ہو چکا ہوتا ہے کہ اُن کے لئے خوش ہو سکنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ اِسی لئے نوجوانوں کو اُن کے اپنے انتخاب پر چھوڑ دینا چاہئے۔ اگر وہ غلطی کرنے لگیں تو معمولی انتباہ کے بعد انہیں غلطی کرنے دینی چاہئے کہ وہ کبھی نہ کبھی خود بخود سیدھی راہ پر آجائیں گے۔ اگر تمہارا لڑکا تھیٹر میں ایکٹر بننا چاہے تو اُسے بننے دو تمہیں اُس کا ایکٹر بننا بُرا معلوم ہوتا ہے لیکن کیا عجب ہے کہ وہ ایکٹروں میں ایک ایسا ایکٹر بن جائے جو تھیٹروں کی دُنیا میں ایک انقلاب پیدا کردے اور معاشرہ کی ترقی کا ذریعہ ثابت ہو۔ دُنیا میں عام طور پر دوسروں کی رائے کے بُت کی ضرورت سے زیادہ پرستش کی جاتی ہے۔ پیشے کا انتخاب، روپے کا صرف کرنا، تفریحات ان سب میں ہم اکثر دوسرے لوگوں کی رائے پر چلتے ہیں حالانکہ اگر ہم اپنی رائے پر چلیں اور لوگوں سے بغیر بحث مباحثہ کئے اُن کی رائوں سے بے پرواہی برتیں یعنی اپنی فطرت کے تقاضا کو پورا کریں اور دوسروں کے ساتھ اکھڑپن کا برتاؤ نہ کریں تو دُنیا اور خود ہمارا دائرہ معاشرت ہمیں زیادہ دلچسپ اور ہمدرد نظر آنے لگے اور دوسروں کی زندگی بھی ہمارے اس رویے سے زیادہ مسرور و پُرلطف ہو جائے۔ موجودہ دنیا میں بوجہ نقل و حرکت کی آسانی کے نزدیکی قریبی ہمسایوں کی مصاحبت سے نجات مل سکتی ہے اور اس لئے ایک سمجھ دار شخص زیادہ آسانی کے ساتھ اپنے ہم خیال و ہم رائے اشخاص کی صحبت اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی متمدن دُنیا میں بعض باتوں میں رواداری کی اشد ضرورت ہے۔ مثلاً بعض وقت اخبار کسی فرد کے گلے کا ہار ہو جاتے ہیں اور زندگی اُس غریب کے لئے عذاب ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہر نوع کی صحیح رواداری انسانی خوشی کے لئے لابدی ہے کیونکہ پائدار انفرادی خوشی انفرادی میلانات و تحریکات ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ ایک طرف اگر عام افراد کو خواہ مخواہ رائے عامہ پر پتھر نہ برسانے چاہئیں تو دوسری طرف رائے عامہ کو بھی افراد کی راہ میں روڑے نہ اٹکانے چاہئیں تاکہ ہر شخص جہاں تک مناسب اور ممکن ہو اپنی پسند اور اپنے میلان کے مطابق زندگی بسر کرے اور اس طرح اپنی اور دوسروں کی خوشی اور ترقی کا ذریعہ ثابت ہو۔

(باقی دارد)

بشیر احمد

سا دوستی وہ ہے جو ہمیں بے طلب ملے محض اس لئے کہ ہم ہمیں ہیں ہمارے جاہ و مال کے لئے نہیں بلکہ صرف ہماری ذات کے لئے۔

پوری لُطف اندوزی صرف دوسروں کی قدردانی سے ہوتی ہے۔

اپنا آپ بنو۔

کم از کم بعض چیزیں ایسی ضرور ہونی چاہئیں جن کے متعلق ہم کبھی ماننے کو تیار نہ ہوں کہ ہم غلطی پر ہیں اور دوسرے راستی پر۔

خوش خلقی معاشری زندگی کی ذمہ داریوں کا اعتراف ہے۔ وہ روزمرہ کی زندگی کو شیریں بنا دیتی ہے۔

جو شخص تعصب کا شکار ہو جاتا ہے وہ پھر غلام بن جاتا ہے۔

ہوالغنی

ٹھنڈی ہوا ہے، رقص میں ہے ابرِ بہمنی
ہاں دیر کیا ہے، ساقیِ رنگیں ہوالغنی

انسان، اور ہو نہ سکے خوش !!! اٹھا تو جام
نادان تیرے دِل کی کلی ہے شگفتنی

ہاں چھیڑ بھی رباب کہ ہے گرمِ اختلاط
حسنِ مہِ دو ہفتہ و ابریقِ یک منی

چھلکا چمن میں جام، کہ یہ رو بھی دیکھ لے
سبزے پہ اوس اوس پہ مے، مے پہ چاندنی

اُٹھ، گوشِ دل کو قلقلِ مینا سے تیز کر
تا سُن سکے صبا کے سخن ہائے گفتنی

آ مست ہو کے حسن کو دے دعوتِ نیاز
نبضِ صنم میں گرم ہے خونِ برہمنی

صہبا سے دھو نگاہ، کہ غلطاں ہے دیر سے
جاناں کے دل میں آرزوئے برقع افگنی

واللہ آج ہند میں تو جوش فرد ہے
رحمت خدا کی تجھ پہ ہو اے مردِ یک فنی

جوش ملیح آبادی

میرا سخت ترین نقاد

کل ایک صاحب جن سے کچھ تکلف بھی ہے اور کافی بے تکلفی بھی ہے میرے کمرے میں آ ڈٹے اور ایسے کہ ٹلنے کا نام نہ لیں۔ دو چار مرتبہ دبی زبان سے کہا بھی کہ تمہارا وقت قیمتی ہوگا مگر وہ کب ماننے والے تھے۔ فرمانے لگے کام تو روز ہی کرتا ہوں اور تم بھی شاید کرتے ہو مگر یہ موقع غنیمت ہے۔"

ادھر کی اُدھر کی ہزاروں باتیں کر ڈالیں۔ بیسیوں سگرٹوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا اور آخرکار کہنے لگے جس مطلب کے لئے آیا تھا وہ اب بیان کرتا ہوں۔ میرے سوال پر کہ کیا یہی موقع مناسب ہے فرمانے لگے "قطعی"

ناچار کہا کہ "جی ہاں ضرور۔ کیا ارشاد ہے؟"

ملاقاتی:۔ "ہمایوں" کے سالگرہ نمبر کی تیاری کا وقت ہے اور مجھے ڈر ہے کہ شاید آپ پھر اس میں کچھ اسی قسم کے پریشان فقرے لکھ دیں گے، جن سے دنیا اکتا چکی ہے۔

میں (چونک کر) حضرت کیسے فقرے؟

ملاقاتی۔ جناب آپ کے سر پر صنفِ نازک کی پرستش کا بھوت سوار ہے۔ عورت نہ ہوئی کمبخت الف لیلہ کی داستان ہوئی کہ ختم ہونے میں نہیں آتی۔

میں۔ سنئے جنوری نمبر کے لئے یہ ایک پرانی چیز بھیجنے کا خیال کر رہا تھا۔

ملاقاتی۔ سنائیے۔

میں۔ پڑھ کر سناتا ہوں:۔

"اے میرے اچھے سے دل، اے میرے بھولے سے دل، تُو جا! تو جا مگر وہ آرزوئیں جن سے تجھے سجایا تھا چھوڑ جا۔ آرزوئیں میری ہیں تیری نہیں۔ اے دل تو محض خالی کرہ ہے۔ محض ننگی دیواریں، بن ڈھکی چھت اور بے فرش کی زمین۔ یہ صرف میری آرزوئیں کی بدولت تیری دیواروں پر طرح طرح کی تصویریں ہیں۔ نیچے قیمتی قالینوں کا فرش ہے، چھت پر گلکاری ہے اور عشق کی بجلی کی روشنی ہے۔

ہاں تو تُو جا! جہاں تُو جا رہا ہے وہ مکان میرا دیکھا ہوا ہے۔ وہاں کے مکین میرے دیکھے ہوئے ہیں۔ نہیں میں تجھے سمجھا نہیں رہا۔ اچھے دل! میں اُن پرانے احمق ناصحوں میں سے ہرگز نہیں کہ تجھ پر نیک و بد واضح کروں۔ نہ تو نیک و بد کا قائل

نہ میں ناصح بننے کے قابل۔ آنا جانا خوشی کا قسمت آزمائی کوئی گناہ نہیں۔ جا اور شوق سے جا مگر میری آرزو میں چھوڑ جا +

"وہ کیا کرتی ہوگی؟" نہیں۔ میں تیرے قصے نہیں سنتا تو کہاں کا ایسا ولی ہے کہ رعنائی حسن کے کرشمے تجھ پر کشف ہوں؟

اے دل! مجھ سے بحث نہ کر تو اپنا علمی سرکس رہنے دے۔ مانا کہ تیرے بیان میں فلسفے کے شیر اور مذہب کے ہاتھی لڑتے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی مانا کہ تو ایسا اگر اپڑا نہیں کہ تیری آؤ بھگت نہ ہو مگر کہاں تو کہاں وہ!

تو نہیں مانتا! اچھا تو جا، مگر میری ایک آرزو چھوڑ جا۔ کون سی آرزو؟ وہی کہ وقت اور حسن کی جنگ میں اُس کا حسن غالب نکلے

یہ آرزو تجھ سے لے لوں تو تو نہ جائے گا ہمیری بلا سے۔ اے بزدل دل! میں تیری گھاتوں سے خوب واقف ہوں۔ اس کی خدمت میں تو الو کھا بن کر پیش ہونا چاہتا ہے۔

جا تجھ میں کچھ بھی نہیں

ملا فاقی۔ لاحول ولا قوۃ۔ آخر اس کا مطلب؟

میں۔ حضرت! مطلب خاک نہیں۔ دل کو آباد کر کے اجاڑنا میرا کھیل ہے۔ مجھے اپنے آپ پر ڈاکا ڈالنے میں وہ لطف حاصل ہوتا ہے جو سکندر اعظم کو سلطنتیں زیر کر کے نہ ہوا تھا۔ میرے دل میں اور مجھ میں جو باتیں ہوئی ہیں وہ بجائے خود انسانی تاریخ ہیں۔ میرے دل میں کبھی طوف حرم کی بھول بھلیاں تھیں۔ سجدوں کے شوق سے چپہ چپہ محراب تھا خطبوں کے جوش سے دل کے کونے کونے میں منبر تھے +

اور پھر جو ہوا بدلی تو دل کی وہ مسجدیں اُجڑ گئیں۔ خدا کی بجائے قوم سر پر سوار ہوئی اور رو رہ وہ قوم کے ماتم ہوئے، کبھی ترقی کے نام پر، کبھی وفا کے نام پر اور کبھی دنیاوی عزو جاہ کے نام پر کہ فرشتے جگر تھام کر بیٹھ گئے۔ مگر حضرت تم سو یہ قصے کہنے فضول ہیں۔ تم سے خدا نہ چھٹا۔ تم اسے رٹے جا رہے ہو۔ تمہیں وہ کچھ نہ کچھ ضرور دے دے گا۔ فرق تم میں اور مجھ میں بس اتنا ہے کہ تم اس سے کچھ کہنا چاہتے ہو میں اپنا آپ اُسے دینا چاہتا تھا۔ مگر نہ میں اس کے کام کا نکلا نہ وہ میرے کام آیا اور یہ قصہ بھی ختم ہوا +

میں اب صرف قزاق ہوں۔ جونہی دل میں کوئی خیال جاگزیں ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے فوراً اس پر بالقصد ڈاکا ڈالتا ہوں اور اُسے لوٹ کھسوٹ کے باہر کرتا ہوں۔ معقولیت پسند ہونے سے کس قدر مجھے عار ہے!

ملا فاقی۔ آپ کو معقول ہونے سے عار ہو یا معقولیت کو آپ سے نفرت ہو دنیا کو کیا مصیبت ہے کہ وہ یہ سب کچھ پڑھے۔

میں۔ تم خاک نہیں سمجھتے۔ یہ میرا قصہ نہیں ہر ایک کا ہے۔ ہم سب دم بدم بدلتے رہتے ہیں صرف لوگوں کو یہ جرأت نہیں کہ اس تبدیلی کو محسوس کریں +

ملا فاقی۔ قطعی غلط۔ اگر ہم اس قدر بدلیں تو پھر پہچانے کیسے جائیں؟ خدا کے لئے "ہمایوں" کو اس قسم کے خرافات سے محفوظ رکھیئے۔

میں۔ اچھا اسے جانے دو۔ یہ اور ایک پرانی چیز سنو۔
ملافانی۔ کہو۔
میں پڑھ کر سناتا ہوں:۔

دُنیا ہزارہا سال سے ایک ہی قسم کے بے شمار انسان پیدا کرتی چلی جارہی ہے یعنی وہ مدّی قسم جس کی خواہش یہ ہے کہ عشق کا عیش ہو، شہرت کے ڈھول ہوں یا وہ دوسری کثیر التعداد قسم جو ہل چلا چلا کر یا ٹوکری ڈھو ڈھو کر یا دوسروں کے فائدے کے لئے دوسروں کا کھا مان کر بے گہوارہ کی پیدائش سے، بے کفن کی موت تک کا سارا رستہ نیم برہنگی اور نیم فاقے میں طے کرلیتی ہے۔ کیا دنیا اس اپنے کرتوت سے کبھی نہ شرمائے گی؟ کاش دُنیا کے یہ پرانے سانچے ٹوٹ جائیں شکلیں نئی ہوں توشاید عقلیں بھی کچھ طرار طرحدار ہوں . . . . . .

ملافانی۔ (کانوں میں انگلیاں دے کر) خدا کے لئے اِس کو بند کرو۔ حضرت کیا آپ کو جنون ہے کہ آپ دنیا غریب کے پیچھے یوں لاٹھی لئے پھرتے ہیں۔

میں۔ اچھا ایک علمی مضمون سنو۔
ملافانی۔ بہتر سناؤ۔
میں۔ پڑھ کر سناتا ہوں:۔

اخلاق کی اُقلیدس

بسم اللہ الحکیم و الجبار و القہار

جن لوگوں کی اردو کو پنجابی سے پردہ ہے اُن کی اطلاع کے لئے صرف اس قدر گزارش ہے کہ جس پنجابی سکول میں اینجانب نے اقلیدس کو دماغی ستیاناس کرنیکی اجازت دی وہاں کے ریاضی کے مدّرس کے طریق تعلیم سے ہم نے یہی نتیجہ نکالا کہ مسماۃ اقلیدس میاں الجبرا کی گھروالی ہے اور اسی دن سے ہمارے ذہن میں اقلیدس کا شمار صیغۂ مونث میں ہے۔ یہ تو ہمیں برسوں بعد پتا چلا کہ یوکلڈ ایک یونانی مرد کا نام تھا۔ مگر ہماری بلا سے اگر عرب والے یوکلڈ کو اقلیدس کر سکتے ہیں تو پنجاب والے اسی بھوت کو بھتنی سمجھ لیں تو کیا گناہ!

آمدم بر سرِ مطلب

اُقلیدس نقطے سے شروع ہوتی ہے اور نقطے کی قطعی صحیح تعریف یہ ہے کہ نقطہ وہ چیز ہے جو سمجھ میں آئے مگر موجود نہ ہو۔ اسی طرح خطِ مستقیم کی اُقلیدس میں صحیح تعریف یہ ہے کہ خطِ مستقیم کسی نقطے کا وہ نقش پا ہے جب کہ وہ نقطہ سفر کرتا ہُوا اِدھر اُدھر بھٹکے

دائرہ کی تعریف یہ ہے کہ دائرہ اس مجبور نقطہ کا نقش پا ہے جو لاکھ چکر کھائے مگر ایک اور نقطے سے جس کا نام مرکز ہے مساوی فاصلے پر رہے۔ ان تین تعریفوں پر تمام اقلیدس کا دارومدار ہے۔ جب یہ تین تعریفیں ہماری سمجھ میں آگئیں تو کمبخت اقلیدس نے بیسیوں اور باتیں ہمارے دماغ میں ٹھونس دیں یعنی یہ کہ مثلث کے تین زاویے ہر حالت میں دو قائم الزاویوں کے برابر ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ +

چونکہ اخلاقیات سے ہمیں خاص شغف ہے اس لئے ہم اسے اقلیدس کے طریقے پر مطالعہ کرنا چاہتے ہیں + جسے ہماری تعریفوں یا نتائج سے اتفاق نہ ہو وہ اگر ہم کافر نہیں تو کج بحث ضرور ہوگا +

اخلاق کی ابتدا زندگی سے ہے، جہاں زندگی نہیں وہاں اخلاق ناممکن۔ گویا اخلاقیات میں زندگی کا وہی پایہ ہے جو اقلیدس میں نقطے کا۔ مگر اقلیدس کے نقطے کے برعکس زندگی وہ چیز ہے جو موجود ہے مگر سمجھ میں نہیں آتی۔ اسی طرح صراط مستقیم زندگی کا وہ نقش پا ہے جس کی نسبت یہ کہا جا سکے کہ جو جتنا بھٹکے اسی قدر راہ راست پر ہو۔ مثال کے طور پر عرب کی تاریخ پر غور کر لیجئے۔ جب عرب والے فسق و فجور و جہالت وظلم کے رستوں پر بے حد بھٹک چکے تو وہاں رحمت الٰہی سے ایسا پیغمبر نازل ہوا کہ تمام دنیا کو اس کی ذات پر ہمیشہ کے لئے فخر کرنا واجب ہے۔ عربوں کے لئے بھٹکنا ہی صراط مستقیم تھا۔ اگر وہ کم بھٹکتے تو انہیں یہ فخر حاصل نہ ہوتا۔ بھٹکتے بھٹکتے انھوں نے اُس شاندار کمال کو حاصل کر لیا جس کے لئے زوال ناممکن ہے۔ اسی بات کا ایک نفی کا پہلو بھی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایک شخص اورنگ زیب کا ذکر ہے۔ اس شخص کی نسبت یہ امر مسلم ہے کہ اسے تمام عمر ذرا سی غلطی کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ اور تمام عمر باوجود "زندہ پیر" ہونے کے اسے ایک بھی سچا دوست نہ ملا "آہ از مردمان کار آہ از مردمان کار" چلتا چلتا مر گیا۔ نہ وہ بھٹکا نہ اُس نے کچھ پایا +

اخلاقیات میں دائرے کی تعریف سخت مشکل ہے، مگر ناممکن نہیں۔ تمام اخلاق کا مرکز گناہ ہے۔ زندگی کا نقطہ تبھی ایک مکمل دائرہ تیار کر سکتا ہے جب گناہ سے ہر وقت مساوی فاصلہ رکھنے کی طاقت اس میں موجود رہے۔ جہاں گناہ سے نفرت ہوئی اور زندگی بہک کر کسی ایک طرف چلی وہیں دائرہ ٹوٹا اور جب کسی دائرے میں ذرا سی بھی شکن آگئی تو یہ یقینی ہے کہ کوئی طاقت اسے دائرہ نہیں بنا سکتی۔ گویا گناہ کی طرف برابر کھنچتے رہنے پر کامیابی کا مدار ہے +

ملاقانی (بے حد طیش سے) ایسی مضمون نگاری پر ہزار لعنت (غصہ میں آکر اُٹھ بیٹھتا ہے)

میں۔ حضرت تشریف رکھئے۔

ملاقانی۔ کیا تمہیں عشق حقیقی سے ذرا بھی مس نہیں؟

میں۔ عشق حقیقی سے تو کوسوں بھاگتا ہوں۔

ملاقانی۔ وہ کیوں؟

میں۔ لمبی بات ہے سنو تو کہوں۔

ملاقانی۔ کہئے۔

ہیں۔ انگریزی عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں بدترین چیز وعظ ہے اور یہ کہنا بھی وعظ ہے چنانچہ اسی لئے انگریز وعظ سُن لیتے ہیں مگر ایسی طرح کہ اس کان سے سُنا اس کان سے نکالا۔ انگریز عام طور پر پسند یہ کرتے ہیں کہ ان کا پادری وعظ اچھا کہے یا بُرا یا نہ کہے مگر مستند ضرور ہو۔ چند ہی دن کا ذکر ہے کہ ایک مشہور پادری کی نسبت فخریہ اخباروں میں لکھا گیا تھا کہ وہ muscular Christianity (یعنی پہلوانی عیسائیت) کا نہایت شاندار نمونہ تھا۔

ایک پادری سے جب اس کی چلبلی بیٹی نے کہہ ہی دیا کہ "ابا آج کا آپ کا وعظ تو خوب رہا" تو پادری صاحب نہایت بے تکلفی سے فرمانے لگے کہ "بیٹی ہمیشہ چھ پنس میں خریدنا تھا اس پر پورے ڈھائی شلنگ صرف کر ڈالے۔ کیا کرتا چندہ بھی تو جمع کرنا تھا" یہ ہے انگریزی قوم کی موقع شناسی کا ادنےٰ ثبوت۔

جس طرح انگریزی قوم کا یہ یقین ہے کہ وعظ (preaching) دنیا کی بدترین حرکت ہے (چنانچہ وہ اُس نظم یا ناول کو بھی چنداں پسند نہیں کرتے جس میں وعظ ہو) اسی طرح اس قوم کا یہ بھی مسلک ہے کہ دنیا کی بہترین چیز عشق ہے۔ ان کے نزدیک خدا خود عشق ہے اور وہ اس شغل میں اس قدر ماہر ہیں کہ انہوں نے عشق کی تمام قسموں کو سر سے پاؤں تک چھان ڈالا ہے۔ عشق ان کی کتابوں میں بالکل اس ترتیب سے مقفل موجود اور محفوظ ہے جیسے ہسپتالوں میں ٹین کمٹ لگی ہوئی مختلف قسم کے زہر کی بوتلیں۔ جس شخص کو جتنا عشق اور جس قسم کا عشق درکار ہو اسے اتنی ہی بوندیں (دن میں تین دفعہ کھانے کے بعد) دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے مناسب یہ ہے کہ عشق کی چند مشہور قسمیں گنوا دی جائیں مثلاً اوّل عشق حقیقی۔ انگریزی اخلاقی فرنابادین میں عشق حقیقی وہ ہے جس کا پول نہ کھلا ہو۔ اب اس کے نمونے ملاحظہ ہوں (۱) کسی بڑے مشہور انسان کا عشق اپنے بڑے خدا کے ساتھ یا اپنی چھوٹی بکری کے ساتھ۔ دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے مگر اس میں فرق نہ آئے کہ آسمان پر خدا زمین پر بکری۔ خدا بکری کو پالتا ہے بکری انسان کو پالتی ہے۔ انسان اپنی ضد کو پالتا ہے (ب) کسی سفید گورنمنٹ کا عشق اپنی سیاہ پولیس سے۔ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے مگر اس میں فرق نہ آئے کہ اوپر گورنمنٹ نیچے پولیس۔ گورنمنٹ پولیس کو پالتی ہے۔ پولیس داروغہ جیل کو پالتی ہے۔ داروغہ جیل جرم پالتا ہے (ج) کسی وفادار مولانا کا اپنی مفقود الخبر خلافت سے عشق۔ دُنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے مگر اس میں فرق نہ آئے کہ . . . .

ملاقاتی غصہ سے لال پیلا، میری طرف جھپٹنے کو تھا کہ میں ایک طرف ہٹ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرے ڈرنگ روم میں داخل ہو کر ان حضرت نے میرا چھے سے اچھا سوٹ پہنا بہتر سے بہتر میری نکٹائی ڈانٹی اور میری نئی چھڑی ہاتھ میں لئے یہ جا وہ جا۔ پھر تو کمرے میں نہ میں تھا نہ وہ تھا۔ مگر واللہ باللہ یہ باتیں ضرور ہوئیں +

فلک پیما

فیضانِ عشق

قربانِ عشق! بندۂ جاناں بنا دیا | فرماں روائے عالمِ امکاں بنا دیا
اِک ناسزا کو سلطنتِ درد سونپ دی | اک بے نوا کو غیرتِ سلطاں بنا دیا
اک بے بصر کو طاقتِ دیدار بخش دی | اک بے خبر کو صاحبِ عرفاں بنا دیا
قطرے کو رتبۂ یمِ ذخّار دے دیا | ذرّے کو آفتابِ درخشاں بنا دیا
فرشِ زمیں سے عرش پہ لا کر بٹھا دیا | ہمسایۂ عطارد و کیواں بنا دیا
غمناک کو نگارِ طرب سے مِلا دیا | خاشاک کو بہار بہ داماں بنا دیا
دورِ ستم کو دورِ کرم سے بدل دیا | فصلِ خزاں کو فصلِ بہاراں بنا دیا
ہستی کا چپہ چپہ بہاروں سے بھر دیا | عالم کا گوشہ گوشہ گلستاں بنا دیا
میخوار و نغمہ بار و مے افشاں دکھا دیا | گل ریز و رنگ ریز و غزل خواں بنا دیا
ساری زمین کو جلوۂ جاناں سے پاٹ کر | سارے جہاں کو روضۂ رضواں بنا دیا
سر تا بہ پا حیات میں تبدیل کر دیا | سر تا بہ پا مجسمۂ جاں بنا دیا
سر تا قدم ثبات میں تبدیل کر دیا | سر تا قدم حرارتِ ایماں بنا دیا
خاموشِ گفتگو کا طریقہ سکھا دیا | اربابِ آرزو کا زباں داں بنا دیا

جامِ شرابِ فقر کا چسکا لگا دیا ــ لذت شناسِ بادۂ عرفاں بنا دیا
سارا جہان شورِ اناالحق سے گونج اُٹھا ــ کُل دہر کو حقیقتِ عریاں بنا دیا
آفاتِ روزگار کا خطرہ مٹا دیا ــ مامُونِ فتنۂ غمِ دوراں بنا دیا
دامِ جفائے دیوِ لعیں سے چھڑا دیا ــ مقرونِ فضل و رحمتِ یزداں بنا دیا
بیگانۂ خیالِ غمِ ہجر کر دیا ــ ناقابلِ تصورِ حرماں بنا دیا
دشواریٔ نجات کا قصہ چکا دیا ــ غمخواریٔ حیات کو آساں بنا دیا
کثرت میں جلوۂ رُخِ وحدت دکھا دیا ــ کافر بنا کے رشکِ مسلماں بنا دیا
صدق و صفا کا جذبۂ بیخوف اُبھار کر ــ غارت گرِ مکائدِ شیطاں بنا دیا
کارِ بزرگِ خدمتِ میخانہ سونپ کر ــ پیرِ طریق بادہ گساراں بنا دیا
نشترِ گنہ کی جرأتِ بیباک بخش کر ــ پیغمبرِ شریعتِ عصیاں بنا دیا

آزاد! شکرِ عشقِ بتاں۔جس کے فیض نے
دل دادۂ پرستشِ یزداں بنا دیا

حکیم آزاد انصاری

پہاڑی لڑکی

(۱)

جب پہاڑ کے دامن میں شمشاد کی بلند ٹہنیوں پر چڑیا صبح کا شیریں راگ گا چکتی اور سورج کی کانپتی ہوئی زرد کرنیں رفتہ رفتہ روشن سایوں میں تبدیل ہو کر چھوٹے سے گاؤں کے درودیوار پر پھیل جاتیں اُس وقت پہاڑی لڑکی جلد جلد رات کا بچا بچایا باسی کھانا کھا کر اپنے جھونپڑے سے باہر نکلتی اور بکریوں کے چھوٹے سے گلّے کو ہانکتی ہوئی پہاڑ کی طرف لے جاتی۔

دن بھر وہ اپنی رفیق بکریوں کے پیچھے پہاڑ کی اونچی نیچی گھاٹیوں پر اچکتی ہوئی نظر آتی اور جنگلی چڑیوں کی طرح اُس کی ننھا مسرت کے چہچہے کوہسار میں گونجا کرتے۔ پہاڑی درختوں پر چڑھ کر گھونسلوں میں سے پرندوں کے انڈے بچے کھینچ نکالنا یا کسی چشمے کے کنارے بیٹھ کر پانی میں اپنے عکس کا مُنہ چڑانا، یا مٹی اور ریت میں سے ٹوٹے پھوٹے گھونگے چُن کر ہار پرو لینا، یہی تھی سادہ دل لڑکی کی زندگی۔

ماں، باپ کی شفقت یا بہن بھائیوں کی محبت سے وہ قطعاً آشنا نہ تھی۔ بچپن سے لے کر کمسنی تک وہ اپنے آپ کو ایک شفیق آقا کے گھر سے وابستہ دیکھتی چلی آئی تھی جو ایک سیدھا سادھا پہاڑی کسان تھا۔ یہ غریب کسان اور اُس کی محنت کش بیوی دونوں یتیم لڑکی پر مہربان تھے۔ لیکن اُسی طرح جیسے ایک نیک دل آقا اپنے فرمانبردار غلام پر شفقت کی نظر رکھتا ہے، اور اس سے زیادہ کی غریب لڑکی کو نہ خواہش تھی اور نہ یہ بات اُس کے خیال میں بھی آسکتی تھی کہ اس سے بہتر سلوک یا اس سے زیادہ محبت کی میں مستحق ہوسکتی ہوں۔

اپنے دل کی محدود سی دُنیا میں ہر طرح وہ مطمئن تھی۔ رات کے وقت سونے سے پہلے بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے اُس کا گہرا سوچ بچار، اُس کی تمام تر غور و فکر یہی ہوتی کہ کل میں اپنی بکریوں کو کونسی ایسی سرسبز وادی میں لے جاؤں جہاں انہیں آج سے بہتر چارہ مل سکے اور ہر شام مالکہ دُودھ کے برتن کو معمول سے زیادہ بوجھل پائے۔ اُس کی مسرت شام کے وقت انتہا کو پہنچ چکی ہوتی جب بکریاں پیٹ بھر کر اُس کے آگے آگے گھر کی طرف جانے کو ہوتیں۔ اُس وقت اسے بکریوں کی وحشیانہ کُود پھاند آس پاس کے تمام خوبصورت مناظر سے زیادہ دلفریب معلوم ہوتی۔ طفلانہ شوخی سے کبھی وہ اُن کے ساتھ مل کر خود بھی ایک چھوٹی سی بکری کی طرح ممیانے لگتی اور کبھی آگے بڑھ کر اپنا صبیح چہرہ ان کے لمبے لمبے سُرخ بالوں میں چھپا لیتی، اور پھر خود بخود ہنس دیتی۔ بکریوں کے قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ اور گھنگروؤں کی دھیمی دھیمی کھنکھناہٹ کے ساتھ مل کر معصوم لڑکی کے قہقہے مرغزار کی خاموش فضا میں ایک نئی دُنیا کو بیدار کر دیتے جہاں شفق کی رنگینیوں کے درمیان صرف ہنسی کا ہلکا سا ترنم ہوتا اور آسمانی رحمت کے ساتھ ملی ہوئی بے لوث مسرت۔

دن بھر کی محنت کے بعد اُس کا آقا شام کے کھانے پینے سے فارغ ہو کر اپنے جھونپڑے میں خشک پیال کے فرش پر مٹی کا ایک پُرانا ساحقہ لے کر بیٹھ جاتا اور اُس کے سب چھوٹے بڑے بچے اُس کے گرد جمع ہو جاتے۔ انہیں بچوں میں ایک بچے کے مانند وُہ بھی

شامل ہوتی، اگرچہ طفلی کی پُرسرور ساعتیں بے خبری میں اُس کا ساتھ چھوڑ کر آہستہ آہستہ اب پیچھے رہی جاتی تھیں۔
چھوٹے بچے کھیل میں اُسے گھوڑا بناکر اُس کی پیٹھ پر سوار ہوجاتے، شرارت سے اُس کے بال کھینچتے اور اُسے مارتے۔ ان کی شرارتوں پر ہنستے ہنستے اُس کا بُرا حال ہوجاتا۔ وہ انہیں اپنی پیٹھ پر سوار کرلیتی اور گھٹنوں کے بل جھونپڑے میں ادھر سے اُدھر لئے پھرتی۔ جب گھر کی مالکہ شام کے کام کاج سے فارغ ہوتی اور چرخہ کاتنے کے لئے اندر آکر چراغ جلاتی تو بچے روشنی کی خوشی میں شور مچادیتے۔ آخر باپ بچوں کی شوخیوں سے تنگ آجاتا اور فوراً کوئی کہانی سنانا شروع کردیتا۔ اس پر سب بچے خاموش بیٹھ جاتے۔ بعض وقت وہ اپنے ہی لڑکپن یا نوجوانی کے زمانے کا کوئی قصہ بیان کرنے لگتا جس میں زیادہ تر بھوت پریت، جن، پری وغیرہ کا ذکر ہوتا۔ لیکن جس قدر یہ ذکر بچوں کو بھیانک معلوم ہوتا اتنی ہی زیادہ دلچسپی اور توجہ سے وہ اسے سُنتے۔
وہ انہیں بتاتا کہ جب وہ لڑکا ہی تھا اور گھر بار کی کوئی ذمہ داری اُس کے سر پر نہ پڑی تھی تو اُسے بھوت پریت کو تابع کرنے کا شوق پیدا ہوا اور اُس شوق میں اِس نے کیا کیا کوششیں کیں۔ پھر کس طرح اُس زمانے میں سُرخ کپڑوں والی چڑیلیں جنگل میں اُس کے پیچھے پیچھے اُس کا نام پکارتی پھرا کرتی تھیں لیکن بغیر اُن کی طرف پلٹ کر دیکھے وہ ہمیشہ اُن کی اصلیت معلوم کرلیتا، اور محض ان عجیب و غریب "اسموں" کی وجہ سے جو اُسے ان دنوں حفظ تھے، وہ صاف بچ نکلتا۔ اور کس طرح شام کے وقت بیابان میں چھلاوے خوبصورت ممینوں کا رُوپ بھر کر اُس کی راہ میں آکھڑے ہوتے، لیکن صرف اپنے "علم" کی طاقت سے وہ معلوم کرلیتا کہ یہ وہی چھلاوا ہے جسے چھُو لینے کے بعد انسان کبھی زندہ سلامت نہیں بچ سکتا۔ پھر کس طرح ایک رات بھوت اُسے جنوں اور پریوں کے مُلک میں لے گئے اور رات کی رات میں وہ سارے ملک میں سیر کرکے صبح پھر اسی طرح اپنے بستر پر آموجود ہُوا، حتیٰ کہ بعض لوگ وہم کرنے لگے کہ اُس نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ پھر وہ انہیں سناتا کہ کس طرح وہ غاروں میں چھپے ہوئے جنگلی برّے پکڑا کرتا تھا اور کس دلیری سے ایک عرصہ تک اُس نے شیر کو مار کر اُس کی کھال اُتارنے کی کوششیں جاری رکھیں۔
سادہ دل لڑکی چراغ کی دھیمی روشنی میں اپنے محنت کش آقا کے کرخت اور پرشکن چہرے پر عقیدت کی نظریں گاڑے ہوئے یہ قصے سُنتی اور دل ہی دل میں اُس کی دانائی اور عقل پر حیران ہوتی اور خیال کرتی کہ وہ کس قدر دلیر اور طاقتور ہے۔ شاید دنیا میں کوئی اُس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

(۲)

شاہزادہ حسبِ معمول اپنے محل سے شکار کھیلنے کے لئے نکلا تھا لیکن بکریاں چرانے والی غریب لڑکی کی قسمت اُسے شکار کے پیچھے بھٹکا کر پہاڑوں کے سلسلے میں لے آئی۔ وہ چشمے کے کنارے اپنی بکریوں کو پانی پلانے کے لئے کھڑی تھی شہزادے کا گھوڑا وہیں رُک گیا اور کوئی وحشی ہرن پہاڑی کی اوٹ سے نکل کر چوکڑیاں بھرتا ہُوا کہیں کا کہیں جا نکلا لیکن شہزادہ پھر بھی وہیں مبہوت و ششدر کھڑا تھا جیسے شکار کا خیال تک اُس کے دل سے محو ہوچکا ہے۔ کئی خیال اس کے دل میں آئے اور چلے گئے۔ آج سے پہلے بھی کسی حسین چہرے میں اُس نے یہ کشش محسوس کی تھی؟ نہیں کسی میں یہ سحر نہ تھا۔ ان بڑی بڑی روشن آنکھوں میں کیا جھلکتا ہے؟ وہ سوچ رہا تھا ــــــ غریب پہاڑی لڑکی اور اُس کی بکریاں اُسے ایک افسانہ معلوم ہو رہی تھیں ــــــ "شاید وہ ایک شہزادی تھی حسین و جمیل، اور بھولی بھالی اُس کی صورت

پر ہر ایک کو پیار آتا تھا۔ لیکن اُس کے ظالم باپ نے ناراض ہوکر اُسے محل سے نکال دیا، اُس کا خوبصورت لباس چھین کر اُسے گودڑ پہنا دیا پھروہ جنگل میں بکریاں چرایا کرتی تھی۔ وہ لوگوں سے چھپ کر زندگی بسر کرتی تھی اور اپنی پلٹی ہوئی قسمت پر کبھی کبھی روتی تھی ــــ آخر ایک دن ایک شہزادہ آیا.....

پہاڑی لڑکی نے سادگی سے نظر اٹھاکر محوِ حیرت شہزادے کو دیکھا اور شہزادے نے محسوس کیا کہ دو چمکتی ہوئی تیز بجلیاں چشم زدن میں آکر اُس کے پہلو میں پیوست ہوگئیں۔ مدتوں سے اُس کے بھٹکتے ہوئے تخیل میں کوئی محبوب سا تصور چکر لگا رہا تھا۔ اُس کے دل کی پوشیدہ ترین گہرائیوں میں ایک ننھا سا رنگین پھول چپکے چپکے کھلا ہوا تھا اور وہی رنگین پھول، وہی محبوب تصور، ایک زندہ تصویر بن کر اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوتا معلوم ہوا ــــ بہت جلد وہ ایک فیصلہ پر پہنچ چکا تھا اور پھر وہ کچھ کہنے اور کچھ سننے کے لئے آگے بڑھا۔

آزاد اور خوش باش پہاڑی لڑکی جو کبھی باز کے پنجے میں پھنسی ہوئی چڑیا کی مضطربانہ چوں چوں سن کر خوشی سے تالیاں بجانے لگ جایا کرتی تھی اب خود کسی خوف زدہ چڑیا کے مانند سہمی ہوئی شہزادے کے تازی گھوڑے کی پشت پر اُس کے سامنے جھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ اور زبردستی آنسو اُس کی سیاہ آنکھوں میں خشک ہوکر رہ گئے تھے۔ لیکن باوجود انتہائی خوف وہراس کے بار بار بے تابی سے وہ اپنا سر پیچھے کی طرف موڑتی جہاں دور ٹیلوں پر اُس کی محبوب بکریاں منہ اٹھائے حیران کھڑی تھیں۔

شہزادے کا دل کسی بڑی سے بڑی کامرانی پر بھی کبھی اس قدر مسرور نہ ہوا تھا پھر وہ کیونکر جان سکتا کہ آج اُس نے ایک ایسے دل کی دُنیا کو جو محض ہنسی خوشی کے چہچہوں سے آباد تھی تہ وبالا کردیا۔

جب وہ شہر کے بڑے دروازے میں داخل ہوئی تو حیرت میں ڈوبی ہوئی بے شمار نگاہیں اُس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ خود بھی مارے استعجاب کے آنکھ تک نہ جھپک سکتی تھی۔ سارا شہر اور اُس کے بسنے والے اسے جادو کا ایک کھیل نظر آتے۔ اور وہ حیران تھی کہ یہ عجیب وغریب لوگ سب کے سب کیوں اُسے اس طرح تعجب سے دیکھ رہے ہیں۔

جس طرح ایک نازک پھول کسی سنسان وادی میں جنگلی گھاس پتیوں کے درمیان آنکھ کھولتا ہے ــــ دور دنیا اور دنیا والوں کی شورشوں سے الگ تھلگ ــــ جس کی خاموش محفل تک بلبل کے پرسوز نغمے حسن کو مغرور بنانے کے لئے نہیں پہنچتے، جس کی آنکھ بھونروں کے والہانہ رقص سے کبھی شناسا نہیں ہوتی اُسی طرح غریب لڑکی بھی اپنے حسن سے، قدرت کے اِس بہترین عطیہ سے بے خبر تھی۔ جس گھر میں اُس نے پرورش پائی تھی وہاں اپنے فرائض کو اچھی طرح انجام دینا، یہی ایک چیز تھی جس سے دوسروں کے دل میں اُس کی جگہ ہوسکتی تھی۔ گھاس پھوس کے اُن سادہ جھونپڑوں میں جو شہروں کی پُرتکلف شان وشوکت کی زندگی سے بے خبر دور پہاڑ کے دامن میں آباد تھے کوئی ایسی آنکھ نہ تھی جو اس کے حسن کی اصل قدر وقیمت کو پہچان سکتی۔ وہاں تو وہ محض ایک محتاج لڑکی تھی، صرف دوسروں کے رحم کی مستحق۔

شہزادے کے شاعر مصاحب نے کہا شہزادے تیرے انتخاب کا جواب واقعی اس روئے زمین پر ملنا آسان نہیں۔ اس عجیب وغریب لڑکی کا حسن ان پھٹے پرانے چیتھڑوں میں اتنا ہی روشن، اتنا ہی درخشاں نظر آتا ہے جتنا وہ تنہا ستارہ جو برسات کی کسی ابر آلود شام

کو گھرے سیاہ بادلوں کے درمیان یک بیک جگمگا اُٹھتا ہے"+

اور اس روز محل کی تمام خوبصورت لڑکیاں افسردہ خاطر اور اُداس نظر آتی تھیں اور بعض رات کے وقت اپنے بستر پر پڑی ہوئی موت کی آرزو کر رہی تھیں+

دوسری صبح غریب لڑکی شہزادیوں کے سے زرتار لباس میں ملبوس کر دی گئی اور شہزادے کے خوبصورت ترین جواہرات اب اس کے جسم کی زینت تھے ـــــــ لیکن اُس کا آزاد دل اب بھی بدستور انہیں پہاڑوں، انہیں ندی نالوں، اور انہیں گھاس پھوس کے جھونپڑوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا+

شہزادے کی تمام دلنوازیاں، اُس کے سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے پرسحر الفاظ، اُس کی حد سے گزرتی ہوئی شاعرانہ تعریف و توصیف اب صرف جنگلی لڑکی کے لئے وقف تھی+ لیکن یہ سب اُس کے لئے بے معنی تھا+ اُس کے دل میں اگر شہزادے کے لئے کوئی خیال تھا تو صرف یہ کہ خدا جانے وہ مجھے گھر سے اتنی دور یہاں کیوں لے آیا ہے اور خدا جانے اب مجھے کب تک وہ اس عجیب و غریب قید میں رکھے گا" اور شہزادے کی تمام مہربانیوں کو دیکھ کر صرف اُس کے دل میں یہ خیال آتا کہ شاید کبھی اسی مہربانی سے وہ مجھے جانے کی اجازت بھی دے دے+

جب شہزادہ اسے مجبور کرتا کہ وہ اُس سے کوئی سوال کرے۔ جس چیز کی اُسے خواہش ہو اُس سے طلب کرے، تو وہ صرف جانے کی خواہش ظاہر کرتی۔ پھر شہزادہ آہستہ آہستہ سرگوشیوں میں اُس سے کہتا "کیا تم اس عظیم الشان سلطنت کی ملکہ نہ ہو گی؟" اور وہ اُس کی بات کا مفہوم سمجھے بغیر فوراً سر کو انکار کے طور پر جنبش دیتی۔ ایک ملکہ کے شکوہ کی قدر و قیمت سے وہ بے خبر تھی اور صرف یہ جانتی تھی کہ شہزادے کے انوکھے سوالوں کے جواب میں ایک دفعہ "ہاں" کہہ دینا ہی اسے اس عجیب قید میں کھینچ لایا تھا۔ اور اب اُس کے ہر سوال کے جواب میں وہ انکار ہی کو مناسب خیال کرتی+

شہزادہ یہ جاننے کے باوجود کہ میری باتیں غریب لڑکی کی سمجھ سے بالاتر ہیں اس بے نیازی پر غمگین ہو جاتا+

(۳)

بہت جلد شہزادے کے اس بے حاصل سودا سے سب لوگ اکتا گئے اور ہر ایک کے دل میں پہاڑی لڑکی کے خلاف غصہ کے جذبات اُٹھنے لگے جس کی "منحوس" آمد نے ان کے چہیتے ہنس مکھ شہزادے کو تمام کھیل تماشوں اور سیر و تفریح سے بے پروا بنا کر اُداس و رنجیدہ بنا دیا تھا۔ آخر دانا وزیروں نے آپس میں مشورہ کر کے شہزادے کو اس بات پر مجبور کیا کہ جب تک جنگلوں میں پلی ہوئی بے سمجھ لڑکی عقل و شعور سیکھ کر اُس کے مرتبے اور محبت کو سمجھنے کے قابل نہ بن لے وہ اُس کے ملنے سے احتراز کرے+ شہزادہ بھی الفت کے رائیگاں اظہار سے تھک کر نا چار اس تجویز پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہو گیا اور لوگ اس کا دل بہلانے کے لئے نئے نئے مشغلے سوچنے لگے+

جلد ہی پہاڑی لڑکی ایک علیحدہ محل میں بھجوا دی گئی اور شہزادے کے مصاحبوں نے جنہیں اپنی عقل اور تدبر پر ناز تھا شہر کے بڑے بڑے داناؤں کو بیش بہا معاوضے دے کر غریب لڑکی کو عقل و دانش کا سبق دینے کے لئے مقرر کیا اور یہ لوگ اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اُس کے

دل و دماغ میں دنیا بھر کا علم ٹھونس دینے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔

وہ اُسے اس چھوٹی سی خوشنما دنیا میں سے جس میں آج تک وہ رہی تھی ایک دم کھینچ کر باہر اُس عظیم الشان پرشور دنیا میں لے آنا چاہتے تھے جس میں ہنسی اور قہقہوں کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا +

وہ اُسے دنیا کے مختلف ہنگاموں کے متعلق باتیں سناتے، اُسے سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کرتے لیکن بغیر ان کی باتوں پر توجہ کئے بغیر کچھ سمجھے وہ عالم تصور میں اُس وقت بھی اپنی بکریوں کے پیچھے ٹیلوں اور گھاٹیوں کو پھلانگ رہی ہوتی +

وہ اُسے رام کرنے کے لئے اُس کے سامنے محبت کے درد بھرے افسانے بیان کرتے جنہیں سن کر پتھر بھی پانی ہو جائے لیکن وہ گزشتہ تصورات میں کھوئی ہوئی اپنے آقا کی دلچسپ حکایتوں کو دل ہی دل میں دہرایا کرتی +

وہ اسے گناہ اور نیکی میں امتیاز سکھاتے، رحم، ایثار، اور وفا کے سبق پڑھاتے اور وُہ عالمِ خیال میں اُس گھونسلے سے جا آخری دن اس نے ببول کے درخت پر دیکھا تھا فاختہ کے بچے نکالنے میں مصروف ہو جاتی +

وہ اسے شہزادے کی عظمتِ شان اور محبت کی قدر و قیمت بتاتے، اور اُس کا خیال اُسے اُسی غریبانہ جھونپڑے میں پہنچا چکا ہوتا جہاں وہ اپنے آقا اور اس کے بچوں کو اپنا منتظر دیکھتی ——— وہی چراغ کی دھیمی دھیمی روشنی، وہی پیال کا نرم فرش وہی بچوں کا شور، وہی آقا کی دلچسپ باتیں، بہشتِ بریں کے کسی خواب کی طرح اُس کی آنکھوں کے سامنے آکر پھرنے لگتیں +

شہزادے کے حکم سے اُس کے اِرد گرد ہر وقت خواصوں کا ایک جھرمٹ لگا رہتا جو اُس کے دل سے "جنگلی وحشیوں" کی یاد محو کرنے کے لئے طرح طرح کی کوششیں کرتیں۔ وہ اسے شہزادے کی باتیں سناتیں اور اُسے خوش کرنے کے لئے لہک لہک کر محبت کی لطیف راگنیاں گاتیں، لیکن وہ ان کی ناجنسی صحبت سے اکتا جاتی، ان کی غمناک موسیقی کے شور سے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتی ——— اور پھر کہیں دور سے خیال ہی خیال میں اُسے اپنی مالکہ کے گیت سنائی دیتے جو وہ چرخا کاتتے ہوئے گا رہی ہوتی +

بچپن کی کسی زبردست طفلانہ خواہش کے مانند یہاں سے واپس جانے کی تمنا اس کے دل و دماغ پر اس درجہ غالب آچکی تھی کہ اُس کے علاوہ وہ کچھ سننا یا سمجھنا نہ چاہتی تھی ——— بظاہر وہ کچھ نہ سمجھی، اُس نے کچھ نہ سنا ——— لیکن آہ! نامعلوم طور پر بہت کچھ اُس کے معصوم دل پر نقش ہوتا چلا گیا +

اُس کی خوبصورت آنکھوں میں غم کا پرتو دیکھ کر لوگ شہزادے کو مبارک دینے لگے "شہزادے! وحشت کی بجائے اب اُس کی آنکھوں سے محبت ٹپکتی ہے"+

اُسے کھوئی ہوئی سی دیکھ کر وہ کہتے "شہزادے! اب تو وہ ہر وقت تیرے ہی خیال میں محو رہتی ہے"+

اُس کے طرز و انداز میں ایک سستی، ایک اضمحلال کی جھلک دیکھ کر وہ کہتے "شہزادے! اب تو وہ ایک ملکہ کی طرح سنجیدہ ہوتی چلی جا رہی ہے"۔

اور شہزادہ اُن سنہرے خوابوں کے دیکھنے میں محو ہو جاتا جن کی تعبیر ہمیشہ تلخ ہوتی ہے ——— وہ اُس چمکتے ہوئے سراب کی

طرف کھنچا چلا جاتا جیسے بے تھاہ سمندر جان کر بھی پیاسا اس کے کناروں سے ایک بار مایوس لوٹتا ہے۔

ہر روز وہ اس سے کہنے کے لئے نئی نئی باتیں سوچتا، ہر روز اسے نئے ہی نئے خیال سوجھتے ——— ہاں اب جب کہ وہ ایک ملکہ کی طرح سنجیدہ اور سمجھ دار ہو چلی تھی +

(۴)

شہزادہ اسے دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے دفعتہً سب کچھ بھول گیا۔ اس کی نگاہ حیرت سے پہاڑی لڑکی کے خد و خال پر جمی ہوئی تھی ——— کیا یہ وہی تھی؟ ——— "اُف کس قدر وہ بدل چکی تھی" ——— اُس کی دلکش نورانی آنکھوں میں اب پتھر کی سی سختی تھی اور بیزاری ——— "اور محبت؟"

شہزادے نے خیال کیا آہ، وہ سب فریب تھا محبت ان آنکھوں میں کبھی بیدار نہ ہوگی۔ اُس کا گلابی پھول کا سا چہرہ اب اترا ہوا اور زرد تھا جیسے سموم ہواؤں نے کسی نازک پھول کو جھلس ڈالا ہو ——— حسن باقی تھا لیکن سحر زائل ہو چکا تھا + ——— کس قدر فرق تھا شاخ پر لہلہاتے ہوئے رنگین پھول میں اور خوبصورت گلدان کے کملائے ہوئے پھول میں؟ اب تو وہ ایک لڑکی تھی معمولی ——— ویسی ہی جیسی بیسیوں محل میں بھری پڑی تھیں +

شہزادے کا دل ایک قاتل کی سی پشیمانی محسوس کر رہا تھا +

اور سب سے پہلی بات جو شہزادے کو دیکھ کر اُس کے لبوں تک آئی وہ جانے کی اجازت کی درخواست تھی ——— وُہی آزادی کی پرانی خواہش، وُہی بغیر انجام کو سوچے سمجھے، پائے ہوئے کو کھونے کی طفلانہ تمنا +

جس سرعت کے ساتھ شہزادے نے پہاڑی لڑکی کو یہاں لانے کا فیصلہ کیا تھا، اُسی سرعت کے ساتھ اب اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اسے اس نامرغوب پابندی سے آزاد کر دے گا ——— اس وقت وہ صرف اسے خوش کرنا چاہتا تھا ——— لیکن جو اس کی خوشی تھی وہی شہزادے کی تمام امیدوں کا خاتمہ تھا ——— تمام تمنّاؤں کی بربادی ——— مگر اُسے جبراً روک کر بھی تو آج تک اُسے خوشی نصیب نہ ہوئی تھی۔ جو کھیل تقدیر نے شہزادے کے ساتھ کھیلا تھا اس میں اب صاف اُسے اپنی ہار نظر آ گئی +

بے اختیار شہزادے کے منہ سے نکلا "جاؤ اگر تم اسی میں خوش ہو۔ میری خوشیوں کو اپنے ساتھ لئے ہوئے چلی جاؤ۔ اب تمہیں کوئی جانے سے نہیں روک سکتا۔ تمہاری خوشی یہی ہے تو تم خوش ہو جاؤ" +

وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی اور شہزادے نے افسردہ لہجے میں کہا کیا پہاڑوں میں جانے کے بعد پھر بھی کبھی اپنے شہزادے کو یاد کرو گی؟" وہ خاموش رہی اور شہزادے نے دوبارہ سوال کیا کیا یہ محلوں کی زندگی اور ایک شہزادے کی مجنونانہ باتیں تمہیں پھر یاد نہ آئیں گی"؟

اُس نے جواب میں صرف سر کو ہلکی سی جنبش دی جو نہ انکار سمجھی جائے اور نہ اقرار شاید وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ "آزاد ہو کر قید کو یاد کرنا کون سی بھلی بات ہے" +

پھر خود بخود وہ شہزادے کے گراں بہا موتی اور ہیرے اپنے جسم سے علٰحدہ کرنے لگی ——— اور پہلی بار شہزادے کے دل میں اپنی

بے مائیگی کا احساس پیدا ہُوا۔ ایک غریب بکریاں چرانے والی نے کس سادگی سے اُس کی نظروں میں اُس کے مال و دولت کو حقیر ثابت کر دیا تھا اور بے نیازی کا ایک ایسا سبق اُس روز اس نے بے خبری میں شہزادے کو پڑھا دیا جس سے شاید عمر بھر یُوں وہ غافل رہتا +

شہزادے نے رنجیدہ ہو کر کہا "ہاں ہاں ان بے فائدہ چیزوں کو یہیں چھوڑ جاؤ جو تمہیں ایک ظالم شہزادے کی یاد دلا سکتی ہیں" +

وہ شہزادے کی اس طنز کو نہ سمجھی۔ ان چیزوں کا یہیں چھوڑ دینا تو اسے بالکل قدرتی معلوم ہو رہا تھا +

اب پھر اُس کے جسم پر اُس کا وہی پھٹا پرانا لباس تھا وہی ٹوٹے پھوٹے بھدے موتیوں اور گھونگوں کی مالا اور وُہ جا رہی تھی +

شہزادے نے رخصت کے وقت نہ اُسے الوداع کہی نہ کوئی پرحسرت لفظ اپنی زبان سے نکالا لیکن اُس کی آخری مغموم نگاہ میں خدا جانے کونسی جادو کی تاثیر تھی کہ جنگلی لڑکی کی نگاہیں بھی خود بخود اس کے سامنے جھک گئیں اور اس کے شوق سے اٹھتے ہوئے قدموں میں ایک لمحہ کے لئے لغزش سی آ گئی +

شہزادہ دیر تک اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس اُمید پر کہ شاید ایک بار وہ پیچھے پلٹ کر دیکھے ـــــــــ لیکن بیکار وہ کھڑا رہا اور اُس کی آزاد کی ہوئی چڑیا پھر سے اُڑ کر آگے نکل گئی۔

(۵)

سارے گاؤں میں اُس کی آمد کا پرچا تھا۔ اُس کی گم شدگی کے متعلق لوگ دیر سے خیال کر چکے تھے کہ اُسے پہاڑوں میں سے کوئی جن یا پری اٹھا لے گئی ہے اور اب لڑکی کی "عجیب و غریب" باتیں سن کر اُن کے شبہات پر مُہر تصدیق لگ گئی +

اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دیکھ کر اُسے گم سم پا کر عورتیں آپس میں قسم قسم کی باتیں کرتیں طرح طرح کے منوہمانہ قصے تراش کر اس سے منسوب کرتیں اور کہتیں ہو نہو ابھی آسیب نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا +

وہ کہیں سے "سن چکی تھی کہ آسیب، جن، بھوت وغیرہ سب انسان کا وہم ہی وہم ہیں اور اب تو اسے خود بھی یہ باتیں صاف غلط اور وہم معلوم ہوتی تھیں، لیکن دوسروں کو کیسے وہ سمجھاتی۔ جو جو باتیں اُس کے دل میں تھیں اگر وہ انہیں سناتی یا سمجھاتی تو یہ لوگ اُسے بالکل ہی مجنون خیال کر لیتے۔ جی ہی جی میں کُڑھ کر وہ خاموش ہو جاتی۔ بے خبری میں ایک بار جو کچھ اُس کے کانوں میں پڑ چکا تھا ـــــ جسے اُس وقت اُس نے کبھی سمجھنے کی کوشش بھی نہ کی تھی اب پہلے سے بدرجہا روشن اور واضح ہو کر اُس کے دماغ میں بیدار ہو رہا تھا +

وہ حیران ہو کر سوچتی "آخر یہ لوگ کیوں اس قدر بدل گئے ہیں پہلے ان کی باتیں ایسی نہ ہوا کرتی تھیں اب ان کی سمجھ کو کیا ہو گیا" پھر وُہ اُن کی صحبت سے بھاگ کر اپنی بکریوں کو لئے ہوئے پہاڑ کی طرف نکل جاتی، لیکن اُسے معلوم ہوتا کہ ان بکریوں میں اور جنگل میں بھی اب وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔ وہ سبزہ جسے ہمیشہ بے پروائی سے روند کر وہ گزر جایا کرتی تھی اب اس پر پہنچتے ہی خود بخود اس کے قدم جھکنے لگتے ایک ایک ننھے سے پھول ایک ایک پتی کو بچا کر اسے چلنا پڑتا۔ نہ جانے کس نے اُس سے کہہ دیا تھا کہ گھاس کے ایک ایک تنکے میں زندگی کی روح ہے +

جب وہ پیار سے اپنی بکریوں پر جھک کر انہیں تھپکانے لگتی تو اس کے ہاتھ کی گرفت بے پروائی سے وہیں ڈھیلی پڑ جاتی اور اُس

کا خیال کہیں سے کہیں بھٹک کر شہزادے کے محل کی طرف چلا جاتا ـــــــ بہرحال اس ہاتھ کی سردی اور اجنبیت کو محسوس کرتیں اور مسکراتی ہوئی اُسے تنہا چھوڑ کر پھلانگ پھلانگ کر چٹانوں پر چڑھ جاتیں۔

پھر وہ وہیں زمین پر بیٹھ جاتی اور سوچتی "آہ کیوں میرے جانے سے سب کچھ ہی بدل گیا؟ کیوں اگلی سی ایک بات بھی نہیں رہی۔ پھر وہ دل بہلانے کی غرض سے زمیں بیٹھے بیٹھے نظر اٹھا کر کسی گھونسلے میں سے ننھے ننھے بچوں کو چونچیں باہر نکالتے ہوئے دیکھتی اور خیال کرتی کبھی میں ان گھونسلوں سے پرندوں کے انڈے اور بچے نکالا کرتی تھی ـــــــ "ہائے کیسا ظلم تھا" ان ننھے بچوں کی بھی کوئی ماں ہوگی کوئی باپ ہوگا۔ اور اگر کوئی انہیں مار ڈالے تو وہ اُن کے لئے کتنا روئیں گے؟ ـــــــ میری نہ ماں ہے نہ باپ پھر اگر کوئی مجھے مار ڈالے تو کون ہے جو میرے لئے روئے؟ ـــــــ دفعتہً اس کے کان میں کوئی شہزادے کا نام لے دیتا ـــــــ ہاں ہاں اگر کوئی مجھے مار ڈالے تو شہزادہ ضرور میرے لئے روئے ـــــــ لیکن اُسے تو میں چھوڑ آئی ہوں ـــــــ کیوں؟ ـــــــ خدا جانے کیوں؟

پھر وہ چشمے کے کنارے جھک جاتی اور سوچتی کہ شہزادے کے محل میں آئینے تھے ـــــــ میں اُن میں بھی اپنی صُورت دیکھا کرتی تھی ـــــــ "شہزادہ کیوں میری اتنی تعریفیں کرتا تھا؟ کیا واقعی میری صورت اتنی اچھی ہے؟

شام کے وقت اپنے جھونپڑے میں بیٹھ کر وہ سوچتی "خدا جانے یہ گھر اب اس قدر تاریک کیوں ہو گیا؟ کیا پہلے بھی ایسا ہی تھا؟" اور جب اس کے آقا کے بچے شرارت سے اس کے بال نوچتے اور اسے گھوڑا بن کر چلنے پر مجبور کرتے تو بے اختیار وہ رونے لگتی اس حالت میں تو بچوں کی شوخیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں جب خود میرا جی اُداس ہے ـــــــ وہ کیوں مجھے میری مرضی کے خلاف کام کرنے پر مجبور کرتے ہیں شہزادے کے محل میں تو کوئی میری مرضی کے خلاف آنکھ نہ اٹھا سکتا تھا"۔

جب مالکہ اُسے رونے پر ڈانٹتی تو اُسے غصہ آجاتا ـــــــ پھر وہ خود ہی سوچتی "پہلے کبھی غصہ نہ آیا کرتا تھا؟ اب کیا بات ہے؟" اور ساتھ ہی اسے محل کی وہ تمام عورتیں یاد آجاتیں جو شہزادے کے حکم سے ہر وقت اُس کی خوشامدوں میں مصروف رہا کرتی تھیں۔

پھر اُس کا آقا وہی پُرانے قصے لے بیٹھتا اور وہ پرشوق انداز سے اُسی گزشتہ دلچسپی کے تصور میں انہیں سُننے کے لئے بیٹھ جاتی لیکن جلد ہی اکتا جاتی اور خیال کرتی آقا کی باتیں اب تو ویسی نہیں رہیں؟ شاید پہلی تمام دلچسپ باتیں وہ بھول چکا ہے"۔ پھر دل میں کوئی ایسا قصہ دُہرانے لگتی جو کبھی خواب کی سی حالت میں اس نے شہزادے کی زبان سے سُنا تھا۔

اس کی مالکہ چرخا کاتتے ہوئے گانا شروع کر دیتی اور وہ بے اختیار ان گیتوں کا مطلب سوچنے لگتی اور حیران ہوتی "کیا مالکہ پہلے بھی ایسے ہی بے معنی گیت گایا کرتی تھی؟ آہ اب اُس کی آواز کی وہ پرانی دلکشی کدھر گئی"؟

آخر تنگ آکر وہ سونے کے لئے آنکھیں بند کر کے اپنے بستر پر لیٹ جاتی لیکن تاریکی میں فوراً شہزادے کی آخری نگاہ اُس کی آنکھوں میں پھرنے لگتی۔ پھر وہ سوچتی "شہزادہ شاید اُس وقت بہت ہی غمگین تھا ـــــــ شاید اس وقت بھی وہ رو رہا ہو ـــــــ اس خیال سے بے اختیار اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے اور پھر تمام رات اُس نگاہ کا تصور اُسے سونے نہ دیتا۔

صبح جب اُس کی مالکہ اُسے دیر سے سو کر اٹھنے پر ملامت کرتی تو وہ اس خوف سے کانپ جاتی کہ کہیں مالکہ اُس کی بیداری کے بھید کو پا کر اُس کے تصورات کو اُس سے چھین نہ لے"۔

اب کبھی کوئی کام اُس سے درست نہ ہوتا تھا۔ بات بات پر وہ بھول جاتی۔ نہ اُسے مالکہ کی خوشنودی کا خیال تھا نہ آقا کا ڈر نہ کسی چیز سے کچھ غرض۔ دن رات وہ اپنے ہی خیالوں میں محو رہتی، دن رات شہزادے کے محل کی باتیں اُس کے دل میں چکر لگایا کرتیں۔

جنگل میں سوکھی ذرا سی کھڑکھڑاہٹ پر، ہر ہلکی سے ہلکی آواز پر، ہر ہوا کی جنبش پر اُسے خدا جانے کیوں شہزادے کے گھوڑے کی چاپ کا شبہ ہوتا اور وہ چونک اٹھتی۔

پھر وہ بکریوں کو آوارہ چھوڑ کر کسی پہاڑ کی اوٹ میں بیٹھ جاتی اور دن دن بھر یہ سوچنے میں گزار دیتی کہ کیوں اس جگہ کی ہر چیز بدل گئی ہے۔ کیوں مجھے کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا؟ کیوں ہر چیز سے میرا دل بیزار ہے؟ شہزادے کے محل میں تو ان چیزوں کی یاد ہر وقت مجھے بیقرار رکھتی تھی ـــــــ کاش وہیں اس تبدیلی کا حال معلوم ہو جاتا ـــــــ لیکن اُس محل میں بھی تو میرا دل نہ بہلتا تھا ـــــــ پھر اب میں کدھر جاؤں؟

پھر وہ سوچتی "کیا واقعی یہ لوگ سچ کہتے ہیں کیا واقعی کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ہے"؟ شہزادہ تو جادوگر نہ تھا ـــــــ پھر کس نے جادو کیا؟ پھر کس نے تمام دنیا کو تبدیل کر دیا؟"

آخر اُسے شہزادے کے محل کے اُن داناؤں کا خیال آیا جو اُسے عجیب عجیب باتیں بتایا کرتے تھے ـــــــ لیکن جادو کو تو وہ باطل کہتے تھے ـــــــ پھر وہ مجھے کیا سکھانے کے لئے آئے تھے؟

علم؟ ہاں علم۔

اور روز بروز اسے یقین ہوتا چلا گیا کہ وہ علم جادو سے بھی زیادہ کوئی خوفناک چیز تھی۔ اور سوچتے سوچتے آخر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ ایکبار پھر میں شہزادے کے پاس جاؤں گی اسے اپنا سب حال سنا کر التجا کروں گی کہ شہزادے اُن لوگوں کو بلا اور اُن سے کہہ جو کچھ وہ مجھے سکھایا کرتے تھے اُسے اب واپس لے لیں یہاں کے لوگ اس علم کو جادو، آسیب اور جانے کیا کیا خیال کرتے ہیں اور میں اس دن سے بڑی آفت میں پھنس گئی ہوں۔

"اب تو شہزادے سے مجھے کوئی خوف معلوم نہیں ہوتا؟ ـــــــ اور اگر اُس نے پھر مجھے وہاں روکنا چاہا تو میں کیا کہوں گی؟ کچھ نہیں ـــــــ ابھی کچھ نہیں"۔

ہر روز وہ جانے کا ارادہ کرتی اور ہر روز اس ارادے کو توڑتی۔ آخر ایک شب اُس نے اپنے آقا اور اُس کی بیوی کی گفتگو سنی وہ اب اس کے بیاہ کی فکر میں تھے اور حیران تھے کہ اس آسیب زدہ لڑکی کو کس کے پلے باندھیں؟ یہ ذکر سن کر وہ لرز گئی اور اسی صبح سب دھندوں کو چھوڑ کر وہ چپکے سے شہزادے کے محل کی جانب چل نکلی۔

دوپہر کے وقت خزاں کی سرد ہوا کے تیز جھونکے اُس کے بکھرے بالوں کو مس کرتے ہوئے اُس کے سر پر سے ہو کر گزر جاتے اور ان کی افسردہ سائیں سائیں میں ایک اندوہناک کہانی بکھری ہوئی محسوس ہوتی ـــــــ ناکام محبت کی حسرت و حرماں میں ڈوبی ہوئی اُداس کہانی ـــــــ اور پھر ہوا کی غمناک رنگینیوں سے خوفزدہ ہو کر وہ اپنے کانوں کو زور سے جھٹکتی اور تیزی سے آگے بڑھ جاتی۔

جوں جوں وہ شہزادے کے شہر کے قریب پہنچتی اُتنا ہی پھر واپس پلٹ کر جانا اُسے دشوار معلوم ہوتا ——— کیسے اب میں پھر اُن نادان لوگوں کی پھبتیاں سہہ سکوں گی جو خود اپنے وہم کا شکار ہو رہے ہیں ——— کیسے پھر اُس تاریک گھر میں جا کر رہ سکوں گی ؟ ——— کیسے میں مالکہ کے بچوں کے علیظ کام کروں گی ؟ ان کی نامرغوب شرارتوں سے تو میں تنگ آچکی ہوں ——— اور بکریوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تو میرے تلوے بھی زخمی ہو چکے ہیں آخر کب تک میں یوں بے کار ماری ماری پھروں گی ؟ ——— آقا کی جھڑکیاں اور مالکہ کے کوسنے اب تو میں برداشت نہ کر سکوں گی " ———

راستے میں وہ بالکل ہی بھول گئی کہ گھر سے کیا سوچ کر روانہ ہوئی تھی ——— اب تو اُس کا مقصد صرف شہزادے سے باتیں کرنا تھا ——— " اتنی باتیں جو کبھی ختم نہ ہوں ——— شہزادہ ہمیشہ اُس سے بات نہ کرنے کا شاکی رہتا تھا اُس زمانے میں جب وہ کوئی بات کرنا جانتی ہی نہ تھی ——— لیکن اب اتنی باتیں سوچ کر وہ آئی تھی جنہیں سنتے سنتے شہزادہ تھک جائے ——— اور وہ ختم نہ ہوں۔ پھر دوسرا دن ہو پھر رات ——— اور پھر دن ——— اور آخر کار یونہی سارے دن گزر جائیں "۔

" شہزادہ میری ناگہاں آمد سے کس قدر خوش ہوگا " یہ سوچ کر خوشی سے اُس کا چہرہ تمتما اٹھتا اور وہ مُسکرانے لگتی +

آخر وہ شہزادے کے شہر میں سے گزرنے لگی ——— ایک دفعہ کس شان کے ساتھ شہزادہ مجھے اپنے ساتھ لے کر یہاں سے گزرا تھا " اور اس خیال کے آتے ہی وہ خود بخود غرور سے تن کر سیدھی ہو گئی +

پھر اُس نے خیال کیا کہ آج شہزادے کا شہر پہلے سے بہت زیادہ خوبصورت اور بارونق معلوم ہو رہا ہے ——— " کہیں شہزادے نے میری آمد کا حال پہلے ہی سے تو نہیں معلوم کر لیا ؟ "

(۶)

چوبدار نے اسے دروازے سے باہر روک لیا اور درشت لہجے میں کہا " کیوں ، کیوں ؟ اب کس لئے آئی ہو " ؟

اس اندازِ مخاطبت پر حیران ہو کر اس نے چوبدار کے چہرے کی طرف دیکھا اور شہزادے کا نام لے کر پھر وہ آگے بڑھنے لگی +

چوبدار نے اُسے سختی سے روکتے ہوئے ایک تضحیک آمیز ہنسی ہنس کر کہا " شہزادہ اب تم سے کبھی نہیں ملے گا +

کیوں ؟؟؟

چوبدار نے مضحکہ اُڑاتے ہوئے جواب میں صرف اُسی کے سوال کو دُہرا دیا " کیوں " ؟

پھر وہ وہیں بیٹھ گئی۔ اُس نے انتہائی مایوسی کے عالم میں کہنا شروع کیا " پھر کون شہزادے کو میرا حال بتائے میں بڑے دُکھ میں ہوں . . . میں تو شہزادے کے پاس فریاد لے کر آئی تھی ..... شہزادے کے وہ آدمی کہاں ہیں جو مجھے علم سکھایا کرتے تھے . . . . . مجھ سے اب کوئی کام نہیں ہو سکتا . . . سب مجھ سے ناخوش ہیں . . . . . اور ہر ایک مجھے ملامت کرتا ہے . . . . . کہیں میرا دل نہیں لگتا . . . . . میں لوگوں سے خوف کھاتی ہوں . . . . . اور لوگ مجھ سے ڈرتے ہیں . . . . . وہ سمجھتے ہیں کہ مجھے آسیب چمٹ گیا . . . . . اور میری بکریاں بھی مجھ سے خوف کھا کر اب دُور دُور بھاگ جاتی ہیں . . . . .

چوبدار جو محل سے آتی ہوئی نفیریوں اور باجوں کی آواز سننے میں محو ہو چکا تھا اس کا صرف آخری فقرہ سُن کر درشتی سے بولا " فریبی

لڑکی! اب شہزادے کو تجھ سے اور تیری منحوس بکریوں سے کیا کام"؟ خدا کے لئے یہاں سے بھاگ جا! آج بڑی آرزوؤں کے بعد ہمارے شہزادے کی شادی کا دن آیا ہے"۔

"شادی؟ کس کی؟ شہزادے کی شادی ——— میں اُس وقت اُسے یاد آیا شہزادہ کہا کرتا تھا "میں کسی اور سے شادی نہ کروں گا"——— اور اب اُس نے شادی کر لی ہے"؟

پھر دفعتہً اُس کی آنکھوں کے سامنے وہ شہزادی آگئی جو محل میں ایک خوبصورت ناگن کی طرح اُسے گھورا کرتی تھی ——— اور ایک بیک نادان لڑکی سی وہ ایک سمجھ دار عورت بن گئی اور رقابت کے جوش کا ایک طوفان اس کے سینے میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"شہزادے نے کس سے شادی کی ہے"؟

چوبدار نے دلی احترام کے ساتھ اُسی خوبصورت لڑکی کا نام اُس کے سامنے لیا ——— اور دوبارہ درد کی ایک ٹیس اُس کے پہلو میں اُٹھی۔

پھر وہ جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی اور اب وہ علم جو اسے شہزادے کے آدمیوں نے سکھایا تھا اسے جان سے بھی زیادہ عزیز معلوم ہُوا ——— آخر شہزادے کی دی ہوئی کوئی چیز تو اب بھی اُس کے پاس موجود تھی"۔

اُس نے چوبدار سے کہا جب تم شہزادے سے ملو تو اُسے بتا دینا کہ پہاڑی لڑکی آئی تھی ——— صرف یہ کہنے کے لئے کہ وہ اپنے شہزادے کو ہمیشہ یاد رکھے گی ——— اور پہاڑوں میں جانے کے بعد کبھی ایک دم کے لئے بھی اُسے نہیں بھُولی"۔

چوبدار نے بے پروائی سے کہا "ہٹ! کیا شور مچا رکھا ہے کچھ سننے بھی دو گی یا نہیں؟ اور شادی کا جلوس دیکھنے کے لئے آگے نکل گیا۔

شاید عمر میں پہلی مرتبہ موت کی شدید خواہش اُس کے دل میں پیدا ہوئی اور پھر وہ واپس جا رہی تھی ——— تھکی ہوئی اور آہستہ آہستہ ——— اور ہر قدم پر ایک بار پیچھے پلٹ کر نگاہ ڈالتی تھی کہ شاید شہزادہ اسے جاتے کہیں سے دیکھ رہا ہو ——— شاید ایک بار پھر شہزادے کا چہرہ نظر آجائے ——— شاید وہ پھر ایک ویسی ہی نگاہ ڈالے جس کا تصور راتوں کو اُسے بیدار رکھتا تھا ——— اور جو اب بھی ویسے ہی اُس کی نگاہوں میں پھر رہی تھی۔

"رابرو"

مشہور فرانسیسی ڈرامانگار مولیئر سے کسی نے پوچھا "اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض ملکوں میں شہزادہ چودہ سال کی عمر میں بادشاہ بن سکتا ہے لیکن اٹھارہ سال تک شادی نہیں کر سکتا"؟ اُس نے جواب دیا "اس کا سبب ظاہر ہے۔ ایک بیوی کو تابو میں رکھنا ایک مُلک پر حکومت کرنے سے زیادہ مشکل ہے"۔

گلچیں

افسانہ کیلئے مواد کی فراہمی

انسان کو اپنے ہم جنسوں کے حالات اور واقعات سے فطری دلچسپی ہوتی ہے۔ اس لئے ہر ملک میں تاریخ اور افسانہ بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ لیکن ثانی الذکر کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ اول الذکر کو نصیب نہیں۔ بات یہ ہے کہ مؤرخ حقیقت و صداقت کا جویا ہوتا ہے۔ تاریخ میں کسی خاص فرد بشر یا جماعت یا قوم کے حالات من وعن بیان کئے جاتے ہیں۔ دنیا دارالعمل ہے دارالجزا نہیں۔ بسا اوقات یہاں ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو سرتاسر ناروا معلوم ہوتے ہیں اور جن سے انسان کے احساسِ عدل کو ٹھیس لگتی ہے۔ مؤرخ کو یہ تمام واقعات بلا کم و کاست بیان کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن افسانہ نویس کا موقلم آزاد ہے۔ وہ اپنی تصویروں میں تخیل کا رنگ بھر کر انہیں نہایت دلکش بنا سکتا ہے۔ وہ انفرادی واقعات کے بجائے زندگی کی عالمگیر صداقتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ اشخاصِ قصہ کو اخلاقی عدالت سے سزا یا جزا دلا کر سامع کے احساسِ عدل کو مطمئن کر سکتا ہے۔ تاریخ میں ایسے واقعات بیان ہوتے ہیں جو صرف ایک بار پیش آ چکے ہیں۔ اور جو کسی فردِ واحد کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن افسانے کے واقعات عام انسانی زندگی کے مطابق ہوتے ہیں اور بار بار پیش آ سکتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ "تاریخ میں بجز نام اور مقام کے تمام باتیں غلط ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس افسانے میں صرف نام و مقام فرضی مگر اس کے واقعات زندگی کی ہمہ گیر صداقتوں کے حامل ہوتے ہیں۔" افسانے کی دلچسپی کے اور بھی بہت سے وجوہ ہیں۔ بہرحال یہ امر مسلمہ ہے کہ مرد، عورت، بچے، بوڑھے، عالم، جاہل سب کے سب افسانے کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ اور جس کو افسانہ سننے سے دلچسپی ہوگی اس کو افسانہ گوئی کا بھی ضرور شوق ہوگا۔ دوسری جبلات کی طرح قصہ گوئی کی جبلت بھی بچپن ہی سے انسان کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے جس کو ابھرنے اور نشوونما پانے کا موقع دینے سے وہ آگے چل کر فن کارانہ حیثیت اختیار کر سکتی ہے اور بے التفاتی و عدم استعمال کے باعث یہ چنگاری راکھ کے ڈھیر کے نیچے دبی دبی آخر بجھ جاتی ہے۔

تہذیب و تمدن کی ترقی نے آجکل معاشرتی معاملات کو نہایت پیچیدہ اور مصنوعی بنا دیا ہے۔ ایسی پیچیدہ و غیر فطری سوسائٹی میں کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے وسیع معلومات کی ضرورت ہے۔ یہ واقفیتیں نوجوانانِ ملک کو خارج سے بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ جس شخص کی خارجی معلومات جتنی وسیع ہوتی ہیں اتنا ہی وہ ہوشیار اور قابل سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے نظامِ تعلیم میں طلبہ کے ذاتی تجربات و مشاہدات کی توسیع و ترقی کی جانب بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ اور کسی مدرسے کے نصابِ تعلیم کو غور سے دیکھا جائے تو درسی کتابوں کا ایک انبار نظر آتا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلبہ ان کے مطالعہ سے خواہ یہ کتنا ہی بیزار کن کیوں نہ ہو زیادہ سے زیادہ خارجی معلومات حاصل کر سکیں۔ لیکن اسی گرانبار درسیات کے نیچے طلبہ کی ذہنی اپج اور اختراع و ایجاد کا مادہ دب کر ہمیشہ کے لئے

سلب ہو جاتا ہے۔ آجکل کے طالب علموں کا دماغ کیا ہے اچھا خاصا ربر کا تھیلا یا عمرو عیار کی زنبیل ہے جس میں انواع و اقسام کی الم غلم چیزیں بھر دی جاتی ہیں۔ حالانکہ دماغ کی حیثیت ایک زندہ نامیاتی ہستی کی سی ہے۔ جس کو مناسب تغذیہ و تقویت اور پرورش و پرداخت کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ باطن سے ابھر کر اچھی طرح نشو و نما پائے اور آگے چل کر خوشنما اور مفید پھول پھل لائے۔ مسز اینی بیسنٹ نے آجکل کے فارغ التحصیل مدارسی طلبہ کی مثال اُس دیا سلائی سے دی ہے۔ جو صرف ڈبیا کے پہلو پر رگڑ کھانے سے روشن ہوتی ہے۔ حقیقت میں یہاں کے گریجوایٹ صرف انہیں مضامین پر کسی حد تک آزادانہ بحث کر سکتے ہیں جن کے متعلق وہ کالج میں تعلیم پا چکے ہیں۔ ورنہ وہ زندگی کے دوسرے اہم معاملات پر رائے زنی کی بہت کم صلاحیت رکھتے ہیں۔ دراصل یہ موجودہ نظام تعلیم کا قصور ہے۔ ہندوستانی مدارس میں مضمون نویسی پر کسی حد تک زور دیا جاتا ہے محض اس لئے کہ امتحانوں میں مضمون نویسی کے لئے خاصے نمبر مقرر ہوتے ہیں لیکن اس سے طلبہ کو حقیقی فائدہ نہیں حاصل ہوتا۔ مضمون نویسی پر بہت سی کتابیں بازار میں بکتی ہیں۔ لڑکے انہیں خرید کر مشہور مضامین یاد کر لیتے ہیں اور امتحان گاہ میں جا کر نگلی ہوئی باتیں اُگل دیتے ہیں۔ غرض کہ طلبہ کے لکھے ہوئے مضامین میں زیادہ تر دوسروں ہی کے خیالات ہوتے ہیں۔ امریکہ کے مدارس کی طرح اگر یہاں بھی مضمون نویسی کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کی تعلیم دی جاتی تو طلبہ کو اپنی جودتِ طبع اور ذہنی اُپج کے اظہار کا موقع ملتا۔ مگر ہمارے ملک میں تو فرزندانِ وطن کے ذہنی اُفق کی فراخی و کشادگی کے لئے اہلِ جامعہ اس قدر بے چین نظر آتے ہیں کہ وہ اُن کے سامنے تمام گذشتہ انسانی تجربات کا بے انتہا ذخیرہ پیش کر دیتے ہیں جس سے طلبہ کی ذاتی تحقیق و تفتیش اور ایجاد و اختراع کی قوتیں زائل ہو جاتی ہیں۔ بعض مدارس میں اگر قصہ نویسی کی نام نہاد تعلیم کا دعویٰ کیا بھی جاتا ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ لڑکوں کے سامنے کوئی قصہ پڑھ دیا جاتا ہے اور اُن کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اس کا خلاصہ لکھ لائیں۔ استاد طلبہ کی تحریر کے نحوی اسقام اور روزمرہ و محاورات کی غلطیوں کی اصلاح کر دیتا ہے۔ لیکن یہ زبان دانی کی تعلیم ہوئی نہ کہ قصہ نویسی کی۔ الغرض ہمارے یہاں کے اسکولوں اور کالجوں میں باضابطہ افسانہ نگاری کی تعلیم یکسر مفقود ہے۔

موجودہ زمانے میں معاشری معاملات کی پیچیدگی، معیارِ حیات کی بلندی، ضروریاتِ زندگی کے اضافے، کاروباری مقابلہ و مسابقت، اقتصادی جد و جہد اور پیکار کی عام ہنگامہ آرائیوں نے انسان کو نہایت عدیم الفرصت بنا دیا ہے۔ اب انسان کو پہلے زمانے کی سی بے فکری اور فارغ البالی کہاں نصیب کہ وہ آرام و اطمینان سے بیٹھا بیٹھا داستانِ امیر حمزہ، طلسمِ ہوشربا فسانۂ آزاد اور اسی قسم کے دوسرے ضخیم ناول اور افسانے مزے لے لے کر پڑھا کرے۔ آج کل زندگی کے مخصوص دھندوں اور بکھیڑوں سے چھٹکارا پا کر ایک عام آدمی زیادہ سے زیادہ گھنٹہ پون گھنٹہ مطالعہ کے لئے وقف کر سکتا ہے۔ ایسے ہنگامہ پرور زمانے میں مختصر قصوں اور افسانوں کا فروغ پانا قدرتی بات ہے۔ عوام کو اپنی کم فرصتی کے باعث اور خواص کو اپنی مشقت گریزی کی وجہ سے ایسے مائدۂ ادب کی تلاش ہوتی ہے جس کی کامل لذت بخشی صرف ایک نشست کی متقاضی ہو۔ یہ ضرورت مختصر افسانوں سے بوجہِ احسن پوری ہوتی ہے۔ ملک کے رسائل و جرائد نے ان کی اہمیت اور بھی بڑھا دی ہے۔ یوں تو ماہانہ اور

ہفتہ وار جرائد کے ہر پرچے میں افسانے کا عنصر غالب ہوتا ہے لیکن اکثر و بیشتر رسالے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ خاص افسانہ نمبر نکالنے لگے ہیں جن کی صوری و معنوی خوبیاں ہر خاص و عام سے خراجِ تحسین حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ جب نوجوان طلبہ ان دلآویز افسانوں کو پڑھتے ہیں تو قدرتی طور پر اُن کے دلوں میں افسانہ نگاری کا شوق پیدا ہوتا ہے لیکن اسکولوں کالج میں اس کی مطلق تربیت نہ ہونے کی وجہ سے یہ کام اُن کو بڑا کٹھن معلوم ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح قصہ گوئی کا عظیم الشان موضوع بھی انسانی زندگی کے واقعات و معاملات ہیں۔ علوم طبعیہ جن کا موضوعِ بحث ہوا، پانی، مادہ، روشنی، بجلی اور دوسرے قدرتی اشیا و مناظر ہوتے ہیں دلچسپی اور تفریح کے لحاظ سے علومِ بشریہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو خاص انسان اور اُس کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انسان کائنات کا مرکز ہے۔ تمام قدرتی اشیا اسی مرکز کے گرد چکر کاٹتی ہیں۔ اس کے آگے سورج، چاند، ستارے سب مسخر ہیں۔ افسانوں کے پلاٹ اسی مرکز سے وابستہ ہوتے ہیں۔ بغیر کردار کے کوئی قصہ معرضِ وجود میں نہیں آسکتا۔ لیکن ہمارے مدارس کے طلبہ کو حیاتِ انسانی کے بلاواسطہ مطالعہ کا موقع ہی نہیں دیا جاتا۔ وہ محض کتابی معلومات پر بھروسا کرنے اور دوسروں کے خیالات و آراء کو شمعِ راہ بنانے کے عادی ہو جاتے ہیں، حالانکہ کوئی شخص اس وقت تک اعلیٰ درجے کا فن کار یا بلند پایہ افسانہ نگار نہیں بن سکتا جب تک اُس میں اپنے گردوپیش کے واقعات اور انسانی زندگی کے معاملات پر آزادانہ غور و فکر کرنے کی قابلیت نہ پائی جائے یہی قابلیت ایک قادرِ فن صناع (آرٹسٹ) کو دوسرے بنی نوعِ انسان سے متمائز کرتی ہے۔ نوجوان طلبہ کی نظر میں افسانہ نگاری کی دشواری کی دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ اُن کو فطرتاً تعجب خیز، ہیجان انگیز اور سنسنی پیدا کرنے والے واقعات سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ لیکن سنسنی پیدا کرنے والے مہماتی و ہفت خوانی قصے بالعموم دور دراز ملکوں، طوفانی سمندروں، لق و دق صحراؤں مہیب جنگلوں، خوفناک پہاڑوں اور خطرناک جنگلی قوموں کے واقعات و تجربات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس لئے نوعمر طالب علم سمجھتے ہیں کہ لمبے چوڑے سفر کرنے اور مختلف قسم کے خطرات کا مقابلہ کئے بغیر افسانہ نویسی کے لئے دلچسپ مواد فراہم ہو ہی نہیں سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ مختلف ممالک کی سیاحت یا بحری سفر کے ذریعے سے اپنی معلومات میں وسعت اور تجربات میں اضافہ کرنا بہت مفید چیز ہے لیکن افسانہ نویسی کی یہ لازمی شرط نہیں ہے۔ اس امر کی مطلق ضرورت نہیں کہ واقعاتِ زندگی و معاملاتِ حیات کا براہِ راست تجربہ حاصل کرنے کے لئے کوئی متعلم اپنا اسکول یا کالج چھوڑ کر ترکستان یا جاپان چلا جائے، یا بحر شمالی و بحر اوقیانوس کا آبی سفر اختیار کرے، یا افریقہ کے بیابان میں جا کر ریت کا طوفان دیکھے، یا کوہ ایورسٹ کی چڑھائی کی مہم میں شریک ہو، یا آسٹریلیا کے وحشیوں میں رہ کر اُن کے طرزِ بود و ماند کے متعلق واقفیت حاصل کرے۔ بلکہ ہر شخص محض اپنے گردوپیش کے حالات و واقعات سے افسانہ نویسی کے لئے وافر مواد فراہم کر سکتا ہے بشرطیکہ اسے اچھی طرح معلوم ہو کہ اس کی ماحولی زندگی میں کون کون سی چیزیں ڈرامائی دلچسپی سے مملو ہیں۔ جو لوگ "صاحبِ کمال" کہلاتے ہیں اُن میں بالعموم دو خوبیاں پائی جاتی ہیں اول یہ کہ وہ زندگی کے معمولی واقعات و معاملات میں ڈرامائی عنصر دریافت کر لینے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ دوم یہ کہ وہ جو کچھ دیکھتے

اور دریافت کرتے ہیں اسے مؤثر الفاظ میں بیان کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ افسانہ نگاری کے شائقین کو چاہیئے۔ کہ وہ اپنے ماحول کی زندگی میں ڈرامائی عناصر کی تلاش کریں یہی ڈرامائی عناصر قصہ نویسی کے لئے بہترین مواد ثابت ہونگے۔ لیکن ڈرامائی عناصر کی پہچان کیا ہے؟ جس طرح شیشۂ منشور کی مدد سے آفتاب کی بظاہر سفید روشنی قوس قزح کے سات رنگوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے اسی طرح حیات انسانی کا ڈرامائی حصہ نفسیات کی مدد سے پانچ اجزا میں تحلیل کیا جاسکتا ہے۔ طلبہ کو اپنی استعداد کے مطابق اپنی ماحولی زندگی میں ان پانچ اجزا کا کھوج لگانا چاہیئے۔ انھیں اجزا کو ڈرامائی عناصر بھی کہتے ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں :-

پہلا عنصر "عمل وحرکت" ہے۔ ہر عمل، ہر کام، ہر فعل میں حرکت پائی جاتی ہے۔ خود زندگی کا مدار حرکت پر ہے ورنہ سکون و جمود موت کے مرادف ہے۔ حرکت میں برکت ہے اور برکت کسے پسند نہیں؟ تم جہاں حرکت دیکھو سمجھ لو کہ وہاں ڈرامائی دلچسپی کا ہیولیٰ موجود ہے۔ کون شخص ایسا ہوگا جو مختلف ملکوں کی سیاحت، بہیروشکار، سراغرسانی، پہاڑ کی چڑھائی اور سات سمندروں کے بحری سفر کے حیرت انگیز واقعات وحالات میں دلچسپی محسوس نہ کرتا ہو؟ جب کوئی شاندار جلوس نکلتا ہے یا میلوں ٹھیلوں میں آدمیوں کا ہجوم حرکت کرتا ہے یا کوئی پلٹن میدان میں پریڈ کرتی ہے یا ہرنوں کی جماعت کھیتوں میں چوکڑی بھرتی ہے یا گھوڑ دوڑ میں گھوڑے دوڑتے ہیں یا چکوروں کی ٹکڑی ہمارے سروں کے اوپر سے اڑی جاتی ہے تو کیا ہم تھوڑی دیر ٹھہر کر ان کا تماشا دیکھنے نہیں لگتے اور اس تماشے سے محظوظ نہیں ہوتے؟ جو طالب علم عمل وحرکت میں دلچسپی محسوس کرتا ہے وہ زندگی کا پہلا ڈرامائی عنصر دریافت کرنے کی فطری صلاحیت رکھتا ہے۔ اگرچہ اردو کے رسائل وجرائد آئے دن بیسیوں افسانے شائع کرتے رہتے ہیں اور بعض مصنفوں نے اپنے افسانوں کے مجموعے کتابی شکل میں چھپوائے بھی ہیں تاہم ان کی کم عیاری مسلّم ہے۔ اردو میں ابھی باکمال افسانہ نگاروں کا کال ہے۔ اردو شاعری کی طرح اردو افسانہ نویسی ابھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی ہے۔ ہماری شاعری صرف پایۂ تکمیل ہی کو نہیں بلکہ معراج کمال کو پہنچ گئی ہے لیکن اردو افسانہ نگاری ابھی ارتقا کے ابتدائی منازل طے کر رہی ہے۔ یہاں یہ بتانا مشکل ہے کہ کس افسانہ نویس کو کون سے ڈرامائی عنصر کی دریافت اور اس کے استعمال میں خاص مہارت حاصل ہے۔ مختصر افسانہ نویسی کا موجود فن مغربی دنیا کی ایجاد ہے۔ وہاں اس فن نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ اس کے متعلق ہر بات کا حوالہ اور ہر شے کی مثال بہ آسانی دستیاب ہوسکتی ہے۔ چنانچہ پہلے ڈرامائی عنصر یعنی "عمل وحرکت" کے دلدادوں میں اسکاٹ، کوپر، اسٹیونسن، ہارڈی، جیک لنڈن اور کپلنگ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس ڈرامائی عنصر کی دریافت کا ان کو غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔ ہماتی قصوں یا ہفت خوانی افسانوں میں "عمل وحرکت" کا عنصر خاص طور پر نمایاں ہوتا ہے۔

دوسرا اہم عنصر "شدّت جذبہ" ہے۔ زندگی کے شدید لمحات کے مشاہدے میں بھی ڈرامائی دلچسپی پائی جاتی ہے۔ جب کوئی متعلم پہلے سرکاری امتحان میں کامیاب ہوتا ہے یا جب اسے سالانہ جلسہ میں کوئی انعام ملتا ہے یا جب وہ کوئی بازی کی شرط جیتتا ہے یا جب وہ اپنی ٹولی (ٹیم) کا کپتان مقرر ہوتا ہے یا جب اس کا پہلا مضمون کسی رسالے میں چھپتا ہے اس وقت اس کے جذبات کی شدت، انتہائی مسرت اور دلی کیفیت قابل دید ہوتی ہے۔ اسی طرح ناکامی ومایوسی کے وقت اس کے کرب والم کے

شدید جذبات کا بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جب عاشق کو معشوق کا پہلا خط وصول ہوتا ہے، جب کسی ساہوکار کا دیوالہ نکلنے کا موقع آتا ہے، جب کسی مجرم کا جرم فاش ہوجاتا ہے، جب کوئی مجاہد قوم ہتھیلی پر سر رکھ کر میدان میں آتا ہے، جب کسی بادشاہ کو اُس کی فوج کی شکست کی اطلاع ملتی ہے، جب ولایت سے والدین کے پاس تار آتا ہے کہ اُن کا لڑکا سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہوگیا۔ کیا اُس وقت اُن کے جذبات کا تلاطم، دل کا دھڑکا اور ہیجانی کیفیت ملاحظے کے قابل نہیں ہوتی۔ یہ سب زندگی کے شدید مواقع ہیں۔ ان ڈرامائی لمحات کا مطالعہ افسانوں کے لئے بہترین مواد فراہم کرتا ہے۔ جن افسانہ نگاروں کی تصنیفات میں زندگی کے شدید لمحات اور شدتِ جذبات کے شواہد بکثرت پائے جاتے ہیں ان میں اڈگرایلن پو، ہارتھورن، موپساں، کانن ڈائل، ڈاس ٹسکی، اور ہیوگو بہت مشہور ہیں۔

تیسرا عنصر "سبب و نتیجہ" ہے۔ جو شخص کوئی واقعہ یا نشان دیکھ کر اس کے علل و اسباب دریافت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، یا ملک کے معاشری و سیاسی واقعات کے مطالعے سے آئندہ عواقب و نتائج کی پیش بینی کرسکتا ہے اس میں قصہ نویسی کا مادہ بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ سراغ رسانی کے دلچسپ افسانے بالعموم "اسباب و نتائج" ہی کی دریافت کے رہینِ منت ہوتے ہیں۔ مدرسے کے لڑکوں نے اپنی درسی کتابوں میں یہ مشہور قصہ پڑھا ہوگا کہ عرب کے بیابان میں ایک درویش سفر کررہا تھا۔ سامنے سے اُس کو دو سوداگر آتے ہوئے ملے جو سخت پریشان معلوم ہورہے تھے۔ درویش نے اُن سے پوچھا کہ کیا تمہارا اونٹ گم ہوگیا ہے؟ اُنھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر درویش نے دریافت کیا کہ کیا تمہارا گم شدہ اونٹ داہنی آنکھ کا کانا اور ایک پاؤں کا لنگڑا تھا؟ کیا اُس کے آگے کے دانت ٹوٹے ہوئے تھے؟ کیا اُس پر ایک طرف گیہوں اور دوسری طرف شہد لدا ہوا تھا؟ سوداگروں نے خوش ہوکر کہا کہ ہاں ہاں تم نے اس کا ٹھیک حلیہ بیان کیا۔ اب جلد بتاؤ کہ وہ اونٹ کہاں ہے؟ جب درویش نے جواب دیا کہ میں نے تمہارا اونٹ نہیں دیکھا ہے تو اُن کی حیرت اور غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ اُسے پکڑ کر قاضی کے پاس لے گئے جہاں درویش نے نہایت واضح طور پر تمام امور کی تشریح کی اور بتایا کہ کس طرح اُس نے درخت کی ٹہنیوں، گھاس کے گچھوں، پاؤں کے نشانات، چیونٹیوں اور مکھیوں کے اجتماع وغیرہ سے گم شدہ اونٹ کے متعلق قیاسات قائم کئے تھے۔ قاضی اور تمام اہلِ عدالت درویش کے تشریحی بیان سے نہایت محظوظ ہوئے اور سب نے اس کی زیرکی اور دانائی کی تعریف کی۔ درویش نے جو کچھ دیکھا تھا اگر وہ اس کو من و عن بیان کردیتا اور نتائج اخذ نہ کرتا تو کوئی پرلطف قصہ معرضِ وجود میں نہ آتا۔ یہاں درویش کے استدلال اور نتائج اخذ کرنے کا طریقہ اصل دلچسپی کی چیز ہے۔

اس مثال سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا میں واقعات و معاملات جس طرح پیش آتے ہیں اسی طرح اُن کو بے کم و کاست بیان کر دینے سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوتی بلکہ بیان کا ڈرامائی طریقہ اس امر کا متقاضی ہے کہ جو واقعات و آثار مشاہدہ میں آئیں ان کے اسباب و نتائج کی درمیانی کڑیوں کو باہم ملانے کی کوشش کی جائے۔ علت و معلول یا سبب و نتیجہ کی دریافت زندگی کے ادنیٰ سے ادنیٰ واقعہ کو نہایت پراسرار و معنی خیز بنا دیتی ہے۔ فرض کرو کہ ایک لمبی داڑھی والے مولوی مجمع میں وعظ کہہ رہے ہیں۔ سارا مجمع خاموش ہے۔ اُن پر وعظ کا کوئی خاص اثر ظاہر نہیں ہوتا لیکن ایک شخص زار و قطار رو رہا ہے۔ کیا تم اُس کے رونے کی وجہ بتا سکتے ہو؟ شیام لال سیٹھ

کسی کاروباری ضرورت سے بمبئی گیا ہوا ہے۔ اس کے مکان میں کوئی جوان مرد نہیں ہے۔ ایک نوجوان صبح و شام وہاں کوچہ گردی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جب مکان سے خادم نکلتی ہے تو وہ اُس کی خوشامد کرتا ہے اور کچھ تحفے بھی پیش کرتا ہے۔ کیا تم اس نوجوان کی حرکات کی توجیہ کر سکتے ہو؟ چاندنی رات میں سڑک کے کنارے دو شخص بہت دیر سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ جب کوئی اُن کے نزدیک گذرتا ہے تو وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ کیا تم اُن کا راز جاننے کے لئے بے چینی محسوس کرتے ہو؟ ایک شخص نگار خانے کے ایک ہی کمرہ میں ہر روز جایا کرتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں نہ قلم ہوتا ہے نہ پردۂ تصویر۔ وہ کسی سے کچھ باتیں بھی نہیں کرتا۔ خاموش آتا اور خاموش چلا جاتا ہے اس سے تم کیا نتیجہ اخذ کرتے ہو؟ ایک بوڑھی عورت قید خانے کی تاریک عمارت سے روتی ہوئی باہر آتی ہے۔ کچھ دیر مجلس کی پرہول دیوار کے نیچے کھڑی ہو کر آنسو بہاتی ہے۔ مایوسی کے عالم میں اپنے گھر واپس جاتی ہے۔ کیا تم اُس کے رونے کا سبب معلوم کر سکتے ہو؟ روزانہ زندگی میں اس قسم کے سینکڑوں واقعات دیکھنے میں آتے ہیں۔ اگر تم اسباب و نتائج کی درمیانی کڑیوں کو باہم مربوط کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو تو سمجھو کہ تم میں افسانہ نویسی کا مادہ موجود ہے۔ "سبب و نتیجہ" کا ڈرامائی عنصر کانن ڈائل، ڈگر ایلن پو، جارج ایلیٹ اور ٹامس ہارڈی کے مختصر قصوں اور ناولوں میں بہت زیادہ نمایاں ہے۔

چوتھا اور نہایت اہم عنصر "انسانی دلچسپی" ہے۔ یوں تو ہر شخص کا مذاق اور پسند جداگانہ ہوتی ہے لیکن بعض امور اور واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اُن سے عام انسانی دلچسپیاں وابستہ ہوتی ہیں۔ اِن واقعات کو افسانے کا بہترین مواد تصور کرنا چاہیئے۔ انسانی دلچسپی کا عنصر جتنا اہم اور ضروری ہے اتنا ہی غیر واضح اور معین بھی ہے۔ دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جنہیں ہم اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں لیکن ان کی منطقی تعریف بیان نہیں کی جا سکتی۔ شاعری سے کون شخص واقف نہیں ہے؟ ہم اشعار پڑھتے ہیں اُن سے محظوظ و متاثر ہوتے ہیں۔ اُن کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرتے ہیں۔ اُن کی تنقید یا تحسین بھی کرتے ہیں لیکن ارسطو کے زمانے سے لے کر آج تک کوئی ماہر فن یا نقاد شاعری کی تشفی بخش منطقی تعریف پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسی طرح ہر شخص اس صفت سے واقف ہے جو خیالات و واقعات اور کردار میں ڈرامائی دلچسپی پیدا کر دیتی ہے لیکن اس صفت کی توضیح و تشریح بہت مشکل امر ہے۔

آج کل مغربی دنیا کے مدبر "انسانی دلچسپی" پر بہت زور دیتے ہیں اور اس صفت کو افسانے کا حقیقی جوہر قرار دیتے ہیں۔ لیکن جب دریافت کیا جاتا ہے کہ آخر اس عنصر کی پہچان کیا ہے؟ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ کونسا واقعہ انسانی دلچسپی کا حامل ہے؟ تو نہ صرف حلقۂ ادب میں بلکہ دائرۂ تنقید میں بھی خاموشی چھا جاتی ہے۔ البتہ ماہرین نفسیات نے "توجہ" اور "دلچسپی" کے درمیان جو امتیاز قائم کیا ہے وہ اہمیت سے خالی نہیں۔ پہلے لوگ توجہ اور دلچسپی کو باہم مرادف خیال کرتے تھے لیکن فی الحقیقت ان کے درمیان وسیع خلیج حائل ہے۔ توجہ کے وقت انسان کی حیثیت انفعالی اور دلچسپی کے موقع پر فاعلی ہوتی ہے۔ کسی اچانک دھماکے یا بجلی کی کڑک کی آواز سن کر ہماری توجہ خود بخود اُس کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔ گویا توجہ ایک غیر اختیاری فعل ہے۔ لیکن کوئی چیز ہماری دلچسپی کو ہماری خواہش کے خلاف زبردستی اپنی جانب مائل نہیں کر سکتی۔ دلچسپی کا احساس ہماری قوتِ ارادی کے تابع ہے۔ کوئی شے ہماری توجہ کو اضطراراً جلب کرتی ہے لیکن کسی امر سے دلچسپی ہم سوچ سمجھ کر حاصل کرتے ہیں۔ غرض کہ دلچسپ چیز ہمارے غور و فکر کی محتاج ہوتی ہے۔

فرض کرو کہ تم کسی سرکس میں ایک ایکٹر کو اونچے تار پر چلتے، تھرکتے اور کئی قسم کے کرتب کرتے ہوئے دیکھتے ہو اگر تم کو اس تماشے سے گہری دلچسپی ہو تو صرف تمہاری توجہ ہی اُس جانب مبذول نہ ہو گی بلکہ تم کو حیرت ہو گی کہ وہ تار پر اپنا توازن کیسے قائم کرتا ہے۔ تم کو انتظار ہو گا کہ دیکھیں ایک کرتب کے بعد وہ دوسرا کونسا کرتب کرتا ہے۔ تم کو خوف ہو گا کہ کہیں وہ نیچے گر کر اپنے ہاتھ پاؤں نہ توڑ لے۔ تم اُس کی ایک ایک حرکت پر غور کرو گے اس طرح تمہارے دل میں خیالات و جذبات کا ایک سلسلہ قائم ہو جائیگا۔ بہرحال یہ تو ایک معمولی تماشے سے دلچسپی کی کیفیت تھی۔ لیکن اگر تم کو استعمار و انسداد، ناپید تجارت، ملکی مصنوعات کی ترقی، جبری تعلیم، آزادیٔ نسواں جیسے اہم سیاسی و معاشری مسائل سے دلچسپی ہو تو کتنے سوچ بچار سے کام لینے کی ضرورت ہو گی؟ تم کو ہر ایک معاملہ کے اسباب و نتائج، فیوض و برکات، خطرات و مشکلات، مضرات و منافع وغیرہ پر انتہائی غور و فکر کرنا ہو گا۔ الغرض نفسیاتی اصول کے مطابق جن واقعات و معاملات کے ساتھ "انسانی دلچسپی" وابستہ ہوتی ہے وہ بالعموم غور و فکر کا مطالبہ کرتے ہیں

لیکن ہر وہ شے جو غور و فکر کی متقاضی ہو ڈرامائی دلچسپی کی حامل نہیں ہوتی مثلاً پہلے مرغی سے انڈا نکلا یا انڈے سے مرغی؟ یہ سوال بھی غور طلب ہی ہے۔ جتنے معمے، چیستان، پہیلیاں، مکرنیاں اور ریاضی کے سوالات ہیں سب کے حل کرنے میں سوچ بچار کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اِن سے افسانہ نگاری کے لئے مفید مواد حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ عمل کا موقع پیدا نہیں کرتے۔ ڈرامائی دلچسپی کے لئے ایسے مواقع کی ضرورت ہے جہاں سوچی ہوئی تجویز عمل پر منتج ہو۔ فرض کرو کہ کوئی بہادر شاہزادہ جنگ میں دشمنوں کے ہاتھ گرفتار ہو کر قید خانہ میں ڈال دیا گیا ہے۔ وہ اپنی رہائی کے لئے مختلف تجویزیں سوچتا ہے۔ بیسیوں تدابیر پر غور کرتا ہے لیکن اُس کا محض سوچنا اور غور کرنا دلچسپی کا محرک نہیں ہو سکتا جب تک وہ کسی تجویز پر عمل کر کے رہا نہ ہو جائے۔ پھر اس عمل کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ وہ حیرت انگیز، غیر متوقع اور سنسنی پیدا کرنے والا ہو ورنہ سیدھی سادھی تدبیر اور معمولی و آسان عمل جس پر ہر کس و ناکس کاربند ہو سکے کبھی ڈرامائی دلچسپی کا باعث نہیں بن سکتا۔

لیکن طلبہ کو یا دوسرے نوجوان و نوآموز افسانہ نگاروں کو ان پیچیدہ مباحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس طرح ہم شاعری کی نوعیت و ماہیت سے ناواقف ہونے پر بھی اچھے اور برے شعر میں تمیز کر لیتے ہیں اسی طرح "انسانی دلچسپی" کی منطقی و نفسیاتی شرائط کے جانے بغیر بھی ہر شخص فطرتاً محسوس کر لیتا ہے کہ کون سے واقعات و معاملات اور مسائل و مواقع عام طور پر دلچسپ ہوتے ہیں۔ نوجوان طلبہ اپنی اور اپنے دوستوں ہی کی زندگی سے انسانی دلچسپی کے بیسیوں واقعات انتخاب کر سکتے ہیں۔ غور کرو کہ جب تم شروع شروع کالج میں داخل ہوئے تھے تو تمہارے خیالات و جذبات کیسے تھے۔ وہ نازک موقع یاد کرو جب تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اپنے ڈوبتے ہوئے دوست کی جان بچائی تھی۔ اسکاؤٹ کی حیثیت سے کیا تم نے کسی جلتے ہوئے مکان کی آگ بجھائی ہے؟ طاعون کے زمانے میں تم نے اپنے محلے کے ایک غریب و بیکس مریض کی کس ہمت اور بہادری سے تیمارداری کی تھی؟ جب تمہاری شادی کا پہلے پہل پیغام آیا تھا تو گھر کے آدمیوں کے سامنے تم کو کیسا حجاب محسوس ہو رہا تھا حالانکہ تمہارے دل کے اندر مسرت کی لہر دوڑ رہی تھی۔ تمہاری زندگی کے یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے واقعات گو معمولی ہیں لیکن اُن میں عام "انسانی دلچسپی" کے سامان موجود ہیں۔ زندگی کے اور بھی چھوٹے چھوٹے

معاملات میں "انسانی دلچسپی" کا مواد پایا جاتا ہے۔ کون ایسا شخص ہوگا جو کسی مدرسے کے گذرتے وقت بچوں کو ڈرل کرتے یا کھیلتے کودتے دیکھے اور اس کے دل میں اپنے لڑکپن کی خوشگوار یاد نہ آجائے۔ جب کوئی غریب الوطن کسی خاندان کے تمام مسن و کمسن افراد کو ایک جگہ جمع ہو کر خوشیاں مناتے دیکھتا ہے تو لامحالہ اس کی چشم تخیل کے آگے اس کے بال بچوں کی پیاری پیاری تصویریں گھومنے لگتی ہیں۔ غرض کہ بچوں کا گیند کھیلنا، کسان کا ہل جوتنا، بوڑھی عورت کا ایک گوشے میں بیٹھ کر چرخا کاتنا، جوان مرد و عورت کا باہم اظہار محبت کرنا، یہ سب عام دلچسپی کی چیزیں ہیں۔ جاہلوں کے اوہام و عقائد، فلسفیوں کے خبط و جنون، ملاؤں کے تعصب و تنگ نظری اور عام انسان کی خوبیوں اور خامیوں کا مطالعہ بھی افسانہ نویسی کے لئے نہایت دلچسپ مواد فراہم کرتا ہے۔ ایسے مواد کی سب سے زیادہ ضرورت کردار نگاری میں پیش آتی ہے۔ مارک ٹوین، ہارٹ ہارٹ اور چارلس ڈکنس نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں "انسانی دلچسپی" کے ڈرامائی عنصر کی خوب توضیح کی ہے۔

پانچواں اور سب سے زیادہ اہم عنصر "آویزش و کشاکش" ہے۔ یہ عنصر اپنی اہمیت کے لحاظ سے تفصیلی بحث کا متقاضی ہے۔ واضح رہے کہ کشاکش کی تین قسمیں ہیں اول انسان کی قدرت یا نیچر کے ساتھ کشاکش، دوم انسان کی انسان کے ساتھ کشاکش، سوم ایک ہی انسان کے اندر مختلف جذبات کی کشاکش۔

(۱) **انسان کی قدرت سے کشاکش** ۔ ابتدائے آفرینش ہی سے انسان قدرت کے ساتھ جنگ کرتا آیا ہے۔ موجودہ تہذیب و تمدن کی عالیشان عمارت انسانی فتوحات کا نتیجہ ہے۔ بڑے بڑے شہروں کے متمول اور عیش طلب باشندوں کو صنعت و حرفت کی ترقی، کلوں اور مشینوں کی ترویج اور سائنس کے ایجادات نے قدرت کی اُن سخت گیریوں اور جابرانہ قوتوں سے بڑی حد تک مامون و محفوظ بنا دیا ہے جن کا میدانی و کوہستانی علاقوں کے باشندوں کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ابھی روئے زمین پر ایسی قومیں بستی ہیں جن کو بحری یا ریگستانی طوفانوں کا مقابلہ کرنا، امساک باراں کے زمانے میں اپنے گاڑھے پسینے سے کھیتوں کو سیراب کرنا، گھنے جنگلوں میں شیر، ریچھ، بھیڑئیے، ہاتھی اور اژدہوں سے اپنے بچاؤ کی سبیل کرنا اور بھوک سے بیتاب ہو کر سخت برف باری میں شکار تلاش کرتے پھرنا پڑتا ہے۔ بعض عالیشان محلوں کے مکینوں کا خیال ہے کہ اس قسم کی نیم وحشیانہ ناشائستہ زندگی کی تنگ و دو صرف عسرت زدہ طبقے کے دلوں میں سنسنی پیدا کر سکتی ہے۔ اعلیٰ طبقے کا مہذب انسان ایسی جفاکشیوں اور عرق ریزیوں سے کوئی ہمدردی و دلچسپی نہیں رکھتا لیکن ایسے عالیشان محلوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ دنیا کی کثیر آبادی عوام پر مشتمل ہے جن کو قدرت کے ساتھ انسانی جنگ کے کارناموں سے خاص دلچسپی ہوتی ہے۔ متوسط درجے کے لوگ قدرت کی گونگی، اندھی اور بہری قوتوں کے خلاف انسانی جد و جہد کو اس وقت تک وقعت کی نگاہ سے دیکھتے رہیں گے جب تک آخری محاذ جنگ فتح نہ ہو جائے۔ اگر ایسا زمانہ آ بھی جائے جب انسان قدرت کے تمام مخالف و معاند عناصر کو تسخیر کرلے تاہم نیچر کے ساتھ آویزش و کشاکش اور جنگ و مقابلہ کے واقعات اور قصے نوجوانوں کے دلوں میں جوش، ولولہ اور سنسنی پیدا کرتے رہیں گے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا خطرات و صدمات کی جگہ ہے۔ جب تک انسان روئے زمین پر آباد ہے اُس کو خطرات و مشکلات سے مقابلہ کرنا ہی پڑے گا۔ بہادری کے قصے بالعموم قدرت کے ساتھ انسانی جنگ کے واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔

(۲) **انسان کی انسان سے کشاکش** ۔ تمام بنی نوع انسان ایک ہی خیال اور ایک ہی عقائد کے نہیں ہو سکتے۔ اس لئے وہ مختلف

مذہبی، سیاسی اور معاشری جماعتوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ جب دو فرقوں یا جماعتوں کے اغراض و مفاد آپس میں ٹکراتے ہیں تو ان میں آویزش و کشاکش کا رونما ہونا ایک فطری امر ہے۔ لیکن جماعتی تصادم کے علاوہ ایک ہی جماعت کے مختلف افراد بھی اپنے ذاتی اغراض کی تکمیل کے لئے ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتے ہیں۔ اگرچہ ہر شائستہ سوسائٹی نے اصول و ضوابط مقرر کر رکھے ہیں جن پر عمل کرنے سے انسان بغیر دوسروں کی حق تلفی کئے اپنے مفاد کی تکمیل کر سکتا ہے تاہم ہر طرف حرص و آز کا بازار گرم نظر آتا ہے۔ اپنی مطلب برآری کی دھن میں انسان اپنے ہم جنسوں کے حقوق کی پروا نہیں کرتا۔ اس لئے آئے دن لوگوں میں مناقشات و تنازعات واقع ہوتے رہتے ہیں۔ اگر دلوں میں کھوٹ نہ ہو تو بھی مختلف جماعتیں اور مختلف افراد ایک دوسرے پر تفوق و تسابق حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ مقابلہ یا مسابقت آج کل کے مادی تہذیب و تمدن کا لازمہ ہے۔ بہرحال انسان کی باہمی کشاکش میں قصوں اور افسانوں کے وافر مواد پائے جاتے ہیں۔ اس قسم کے قصوں کو اصطلاحاً معاشری قصے کہتے ہیں۔

دو نوجوانوں کا ایک ہی عورت سے عشق و محبت کرنا، دو کاریگروں کا ایک ہی نمائش کے لئے سامان تیار کرنا، ایک ہی جائداد کے لئے کئی امیدواروں کا کوشش کرنا، دو کمپنیوں کا ایک ہی ریلوے لائن کا اجارہ حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کرنا، کسی بورڈ یا مجلس یا کونسل کی رکنیت کے لئے مختلف امیدواروں کا آپس میں مقابلہ کرنا، مانیٹر، کپتان یا عریف (champion) منتخب ہونے کے لئے کئی طالبعلموں کا دوڑ دھوپ کرنا۔ یہ سب انسانی آویزش و کشاکش کی چھوٹی بڑی مثالیں ہیں جن سے معاشری افسانوں کے لئے وافر مواد دستیاب ہو سکتا ہے۔ عام طور پر معاشری افسانے سب سے زیادہ دلچسپ متصور ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ لوگ انہیں قصوں کو پسند کرتے ہیں جن میں روزانہ زندگی کے واقعات و معاملات کی توضیح و تشریح ہوتی ہے۔ جن مہماتی قصوں میں قدرتی شدائد کے خلاف مقابلہ و مجاہدہ کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں وہ بالعموم دہقانی اور نیم شائستہ زندگی سے براہِ راست تعلق رکھتے ہیں۔ برخلاف اس کے شہری اور مہذب زندگی میں زیادہ تر معاشری جد و جہد یا کاروباری مقابلہ و مسابقت کے نظارے دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس لئے تعلیم یافتہ حلقے میں معاشری افسانوں کا مقبول و ہردلعزیز ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

لیکن زمانہ ہمیشہ آج کل کی طرح پرامن نہ تھا۔ ایک ڈیڑھ صدی پیشتر ملک میں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ راستے نہایت خطرناک تھے ہر وقت ٹھگوں اور رہزنوں کا ڈر لگا رہتا تھا۔ شہروں کے باشندوں کی بھی جان مال اور آبرو ہمیشہ خطرے میں تھی۔ پنڈاروں کی قزاقی و ہلاکت بازی سے نہ قریے محفوظ تھے نہ قصبے۔ مرہٹوں نے خود دار السلطنت دہلی تک لوٹ مار پھیلا رکھی تھی۔ اس لئے اُس زمانہ میں شہر اور قصبے بالعموم فصیل بند ہوا کرتے تھے۔ لوگوں کو ہر وقت اپنی حفاظت کی فکر دامن گیر رہا کرتی تھی۔ سب کو محنت و مشقت اور سخت کوشی و جفاکشی کی عادت تھی۔ ذرا سی غفلت سے نقصانِ عظیم پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اہل شہر کو آج کل کی طرح آرام طلبی و عیش پسندی نصیب نہ تھی۔ بسا اوقات اُن کو بھی مسلح بند رہنا پڑتا تھا۔ اس لئے مہماتی قصوں کے واقعات اُن کی زندگی سے بے میل اور بے تعلق چیز نہ تھے بلکہ ان کے آئے دن کے تلخ تجربات کے عین مطابق تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ اعلیٰ التعلیم یافتہ طبقہ بھی مہماتی قصوں اور ہفت خوانی افسانوں سے خاصی دلچسپی رکھتا تھا۔ لیکن بیسویں صدی کے پُرامن زمانے میں مہماتی افسانے صرف جوشیلے نوجوانوں کے دل میں سنسنی پیدا کرتے ہیں ورنہ وہ عام لوگوں کی زندگی کے

واقعات سے کوئی مناسبت یا مطابقت نہیں رکھتے۔ آج کل ہمیں قدرت کی بے محابا طاقتوں سے کوئی خوف نہیں رہا کیونکہ علوم و فنون کی ترقی نے انہیں مسخر کر لیا ہے البتہ اس دو ہے ادبیت ہیں ہمیں جھکے پیچھے والوں کے لگاؤ بجھاؤ سے سخت نقصان پہنچنے کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ اگرچہ ملکی نظم و نسق کی خوبیوں نے ہمیں بڑی حد تک رہزنوں اور ڈاکوؤں سے محفوظ بنا دیا ہے لیکن طرح طرح کے جابرانہ اور گلو خراش محصول ہماری گاڑھی کمائی لوٹنے میں قزاقوں سے کم نہیں ہیں۔ پہلے انسان کو شیر اور بھیڑیے سے گزند پہنچتا تھا لیکن اب مذہبی تعصب اور تنگ نظری کی بنا پر آئے دن سر پھٹول کے واقعات پیش آیا کرتے ہیں۔ اس لئے آج کل ہمارے تخیلات زیادہ تر انہیں معاشری امور کی جانب مائل ہوتے ہیں اور انہیں سے ہمیں فطری دلچسپی حاصل ہوتی ہے کیونکہ وہ ہماری روزانہ زندگی کے تجربہ و مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں۔

(۳) **ایک ہی شخص کے دل میں مختلف جذبات کی کشاکش**۔ بسا اوقات انسان کے دل میں مختلف و متضاد جذبات میں کشمکش پائی جاتی ہے۔ نفس امارہ و نفس لوامہ یا خیر و شر کی ملکوتی اور طاغوتی قوتوں کی ستیزہ کاری سے کون شخص واقف نہیں۔ ہمو فیا ایک عرصہ تک ایک تکلیف دہ خلش کے ساتھ سوچتی رہی کہ وہ اپنے شوہر انیڈ بے کے ساتھ نکاح کی عزت و حرمت قائم رکھے یا اپنے چاہنے والے آلین کی ناجائز محبت کو دل میں جگہ دے۔ فلک زدہ و ستم رسیدہ ہیملٹ سخت کشمکش میں تھا کہ وہ مدت العمر تکالیف و مصائب جھیلتا رہے یا خودکشی کر کے تمام صدمات سے چھٹکارا حاصل کرلے۔ دفعدار درگا سنگھ تین دن تک اسی حیص بیص میں رہا کہ میجر محمد علی نے جو اُس کا ایک درجہ تنزل کر دیا ہے وہ اس ذلت کو برداشت کرے یا پستول کے ذریعہ سے اُس کا انتقام لے۔ یہ سب اندرونی جذباتی کشاکش کی مثالیں ہیں۔ جب انسان کے دل میں مختلف جذبات ستیزہ کار ہوتے ہیں تو آخیر میں جو جذبہ غالب آتا ہے وہ اُسی پر عمل کر بیٹھتا ہے۔ بہرحال جذبات کی آویزش و کشاکش سے بھی ایک خاص نوع کے افسانوں کے لئے وافر مواد حاصل ہو سکتا ہے۔ جو اصطلاحاً نفسیاتی افسانے کہلاتے ہیں۔

لیکن جذبات کی تحلیل و تجزیہ یا اُن کی توضیح و تشریح کا مادہ اوسط درجے کے آدمیوں میں نہیں پایا جاتا۔ جذبات و احساس، خیالات و وجدانات، تاثرات و ہیجانات کی کارفرمائیوں کے مطالعے کے لئے علم النفس سے واقفیت کی ضرورت ہے۔ عوام کو تو ان ذہنی کیفیتوں کے وجود کا بھی علم نہیں ہوتا۔ وہ صرف اُن مادی اشیا یا مرئی واقعات کا ادراک کر سکتے ہیں جو مختلف جذبات کے محرک ہوتے ہیں۔ خود مجرد جذبات کی تحلیل و تشریح کی مطلق ان میں قابلیت نہیں پائی جاتی۔ وہ انہیں معاملات سے دلچسپی رکھتے ہیں جو خود اُن کی یا اُن لوگوں کی زندگی میں پیش آئیں جن سے اُن کو ملنے جلنے یا کاروبار کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ زید، عمر، بکر کو اپنے روزگاری مشاغل، معاشری معاملات اور خانگی ذمہ واریوں کے باوجود اتنی فرصت اور لیاقت کہاں کہ وہ دماغ کے لطائف، نفس کی مختلف کیفیتوں اور جذبات کی کارفرمائیوں پر غور کر سکیں۔ اس لئے عوام کو نفسیاتی افسانوں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی۔ الغرض جن تین قسم کی کشاکشوں کا اوپر ذکر ہوا اُن سے تین قسم کے افسانے معرض وجود میں آتے ہیں جنہیں اصطلاحاً ہنگامی، معاشری اور نفسیاتی افسانے کہتے ہیں۔

ممکن ہے کہ آویزش اور کشاکش کی مذکورہ بالا بحث طلبہ اور نو آموز افسانہ نگاروں کو ذرا مشکل اور پیچیدہ معلوم ہو۔ لیکن کشاکش کے چھوٹے چھوٹے واقعات آئے دن کم عمر طالب علموں کے مشاہدے میں بھی آتے رہتے ہیں۔ کون ایسا لڑکا ہوگا جو مرغ یا بٹیر کی لڑائی، کشتی، دنگل، فٹ بال اور ہاکی کے مقابلے یا مشاعرے کی تفریحات سے دلچسپی نہ رکھتا ہو۔ مدرسے کا متعلم بھی اپنے ارد گرد دو حریفوں

کی کاروباری و معاشی معرکہ آرائیوں کے نظارے دیکھتا ہے۔ علاوہ بریں طلبہ کی زندگی میں جذباتی کشاکش کی بھی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک لڑکا مدرسے کی راہ گزرگاہ پر ایک گھڑی پاتا ہے۔ اس کے دل میں اس کے ہتھیا لینے کی بُری خواہش پیدا ہوتی ہے لیکن مدرسے کی اخلاقی تربیت کا اس پر اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے اور دوسرے روز گھڑی کو اپنے محترم استاد کے حوالے کر دیتا ہے کہ تلاش کر کے اُسے اُس کے مالک کو دیدیں۔ جارج واشنگٹن بچپن کے زمانے میں اپنے باغ میں جاتا ہے اور خوبصورت شاہ بلوط کے درخت کو کلہاڑی سے کاٹ دیتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد اس کا باپ وہاں آتا ہے۔ شاہ بلوط کے درخت کی یہ حالت دیکھ کر اُسے سخت صدمہ ہوتا ہے۔ جب وہ غصہ کے لہجہ میں واشنگٹن سے اس کے متعلق دریافت کرتا ہے تو سزا کا خوف لڑکے کو اخفائے جرم کی ترغیب دیتا ہے لیکن وہ اخلاقی بہادری سے کام لے کر اپنے قصور کا اعتراف کرتا ہے۔ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے لڑکپن کا یہ واقعہ ہے کہ جب اُن کی والدہ اُنہیں تحصیل علم کے لئے بغداد بھیجنے لگیں تو کملی کے اندر سو دینار ٹانک دئے اور نصیحت کی کہ بیٹا کبھی جھوٹ نہ بولنا۔ راستے میں اُن کے مختصر قافلہ کو ڈاکوؤں نے آگھیرا اور سب کی نقدی کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ڈاکوؤں کے سردار نے عبدالقادر رحمتہ اللہ علیہ سے بھی دریافت کیا۔ ماں کی محبت کا تقاضا تھا کہ وہ انکشافِ راز نہ کرتے لیکن انہیں ماں کی نصیحت یاد آگئی اس لئے سچ سچ بتا دیا کہ اُن کی کملی میں سو دینار ٹکے ہوئے ہیں۔ اُن کی صداقت شعاری سے ڈاکو اس قدر متاثر ہوا کہ اسی دن سے رہزنی ترک کر دی۔ ایسی جذباتی کشاکش کے بیشمار مواقع طلبا کی زندگی میں پیش آیا کرتے ہیں جس متعلم کو ان تمام امور سے دلچسپی ہو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ قدرت نے اس کو افسانہ نگاری کا مادہ ضرور عطا کیا ہے۔ دنیا کے مشاہیر مصنفین میں ہیوگو، شکسپیئر، ڈوماز، جیک لنڈن اور رکس بیچ کو اس مشہور ڈرامائی عنصر یعنی آمیزش و کشاکش کو اپنے ڈراموں، ناولوں اور افسانوں میں نمایاں کرنے کی بڑی مہارت حاصل ہے۔

یہ پانچوں عناصر یعنی عمل، شدتِ جذبہ، سبب و نتیجہ، انسانی دلچسپی اور کشاکش انسانی زندگی کے ڈرامائی حصہ کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اوپر ہر عنصر کی بحث کے آخر میں مشہور مصنفوں کی جو مثالیں پیش کی گئی ہیں اُن کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُن کے افسانے صرف ایک ہی عنصر پر مبنی ہوتے ہیں بلکہ جس طرح قوسِ قزح کے سات رنگوں کے ملنے سے آفتاب کی روشنی بنی ہے اسی طرح پانچوں ڈرامائی عناصر کی آمیزش سے افسانے معرضِ وجود میں آتے ہیں لیکن ان میں بعض عناصر کا رنگ دھیما اور کسی خاص عنصر کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ مہماتی یا معاشرتی افسانوں میں تو عمل، شدتِ جذبہ، انسانی دلچسپی اور کشاکش کے عناصر کا رنگ مساوی طور پر شوخ اور چوکھا ہوتا ہے۔ مگر ایک سبب و نتیجہ کا عنصر ان میں ذرا ماند ہو تو ہو

زندگی کے ڈرامائی حصہ کی تحلیل و تشریح کے بعد غور طلب امر یہ ہے کہ افسانے کے یہ عناصر یا مواد کن کن ذرائع سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان کی پہچان تو اوپر بیان کر دی گئی ہے لیکن مذکورہ بالا شناخت اور نشان کی مدد سے انہیں کہاں تلاش کیا جائے۔ ماہرینِ فن کا خیال ہے کہ تین ذرائع ایسے ہیں جن سے ہر قسم کے قصوں اور افسانوں کے بیشمار پلاٹ اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ اول مطالعۂ باطن، دوم مشاہدہ، سوم اخبارات۔

(۱) مطالعۂ باطن۔ اگر انسان اپنی ہی گذشتہ زندگی کے واقعات اور سوانحِ حیات پر غور کرے تو اُس کو ہر قسم کے افسانے کے لئے کافی مواد دستیاب ہو سکتا ہے۔ ایک نو عمر طالب علم کے ذاتی تجربات کتنے ہی محدود سہی لیکن وہ اُنہیں مختصر تجربات میں زندگی کے پانچوں ڈرامائی عناصر دریافت کر سکتا ہے۔ مثلاً کسی ریلوے کے سفر یا مچھلی کے شکار میں "عمل" کے، کسی سخت طوفان سے کبھی گھر جانے یا امتحان

میں ناکامی کی خبر پانے کے موقعوں پر شدتِ جذبہ کے، سستی و کاہلی کی عادت کا بُرا نتیجہ ہویدا ہونے یا محنت و توجہ کی بنا پر کوئی انعام پانے کے واقعات میں ”سبب و نتیجہ“ کے۔ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اپنے دوست کو کسی خطرے سے بچانے یا بحیثیت بوائے سکاؤٹ کسی مجرم کا سراغ لگانے میں ”انسانی دلچسپی“ کے۔ کشتی میں اپنے مدِ مقابل کو پچھاڑنے یا کئی اُمیدواروں کے خلاف جماعت کی مانیٹری کے لئے جد و جہد کرنے میں ”کشاکش“ کے شواہد پائے جاتے ہیں۔ بہرکیف بہت سے لوگ اپنی زندگی کے واقعات اپنی بیاض میں درج کرتے رہنے کی بدولت بلند پایہ افسانہ نگار بن گئے۔ انٹونی ٹرولوپ کا بیان ہے کہ مجھے دو چیزوں نے کامیاب افسانہ نگار بنایا ہے۔ ایک خیال بندی و عبارت آرائی کی مشق اور دوسری اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کو روزنامچہ میں لکھ لینے کی عادت۔ ڈاڈٹ نے اپنی تالیف و تصنیف کے کام کی ابتدا اپنی طفلی کے حالات و واقعات قلم بند کرنے سے کی تھی۔ آرنلڈ بینٹ کا خیال ہے کہ دنیا کے اکثر و بیشتر بلند پایہ افسانوں کا مواد بالعموم خود نوشت سوانح عمریوں سے ماخوذ ہے۔ ٹرجنیف کو شکار سے بڑا شوق تھا۔ وہ شکارگاہ کے تمام واقعات و تجربات قلمبند کر لینے کا عادی تھا یہی واقعہ نگاری اُس کی آئندہ افسانہ نگاری کا پیش خیمہ تھی۔

دوسرا اہم ذریعہ ”مشاہدہ“ ہے۔ انسان دوسروں کے جو کچھ حالات و واقعات مشاہدہ کرتا ہے وہ بھی افسانوں کے لئے بہترین پلاٹ بن سکتے ہیں۔ ولیم ڈین ہاول کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے اپنے مکان میں کمرۂ ملاقات کے متصل ہی اپنا کتب خانہ قائم کر رکھا تھا جب کوئی ملاقاتی اُس کی بیوی سے ملنے آتا تو وہ کتب خانے میں مطالعے کے حیلے سے بیٹھا بیٹھا اُن کی گفتگو غور سے سنتا اور اسے حرف بحرف قلمبند کر لیتا تھا۔ ہاتھورن اپنے تمام مشاہدات کو اپنی بیاض میں درج کر لینے کا عادی تھا۔ ڈکنس اپنے دورانِ سفر میں جو کچھ دیکھتا اُسے لکھ لیا کرتا تھا۔ غرض کہ جتنے بڑے بڑے افسانہ نویس گذرے ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر اپنے مشاہدات کے متعلق نوٹ بک (بیاض) رکھا کرتے تھے۔ ایک قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ مشاہدات کو درج کرتے رہنے کی عادت کے ساتھ ساتھ انسان کی قوتِ مشاہدہ بھی ترقی کر جاتی ہے۔ پہلے جن چھوٹی چھوٹی باتوں پر اُس کی نظر نہیں پڑتی تھی وہ بھی آگے چل کر اس کی توجہ کی دامن کش بن جاتی ہیں۔ اور اسے ادنیٰ اور معمولی امور میں بھی دلچسپی محسوس ہونے لگتی ہے۔

تیسرا مشہور ذریعہ اخبار ہے۔ اگر کوئی شخص خاص اپنی زندگی کے واقعات و معاملات یا اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کے حدود سے باہر قدم رکھ کر ڈرامائی مواد کی تلاش کرے تو اخبارات و جرائد ہر لحاظ سے اس کے ذوقِ جستجو کی تسکین کر سکتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نوعمر طلبہ افسانہ نگاری کے شوق میں روزانہ اپنے وقت کا بڑا حصہ اخبار بینی میں ضائع کیا کریں۔ اگر وہ کبھی کبھی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک افسانوی مواد کی تلاش کے لئے اخبارات کے نئے یا پرانے پلندوں کا مطالعہ کریں تو نہایت مفیدِ مطلب نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ آج کل اخبارات میں پیچیدہ سیاسی واقعات کی کثرت اور دلچسپ معاشری معاملات کی قلت پائی جاتی ہے لیکن طلبہ کو سیاسیات میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔ اُن کے لئے معاشری معاملات زیادہ مفید و سبق آموز ثابت ہوں گے۔ او۔ ہنری کے افسانوں کے پلاٹ زیادہ تر اخبارات ہی سے اخذ کردہ خیالات پر مبنی ہوتے ہیں۔ خود براؤننگ نے ”رنگ اینڈ دی بک“ کا موضوع ایک اخبار سے حاصل کیا تھا جسے اُس نے اٹالیہ کے ایک کتب فروش سے خریدا تھا۔ واضح رہے کہ افسانہ نگاری اور اخبار نویسی کے اسالیبِ بیان میں زمین آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔ اس لئے نوجوانوں کو چاہیئے کہ وہ اخباروں میں صرف افسانوی مواد کی تلاش کریں لیکن اخباری پیرایۂ بیان کی ہرگز تقلید نہ کریں ورنہ وہ افسانہ نگار کے بجائے اخبار نویس بن جائیں گے۔

محمد حسین ادیب

جاڑے کا موسم

دنت[۱] بجے دیتہا[۲] ٹھرلا گے تاپے بن کوئی چین نہ پائی
شال دوشالہ اوڑھے جا ہے[۴] اوڑھے کمل اور رزائی
آیا اب جاڑے کا موسم، سن سن چلی ہوا پچھوائی[۳]

شام ہوئی سورج ہے پیلا دھوپ میں ہلکی زردی آئی
گرے کبوتر کوّے لوٹے کاؤں کاؤں مل دھوم مچائی
پنکھ پکھیرو کریں بسیرا سن سن چلی ہوا پچھوائی

گاؤں کنارے دھواں گھرا ہے گھر میں سگڑی سب نے جلائی
روکھی سوکھی روٹی جلدی گھر والی نے گوندھ پکائی
ہاتھ پاؤں سب ٹھٹھرے جاویں سن سن چلی ہوا پچھوائی

ماتا دین، بہاری، ہیرا ہیں یہ تینوں بھائی بھائی
لمبردار کے کھیت میں مل کے کرتے ہیں تینوں نروائی
شام کو ملتی ہے مزدوری، سن سن چلی ہوا پچھوائی

گھاس کا گٹھا سر پر رکھے ندی پار سے تینوں بھائی

۱ دنت بمعنی دانت ۲ دیتہا یعنی جسم ۳ پچھوائی پچھوا ہوا ۴ ہا مرچیخانہ

آئے اور بہن نے جلدی کٹوا ڈال چلم سلگائی
سُلفہ[1] پی کر تینوں کھانسے سن سن چلی ہوا پچھوائی

~~~

آگ تاپ کے بیٹھے تینوں جب تن میں کچھ گرمی آئی
ڈھول اُٹھائی بدھے چھیڑے، کبت پڑھے چوپائی گائی
جاڑا لگتا ہے تینوں کو، سن سن چلی ہوا پچھوائی

~~~

ہنسی خوشی پھر سب نے مل کر ساگ پات سے روٹی کھائی
گدڑی اوڑھ کے پیال پہ لیٹے نیند آنکھوں میں آن سمائی
لوری چھیڑی جھینگر نے اور سن سن چلی ہوا پچھوائی

~~~

پنکھ پکھیرو کوئی نہ ڈولے، سائیں سائیں دے کان سنائی
ہوا بجاوے سیٹی بن میں، کاری رات اندھیری چھائی
نیچے اوپر ہے سناٹا، سن سن چلی ہوا پچھوائی

~~~

ایسی رات میں اے پرمیشور راس آئی کب کڑی کمائی
محنت کرنے والے نے جب پورے پیٹ نہ روٹی کھائی
اے ان داتا تیری دُہائی، سن سن چلی ہوا پچھوائی

~~~

سید مقبول حسین

[1] کڑوا تمباکو جو دیسی اور گھر کی پیداوار ہوتا ہے [2] بغیر توا رکھے تمباکو پر کوئلے رکھنے کو سلفہ کہتے ہیں [3] گیتوں کے نام [4] جب اندھیری اور خاموش رات میں ہو کا عالم ہوتا ہے تو کانوں میں سائیں سائیں کی آواز آتی ہے۔
~~~

ایک رومان

تاروں بھری رات خاموش ہے،
اُس کا حسن ایک کہانی کی طرح دلکش ہے؛
میرا حق مجھے کیوں نہیں ملتا؟
محبت اور شہرت کی آرزو کیوں بر نہیں آتی؟

جو زمین کے پردے میں چھپ گئے،
وہ کیوں خوش ہیں اور میں کیوں خوش نہیں؟
رات کی تاریکی مجھ سے کیوں کہتی ہے
کہ موت ایک انعام ہے، ایک خوشی؟

ایک پست قد خاکی پوش سپاہی یہ اشعار ایک عجیب سے بے بس گانا ہوا، بارکوں کے بڑے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ سیرافینو نے مڑ کر تعجب سے اُس کی طرف دیکھا، کیونکہ وہ بھی اُس وقت خودکشی کے مسئلے پر غور کر رہا تھا، جیسا کہ اکثر کیا کرتا تھا۔ یہاں یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ اُن لوگوں کے لئے جو کبھی خودکشی نہیں کر سکتے خودکشی کا خیال جتنا سوہانِ روح ہوتا ہے سیرافینو کے لئے اُسی قدر تسکینِ قلب کا موجب تھا۔

اُسے خیال آیا "آخر زندہ رہنے سے کیا فائدہ؟ میری عمر تیس سال کی ہے، غریب ہوں، بیمار ہوں، ناکام ہوں۔ نہ میرے پاس دماغ ہے نہ ارادہ ہے نہ دولت ہے۔ میں نے ایک دفعہ ایک افسانہ لکھا تھا، لیکن جس پرچے کی طرف میں نے اُسے بھیجا اُس کے ایڈیٹر نے ایک لفظ تحریر کئے بغیر اُسے واپس کر دیا۔ کبھی مجھے اتنی خوشی بھی نصیب نہ ہوئی کہ میرے پاس ایک خوبصورت عمدہ سوٹ ہو۔ میرے رشتہ دار ایسے غریب ہیں کہ انہیں مجھے نارمل سکول میں پڑھانے کے لئے عظیم الشان قربانیاں کرنی پڑیں۔ اب میں ایک اُستاد ہوں، اور جب میں اپنی فوجی ملازمت ختم کر لوں گا تو شاید مجھے ایک "روشن مستقبل" کی امید ہو۔ اور اس کے بعد موت!"

"اس کے بعد موت!" اُس نے کچھ اِس انداز سے کہا جیسے ہم کسی جگہ رہتے رہتے تنگ آجائیں اور کہیں "اس کے بعد ہم چلے جائیں گے"

اگرچہ سیرافینو حریص تھا نہ مغرور لیکن اس نیک اور شریف بلی کی طرح جسے ظالم بچوں کی بدسلوکی نے جینے سے بیزار کر دیا ہو اُس کے دل میں ایک آخری آرزو تھی، اور وہ آرزو یہ تھی کہ کاش موت سے پہلے وہ ایک زبردست کشمکش سے اپنی دلیری

کا ثبوت دے سکے، یا کم از کم اپنی ناگہانی موت پر اپنی بلند ہمتی کا اظہار ہی کر سکے۔

مثلاً وہ دل ہی دل میں سوچتا کہ کسی بڑی دولت مند اور خوبصورت خاتون سے محبت کروں یا کسی فتّان عورت کے عشق میں مبتلا ہو جاؤں۔ وہ بھی ضرور مجھ سے محبت کرے گی۔ لیکن منزلِ عشق کی بیشمار مشکلات کب اُسے وفا کرنے دیں گی۔ اور اس کی بیوفائی کے بہانے میں خودکشی کر لوں گا۔ اپنی خودکشی کو ایک سانحۂ محبت کا رنگ دینے کے لئے وہ بے وفا عورتوں تک سے محبت کرنے کو تیار تھا لیکن سوال یہ تھا کہ ایسی عورتیں آئیں گی کہاں سے؟

غم روز بروز اس پر غلبہ پا رہا تھا کیونکہ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ اُس کی آرزوئیں کبھی بر نہیں آئیں گی۔ اُسے معلوم تھا کہ غریبوں کی قسمت میں ہمیشہ فاقوں کی موت ہوتی ہے۔

× × × × × × ×

آج شام اُس پر غم کی ایک ایسی کیفیت طاری تھی جس کے دوران میں موت کا خیال اُس میٹھی نیند کی طرح طویل اور گہرا ہوتا ہے جو ایک کمزور بیمار پر صحت کے بعد طاری ہوتی ہے۔

جہاں وہ اب ایک ہفتے سے مقیم تھا وہ ایک ایسی جگہ تھی جو اُس کے غم کو دم بدم بڑھا رہی تھی۔ یہ ایک پہاڑی جزیرہ تھا جس کی چوٹی پر ایک زنداں کی سفید عمارت دنیا کے اس خوبصورت ترین سمندر کی صاف شفاف وسعت پر اُسی طرح مسلط تھی جس طرح سیرافینو کی جوانی پر موت کا خیال چھایا ہوا تھا۔ اس پر خزاں کی خاموشی اور تنہا شام ہر چیز کو اُداس بنا رہی تھی، یہاں تک کہ خود سمندر نیلا اور سنہری سمندر سردی سے کانپ کانپ جاتا تھا۔

ہوا ساحل کی کائی اور کیکروں میں سے اس تیزی کے ساتھ گذرتی تھی کہ اُن کی سرسراہٹ کا شور بارکوں کے صحن تک سنائی دیتا تھا، اور اس آہِ مسلسل کو سن سن کر دل بیٹھا جاتا تھا۔ دیہاتی مکانوں کی طرح نیچی نیچی چھتوں والی بارکوں کے سامنے میدان میں بہت سے سپاہی جمع تھے اور سب کے سب بادِ خزاں کے طویل اور غم انگیز راگ سے کم و بیش متاثر معلوم ہوتے تھے۔

اُس روز صبح کے وقت تمام قیدی اچھے بھلے تھے، لیکن شام کو یہ سننے میں آیا تھا کہ ایک قیدی سکرات کی حالت میں ہے۔ سیرافینو نے اپنے گانے والے رفیق کے ساتھ ایک بحث شروع کر دی۔ وہ دونوں اکثر ایسی بحثیں کیا کرتے تھے۔ سیرافینو نے کہا جو لوگ طویل عرصے کے لئے قید ہو جاتے ہیں یا کسی لاعلاج مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ کیوں یہ نہیں سمجھ لیتے کہ اُنہیں خودکشی کر لینی چاہئیے۔

اس کے موسیقی پرست دوست نے جواب دیا "اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک کو یہ امید رہتی ہے کہ کبھی نہ کبھی قید ختم ہو جائے گی اور کبھی نہ کبھی مرض جاتا رہے گا" اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں۔ اُس نے پھر سلسلۂ گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا "تم کیا کہتے ہو؟ زندگی ایک نہایت خوشگوار چیز ہے! زندہ رہنا ہی ایک فتح الفتوح ہے! اور تم نے یہ بھی کبھی سوچا ہے کہ جتنا زیادہ کوئی بیمار ہوتا ہے یا جتنی زیادہ کسی کو مصیبت پڑتی ہے۔ اتنا ہی زیادہ وہ زندگی سے محبت کرنے لگتا ہے"

سیبرافینو نے شاعرانہ انداز سے کہا "یہ محض کہنے کی باتیں ہیں، صحت، آزادی اور دولت کے بغیر زندگی ایک ناکام فتح ہے"۔

اُس کے دوست نے کہا "مجھی کو دیکھو: بیمار میں ہوں، دولت میرے پاس نہیں، فوجی ملازمت کرنے پر میں مجبور ہوں لیکن پھر بھی خوش ہوں۔ مگر جو خوش نہیں ہوتے اُن کا حال مجھ سے بھی ابتر ہوتا ہے"۔

"تم نہایت بے حس واقع ہوئے ہو!"

جس طرح کوئی مرغ بے ہنگام بولے ایک کرخت آواز نے اُن کی بحث کو منقطع کر دیا:

"خاموش!"

"حاضر!"

سپاہیوں کی حاضری بولی جا رہی تھی۔

شام کا اندھیرا جلد جلد چھانے لگا۔ مغرب کی طرف آسمان پر ایک پُرشکوہ تیرگی غلبہ پانے لگی، اور کانپتے ہوئے کیکروں میں سے نیلا سمندر خود اپنی روشنی سے چمکتا ہوا معلوم ہونے لگا۔

بارکوں کے بڑے دروازے کے ساتھ ہی ایک پکی اور دونوں طرف دو دیواروں سے گھری ہوئی ڈھلوان سڑک شروع ہوتی تھی جس کے آخری سرے پر ایک اور دروازہ تھا۔ یہ دروازہ اس وقت کھلا ہوا تھا اور اس میں سے ایک سرائے کا اندرونی حصہ نظر آرہا تھا۔ سرائے کے اندر ایک دھیمی سی روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ ہوا کچھ دیر کے لئے تھم گئی تھی، اور افسر کے حاضری بلانے پر سپاہیوں کے جواب فضا میں پہلے سے زیادہ گونجنے لگے تھے۔ کسی کی آواز میں تازگی اور خوشی تھی اور کسی کی آواز میں غم اور پژمردگی۔ سیبرافینو کے موسیقی پرست دوست کے "حاضر" کہنے میں کسی راگ کے سم کی سی کیفیت تھی، اور جب سیبرافینو بولا تو اُس کی آواز اتنے فاصلے سے آتی ہوئی معلوم ہوئی گویا ہوا اسے کاہی فذربیون کی آہوں کے ساتھ اڑا کر کہیں دور لے گئی تھی۔

حاضری ختم ہونے کے بعد سپاہیوں نے پھر گانا اور شور مچانا شروع کر دیا۔ اُن کے کرخت اور وحشیانہ راگ میں ایک تلخی سی ملی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس دنیائے تعزیریں پا کر گھبرا گئے ہیں اور اب چلا چلا کر اپنے غم کو بھلانا چاہتے ہیں۔ جو سپاہی سب سے زیادہ بلند آواز سے گا رہے تھے اُنہیں رات کے وقت جزیرے کے ساحل پر پہرہ دینا تھا۔ صرف ایک خاموش تھا۔ یہ سیبرافینو تھا۔

× × × × × ×

آدھی رات کے قریب اُس نے اپنے آپ کو ایک ایسے مقام پر پہرہ دیتے ہوئے پایا جہاں دیواروں سے محصور سڑک ختم ہو کر ایک عظیم گھاٹی شروع ہوتی تھی جو سیدھی سمندر میں اُتر گئی تھی۔

اگرچہ ہوا کی تیزی اب زائل ہو چکی تھی لیکن تاروں بھری رات میں اُس کی خنکی کے ساتھ سمندر کی خوشبو مل کر بہار کی سہانی راتوں کی یاد تازہ کر رہی تھی۔ یکایک اُس لالٹین سے جو ایک کینہ توز آنکھ کی طرح قیدیوں کے اس جزیرے کی محافظت کیا کرتی تھی سبز روشنی کی ایک تیز شعاع نکل کر تاریک سمندر پر پڑی۔

گھاٹی کے نیچے سمندر میں سیرافینو کی آنکھوں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ ایک سیاہ رنگ کی کشتی جو گیس کی تیز شعاع سے روشن تھی، جزیرے کی طرف آرہی تھی، اور اُس میں اُن ماہی گیروں کی وضع کا ایک آدمی بیٹھا تھا جنہیں جزیرے تک آنے کی عام طور پر اجازت حاصل تھی۔ اُس کا دُبلا پتلا جسم ایک سرخ چادر میں لپٹا ہُوا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جادو کے آتشیں حلقے میں کوئی شیطان چھپا ہُوا ہو۔

تاریک ساحل پر دور بہت دور کہیں کہیں کوئی روشنی نظر آتی تھی یا تاریک آسمان پر ستارے روشن تھے، اس کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

سیرافینو ٹالسٹائی کی تعلیمات سے متاثر تھا۔ اسی لئے جب کبھی وہ پہرے پر کھڑا ہوتا تھا وہ بڑی سختی سے اپنے دل سے یہ سوال کیا کرتا تھا کہ آخر وہ کونسی ہستی ہے جو اُسے ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے، اُسے کیوں ایک مجہول و عظیم وہیبت طاقت کی فرمانبرداری کرنی پڑتی ہے ــ اُس طاقت کی جس کے نمائندے خود اُس سے کم حیثیت ہیں، کوئی کسان ہے تو کوئی نائی، مگر یہاں اُس کے افسر بنے بیٹھے ہیں، کون اُس کی آنکھوں کو منحوس لالٹین کی بے شعور اور کینہ توز آنکھ کی طرح اُس چٹان کی پاسبانی کرنے پر مجبور کرتا ہے جس کے ساتھ سمندر کی لہریں ہر وقت بے فائدہ سر ٹکراتی رہتی ہیں۔

وہ تنہا نعمت جو قسمت اُسے نہایت آسانی سے عطا کر سکتی ہے نیند ہے ۔ پھر کیوں وہ اُن زندہ آدمیوں کے مقبرے کی پاسبانی کی خاطر جنہوں نے کبھی اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا نیند سے محروم رہے؟ یہ کسے معلوم ہے؛ شاید اُسی مہیب و عظیم اور مجہول طاقت کو معلوم ہو جس کے ہاتھوں وہ ایک بے محبت اور بے درد زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا ــــ وہ زندگی جس کے دن سمندر کی لہروں کی طرح نیستی کی چٹان کے ساتھ بے مصرف سر ٹکراتے رہتے تھے۔

ماہی گیر اپنی کشتی کو پہاڑی کے دوسری طرف لے گیا، اور روشنی کی شعاع بھی غائب ہوگئی۔ تاریکی پھر پہلے کی طرح چھاگئی سیرافینو کو نیند آرہی تھی۔ جس طرح دریا کی موجیں ایک یکساں، ہموار اور خواب آور سا نغمہ پیدا کیا کرتی ہیں اسی طرح اُس کے غم انگیز خیالات کا راگ اُسے لوری دے دے کر سلا رہا تھا۔ اُس نے خودکشی والے اشعار کو اپنے دل میں ایک دفعہ پھر دہرایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاعر نے انہیں اسی کے لئے لکھا ہے۔ ان اشعار میں ایک ایسی شیرینی اور کیف تھا جس نے اُس کے دل میں عہدِ گذشتہ کی یاد تازہ کر دی، اور زمانۂ طالب علمی کے اولیں تصورات اُس کی آنکھوں کے سامنے لا کھڑے کئے۔

رات اب خاموش تھی اور تاروں سے بھری ہوئی، لیکن مسرت انگیز خیالات سے خالی تھی۔ صرف ایک خیال اس تاروں بھری رات کے سکوت کو توڑتا تھا، اور وہ موت کا خیال تھا۔ وہی ایک منتظر دوست تھی جسے وہ اکثر اپنے قریب محسوس کیا کرتا تھا اور آج رات بھی اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی نرم و ملائم وجود فضا میں سے گزر رہا ہے ۔ یہ کوئی ہوا کا جھونکا نہ تھا، نہ خوشبو تھی، نہ کوئی نغمہ تھا، بلکہ ان سب سے زیادہ کیف آور، زیادہ شیریں کوئی چیز تھی، شاید موت جو گزرتے گزرتے اپنے مخملیں فرغل سے اُس کے جسم کو چھو رہی تھی، اپنے نرم ہاتھوں سے اُسے پیار کر رہی تھی۔

اُس نے اپنے دل میں کہا "ضرور اس وقت وہ قیدی مر رہا ہوگا۔ مجھے یاد ہے جب اماں مری تھیں مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی غیر مرئی ہاتھ، سمور کی طرح نرم ہاتھ میرے منہ پر پیار سے پھر رہا ہے ۔

گھاٹی کے کنارے پر سے وہ آہستہ آہستہ گلی کی طرف چلنے لگا۔ نیند نے اپنا دامن اور پھیلا دیا۔ ایک لمحے کے بعد اُس سے حرکت کرنی بھی مشکل ہوگئی۔ تھک کر وہ ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ بندوق کو اس نے اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا، اور اُسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ایک غیر مرئی ہاتھ نے اُس کی آنکھوں کو بند کر دیا ہے۔

اُس کی آنکھیں نیم بند تھیں لیکن جیسے کوئی ایک جادو کے نقاب میں سے دیکھے اُس کی آنکھوں نے ایک لمحے کے لئے صاف طور پر دیکھا کہ سمندر اُس کے سامنے ہے، ساحل کی سیاہ لکیر کے ساتھ ساتھ پیلی پیلی روشنیاں جھلک رہی ہیں، ستارے چمک رہے ہیں، شاید کسی روشنی کے مینار میں سے ایک شعاع نکل رہی ہے اور مغموم لہریں اُس کے پاؤں سے آ آ کر ٹکرا رہی ہیں۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ جزیرہ ایک ساز ہے جس کے تاروں پر سمندر کی موجیں ایک بے حد غم انگیز راگ گا رہی ہیں۔ نیند.... نیند.... آہ اُس نے آج تک نیند کا عذاب اس درجہ محسوس نہ کیا تھا۔ اُسے بار بار یوں معلوم ہوتا کہ کوئی دبے پاؤں اُس کے قریب سے گزر رہا ہے، بار بار اُسے اُس قیدی کا خیال آتا تھا جس کے متعلق سنا گیا تھا کہ وہ سکرات کی حالت میں ہے۔ شاید وہ اب تک مر چکا ہوگا.... آخر اُس نے نیند پر غلبہ پا لیا! ان خیالات میں نیند کیسے ٹھہر سکتی ہے؟ وہ قیدی کو جانتا تھا۔ اُس نے سڑک کی مرمت کا کام کرتے ہوئے اکثر اُسے دیکھا تھا۔ بلند و بالا پتلا دبلا اور بڑھاپے سے ذرا جھکا ہوا قد، شگفتہ اور خوبصورت چہرہ اور دو پیلی سی ہنستی ہوئی آنکھیں۔

× × × × × ×

لیکن — لیکن — اب تو ان پر اسرار قدموں کی چاپ حقیقت میں سنائی دینے لگی تھی۔ اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اپنے آپ کو ایک جھٹکا دے کر اچھی طرح بیدار کر لیا۔ چھپ کر نکل جانے والے قیدیوں کی کہانیاں اُس کے ذہن میں چکر لگانے لگیں۔ آج سے چند ماہ پیشتر ایک ایسے ہی ماہی گیر کی کشتی سے فائدہ اُٹھا کر پانچ قیدی بھاگنے میں حیرت انگیز طور پر کامیاب ہوگئے تھے، اور تعجب تو یہ ہے کہ ان میں ایک ستر سال کا بڈھا بھی تھا۔ جب وہ مقابل کے ساحل پر پہنچے تو انہیں کچھ سمجھ نہ آئی کہ کہاں چھپیں اور اس لئے وہ آٹھ دن تک انہیں پہاڑیوں میں گھومتے رہے جو کچھ زیادہ غیر آباد نہیں ہیں۔ آخر ہمارے سپاہیوں نے انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا اور سخت سردی کے موسم میں اُنہیں کپڑوں سے بھی محروم کر دیا گیا۔

× × × × ×

کیا یہ وہم تھا؟ کیا یہ حقیقت تھی؟ کوئی دبے پاؤں جا رہا تھا! بلا شبہ دیوار کے پیچھے ڈھلوان سڑک پر سے کوئی آدمی نیچے اُتر رہا تھا۔ اب اس میں کچھ شک نہ تھا۔

"کون ہے؟"

اُس کی آواز نہایت صفائی اور تحکم کے ساتھ فضا میں گونجی۔ اس کے بعد پھر پہلے کی طرح خاموشی چھا گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید پھر اُسے دھوکا ہوا ہے۔ اُسی وقت دیوار سے ایک شخص نے چھلانگ لگائی اور تیزی کے ساتھ سڑک پر سے

—

اُٹھانا شروع کر دیا۔

"کون ہے؟"

اگرچہ سیرافینو ہر بات کے لئے تیار تھا لیکن پھر بھی وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔

"بس!" اُس شخص نے دلیرانہ اُس کی طرف آتے ہوئے کہا۔

رات کی تاریکی میں وہ شخص مدافعانہ یا شاید ملتجیانہ انداز میں اپنے ہاتھ پھیلائے بڑھا چلا آ رہا تھا۔ صرف اُس وقت اُس نے اپنی پیش قدمی کو روکا جب سپاہی کی بندوق اُس کے ہاتھ کو چھونے لگی۔ سیرافینو کا خوف حیرت سے تبدیل ہو گیا۔ اُس نے جانباز قیدی کو پہچان لیا تھا۔

"کھڑے رہو ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا!"

قیدی نے اپنا سر جھکا دیا اور گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ اب بھی اُسی طرح ملتجیانہ انداز میں آگے کی طرف پھیلے ہوئے تھے یا شاید فطری طور پر وہ مدافعت کر رہا تھا۔

سیرافینو نے چلا کر کہا "تم کہاں جا رہے ہو؟"

قیدی نے نہایت نیچی مگر مضبوط آواز سے کہا "اس طرح بلند آواز سے نہ بولو۔ تو میرے ہاتھوں کو باندھ لو مگر دوسروں کو خبر نہ ہونے دو۔ تم ایک مسیحی ہو اور مسیح کا فرمان ہے کہ کسی کو جان سے نہ مارو۔ میں بڈھا ہوں، تم مجھے آسانی سے گرفتار کر سکتے ہو"۔

سیرافینو نے پھر نہایت سختی سے چلا کر کہا "خاموش! بتاؤ تم کہاں جا رہے تھے؟"

بڈھے نے ہاتھوں کو نیچے گراتے ہوئے سادگی سے کہا "میں بھاگ جانا چاہتا تھا" پھر سپاہی کی سختی کے باوجود غالباً اس خیال سے کہ وہ مسیحی ہے اُس نے ان الفاظ کا اضافہ کیا "مجھے گزر جانے دو۔ کسی کو خبر بھی نہ ہو گی کہ میں یہاں سے گزرا ہوں"۔

"خاموش رہو ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔ اب میں جگونی بجانے لگا ہوں"

یکایک قیدی نے ایک لرزش کی۔ وہ اور جھک گیا اور ایک کتے کی طرح سپاہی کی ٹانگوں میں پناہ لینے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دوسروں سے ڈر کر جواب کوئی دم میں ظاہر ہوا چاہتے تھے اُس کی حمایت میں آنا چاہتا ہے۔

"نہیں، نہیں، میرے بیٹے، نہیں۔ اوروں کو مت بلاؤ"۔ چونکہ سیرافینو اُس کی بات کو سن رہا تھا اس لئے اُس نے جرأت کر کے اپنا سر ذرا اُٹھایا اور ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھ کر کہنے لگا "مجھے باندھ لو، باندھ لو مگر دوسروں کو نہ بلاؤ! میں نے بھاگنے کے لئے بیماری کا بہانہ کیا تھا۔ ایک عورت ایک بڑھیا بیس سال سے میرا انتظار کر رہی ہے۔ وہ میری بیوی ہے۔ اب اُس نے لکھا ہے کہ وہ بیمار ہے، بہت بیمار، لیکن اگر وہ مجھے ایک دفعہ دیکھ سکے تو وہ خوشی سے جان دے گی۔ میں نے اُسے لکھا ہے کہ میں اُسے خوش کرنے کے لئے، اُسے عمر بھر کا رنج دینے کے بعد یہ آخری راحت پہنچانے کے لئے سب کچھ کر گزروں گا۔ اب وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ اگر میرا وعدہ پورا نہ ہوا تو اُس کی موت عجب مایوسی کی موت ہو گی۔ آہ اگر تم نے مجھ پر رحم نہ کیا تو میں کیا کروں گا! بیٹے رحم کرو! میرے

لئے نہیں تو اُس بوڑھی ہونے والی ہی کی خاطر رحم کر جس نے تمام عمر مصیبت میں کاٹ دی۔ اگر میری جگہ تمہارا بوڑھا باپ ہوتا اور تمہاری جگہ میرا سپاہی بیٹا تو بتاؤ تم کیا کہتے؟ مجھے گزر جانے دو۔ دنیا میں ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ کون جانتا ہے کہ کسی دن شاید میں بھی تمہارے کام آسکوں۔ یہاں سے ——" سیرافینو کی خاموشی سے حوصلہ پاکر وہ مڑا اور اشارہ کر کے کہنے لگا "یہاں سے میں نیچے اتر جاؤں گا۔ چٹان پر میرے پاؤں کا کوئی نشان باقی نہیں رہے گا۔ گویا تم نے کچھ نہیں دیکھا اور —— خدا تمہیں اس کا اجر دے گا۔"

سیرافینو کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ اُس کے بھاگنے کا اعلان کرنا چاہتا تھا، اُسے باندھ لینا چاہتا تھا، یعنی وہ کچھ کرنا چاہتا تھا، جیسے اُس کے افسر "فرض" کہا کرتے تھے۔ لیکن کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ایک پراسرار طاقت جس سے انسان کا صرف خواب میں سابقہ پڑتا ہے اُسے کوئی حرکت نہ کرنے دیتی تھی۔ مجرم کا پھولا ہوا سانس اور مسترحمانہ انداز دیکھ کر اُس کا دل پگھل گیا، بلکہ اس بڈھی جان کے لئے جس کا رابطہ اِس قعرِ مصیبت میں پڑ کر بھی زندگی کے ساتھ اسقدر استوار تھا کہ اُس کے دل میں اُس کیلئے تعریف کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

اپنے دل سے یہ سوال کئے بغیر کہ آیا اُس کی اپنی جان زیادہ قیمتی ہے یا اِس بدقسمت قیدی کی اُس نے خیال کیا کہ اب اس کے لئے خودکشی کا بہترین موقع ہے۔ لوگ سمجھیں گے کہ اس نے اپنے فرض کی بجاآوری میں اپنی جان تک دے دی۔ ہاں وہ اِس موقع کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔

اُس نے آہستہ سے کہا "جاؤ، چلے جاؤ۔" اور اپنی بندوق اُٹھا کر زمین پر رکھ دی۔ قیدی خاموشی کے ساتھ اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا، پھر ایک ہاتھ سے زمین کا سہارا لیتے ہوئے بمشکل اُٹھا اور کھڑا ہو گیا۔ اُس کا بلند قد رات کی طرح تاریک نظر آرہا تھا۔ نہایت ہلکی آواز میں اُس نے کہا "میرے بیٹے، تمہیں بڑی دولت نصیب ہو گی اور بڑی خوشی سے تمہیں اتنی ہی دولت ملے گی جتنی تم نے نیکی کی ہے۔"

آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کے ساتھ سیرافینو نے دیکھا کہ قیدی کا بلند اور تاریک پیکر چٹان کی دیوار کو پھلانگ گیا۔ اس کے بعد چند چھوٹے چھوٹے پتھروں کے نیچے کی طرف سرکنے کی آواز آئی، اور پھر سمندر کی لہروں کا وہی سریلا اور مغموم نغمہ رات کی خاموشی کو توڑنے لگا۔

× × × × × × ×

سیرافینو نے اپنے دل میں کہا "دولت اور خوشی کہاں! بلکہ اس کے برعکس مجھ سے زیادہ بدنصیب اور ناخوش کون ہو گا!"

زندگی کے اِس آخری لمحے میں بجائے اس کے کوئی سنجیدہ خیال اس کے دل میں آتا گزری ہوئی زندگی کی ادنیٰ ادنیٰ تلخیاں اُسے یاد آنے لگیں۔ آہ پُرتکلف کھانوں کا وہ کبھی خواب تک نہ دیکھ سکا تھا۔ اُسے اپنے جوتوں کو دیر تک صحیح و سالم رکھنے کے لئے کتنی جدوجہد کرنی پڑتی تھی، اور ایک سیاہ سوٹ کی اُسے ہمیشہ ہی کتنی آرزو رہی تھی۔ آہ اسے سرد موسم میں گرم کپڑے حاصل کرنے کے لئے کتنی صعوبت برداشت کرنی پڑتی تھی۔

اس سے بڑھ کر بھی کوئی مصیبت ہو گی؟ اُس کی ہر چیز پرانی، خراب و خستہ اور فرسودہ ہو چکی تھی بلکہ شاید اس کی روح بھی کسی پرانے کپڑے کی طرح فرسودہ و مضمحل تھی۔ ہر بات کا انجام آپہنچا تھا۔ قسمت کے ساتھ لڑائی ختم ہو چکی تھی، اُس قسمت کے ساتھ جس کے

دوشکار اُس نے چھین لئے تھے — اپنا آپ اور بوڑھا قیدی۔ اور اسی بوڑھے قیدی کی طرح اب خود بھی دنیا کے قید خانے سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔

× × × × × ×

اُس نے بندوق کو زمین پر رکھ دیا اور اُس کا سرد دہانہ اپنے گلے سے لگالیا۔ آخری گھڑی آپہنچی تھی۔ وہ محبت سے محروم اُمید سے محروم، ایمان سے محروم مر رہا تھا لیکن رحم کا ایک پُراسرار احساس اُس کے دل میں موجود تھا۔
اُس کی موت پر کوئی نہ روئے گا۔ لیکن وہ تمام مصیبت زدوں کے لئے روتا ہوا مر رہا تھا۔ خدا حافظ! ستاروں کی روشنی اب اُسے نظر نہ آتی تھی، موجوں کا نغمہ اب اُسے سنائی نہ دیتا تھا۔ موت کا سیاہ پردہ ہر چیز کے درمیان حائل ہو رہا تھا۔ خدا حافظ! اُس نے لبلبی پر ہاتھ رکھنا چاہا لیکن یکایک بندوق اُس کے ہاتھ چھوٹ کر دھم سے زمین پر آرہی۔

× × × × × ×

بندوق کے گرنے کی آواز سن کر وہ کانپ گیا اور جاگ اُٹھا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے اور سمندر کی موجیں ہلکا ہلکا نغمہ پیدا کر رہی تھیں۔ بندوق حقیقت میں اُس کے گھٹنوں سے نیچے گر گئی تھی۔ خواب کے اثرات سے وہ اس قدر بے حس ہو گیا تھا کہ چند لمحوں کے لئے وہ بالکل حرکت نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ اُس نے بندوق بھی زمین سے نہ اُٹھائی۔

× × × × × ×

دوسرے دن اُس نے سنا کہ عین اُس وقت جب اُسے خواب آرہا تھا وہی بوڑھا قیدی ایک ایسے راستے سے جہاں اُس کو روکنے کے لئے کوئی پاسبان موجود نہ تھا حقیقت میں بچ نکلا تھا۔ لیکن آگے جا کر کسی سپاہی نے اُسے مار دیا تھا۔

× × × × × ×

شام کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ کائی اور کیکر کے درختوں میں سے سائیں سائیں کی آواز آرہی تھی، اور گلابی بادلوں والے آسمان کے نیچے اُن پر تاریکی کی ایک گھٹا چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ لال اور نیلے پانی پر سرد ہوا کے جھونکے ہلکی ہلکی لہریں پیدا کر رہے تھے۔
سپاہی صحن میں جمع ہو کر گا رہے تھے۔ سیرافینو نے بڑے دروازے کے سامنے کھڑا ہونے کی بجائے فراغت کے اِس گھنٹے میں ایک چھوٹا سا ناول لکھنا شروع کر دیا۔ جب وہ لکھ رہا تھا تو اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کے آس پاس ہر چیز نے ایک عجیب پُراسرار صورت اختیار کر لی ہے۔ یہاں تک کہ میز کی سطح پر پانی کا ایک حقیر سا قطرہ بھی اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر رہا تھا اور آفتاب کی آتشیں کرنوں میں ایک ننھی سی چنگاری کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔
وہ کئی دن تک اس افسانے کو لکھتا رہا۔ ایک شام اُس کے موسیقی پرست دوست نے دیکھا کہ سیرافینو صفحے کے اختتام پر اپنا نام ثبت کر رہا ہے۔ اُس نے کہا کیا میں اسے پڑھ سکتا ہوں؟
سیرافینو نے پہلے تو انکار کیا، مگر کسی قدر اصرار کے بعد آخر اُس نے مسودہ اپنے دوست کے حوالے کر دیا۔ افسانہ ایک ڈائری کی شکل میں لکھا گیا تھا۔ ایک سپاہی کی تحویل میں کچھ قیدی ہیں جن میں سے ایک اُس سڑک کی تعمیر کے کام پر متعین ہے جو سمندر کے ساحل سے قید خانے کی طرف جاتی ہے۔ اس طرح اُسے

سپاہی کو اپنی مصیبت اور دنیا کی بے انصافی کا ایک طویل افسانہ سنانے کا موقع مل جاتا ہے۔ سپاہی اس کی باتیں سن سن کر روز بروز رحم کے جذبے سے مغلوب ہوتا جاتا ہے۔ قیدی اس سے کہتا ہے کہ مجھے یہاں سے بھاگ جانے میں مدد دو۔ سپاہی کو اگرچہ ادائے فرض کا بہت زیادہ احساس ہے لیکن پھر بھی اس کی ترغیب میں آجاتا ہے، اور ایک رات جب کہ وہ پہرے پر ہوتا ہے وہ قیدی کو بھاگتے ہوئے دیکھتا ہے لیکن خاموش رہتا ہے۔ اس کے بعد سپاہی خودکشی کر لیتا ہے۔

اُس کے دوست کو افسانہ اتنا موثر اور رقت انگیز معلوم ہوا کہ اُس نے کہا "بالکل ایک سچی ناول معلوم ہوتا ہے۔"

سیرافینو نے ذرا طیش آمیز لہجے میں پوچھا "مگر یہ کیوں نہیں معلوم ہوتا؟ تم یہ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے کہ یہ واقعہ مجھ پر گزرا ہے؟"

"اس لئے کہ تم ابھی زندہ ہو!"

"مگر پھر بھی یہ مجھی پر گزرا ہے ـــــ خواب میں!"

"خواب میں؟"

"ہاں خواب میں، یا ہماری زندگی کے اُس حصے میں جسے ہم خواب کہتے ہیں، اور جسے اگر ایک دوسری نظر سے دیکھا جائے تو شاید وہی حقیقت ہو۔ کیونکہ ہمیں تو ابھی علم ہی نہیں حقیقت ہے کیا چیز۔"

سیرافینو نے طنزیہ انداز میں کہا "حقیقت تو یہ ہے کہ تمہاری باتیں سُن سُن کر میں اپنی بیداری کو خواب سمجھنے لگا ہوں۔"

اس کے بعد حسب معمول ایک طویل بحث کا سلسلہ چھڑ گیا۔ آخر اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ اس افسانے کو میلان کے ایک رسالے میں بھیج دیا جائے۔ ایک عرصے تک وہ انتظار کرتے رہے لیکن رسالے کے دفتر سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔

× × × × × × ×

سیرافینو کا مکان دو کمروں پر مشتمل تھا جن پر ایک عارضی چھت ڈالی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دیواریں تعمیر ہوتے ہی اس کی تعمیر روک دی گئی تھی اور اب تک کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہنے سے یہ بالکل ویرانہ بن گیا تھا۔ پتھر کا ایک زینہ جو مکڑیوں اور چھپکلیوں کا گھر بنا ہوا تھا اوپر جاتا تھا، اور بعض اوقات سیرافینو بھی اُنہیں حشرات الارض کی طرح کوٹھے پر چڑھتا تھا اور اِدھر اُدھر گھومتا تھا۔ کھڑکیوں کے موکھوں میں کھڑے ہو کر وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ کیا زندگی اُس کے لئے بھی اسی بے چھت اور بے در مکان کی طرح نہیں ہے جس کی دیواریں بغیر کسی مصرف کے کہنہ و فرسودہ ہو گئی ہیں؟

مکان کے پیچھے پہاڑی جنگل تھا اور بہار کی راتوں میں جنگلی پھولوں کی خوشبو اُس کے کمروں کو مہکا دیا کرتی تھی۔ ایک چھوٹا سا غیر آباد باغیچہ اس کے مکان اور سکول کے درمیان حائل تھا۔ لیکن خزاں کے دنوں میں جنگل کے اس گوشے سے زیادہ ویران اور زیادہ اداس اور کوئی جگہ نہ ہوتی تھی۔

خزاں کے ایک دن کا ذکر ہے: فضا بے نور اور مرطوب تھی، ہر چیز پر دھند اور اداسی چھائی ہوئی تھی ـــــ لیکن ایسے دنوں میں ایک یہ خصوصیت ضرور ہوتی ہے کہ اُن کو ہمارے جذبات کے ساتھ ایک پر اسرار ہمدردی کا علاقہ معلوم ہوتا ہے، اور جنگل کا

کی ایک ٹہنی کی خوشبو تک ان دنوں میں ایام گزشتہ کی یاد کو تازہ کر دیا کرتی ہے۔ ایسے ہی ایک دن کا ذکر ہے کہ سیرافینو کو ایک خط موصول ہوا جس پر ولندیزی ڈاک خانے کی مُہر لگی ہوئی تھی۔ وہ بہت دیر تک اس نیلے لفافے کی طرف دیکھتا رہا جس پر گول گول حروف میں اس کا نام لکھا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کب اور کہاں اُس نے اس دستخط کو پہلے دیکھا ہے۔ مگر وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ بچپن کے زمانے میں جب اُس نے پہلی دفعہ ایک کہانی لکھی تھی تو اُسے ایک مشہور مصنف بننے کی اُمید تھی اور دور دور کے ملکوں سے ہر روز اسی قسم کے خطوط موصول ہونے کی توقع تھی۔ اُس نے بیتاب ہو کر ایک ہی جھٹکے میں لفافے کو کھول دیا۔

× × × × × ×

جنابِ من،

میلان ریویو میں آپ کا دلکش اور لطیف افسانہ "رحم" میں نے پڑھا ہے، اور میں چاہتی ہوں کہ اگر آپ کسی اور کو اس کے ترجمے کی اجازت نہیں دے چکے تو میں اس کا ترجمہ جرمن اور ولندیزی زبان میں کر دوں۔ جرمن ترجمے کے متعلق مجھے تقریباً یقین ہے کہ رسالہ "افکار" میں چھپ جائے گا۔ جو اس وقت وائنا کا سب سے موقر اور مشہور پرچہ ہے۔ میں جرمن ہوں، لیکن میری ماں کے والدین ولندیزی تھے، اور مجھے یہ زبان بھی پوری طرح آتی ہے، کیونکہ میں زیادہ تر ہالینڈ ہی میں رہتی ہوں۔ میں بہت دفعہ اٹلی گئی ہوں اور فلورنس میں حسنِ اتفاق سے مجھے پروفیسر گوٹینی کے گھر میں رہنے کا موقع ملا ہے، اس لئے مجھے اطالوی زبان سے کافی واقفیت ہے اور آپ کو اطمینان رکھنا چاہیئے کہ میں صحیح ترجمہ کروں گی۔ نیپلز کی چند روزہ اقامت کے دوران میں میں نے نسیدا کا جزیرہ بھی دیکھا ہے جس کے باعث مجھے آپ کے افسانہ سے دوگونہ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ترجمے کی اشاعت کی شرائط آسانی سے طے ہو سکتی ہیں کیونکہ میں "افکار" کے ایڈیٹر کو لکھ دوں گی کہ وہ تمام معاوضہ براہِ راست آپ کی طرف بھیج دیں۔

اس کے علاوہ مجھے مسرت ہو گی اگر آپ مطلع فرمائیں کہ آپ نے اور کون کون سے ناول لکھے ہیں، اور میں ممنون ہوں گی اگر آپ اپنی زندگی کے کچھ حالات مجھے بھیجیں گے کیونکہ میں انہیں ترجمے کے ساتھ شامل کرنا چاہتی ہوں۔

اُمید ہے کہ آپ جوابِ باثواب سے جلد سرفراز فرمائیں گے اور میرا دلی شکریہ قبول فرمائیں گے۔

الزبتھ کرکر

× × × × × ×

سیرافینو نے ہمیشہ یہی سمجھا تھا کہ خوشحالی اور دولت امن و مسرت کا پیغام لے کر آئے گی، لیکن یہ کیا بات تھی کہ الزبتھ کرکر کے خط سے اُس پر ایک خوف کا سا احساس طاری ہو رہا تھا؟ بلکہ پہلے پہل تو وہ اپنے آپ میں اسے دوسری مرتبہ پڑھنے کی جرأت بھی نہ پاتا تھا۔ کیا یہ کوئی خواب تھا؟ اُس نے بیداری کا یقین کرنے کے لئے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی پھر ایک سوئی لے کر اپنے ہاتھ میں چبھو لی۔ آخر اُس نے خط کو ایک دفعہ اور پڑھا اور پھر اس طرح چھپا لیا جیسے وہ خائف تھا کہ کوئی اُسے چرا نہ لے۔

اپنی کامیابی کا پہلا احساس اُسے اس صورت میں ہوا کہ اُسے یقین ہونے لگا کہ لوگ اُس کی مسرت کو زہر آلود کرنے کی کوشش

کریں گے۔ لیکن اس کے برعکس اُس نے دیکھا کہ پہلے کی بہ نسبت اب اُس سے زیادہ نیک سلوک کیا جاتا ہے۔ اور اُس کے دل میں بھی حاسدوں کے لئے، اُن کے لئے جو اس واسطے حسد کرتے ہیں کہ وہ ناخوش ہیں رحم و رافت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد اُسے خوشی محسوس ہونے لگی ــــ اتنی خوشی کہ اُسے ڈر آنے لگا۔

اُس نے کھڑکیاں کھول دیں اور اپنی میز پر بیٹھ گیا۔ ہر چیز پر دھند اور سکوت چھایا ہوا تھا، لیکن اس کے لئے ایک روشن افق کا ظہور عمل میں آچکا تھا۔

× × × × × ×

محترم خاتون،

مجھے آپ کی تجویز شکریے کے ساتھ منظور ہے۔ کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ آپ نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے!
میں کوئی مصنف نہیں ہوں، لیکن چونکہ آپ میرے متعلق کچھ معلومات بہم پہنچانا چاہتی ہیں اس لئے میں یہ سطور لکھنے پر مجبور ہوا ہوں۔ میں ایک معمولی اُستاد ہوں جسے ایک وحشی اور ویران ملک میں جلاوطن کر دیا گیا ہے، میں تنہا ہوں، اس قدر تنہا کہ ایک دوستانہ آواز خواہ وُہ کتنی دور سے آئے، مجھ میں نئی روح اور نئی اُمید پھونکنے کو کافی ہوتی ہے۔ آپ کا خط، خاتون صاحبہ، مجھے عجب یاسی کی حالت میں موصول ہوا۔ اُس وقت موت کے خیال میں اس قدر شیرینی تھی کہ مجھے اُس میں آغوش مادری کا سا لطف آرہا تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میرا افسانہ چھپ چکا ہے، میں نے اسے اپنی زندگی کی مغموم ترین گھڑیوں میں لکھا تھا اور یہ دلچسپ اس لئے ہے کہ میں نے اسے محسوس کیا تھا۔ اپنے ہیرو کی جگہ اگر میں خود ہوتا تو میں بھی وہی کرتا جو اُس نے کیا۔ میں ایک اور بات بھی آپ کو بتا دوں۔ یہ ساری کہانی میرا خواب ہے۔
اس خواب سے میں بے حد متاثر ہوا۔ بڑی مدت تک مجھے یہ یقین رہا کہ میں نے قیدی کو التجائیں کرتے ہوئے حقیقت میں دیکھا ہے۔ پھر وہ منظر بھی اب تک میرے سامنے ہے جب اُس نے مجھے دعا دی تھی۔ اُس دن کے بعد جب کبھی میں ناخوش ہوا ہوں یا مجھے انسانی ہمدردی اور محبت کی آرزو محسوس ہوئی ہے تو اُس قیدی کی پیشین گوئی کے الفاظ قسمت کی طعنہ زنی کی طرح کسی قدر تلخی کے ساتھ میرے حافظے میں تازہ ہو گئے ہیں۔ لیکن آج مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اپنے ایک بھائی کے لئے میرا جذبۂ رحم رائگاں نہیں گیا۔
انسان پر ہر قسم کا زمانہ آتا ہے اور میرے لئے بھی خوشی کا زمانہ آگیا ہے۔ آج میری زندگی کی ابتدا ہوئی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک طویل خواب سے بیدار ہوا ہوں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک پُراسرار قوت میرے اندر پیدا ہو رہی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ میں تنہا ہوں ساری عمر کے لئے جلاوطن ہو گیا ہوں، لیکن اب مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ میری روح کی آواز دور دور تک پہنچ سکتی ہے اور پہنچ چکی ہے بلکہ ہم جنس روحوں کی طرف سے میرے پیغام کا جواب بھی لا چکی ہے۔ اور میرے دل میں زندگی کی محبت پیدا کرنے میں جتنا اس خیال نے کام کیا ہے میری حقیر تصنیف کی شہرت نے نہیں کیا۔
آپ کی اس عنایت کے لئے جو آپ نے مجھ پر کی ہے میں ایک دفعہ اور شکریہ ادا کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ مجھے ہمیشہ اپنا بندۂ ممنون خیال فرمائیں گی۔

سیر افیم نوراسی

× × × × × × ×

جنابِ محترم

آپ کا خط ملا۔ میں آپ کے اعتماد کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ یقیناً آپ ایک شریف الطبع انسان ہیں اور مجھے آپ سے متعارف ہونے کی بے حد خوشی ہے۔ اُمید ہے کہ مجھے یوں ہی آپ کے پُرخلوص خطوط موصول ہوتے رہیں گے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نوجوان ہیں۔ میری عمر اس حد سے کچھ متجاوز ہے، اور اس لئے میں صرف آپ کی مترجم بننا چاہتی ہوں بلکہ آپ کی دور اُفتادہ دوست ہونے کی خواہش بھی رکھتی ہوں۔ دور افتادگی بھی کوئی نہیں، فاصلے کی آج کل حقیقت ہی کیا ہے۔ ابھی اگلے ہی دن میں نے ایک اخبار میں پڑھا ہے کہ بہت سی عورتیں سیاحت کے لئے یورپ سے امریکہ جا رہی ہیں۔

آپ کے خط کو میں نے آپ کے افسانے سے بھی زیادہ دلچسپی سے پڑھا ہے۔ یہ کسی رومان کا ایک باب معلوم ہوتا ہے، لیکن وہ کون ہے جس کی کتابِ زندگی میں رومان کا کم از کم ایک باب، کم و بیش خوبصورت، کم و بیش خوفناک باب موجود نہ ہوتا ہو۔

آپ کے افسانے "رحم" میں حقیقت کی ایک ایسی تصویر پیش کی گئی ہے جس کا احساس مجھے ایک خاص وجہ سے ہؤا۔

ہمارے گھرانے کا ایک قدیم دوست جو مجھے اپنے باپ کی طرح عزیز تھا، چند سال ہوئے اپنی دوسری بیوی کو اُس کی بیوفائی پر قتل کر دینے کے الزام میں ماخوذ ہو گیا تھا۔ اُس نے قید خانے سے بھاگ جانے کی کوشش کی، لیکن ایک پہرے دار نے اُسے مار دیا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے افسانے نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا۔ اسی لئے بلکہ اس لئے بھی کہ آپ کا اندازِ نہایت سادہ اور بلیغ ہے میں آپ کو مشورہ دینے کی اجازت چاہتی ہوں کہ آپ لکھنے کی مشق جاری رکھیں۔

میں نے چند ناول لکھے ہیں، اور اطالوی شاعری اور افسانوں کا کچھ ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ جن دنوں میں لینڈ میں مقیم ہوتی ہوں میں تقریباً تیس یتیم بچوں کا ایک سکول چلاتی ہوں۔ اس سے آپ کو معلوم ہو گا کہ ہماری زندگیوں میں ایک مشابہت پائی جاتی ہے لیکن مجھے زندگی پر آپ سے زیادہ اعتماد ہے، اور اس لئے مجھے یہ کہنے کی جرأت ہوئی ہے کہ مایوس ہو جانے میں آپ غلطی پر ہیں۔ غربت دراصل بڑی دولت ہے۔ امیر آدمی کی بہ نسبت غریب آدمی کے لئے زندگی کو بے فائدہ کھونے کا کم احتمال ہے، اور ایک حقیقی اخلاقی زندگی بسر کرنے کا زیادہ امکان ہے اور اگر اور کچھ بھی نہ ہو تو اتنا تو ضرور ہے کہ غریب آدمی کی زندگی ۔۔ مادی حیثیت سے بھی ۔۔ اُس کی اپنی ذات کی رہینِ منت ہے۔ ہاں ہاں یقین مانئے غربت ادنیٰ ترین انسانی مصائب میں سے ہے۔

اگر میں اپنے مفہوم کو اچھی طرح ادا نہ کر سکوں تو مجھے معاف فرمائیے گا۔ کاش مجھے اپنے خیالات کو، اُن خیالات کو جو میرے دماغ میں میری پر الم زندگی نے پیدا کر دئے ہیں اچھے پیرائے میں ادا کرنے کے لئے آپ کی سی خوبصورت زبان لکھنے کا راز معلوم ہوتا۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ہماری دوستی قائم رہے گی اور اس طرح ہمیں ایک دوسرے کو بہتر طریق پر جاننے کے موقعے ملتے رہیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

سیرافینو کا خیال تھا کہ خط کے بقیہ حصے میں کچھ ایسی باتیں لکھی تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ الزبتھ کر کر بہت زیادہ خلوص والی عورت نہیں ہے۔ مگر اُس نے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ شاید شوق کے خیال سے یا شاید طوعاً و کرہاً وہ اپنے گھر والے

باغیچے، اپنی بیماری، اپنے سکول، اپنے شاگردوں کی لفظی تصویریں بنا بنا کر الزبتھ کو بھیجتا رہا اور اس طرح اُس نے اپنی اداس زندگی کا پورا پورا خاکا کھینچ کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔

× × × × × ×

اسی طرح ایک سال اور چھ مہینے گزر گئے۔ دو دفعہ سرد اور مرطوب خزاں آئی ایک دفعہ پھولوں بھری بہار، ایک دفعہ تپتی ہوئی گرمی اور دو دفعہ بہار جیسا خوشگوار اور نکھرا ہوا جاڑا۔

سیرافینو کو اُن موسموں کے سرد و گرم کی کوئی بات یاد نہ رہی جن کو اُس نے گویا آنکھیں بند کر کے گزارا تھا، لیکن موجودہ موسم بہار کی گرمی اور گزشتہ دو جاڑوں کا لطف اُسے کبھی بھول نہ سکا۔

اُس کی مصنفیت نے اُس کے ساتھ دشمنی کی۔ سارا علاقہ اب اُس کی صرف اس وجہ سے عزت کرتا تھا کہ "افکار" کے کارپردازوں نے اُس کی طرف رسالے کی دس کاپیاں اور ستر فلورن ایک رجسٹرڈ خط میں ملفوف کر کے بھیجے تھے۔ سیرافینو ہرگز یہ نہ چاہتا تھا کہ اُس کی شہرت وہاں بھی پہنچ جائے جہاں وہ ایک معمولی استاد کی حیثیت سے بچوں کو پڑھاتا تھا، لیکن اس کی عظمت اور دولت کا راز ڈاک خانے والوں نے افشا کر دیا۔

× × × × × ×

موسم سرما کی سرد مہری کا اب اُسے کوئی شکوہ نہ تھا۔ اُس کے آس پاس ہر چیز حسین اور دلکش تھی۔ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی اُس سے محبت کرتا ہے اور اُسے بھی کسی سے محبت ہے! یہ سچ تھا کہ الزبتھ نے کبھی اُس کی طرف یہ نہ لکھا کہ اُسے اُس سے محبت ہے نہ خود اُس نے اُس کی طرف یہ لکھا تھا، لیکن بعض باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی تشریح کی ضرورت نہیں ہوتی — وہ صرف سمجھ لی جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ سیرافینو اُسی قسم کی محبت کر رہا تھا جیسی وہ ایک زمانے میں کرنی چاہتا تھا، بغیر سوچے سمجھے، بغیر کسی توقع کے، صرف محبت کرنے کی خاطر۔ الزبتھ بڑی امیر تھی، اور مغرور بھی تھی، لیکن اس علاقے کی لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی۔ ایک بار اس نے سیرافینو کو لکھا:

"میں خوش ہوں کہ میرے اور اُس شخص کے درمیان جو کسی دن مجھ سے اظہارِ محبت کرنے والا ہے ایک بڑی مشکل حائل ہے۔ یہ مشکل اُن اخلاقی مشکلات میں سے ہے جن پر ہر کوئی غلبہ نہیں پا سکتا . . . ."

سیرافینو نے یہ نہ پوچھا کہ اس مشکل کی نوعیت کیا ہے۔ کیا الزبتھ کی گذشتہ زندگی پر یہ کوئی داغ تھا۔ سیرافینو کو اس کی کچھ پروا نہ تھی۔ اُسے یقین تھا کہ وہ کبھی الزبتھ تک نہ پہنچ سکے گا نہ اُس کی محبت کی جستجو کرے گا۔ لیکن چونکہ اب اُس کا خوابِ محبت ایک حقیقی شکل اختیار کر چکا تھا اس لئے موت کا خیال اُس کے دل میں باقی نہ رہا تھا۔

× × × × × × ×

اتنے میں بہار کا دوسرا موسم بھی آن پہنچا۔ سیرافینو کے تنہا مکان کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں چھوٹے چھوٹے پیلے پیلے پھولوں سے

بھر گئیں اور پہاڑ سے بھی جنگلی پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو آنے لگی۔

بہار کی چھٹیوں میں سیرافینو نیپلز چلا گیا۔ اُس سے ایک دن پہلے الزبتھ بھی وہاں پہنچ چکی تھی اور ہوٹل میں اس کی منتظر تھی۔

سیرافینو کی طبیعت میں کامل سکون تھا اور اُس نے پختہ ارادہ کر رکھا تھا کہ دولت مند الزبتھ سے ملتے وقت وہ اپنی غریبانہ تمکنت کو ہاتھ سے نہ جانے دیگا، لیکن جونہی کہ وہ ریلوے چوک کے قریب پہنچا اپنے تمام ارادوں کے باوجود اس کے دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کر دیا۔

چوک میں بڑی رونق تھی اور لوگوں کے رنگ برنگ لباسوں نے ایک عجیب کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ ہوا خوشگوار تھی اور آسمان پر جا بجا سفید براق اور روشن بادلوں کے ٹکڑے نہایت تیزی سے رواں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ جلد سے جلد کسی انجمن میں پہنچنا چاہتے ہیں۔

× × × × × × ×

اس کے دو گھنٹے بعد سیرافینو اور الزبتھ کر کر دونوں سگینولی کے ساحل پر کھڑے تھے۔ نسیڈا کا جزیرہ اُن کی نظروں کے سامنے تھا۔ الزبتھ اطالوی عورتوں ہی کی طرح خوبصورت تھی۔ سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں، چاند سا چہرہ، گلابی ہونٹ اور موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے دانت۔ جو بات سیرافینو کو پسند نہ آئی وہ اُس کے ہونٹوں کا وہ خم تھا جو کوئی مشکل اطالوی لفظ بولتے وقت پیدا ہو جاتا تھا۔

لیکن یکایک اُس نے جرمن زبان بولنی شروع کر دی۔ پھر اُس نے سمندر کے اُس روشن ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس کے ساتھ نیلی نیلی لہریں آہستہ آہستہ ٹکرا رہی تھیں "سنو اس منظر کو دیکھ کر ایک مصنفہ کی وہ حیرت انگیز سطور میری نظروں کے سامنے آگئی ہیں جو اُس نے اپنے ایک خواب کے متعلق اپنے محبوب کے نام لکھی تھیں اور جو کبھی اُس تک نہ پہنچ سکیں"۔ اور پھر جرمن زبان میں اُس نے وہ "حیرت انگیز سطور" دہرانی شروع کیں۔

"میں نے ایک صاف شفاف سمندر دیکھا جس کے اوپر آسمان نے اپنی انتہائی بلندی سے سایہ کر رکھا تھا۔ دو شخص ساحل کے قریب ہی بیٹھے تھے، اور اُن پر نوجوانی کا ایک سحر سا چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا . . . ."

سیرافینو جرمن زبان نہ جانتا تھا اس لئے کچھ نہ سمجھ سکا، لیکن جب وہ بول رہی تھی تو اُس کے ہونٹ اس قدر خوبصورت معلوم ہوتے تھے کہ وہ اُس کی طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے کوئی پیاسا آدمی رس بھرے پھل کی طرف دیکھتا ہے۔

بہت جلد الزبتھ کی نگاہیں اس کی نگاہوں کا جواب دینے لگیں۔ سیرافینو نے اپنی آنکھیں پھیر لیں۔ اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ محبت کے دھوکے میں گرفتار نہ ہوگا بلکہ اپنی غریبانہ تمکنت کو قائم رکھے گا۔ لیکن اُس نے معصومانہ انداز میں کہا:

"کیا آپ اطالوی زبان میں ان الفاظ کا ترجمہ کریں گی؟"

الزبتھ نے ترجمہ کر دیا۔

× × × × × × ×

اُسی لمحے سے سیرافینو نے اپنی غریبانہ تمکنت کھونی شروع کی۔ الزبتھ نہ صرف اُس سے محبت کر رہی تھی بلکہ سیرافینو

کو محبت کرنے کی دعوت بھی دے رہی تھی۔ سیرفینو بھی اتنا بے پروا نہیں تھا کہ اس موقع سے فائدہ نہ اُٹھاتا۔ صرف اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ ابتدا کیونکر کرنی چاہیئے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ وہمی بھی تھا۔

الزبتھ کون تھی؟ وہ کہاں سے آئی تھی؟ کیا وہ رشتۂ ازدواج سے آزاد تھی؟ کیا وہ نیک چلن تھی؟ وہ کیا مشکل تھی جس کا اُس نے ایک دفعہ حوالہ دیا تھا؟

تمام دن وہ بیگنولی کی سیر کرتے رہے۔ کھانا بھی اُنہوں نے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں اکٹھے کھایا۔ اس کے بعد وہ نسیڈا کی طرف روانہ ہوگئے۔ بہار کی ہلکی ہلکی نسیم چل رہی تھی۔ سمندر کی ہلکی ہلکی لہریں نیلے اور سنہری پھولوں کے بڑے بڑے ہاروں کی طرح نظر آرہی تھیں۔ سبز پہاڑیاں اور نیلے جزیروں کے اوپر سنہری بادلوں کی ایک کورنگی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن الزبتھ جس کا خوبصورت عکس سمندر کے آئینے میں پڑ رہا تھا مغموم تھی اور اُس کے خیالات کہیں دور پہنچ چکے تھے۔ شاید وہ سیرافینو کی موجودگی کو بھی محسوس کر رہی تھی۔

نسیڈا قریب آگیا۔ آہستہ آہستہ ایک اُڑتے ہوئے ستارے سے اُس کی مشابہت جاتی رہی۔ رنگین مکانات، نیلی نیلی چٹانیں، زندہ موت کا سفید مسکن لمحہ بہ لمحہ قریب آرہے تھے۔

جب کشتی جزیرے کے ساحل سے آلگی تو الزبتھ نے نظر اُٹھا کر پہاڑ کی طرف دیکھا۔ اُس کے بعد کنارے پر جانے کے لئے سیرافینو کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی تقریباً ہر رومان میں ایک باب ایسا ہوتا ہے کہ دو والہان الفت کسی پرانے قلعے میں یا کسی عجائب خانے میں یا کسی پرانی معبد میں جاتے ہیں یا مصنف کو اس طرح اپنی حسن کاری کی نمائش کا موقع ملتا ہے اور محبت کرنے والوں کو اپنے جذبات کے اظہار کا لیکن میں نہیں سمجھتی کہ کوئی دوجونی ہماری طرح کسی عجائب خانے میں بھی گئے ہوں۔

سیرافینو نے بیدم ہوکر کہا "یہ سچ ہے"!

اُس کی آواز میں ایک لرزش تھی، اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ الزبتھ کیا کہنے لگی تھی؟ کیا اظہار مدعا کا وقت آگیا تھا؟ اب وہ اُس سڑک پر آگئے تھے جو دونوں طرف سے دو دیواروں سے گھری ہوئی تھی اور تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر آہنی دروازوں سے منقطع ہو جاتی تھی۔

اب صرف اتنی ضرورت تھی کہ سیرافینو ایک ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنی آغوش میں لے لے ــــ اور یہی اب اُس کی انتہائی آرزو تھی، مگر اُس کو اس کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے الزبتھ مذاق کر رہی تھی ــــ ہاں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ حقیقت میں اُس سے محبت کرتی ہو۔

یکایک سڑک مڑ گئی اور آگے ایک چٹانی ڈھلوان آگئی جس کے نیچے سمندر آہستہ آہستہ آہیں بھر رہا تھا۔

الزبتھ ٹھہر گئی اور پُرخیال آنکھوں سے نیچے کی طرف دیکھنے لگی، پھر اُس نے کہا کیا وہ اس قسم کا کوئی مقام تھا؟"

سیرافینو نے کہا "ہاں"

اُسے کچھ سمجھ نہ آئی کہ کس طرح اُس کی تمام گزشتہ زندگی اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گذر گئی۔ اور پھر؟

اب وہ محبت کر رہا تھا، بلکہ شاید محبوب تھا ــــ ایک خوبصورت اور ذہین لڑکی کے پہلو بہ پہلو کھڑا تھا جو سمندر کی لہروں کی

طرح، سفید سفید بادلوں کی طرح، اور چہچہانے والے پرندوں کی طرح دور، دور سے آئی تھی، اور جو شاید اپنا تمام حسن اور اپنی تمام دولت اُس کے ایک لفظ پر نثار کر دینے کو تیار تھی۔

سیرافینو نے یکایک بے اختیار ہو کر اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

الزبتھ نے اپنا سر پُر غرور انداز میں اوپر اُٹھایا۔ سیرافینو اُس کی طرف دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ رو رہی تھی۔

سیرافینو نے کہا "ہائے تم کیوں رو رہی ہو؟ مجھے معاف کر دو۔ میں دیوانہ ہو گیا ہوں۔ لیکن صرف ایک لفظ میں مجھے اتنا بتا دو کہ تمہیں میری کچھ پروا ہے کہ نہیں ـــــ پھر اگر تم چاہو تو میں اپنی صورت تمہیں کبھی نہیں دکھاؤں گا ـــــ کبھی نہیں ـــــ کبھی نہیں"۔ غم کے وفور میں ایک بچے کی طرح اُس نے ان الفاظ کو دہرایا۔

الزبتھ نے ایک دفعہ پھر اپنے گال کو اُس کے گال سے لگا کر کہا "یہ بات نہیں۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ میں ایک اور وجہ سے رو رہی ہوں۔ لیکن وہ میں تمہیں ابھی بتا دینا چاہتی ہوں ورنہ پھر کبھی نہ بتا سکوں گی۔ تمہیں معلوم ہے، وہ بوڑھا آدمی جس نے اِس دنیاوی جہنم سے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور ایک پہرہ دار کے ہاتھوں مارا گیا تھا میرا باپ تھا ـــــ"

"الزبتھ ـــــ الزبتھ"۔

سیرافینو کے چہرے پر موت کی سی زردی چھا رہی تھی۔ اُس کا نچلا ہونٹ خم کھا کر اکڑ گیا تھا۔ اُس کے منہ سے اس کے سوا اور ایک لفظ بھی نہ نکلتا تھا۔

الزبتھ نے کہا "یہی وجہ تھی کہ تمہاری دور افتادہ روح کی آواز نے میرے دل پر اثر کیا۔ اگر میرے باپ نے تم سے رحم کی التجا کی ہوتی تو تم ضرور اُس پر رحم کرتے ـــــ اب تم مجھ پر رحم کرو"۔

لیکن نہیں، دراصل سیرافینو کو اُس کے رحم کی ضرورت تھی۔ وہ اُس کے پاس کھڑا اس خوف سے کانپ رہا تھا کہ الزبتھ کہیں اس کو چھوڑ نہ دے۔ وہ مسکرا پڑی ـــ آنسوؤں سے اُس کی آنکھیں ابھی تر تھیں، اُس نے اپنے سر کو جھکا دیا تاکہ اُس کے ہونٹ سیرافینو کے ہونٹوں سے جا ملیں۔

(گزیزیا ڈیلڈا) منصور احمد

اس قصرِ الم میں کون لایا مجھکو؟ کیوں نغمۂ بیش و کم سنایا مجھکو؟

شیرینی میں کیوں یہاں چھپی ہے تلخی؟ کیوں زہر بھرا شہد کھلایا مجھکو؟

ب

راحت کدہ

ہے عجیب حیرت افزا یہ طلسمِ زندگانی کبھی شامِ نامرادی کبھی صبحِ کامرانی
کبھی نالہ ہائے فرقت کبھی نغمہ ہائے اُلفت کبھی سوزِ نوحہ خوانی کبھی سازِ شادمانی
کبھی چشمِ خونچکاں ہے کبھی دل طرب نشاں ہے کبھی خونِ دل کی مے ہے کبھی جامِ ارغوانی
کبھی جوشِ مے پرستی ہیں نشاطِ رقصِ مستی کبھی مثلِ نیشتر ہے خلشِ غمِ نہانی

وہ مرا شبابِ رنگیں وہ شرابِ کیف آگیں وہ سیاہ مستیوں کی طرب آفریں کہانی
یہ نظارۂ جہاں تھا کہ جمالِ گلفشاں تھا یہ مرا ریاضِ دل تھا کہ بہشتِ شادمانی
مگر آہ! آج کیا ہے اثر اک بجھا ہوا ہے یہی ایک داغ باقی ہے شباب کی نشانی
نہ وہ ساغر و سبو ہے نہ خروشِ ہاؤ ہو ہے نہ دماغِ آرزو ہے نہ ہوائے زندگانی

یہ مگر فسوں گری ہے یہ فریبِ زندگی ہے نہ خوشی نہ بیدلی ہے نہ الم نہ شادمانی
نہ تو عیش کو بقا ہے نہ الم ہی لا فنا ہے مری زندگی ہی کیا ہے! فقط اک حبابِ فانی

~~~

مرے قلبِ ناتواں نے بہت انقلاب دیکھے کبھی پستیوں کی ذلت کبھی اوجِ آسمانی
کبھی تھی صنم پرستی، کبھی میکدے کی مستی کبھی تھا طوافِ کعبہ کبھی شغلِ سبحہ خوانی
مگر اب عدم نشاں ہیں وہ مناظر اب کہاں ہیں تھے تمام نقشِ باطل تھے تمام نقشِ فانی

~~~

مری جانِ دل کی راحت! مری روح کی مسرت تری شمعِ عشق کی ہے مرے دل میں ضو فشانی
مرے عشق کا ترانہ ترے حسن کا فسانہ مرے سازِ دل میں رقصاں ہے سرودِ غیر فانی
مرا دل گدازِ الفت مری روح سازِ الفت مرا سوز مستقل ہے مرا سازِ جاودانی

اثر صہبائی

~~~
~~~

آزاد نگارستان اور دادا جان

دادا جان کے پارلیمان میں جانے کی کیفیت تو آپ دیکھ چکے۔ اب یہ دیکھئے کہ انہوں نے پارلیمان میں جاکر کیا کارہائے نمایاں کئے اور وہاں کے ممبروں سے ان کی کیسی گزری +

جب مسٹر اسپیکر کو معلوم ہوا کہ دادا جان امن آباد کے رکن پارلیمان ہیں تو انہوں نے منتظم پارلیمان کو حکم دیا کہ ان نئے رکن کو حلف دیا جائے۔ منتظم صاحب اٹھے۔ یہ بہت بھاری بھرکم آدمی تھے۔ ڈاڑھی مونچھیں بالکل صاف تھیں۔ خالص انگریزی لباس پہنے ہوئے تھے اور اپنی ہر حرکت سے ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ میں بھی کوئی چیز ہوں اور پارلیمان کا انتظام بس میرے ہی دم قدم سے قائم ہے + بہت متانت سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے یہ مسٹر اسپیکر کی میز کے قریب آئے۔ اتنے میں گورنمنٹ کی موافق اور مخالف پارٹیوں کے ایک ایک ممبر بھی اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر دادا جان کے دونوں طرف کھڑے ہوگئے تاکہ حسب قاعدہ ان کا تعارف کرائیں لیکن دونوں میں سے کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ حضرت کس پارٹی میں شریک ہیں، اس لئے ایک نے دادا جان کی دائیں بانہہ پکڑی اور دوسرے نے بائیں۔ یہ سمجھے کہ ابھی جو گڑبڑ ہوئی تھی اس کی جواب دہی کے لئے مجھے گرفتار کیا جاتا ہے۔ جو صاحب ان کی دائیں طرف تھے ان کو تو انہوں نے ایسا دھکا دیا کہ وہ ریلوے کے ممبر پر جا پڑے اور دوسرے کو گھسیٹتے ہوئے دروازہ کی طرف بھاگے۔ ایک غل مچ گیا۔ پولیس والا جو دروازہ کے ایک بازو سے لگا کھڑا تھا یہ شور و غل سن کر دروازہ میں آکھڑا ہوا۔ دادا جان سمجھے کہ اب اس دروازہ سے نکلنا مشکل ہے وہ دروازہ چھوڑ دوسرے دروازے کا رخ کیا۔ جو ممبر صاحب ان کی بائیں بانہہ پکڑے ہوئے تھے وہ ایسی رخ بدلنے کی وجہ سے اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے اور منتظم پارلیمان کے اوپر جا پڑے۔ مسٹر اسپیکر نے "آرڈر آرڈر" کے نعرے مارے۔ دو چار ممبروں نے دادا جان کو سنبھالا۔ دو ایک نے منتظم صاحب کو اٹھایا۔ دادا جان ہانپتے ہوئے مسٹر اسپیکر کی میز کے پاس لائے گئے اور کہنے لگے کہ "اگر پہلے سے معلوم ہوتا کہ یہاں یہ فساد ہونے والا ہے تو میں اپنا لٹھ ساتھ لاتا۔ قسم خدا کی دس بارہ کے سر پھوڑے بغیر کبھی گرفتار نہ ہوتا۔ جہنم جاتے کہاں ہو۔ ایسی کی وہ خبر لوں گا کہ تمام عمر یاد رکھو گے۔ مذاق سمجھ لیا ہے" مسٹر اسپیکر نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ معزز رکن کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ ان کو گرفتار کرنا مقصود نہ تھا بلکہ قاعدہ کی رو سے اس پارلیمان کے دو رکن حلف کے لئے ان کو پیش کرنا چاہتے تھے۔ مجھے امید ہے کہ معزز رکن امن آباد اپنی اس زیادتی کے متعلق ان دونوں اراکین سے معافی چاہیں گے"۔

دادا جان۔ سچ ہے صاحب۔ میری غلطی ضرور ہے۔ مگر کیا ان دونوں بیوقوفوں کی بھی غلطی نہیں ہے۔ پہلے ہی کہہ دیا ہوتا کہ ہم اس لئے آئے ہیں۔ یہ کیا ہے کہ آتے ہی ڈنڈ تھام لئے۔ وہ تو کہو کہ اس وقت میرے پاس لٹھ نہ تھا ورنہ اس غلط فہمی میں دونوں کے سر کھل جاتے

اچھا صاحب غلطی ہوئی۔ بھیجئے صاحب ان دونوں کو بھیجئے +

ان دونوں ممبروں نے یہ سوچ کر کہ خدا جانے گھوڑا چھوٹے ہاتھی چھوٹے دادا جان کو حلف دلانے سے انکار کر دیا آخر دو اور ممبر اپنی جگہ سے اٹھے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر مسٹر اسپیکر کی میز تک لے گئے۔ منتظم صاحب بھی کپڑے وپڑے جھاڑ قریب آئے مگر اب ان کی متانت میں کچھ فرق آگیا تھا اور ذرا دور ہی دور رہنا چاہتے تھے۔ بہرحال انہوں نے نہایت نپے تلے الفاظ میں فرمایا کہ "سیدھا ہاتھ اٹھائیے"۔

دادا جان۔ کیوں ؟

منتظم۔ قسم کھانے کے لئے۔

دادا جان۔ قسم منہ سے کھائی جاتی ہے یا ہاتھ سے۔

منتظم۔ یہاں کا یہی طریقہ ہے۔

دادا جان۔ اگر طریقہ ہے تو غلط طریقہ ہے۔ بدل دو ہم ہاتھ واتھ کچھ نہیں اٹھاتے۔

منتظم۔ اٹھانا پڑے گا۔

دادا جان۔ کیا کہا۔ اٹھانا پڑے گا۔ ہے کسی میں ہمت جو زبردستی میرا ہاتھ اٹھوا سکے۔ ابھی منٹ بھر میں ٹھیک کر دوں۔

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکن کو پھر غلط فہمی ہوئی ہے۔ ملک کا یہ قانون ہے کہ حلف لینے کے لئے ہاتھ اٹھایا جاتا ہے +

دادا جان۔ اچھا یہ بات ہے تو لو ہم ہاتھ اٹھائے لیتے ہیں۔

منتظم۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جانتا ہوں۔

دادا جان۔ اور وہ کون مسخرا ہے جو خدا کو حاضر و ناظر نہیں جانتا۔ تم حلف دے رہے ہو یا مذاق کر رہے ہو۔ اپنی عمر دیکھو اور میری عمر دیکھو۔ تمہارے دادا کے برابر ہوں۔ مجھ سے مذاق کرتے تمہیں شرم نہیں آتی۔

مسٹر اسپیکر۔ خاموش۔ خاموش۔

دادا جان۔ لیجئے یہ دوسرے عقلمند بولے۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ بولو۔ دوسرے فرماتے ہیں کہ خاموش رہو سبحان اللہ کیسے تماشے کے آدمی اس پارلیمان میں جمع ہو گئے ہیں +

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکن امن آباد کو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ وہ اس وقت پارلیمان میں ہیں۔

دادا جان۔ آپ کو بھی خیال رکھنا چاہئے کہ میں اندھا نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں پارلیمان میں ہوں۔ پھر یہ بے معنی بات کہنے سے کیا مطلب ہے کہ تم پارلیمان میں ہو +

مسٹر اسپیکر۔ مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی گفتگو سے یہاں احتراز کیا جائے۔

دادا جان۔ کیوں۔ آخر وجہ۔ کیا سچی بات بھی کہنا یہاں گناہ ہے۔ اُلٹی سیدھی آپ لوگ باتیں کر رہے ہیں یا میں۔ ایک

صاحب کہتے ہیں کہ ہاتھ اٹھا کر کہو کہ میں خدا کو حاضر و ناظر جانتا ہوں۔ دوسرے صاحب کا ارشاد ہوتا ہے کہ خاموش رہو۔ تم لوگوں نے کیا مجھے دیوانہ سمجھا ہے۔

مسٹر اسپیکر: معزز رکن کی مہربانی ہوگی اگر وہ قانون کی پابندی کریں اور جو کچھ منتظم پارلیمان کہیں ان کے الفاظ کو دہرائیں۔

دادا جان۔ بہت خوب میں خدا کو حاضر و ناظر جانتا ہوں۔

منتظم۔ اور حلف کرتا ہوں۔

دادا جان۔ اور حلف کرتا ہوں۔

منتظم۔ کہ ملک کی خدمت ایمانداری سے کروں گا۔

دادا جان۔ اور ملک کی خدمت کوئی بے ایمانی سے بھی کرتا ہے۔ واللہ کیا اچھا حلف ہے۔

منتظم۔ آپ فرمائیے۔

دادا جان۔ فرماؤں کیا خاک۔ تمہاری کوئی بات ٹھکانے کی ہو تو کچھ فرماؤں۔ خدا کی قسم کیا عجیب و غریب فقرہ ہے کہ میں ملک کی خدمت ایمانداری سے کروں گا۔

منتظم۔ میں ملک کے قوانین کی پابندی کروں گا۔

دادا جان۔ یہ پہلے فقرہ سے بھی کچھ زیادہ زور کا فقرہ ہے۔ بھلا یہ تو بتاؤ کہ اس کے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر قوانین کی پابندی نہ کروں گا تو جیل خانے نہ جاؤں گا۔ تم لوگ جب حلف کی چار سطروں میں اتنی غلطیاں کرتے ہو تو خدا جانے قانون بنانے میں کیا کچھ بیوقوفیاں نہ کرتے ہوگے۔

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکن کو معلوم ہونا چاہئیے کہ وہ اس وقت پارلیمان میں ہیں۔

دادا جان۔ آخر یہ فقرہ کتنی دفعہ کہا جائے گا۔ پارلیمان نہیں تو کیا میں کسی قبرستان میں کھڑا ہوں۔

مسٹر اسپیکر: منتظم صاحب حلف کی تکمیل ہوگئی۔ آپ ان سے دریافت کیجئے کہ یہ دائیں جانب کے ارکین میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا بائیں جانب کے ارکین میں۔

دادا جان۔ کیا فرمایا یہ دائیں بائیں ارکین کون بلا ہیں۔

منتظم۔ دائیں جانب کے جو ارکین ہیں وہ موجودہ گورنمنٹ کے موافق ہیں اور بائیں جانب کے خلاف۔

دادا جان۔ تو ملک کے مخالفوں کو یہاں رہنے ہی کیوں دیا ہے۔ مار کر نکال باہر کرو۔ . . . . غضب خدا کا یہ لوگ ملک کے خلاف ہوں اور پارلیمان میں رہیں (مسٹر اسپیکر کی طرف اشارہ کر کے) یہ سب آپ کی کمزوری ہے ذرا مجھے اپنی جگہ بٹھا دیجئے۔ ابھی سب مخالفوں کے کان پکڑ کر باہر کئے دیتا ہوں۔

بائیں جانب کے ارکین۔ مسٹر اسپیکر ذرا اس گفتگو کو نوٹ کیا جائے۔

مسٹر اسپیکر۔ خاموش۔

دادا جان۔ نوٹ کیوں کرو۔ پولیس میں رپٹ لکھوا دو۔ میں تم نمک حراموں سے کوئی دبنے والا تھوڑا ہی ہوں (مسٹر اسپیکر کی طرف اشارہ کرکے) اس بچارے غریب کو دبا کر شیر ہوگئے ہو۔ یاد رکھنا میں بھی پٹھان ہوں۔ ابھی سب نوٹ ووٹ ناک کے رستے نکال دونگا

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکنِ امن آباد کو پھر غلط فہمی ہوئی ہے۔ کسی مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے لازمی ہے کہ اس کے موافق اور مخالف دونوں پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے۔ اسی لئے ہر پارلیمان میں گورنمنٹ کے مخالف اراکین کا ہونا ضروری ہے +

دادا جان۔ یہ کچھ عجیب بات ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ غلط فہمی سمجھا جاتا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا بغیر فرقہ بندیاں کئے کسی مسئلہ کے ہر پہلو پر نظر نہیں ڈالی جا سکتی۔ خیر سنئے۔ میں آپ کے کسی فرقہ میں شریک رہنا نہیں چاہتا۔ میں آزاد ہوں اور آزاد ہی رہوں گا +

مسٹر اسپیکر۔ آپ کو آزاد اراکین کے بنچوں پر جگہ بتا دی جائے۔

منتظم نے پارلیمان کے وسطی بنچوں کی طرف اشارہ کر دیا اور دادا جان نہایت متانت سے ٹہلتے ہوئے جاکر ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ اُن کے برابر ایک دوسرے صاحب بیٹھے تھے۔ بہت زرق برق لباس تھا۔ ناک پر گول تالوں کی بڑی عینک تھی، سر ننگا تھا اور اس طرح آنکھیں بند کئے ہوئے تھے گویا اونگھ رہے ہیں یا کچھ سوچ رہے ہیں۔ دادا جان کے بیٹھ جانے کے بعد پارلیمان کی کارروائی پھر شروع ہوئی +

وزیر مالیہ۔ میں نے اس وقت تک جو کچھ عرض کیا ہے وہ آپ صاحبوں کے ذہن میں ہوگا لیکن اس خیال سے کہ میری بحث میں معزز رکنِ امن آباد کے حلف لینے کی کارروائی کے باعث تسلسل قائم نہیں رہا ہے میں از سرِ نو اپنی بحث کو مختصراً عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ ریلوں کے جو فوائد ہیں ان کے اظہار کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس کی وجہ سے قحط کا انتظام ہو سکتا ہے یہی وہ ذریعہ ہے جس سے ملک میں خوشحالی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس سے تجارت کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ غرض کوئی ملک ترقی کے میدان میں نہیں آسکتا جس میں ریلوں کا جال نہ بچھا دیا جائے۔ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ سب سے پہلے ملک کے دور و دراز حصوں کو ریل کے ذریعہ سے ملانے کی کوشش کرے تاکہ ذرائع آمد و رفت کی سہولت نہ صرف ملک میں تجارت بڑھانے کا باعث ہو، بلکہ آپس کے میل جول سے مُلک میں امن قائم رکھا جا سکے +

یہاں امن کے ذرائع بتائے جا رہے تھے اور ادھر دادا جان کے بیچ سی غل اٹھا کہ "مار ڈالا۔ مار ڈالا" اب جو دیکھتے ہیں تو دادا جان اپنے برابر والے رکن کو دبائے گدگدیاں کر رہے ہیں اور وہ ہے کہ چیخوں پر چیخیں مار رہا ہے۔ اوپر کی گیلری میں سے جو لوگ جھک جھک کر یہ تماشا دیکھنے لگے تو ایک صاحب کا جھوک نکل گیا۔ گرے اور گرتے گرتے انھوں نے بجلی کے جھاڑ کو پکڑ لیا۔ کئی بجلی کے گولے دنادن کرکے پھٹے کئی کنول اور قمقمیں ٹوٹ کر نیچے گریں۔ آپ ہیں کہ جھاڑ میں لٹکے جھولا جھول رہے ہیں اور مخالف پارٹی والے اس ڈر سے کہ کہیں گرفت ڈھیلی ہو کر یہ ہم پر نہ آپڑیں اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ غرض ایک اودھم مچ گیا۔ ایک ممبر صاحب شراب پئے بیٹھے تھے وہ اٹھے اور کہنے لگے۔

شرابی رکن۔ مسٹر اسپیکر۔ مسٹر اسپیکر۔ ایک۔ سوال۔ بڑا۔ ضروری۔ سوال۔

مسٹر اسپیکر۔ خاموش۔ خاموش۔

شرابی رکن۔ ہم۔ ہم۔ ہم۔ سوال۔ کا۔ جواب لے کر۔ خاموش ہوں گے۔ ایک سوال۔ بڑا ضروری سوال۔

مسٹر اسپیکر۔ فرمائیے کیا سوال ہے ؟

شرابی رکن۔ سوال یہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس رستہ سے یہ شخص (جھاڑیں لٹکے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کرکے) یہ شخص اوپر سے آرہا ہے۔ وہ کیا۔ وہ کیا۔ اس پارلیمان کے ضابطہ کے۔ موافق ہے +

مسٹر اسپیکر۔ یہ کوئی سوال نہیں ہے۔

شرابی رکن۔ یہ۔ یہ۔ بہت۔ اہم۔ سوال۔ ہے۔ آپ کو۔ آپ کو۔ اس کا۔ اس کا۔ تصفیہ کرنا ہوگا +

بائیں جانب کا ایک رکن۔ معزز رکنِ مخمور نگر شراب پیئے ہوئے ہیں۔ ان کا اس حالت میں یہاں آنا پارلیمان کی توہین کرنا ہے +

شرابی رکن۔ ہم اپنے داموں سے ہم اپنے داموں سے پی کر۔ آئے ہیں کسی کے باپ کا دینا۔ دینا۔ نہیں آتا۔ تم۔ تم۔ ہمارے پینے سے جلتے ہو۔ جلتے ہو۔

بائیں جانب کے کئی اراکین۔ نکالو۔ اس شرابی کو نکالو۔

شرابی رکن۔ (آستین چڑھاکر) آؤ۔ تم آؤ۔ بہت ہے۔ تو۔ تم۔ آؤ۔ ابھی۔ ابھی کچومر نکال دیتا ہوں۔ ہم۔ ہم۔ گورنمنٹ کے آدمی ہیں۔ کوئی۔ ہم کو۔ نکال۔ سکتا ہے ؟

بڑی مشکل سے ان شرابی رکن کے ایک پارٹی والے نے ان کو زبردستی بنچ پر بٹھا دیا۔ اس گڑبڑ میں راجاجان کے بنچ کی آواز ذرا دب گئی تھی۔ جب ان شرابی صاحب کی آواز ذرا دھیمی ہوئی تو اُدھر سے مار ڈالا۔ مار ڈالا کا غل پھر شروع ہوا۔ شرابی صاحب نے مڑکر ادھر دیکھا اور پھر کھڑے ہوگئے۔

شرابی رکن۔ ایک سوال ہے۔ بہت ضروری۔ سوال ہے +

مسٹر اسپیکر۔ اب آپ کا کیا سوال ہے +

شرابی رکن۔ آپ۔ آپ۔ ذرا۔ اونچی کرسی پر۔ اونچی کرسی پر۔ بیٹھے ہیں۔ مہربانی کرکے۔ مہربانی کرکے مطلع فرمائیے۔ ہم سب کو مطلع فرمائیے کہ ان دونوں رکنوں میں اوپر کون ہے۔ اور نیچے کون ہے۔

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکنِ مخمور نگر کو ایسے سوالات سے پرہیز کرنا چاہئیے۔

شرابی رکن۔ میں۔ میں۔ بڈھے کی طرف سے۔ چار۔ اور۔ ایک کی شرط۔ چار اور ایک کی شرط باندھتا ہوں۔ مسٹر اسپیکر۔ مسٹر اسپیکر۔ آپ کو۔ آپ کو منظور۔ ہے ؟

مسٹر اسپیکر۔ آرڈر۔ آرڈر!

بہرحال پولیس نے آکر ان صاحب کو جو جھاڑ میں لٹکے ہوئے غل مچا رہے تھے۔ نیچے اتارا۔ ان شرابی رکن کو اپنی جگہ بٹھایا۔ دادا جان کے پنجہ سے ریاپور کے ممبر کو رہائی دلائی۔ پارلیمان میں ذرا امن ہوا اور اس کے بعد مسٹر اسپیکر نے کہا:۔

مسٹر اسپیکر۔ آج جس قدر بیہودگی اس اجلاس پر ہوئی ہے اس کے متعلق ارکین امن آباد۔ ریاپور اور مخمور نگر کو شرمندہ ہونا چاہیئے اور بتانا چاہیئے کہ اس طرح اپنے ملک کی پارلیمان میں ان کو نہ صرف اپنی حد سے بڑھنے بلکہ شرافت کی حد سے تجاوز کرنے کی کیا وجہ تھی۔ پہلے میں معزز رکن امن آباد کا جواب اس کے متعلق سننا چاہتا ہوں +

دادا جان۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ (رکن ریاپور کی طرف اشارہ کر کے) اس بیوقوف سے پوچھو۔ میں حلف لے کر اپنے بنچ پر آکر بیٹھا تو اس نے میری پسلی پر گدگدی کی۔ میں نے اس کو غور سے دیکھا کہ شاید کبھی کی جان پہچان ہو۔ بہت غور کیا مگر یاد نہ آیا کہ یہ کون شخص ہے۔ چپکا ہو رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے میری پسلیوں میں پھر انگلی چھوئی۔ میں نے بھی اس خیال سے کہ جب یہ مذاق کر رہا ہے تو میں کیوں نہ کروں۔ اس کے گدگدیاں کیں اور چپکا ہو رہا۔ اس نے تھوڑی دیر میں پھر گدگدی کی۔ میں نے بھی جواب میں گدگدیاں کرنی شروع کر دیں۔ اس نے میرے چٹکی لی۔ میں نے بھی چٹکی لی۔ اس پر اس نے میرے ایک مکا مارا۔ بھلا میں کوئی اس کا دیسل تھا جو مکا کھا کر چپکا ہو رہتا۔ وہیں دبوچ لیا اور اچھی طرح ہڈیاں پسلیاں نرم کریں۔ مزا تو دیکھئے کہ مذاق تو خود شروع کیا اور خود ہی مرگیا مرگیا کا غل مچایا۔ اگر لڑنے کا دم نہ تھا تو یہ چھیڑ خانی شروع ہی کیوں کی تھی۔ اب آپ ہی دیکھئے کہ بیہودگی اس نے کی یا میں نے؟

مسٹر اسپیکر۔ اب براہ کرم معزز رکن ریاپور اپنے افعال غیر پارلیمانہ کی جواب دہی فرمائیں۔

رکن ریاپور۔ مسٹر اسپیکر۔ میں رکن امن آباد کے اس غیر شریفانہ برتاؤ کے متعلق اپنے ملک کی پارلیمان سے طالب امداد و انصاف ہوں۔ جو ظلم اس وقت مجھ پر ہوا ہے اور جو تکلیف جسمانی اور روحانی اس وقت مجھے پہنچی ہے وہ اس قابل ہے کہ مجھے رکن امن آباد کے خلاف عدالتی چارہ کار اختیار کرنے کی اجازت دی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب رکن امن آباد حلف لے کر میرے برابر آکر بیٹھے تو جس بنچ پر یہ بیٹھے اس پر میری ٹوپی پڑی ہوئی تھی۔ وہ ان کے بھاری جسم کی وجہ سے بالکل پچک گئی۔ میں نے ان کی پسلی میں انگلی مار کر ان کو توجہ دلائی کہ آپ میری ٹوپی پر بیٹھ گئے ہیں اور بجائے اس کے کہ یہ معافی مانگ کر اٹھتے اور ٹوپی نکال کر مجھے دیتے انہوں نے میرے گدگدیاں کرنی شروع کر دیں۔ اس کے بعد میں نے اس خیال سے ان کے چٹکی لی کہ شاید یہ اٹھیں اور میں جلدی سے ان کے نیچے سے ٹوپی نکال لوں۔ لیکن بجائے اٹھنے کے انہوں نے میرے اس زور سے چٹکی لی کہ نیل پڑ گیا ہو تو کوئی تعجب نہیں ہے۔ اس پر واقعی میں نے ان کو مکا مارا۔ پھر جو انہوں نے مجھے مارا اور دبوچا ہے تو اب تک میری ہڈی ہڈی میں درد ہو رہا ہے۔ اگر پولیس والے آکر مجھے نہ چھڑاتے تو میرے مرجانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی تھی۔ بس پھر کہتا ہوں کہ میں رکن امن آباد کے مقابلے میں اپنے ملک کی پارلیمان سے طالب امداد و انصاف ہوں +

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکن امن آباد تسلیم کریں گے کہ ان کو اس معاملہ میں غلط فہمی ہوئی ہے اور اس لئے معافی ان کو

مانگنی چاہیئے +

داداجان۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے لئے یہ غلط فہمی کا لفظ کیوں استعمال کرتے ہیں غضب خدا کا کہ میری کوئی بات اور میرا کوئی فعل آج غلط فہمی سے خالی نہیں ہے۔ اول تو کوئی ان عقلمند سے پوچھے کہ ان کو ٹوپی اتار کر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور اگر ٹوپی اتار کر بیٹھے بھی تھے تو اپنے بنچ پر رکھنے کی بجائے یہ ٹوپی دوسرے بنچ پر کیوں رکھی تھی۔ اور رکھی بھی تھی تو جب میں اس بنچ پر بیٹھنے لگا تو اٹھا کیوں نہ لی۔ کوئی میری، گدی میں آنکھیں تو ہیں نہیں کہ میں دیکھ لیتا کہ بنچ پر کسی کی ٹوپی رکھی ہوئی ہے اور بالفرض محال میں ٹوپی پر بیٹھ ہی گیا تھا تو انہیں زبان ہلاتے کیوں شرم آئی۔ طلب امداد و انصاف کے لئے تو انہوں نے لمبی چوڑی تقریر کر دی۔ اور اس وقت اتنا نہ کہا گیا کہ "جناب آپ میری ٹوپی پر بیٹھ گئے ہیں"۔ کیا شریف آدمی اس طرح پسلیوں میں انگلیاں مار مار کر متوجہ کیا کرتے ہیں۔ کیا بھلے مانس اسی طرح چٹکیاں لیا کرتے ہیں جس طرح ان حضرت نے لی ہیں۔ اور کیا باوجود ایسی بیہودگیاں کرنے کے اس پارلیمان کے رکن اسی طرح لپاڈگی پر اتر آتے ہیں جیسا ان معزز رکن ریاپور نے کیا۔ خود ہی یہ کچھ اودھم مچائیں اور خود ہی انصاف، انصاف کے نعرے لگائیں، اور آپ کو دیکھئے کہ پارلیمان کے اسپیکر بن کر بیٹھے ہیں اور سمجھیں نہ بوجھیں ہر بات پر یہی کہتے ہیں کہ رکن امن آباد کو غلط فہمی ہوئی ہے[1] +

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکن امن آباد نے واقعات کی جو صراحت اس وقت کی ہے اس کے لحاظ سے مجھے امید ہے کہ معزز رکن ریاپور اب اس کارروائی کو طول دینا مناسب نہ خیال فرمائیں گے +

رکن ریاپور۔ مسٹر اسپیکر۔ میں آپ کے تصفیہ کو قبول کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ میرے شریک کار یعنی معزز رکن امن آباد اب اس واقعہ کو بھول جائیں گے اور میں بھی سمجھوں گا گویا یہ واقعہ ہوا ہی نہیں +

داداجان۔ مجھے یقین ہے کہ معزز رکن ریاپور اتنی جلدی اس واقعہ کو نہ بھول سکیں گے۔ کیونکہ جو جسمانی تکلیف ان کو پہنچی ہے وہ عرصہ تک ان کو ہمارے اس "اختلاف" کی یاد دلاتی رہے گی۔ بہرحال چونکہ یہ خود اس کارروائی کو ختم کرنا چاہتے ہیں اس لئے مجھے بھی کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن میں ان سے کہے دیتا ہوں کہ آئندہ جو کچھ ان کو مجھ سے کہنا ہو وہ زبان سے کہیں اور اس طرح انگلیاں چبھونے اور چٹکیاں لینے سے احتراز کریں ورنہ کہیں پھر مسٹر اسپیکر آپ کو یہ نہ کہنا پڑے کہ اس میں رکن امن آباد کو غلط فہمی ہوئی ہے +

---

[1] اوپر جو کچھ گڑبڑ لکھی گئی ہے اس کو شاید بعض قارئین کرام محض مذاق سمجھیں مگر ان کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ یہ سب واقعات ایک بہت بڑے اور مہذب ملک کی پارلیمان میں پیش آ چکے ہیں۔ میں نے رنگ آمیزی ضرور کی ہے۔ لیکن واقعات کو ہاتھ نہیں لگایا۔ آپ کو فرانس کی پارلیمنٹ کا وہ واقعہ تو یاد ہی ہوگا جہاں کچھ ہی عرصہ گزرا کہ لپاڈگی "تو کیا خوب" سر پھٹول "ہو چکی ہے۔ اب رہی زبان کی لڑائی تو وہ اکثر پارلیمنٹوں میں روزانہ ہوتی رہتی ہے۔ اور سچ بھی ہے اگر یہ دلچسپیاں نہ ہوں تو پارلیمنٹ کے اجلاسوں میں اتنی دیر بیٹھنا عذاب جان ہو جائے +

مسٹر اسپیکر۔ چونکہ یہ افسوسناک واقعہ بخیر و خوبی ختم ہو گیا اس لئے اب اجلاس کی کارروائی شروع کی جائے +

وزیر مالیہ۔ مسٹر اسپیکر مجھے حکومت سابقہ میں ایک عرصہ تک ملک کی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے اور مجھے فخر ہے کہ گزشتہ دس سال سے میں معزز پارلیمان میں مختلف حیثیتوں سے شریک رہ چکا ہوں لیکن جس طرح آج میری گفتگو میں در اندازی ہو رہی ہے اور جس طریقہ سے آج بعض معزز اراکین اس گفتگو میں وقفے پیدا کر رہے ہیں وہ صورت کبھی پیش نہیں آئی تھی اور مجھے امید ہے اور میں توقع کرتا ہوں کہ آپ کی صدر نشینی کے دوران میں آئندہ کبھی پیش نہ آئے گی (دائیں بنچوں سے آوازیں آئیں۔ ہیر۔ ہیر) میں اپنی بحث میں یہ ظاہر کر رہا تھا کہ ملک کے ذرائع آمدنی بڑھانے اور ملک میں امن قائم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ریل ہے

رکن شورش آباد۔ اگر قیام امن کا ذریعہ ریل ہے تو سب سے پہلے اس کو ہماری پارلیمان کے کمرے میں بچھانے کی ضرورت ہے

مسٹر اسپیکر۔ آرڈر۔ آرڈر۔

وزیر مالیہ۔ مجھے اپنی ریل کا رخ بدل کر معزز رکن شورش آباد کے گھر میں سے اس کو نکالنا پڑے گا۔ کیونکہ جہاں تک مجھے علم ہے پارلیمان کی بہ نسبت ان کے گھر میں امن کی زیادہ ضرورت ہے (بائیں جانب کے اراکین۔ شرم۔ شرم۔ وزیر مالیہ کو اپنے الفاظ واپس لینے چاہئیں)

مسٹر اسپیکر۔ آرڈر۔ آرڈر۔

وزیر مالیہ۔ بہر حال اس امر کو تسلیم کرنے کے بعد کہ ملک کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے ریلوں کا جال بچھانا گورنمنٹ کا اہم ترین فرض ہے۔ میں اپنی اسکیم معزز اراکین پارلیمان کے سامنے پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہمارا شہر امن آباد ایک ایسا شہر ہے کہ نہ صرف وہاں کے باشندوں کو بلکہ تمام ملک کو اس پر فخر ہے اور بجا طور پر فخر ہے (دادا جان۔ ہیر۔ ہیر) کیا بلحاظ ان کی اخلاقی جرأت کے، اور کیا بلحاظ شوق ترقی کے (دادا جان۔ ہیر۔ ہیر) اور گورنمنٹ اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کرے گی اگر ان باہمت لوگوں کو ترقی کرنے کا موقع نہ دے یا ان کے لئے ترقی کے ذرائع پیدا نہ کرے (دادا جان۔ ہیر۔ ہیر) اور مجھے پوری توقع ہے کہ جو اسکیم میں اس وقت پیش کر رہا ہوں اس کو منظور کرانے میں میرے معزز دوست مسٹر دادا جان میری پوری مدد فرمائیں گے (دادا جان۔ ضرور۔ بالضرور) جس طرح امن آباد ایک قابل قدر شہر ہے اسی طرح نیکی پور کا شہر بھی۔

دادا جان۔ نیکی پور شہر نہیں ہے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔

وزیر مالیہ۔ میں اپنے معزز دوست کی اس رہبری کا شکریہ ادا کرتا ہوں میرا مطلب بھی لفظ "شہر" سے "گاؤں" ہی تھا۔

رکن نیکی پور۔ آپ غلط کہتے ہیں۔ کیا بلحاظ آبادی۔ کیا بلحاظ مالگزاری اور کیا بلحاظ تعلیم ہمارا شہر نیکی پور ان بڑے میاں کے گاؤں امن آباد سے بہت بڑھا ہوا ہے۔

دادا جان۔ کیا کہا۔ ذرا پھر تو کہنا۔ ہمارا شہر گاؤں ہے۔ اسپیکر صاحب۔ پارلیمان کی کارروائی بند کیجئے اور دونوں جگہ کے پٹواریوں کے کاغذات منگوا کر پہلے اس کا تصفیہ کیجئے کہ ہمارا شہر گاؤں ہے یا اس بیوقوف کا +

رکن نیکی پور۔ بیوقوف کس کو کہا۔ اب آکر بتاؤں۔ بدمعاش کہیں کا۔

مسٹر اسپیکر۔ میں دونوں معزز اراکین پر ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ وہ اس وقت ملک کی پارلیمان میں ہیں (ایک جانب سے آوازیں آئیں ان دونوں بڈھوں نے پارلیمان کو اپنے گاؤں کی چوپال سمجھا ہے۔ گیلری سے آوازیں آئیں "کاغذات منگوانے کی بجائے ان دونوں کے ہاتھوں میں لٹھ دے دو۔ ابھی معلوم ہو جاتا ہے کہ امن آباد شہر ہے یا نیکی پور)۔

مسٹر اسپیکر۔ خاموش۔ آرڈر۔ آرڈر۔ معزز وزیر مالیہ اپنی بحث شروع کریں۔

وزیر مالیہ۔ میری اسکیم کو اس بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ امن آباد شہر ہے یا نیکی پور۔ اگر یہ دونوں شہر ہیں تو اس اسکیم سے یہ دو نو بڑے شہر ہو جائیں گے۔ اگر گاؤں ہیں تو قصبہ ہو جائیں گے اگر قصبہ ہیں تو شہر ہو جائیں گے۔ بہرحال اسکیم یہ ہے کہ ریل کی جو دو لائینیں ان دونوں اسٹیشنوں پر سے گزرتی ہیں ان کو ایک لائن ڈال کر ملا دیا جائے۔

دادا جان۔ اس سے فائدہ۔ ان دونوں اسٹیشنوں کے بیچ میں آبادی ہی کون سی ہے جس کا مال اس ریل پر آئے گا یا مسافروں سے کوئی آمدنی ہوگی۔

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکن امن آباد کو یہ امور اپنی بحث کے لئے رکھنے چاہئیں۔ اس طرح معزز رکن کی بحث میں دخل دینا پارلیمانی طریقہ کے خلاف ہے۔

وزیر مالیہ۔ مسٹر اسپیکر میں آپ کی اس توجہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور مجھے اپنے معزز دوست رکن امن آباد کے اس ریمارک کے متعلق بھی کوئی شکایت نہیں ہے کیونکہ انہیں ابھی تک تجربہ نہیں ہے کہ ریلوں سے کیا فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں اور کس طرح ان کے ذریعے سے غیر آباد ملکوں کو آباد کیا جا سکتا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس وقت امن آباد اور نیکی پور کا درمیانی حصہ غیر آباد ہے لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ریل نکلنے کے بعد بھی وہ غیر آباد رہے گا۔

دادا جان۔ ہاں میں کہتا ہوں کہ غیر آباد رہے گا کسی صحرائے لق و دق میں جہاں میلوں پانی کا نام و نشان نہ ہو۔ جہاں اناج تو کیا گھاس بھی پیدا نہ ہوتی ہو، جہاں سر چھپانے کو درخت کا سایہ تک نہ ہو۔ جہاں آدمی تو کیا جنگلی جانور بھی رہنا پسند نہ کرتے ہوں ریل ڈالنے سے آبادی کی توقع کی جا سکتی ہے؟ یا تو (وزیر مالیہ کی طرف اشارہ کر کے) ان حضرت نے وہ حصہ دیکھا ہی نہیں۔ یا یہ جان بوجھ کر ہم سب کو بیوقوف بنا رہے ہیں۔

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکن امن آباد کو اس طرح بحث کے بیچ میں بولنے سے احتراز کرنا چاہئے۔

دادا جان۔ تو پھر آپ کا یہ مطلب ہے کہ یہ حضرت ہم سب کو بیوقوف بنائے جائیں اور ہم اُلوؤں کی طرح بیٹھے ان کا منہ دیکھتے رہیں۔

دائیں جانب کے ایک رکن۔ مسٹر اسپیکر۔ براہ کرم اس کا نوٹ کر لیا جائے کہ ہم اُلو نہیں ہیں معزز رکن امن آباد کو اس غلط بیانی کے متعلق معافی مانگنی چاہئے۔

داداجان۔ تم اُلّو نہیں تو اور کیا ہو۔ ایک شخص صریحاً جھوٹ بول کر تم کو دھوکا دے رہا ہو اور تم ذرا نہیں ٹوکتے۔ ہم کو اگر معلوم ہوتا کہ ملک کے آزاد ہونے کے بعد تم جیسے گدھے پارلیمان میں آئیں گے تو ہم آزادی کی جدوجہد میں ہرگز کوئی حصہ نہ لیتے (کسی طرف سے آواز آئی حصہ نہ لیتے تو جوتے کھاتے)

یہ سننا تھا کہ داداجان بنچ پر کھڑے ہو گئے۔ آستینیں چڑھالیں پگڑی ایک طرف پھینکی اور نہایت غضب ناک آواز میں کہا کہ ہے تم میں کوئی رُستم کا جنا ہو۔ اجو ہمارے جوتے مارے"

رکنِ مخمور نگر۔ مسٹر اسپیکر۔ مسٹر۔ اسپیکر۔ ایک سوال ہے۔ بہت۔ بہت۔ ضروری سوال۔ ہے۔

مسٹر اسپیکر۔ خاموش۔ خاموش۔

رکنِ مخمور نگر۔ ہم۔ ہم۔ خاموش۔ نہیں۔ ہو سکتے۔ ایک۔ سوال۔ ہے۔

مسٹر اسپیکر۔ آخر آپ کا کیا سوال ہے۔

رکنِ مخمور نگر۔ آپ۔ آپ۔ پلیٹ فارم سے۔ اتر۔ آیئے۔ اور۔ اور۔ پہلے۔ پارلیمان کو۔ ان۔ بڑے میاں کی۔ کُشتی۔ دیکھنے۔ دیجئے۔ میں۔ میں۔ ان کی طرف سے۔ ان کی طرف سے۔ سو اور دس۔ کی شرط لگاتا ہوں۔

مسٹر اسپیکر۔ معزز رکنِ مخمور نگر کو اپنی حد سے تجاوز کرنے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

رکنِ مخمور نگر۔ ملک کا فرض ہے۔ فرض ہے۔ کہ یہاں کے لوگوں کی ہمت۔ ہمت۔ قائم رکھے۔ ریل والی اسکیم۔ نامنظور۔ خیر بڑی مشکل سے داداجان کو سمجھا بجھا کر بنچ سے اتارا گیا۔ رکنِ مخمور نگر کو پکڑ دھکڑ کر بٹھایا گیا۔ پارلیمان میں ذرا امن ہوا اور پھر کارروائی شروع ہوئی۔

وزیر مالیہ۔ میں اس فیصلہ کو معزز اراکین پارلیمان پر چھوڑتا ہوں کہ ریلوں کے نکلنے سے کیسا ہی غیر آباد ملک کیوں نہ ہو آباد ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اور امن آباد اور نیکی پور کے اسٹیشنوں کے بیچ میں لائن قائم کرنے سے اس حصّہ ملک کو ترقی دی جا سکتی ہے یا نہیں اور اب میں مالیہ کے نقطۂ نظر سے اس اسکیم کے فوائد آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔

مجھ کو یہ ظاہر کرنے کی ضرورت تو نہیں ہے کہ ملک میں جو اسکیمیں تجارتی اصول پر قائم ہوتی ہیں ان میں کوشش کی جاتی ہے کہ کم سے کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جائے اور ریلوں کے نکالنے میں یہ امر پیشِ نظر رکھا جاتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو کسی آبادی میں سے ان کو نہ گزارا جائے۔ کیونکہ وہاں کی اراضی قیمتی ہوتی ہیں اور معاوضہ بہت دینا پڑتا ہے اور ساتھ ہی اراضی کاشت کے ریل میں آجانے سے مال گزاریٔ ملک کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس لئے اسکیم وہی زیادہ بہتر ہے جس میں ریل کو ویران حصّۂ ملک میں سے نکالنے کی کوشش کی جائے۔

بائیں جانب کے ایک رکن۔ تو اس اصول کے لحاظ سے بہترین اسکیم یہ ہوگی کہ صحرائے اعظم میں ریلوں کا جال بچھا دیا جائے۔ کیونکہ وہاں نہ زراعت کا نقصان ہوگا اور نہ زمین کا معاوضہ دینا ہوگا۔

وزیر مالیہ۔ وُہ دن بھی دُور نہیں ہے +
وہ رُکن۔ گھبرائیے نہیں۔ جہاں آپ جیسے وزیر ہوں۔ وہاں یہ ملک بھی تھوڑے دنوں میں صحرائے اعظم ہو جائے گا +
مسٹر اسپیکر۔ آرڈر آرڈر۔ معزز اراکین کا اس طرح ایک دوسرے کو مخاطب کرنا خلافِ ضابطہ ہے +
وزیر مالیہ۔ مسٹر اسپیکر۔ میں اپنے اس غیر پارلیمانی طریقہ کے متعلق طالبِ معافی ہوں +
میری اسکیم کے تحت جو تخمینہ سررشتۂ ریلوے نے کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کو اس زمین کے لئے جس پر سے یہ ریل گزر رہی ہے اور جہاں دو اسٹیشن بھی قائم ہوں گے صرف تین لاکھ پچیس ہزار دو سو انتیس روپے نو آنے چھ پائی ادا کرنے ہوں گے +
دادا جان۔ کتنے روپے۔
وزیر مالیہ۔ صرف دو لاکھ پچیس ہزار دو سو انتیس روپے نو آنے چھ پائی +
دادا جان۔ اور ابھی چھ مہینے بھی نہیں گزرے کہ اتنا بڑا ٹکڑا تو کیا امن آباد اور نیکی پور کے بیچ کا سارا صحرائی علاقہ راجہ صاحب ویران آباد نے ایک انگریز ن کے ہاتھ اٹھائیس ہزار روپے میں فروخت کیا ہے۔ ہاں وہ دیکھو عورتوں کی گیلری میں سید ھے ہاتھ کی طرف تیسرے نمبر پر جو عورت بیٹھی ہے اسی نے یہ علاقہ خریدا ہے۔ میں اس دستاویز کا گواہِ حاشیہ ہوں۔
وزیر مالیہ۔ مسٹر اسپیکر۔ مجھے امید ہے کہ معزز رکن امن آباد کو اس قسم کے حملوں سے روکا جائے گا +
بائیں جانب کے لیڈر۔ مسٹر اسپیکر۔ اس کارروائی نے جو شکل اختیار کر لی ہے اس کے لحاظ سے میں ایک سوال کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ کیونکہ جب تک اس سوال کا تصفیہ نہ ہو جائے گا اس وقت تک میری پارٹی والوں کو اس اسکیم کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کا موقع نہ ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ معاملہ کو صاف کرنے کے لئے مجھے اس سوال کی اجازت دی جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح وزیر مالیہ کی بحث میں میرا دخل دینا نامناسب ضرور ہے لیکن سوال کی اہمیت مجھے اس اجازت طلب کرنے پر مجبور کرتی ہے۔
مسٹر اسپیکر۔ آپ کو سوال کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔
وہ رکن۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا معزز وزیر مالیہ کی بیگم صاحبہ نے وہ علاقہ جس پر سے یہ ریل نکل رہی ہے راجہ صاحب ویران آباد سے اٹھائیس ہزار روپیہ میں تقریباً چھ ماہ قبل خریدا ہے؟
مسٹر اسپیکر۔ مجھے امید ہے کہ معزز وزیر مالیہ اس سوال کا جواب عنایت کر کے معزز رکنِ مخالف کی تشفی فرمائیں گے +
وزیر مالیہ۔ مسٹر اسپیکر۔ تجارت ہر شخص کا قانونی حق ہے۔ کوئی مہذب گورنمنٹ کسی شخص کو خرید و فروخت کا فائدہ حاصل کرنے سے روک نہیں سکتی۔ کامیاب تاجر وہی ہے جو وقت کو سمجھے۔ ملک کی ضرورت کو جانے اور اپنے روپے کا استعمال ان تمام امور پر غور کرنے کے بعد اس طرح کرے کہ نقصان کی کوئی صورت پیدا ہونے کا اندیشہ نہ رہے +
بائیں جانب کے لیڈر۔ مسٹر اسپیکر۔ میں معزز وزیر مالیہ سے اصول تجارت معلوم کرنا نہیں چاہتا اور نہ مجھے

یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ تاجروں کو اپنا روپیہ کس طرح اور کس موقع پر خرچ کرنا چاہئے۔ میرا سوال بالکل صاف ہے کہ "کیا معزز وزیر مالیہ کی بیگم صاحبہ نے وہ علاقہ جس پر سے یہ ریل نکل رہی ہے راجہ صاحب ویران آباد سے اٹھائیس ہزار روپے میں تقریباً چھ ماہ قبل خریدا ہے"؟ جس طرح میرے سوال میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے اسی طرح میں صاف صاف جواب کا طالب ہوں +

وزیر مالیہ - جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ وہ صحیح ہے (بائیں جانب کے اراکین نے غل مچایا۔ "بدمعاش، غدار گورنمنٹ کو ایسے نمک حلال وزیر کی قدر کرنی چاہئے")

وزیر مالیہ - لیکن شادی سے قبل جو رقوم میں نے اپنی بیگم صاحبہ کو دی تھیں۔ اس سے انہوں نے یہ علاقہ خریدا ہے میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے (آوازیں آئیں "کسی صاحبزادے کے نام سے سمندر کا ٹکڑا خرید کر وہ بھی جہاز چلانے کے لئے گورنمنٹ کے ہاتھ بیچ ڈالئے۔ نمک حرام، بدمعاش")

غرض پارلیمان میں ایک شور مچ گیا۔ مسٹر اسپیکر نے ہزاروں دفعہ "آرڈر۔ آرڈر" اور "خاموش خاموش" کہا مگر کون سنتا تھا آخر جب بائیں جانب کے لیڈر کھڑے ہوئے اس وقت کہیں جا کر ذرا امن ہوا +

لیڈر - مسٹر اسپیکر جن واقعات کا اظہار ابھی معزز رکن مالیہ نے کیا ہے۔ ان کا لحاظ کرتے ہوئے میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ پیش شدہ اسکیم کو فی الحال ملتوی کر دیا جائے اور بذریعہ کمیٹی اس معاملہ کی دریافت کی جائے۔ مجھے امید ہے کہ جو غلط فہمی اس وقت معزز اراکین پارلیمان کو پیدا ہو گئی ہے اس کو ہمارے معزز وزیر مالیہ اپنا بیان کمیٹی میں دے کر رفع کریں گے۔ اگر اس کارروائی کو ملتوی کرنے اور کمیٹی کے قائم کرنے کے متعلق ووٹ لئے جائیں تو مناسب ہے (آوازیں آئیں، ہیر، ہیر)

مسٹر اسپیکر - میری بھی یہی رائے ہے۔ براہ کرم وہ معزز اراکین جو اس کارروائی کو ملتوی کر کے بذریعہ کمیٹی اس معاملہ کی دریافت کرانے کے موافق ہوں وہ ہاتھ اٹھائیں۔

سوائے گورنمنٹ کے چند اراکین کے بقیہ سب نے ہاتھ اٹھا دیئے اور کارروائی ملتوی کی گئی۔ کمیٹی کے ممبروں کا انتخاب ہوا جس میں دادا جان بھی شریک کئے گئے۔ اور اس طرح ہمارے دادا جان کی شرکت اجلاس پارلیمان کا پہلا سین ختم ہوا +

مرزا فرحت اللہ بیگ

دنیا ساری کی ساری تمہاری ہے اب اور ہمیشہ کے لئے!

اور چونکہ تمہیں کسی شے کی ضرورت نہیں

اے میرے بادشاہ! تم اپنی دولت سے کچھ لطف نہیں اٹھاتے، گویا اس کا ہونا نہ ہونا تمہارے لئے برابر ہے +

اس لئے مدتوں کے اندر آہستہ آہستہ تم مجھے دیتے رہتے ہو وہ سب کچھ جو تمہارا ہے اور مسلسل طور پر مجھ میں اپنی سلطنت قائم کئے جاتے ہو۔

روز بروز تم اپنی سورج کی روشنی میرے دل سے مول لیتے ہو اور میری زندگی کے مجسمے میں اپنی محبت کو تراشیدہ پاتے ہو

ٹیگور

گلچیں

وادیٔ اِمن

گودی میں پہاڑوں کی　　اِک وادیٔ دلکش ہے
قدرت کا کھلونا سا　　راحت کا بچھونا سا
گودی میں پہاڑوں کی
اِک امن کی دُنیا ہے　　یہ وادیٔ دلکش بھی
تہذیب کے پھندوں سے　　تادیب کے دھندوں سے
اقرار کی شورش سے　　اِنکار کی شورش سے
اظہار کی شورش سے　　ایثار کی شورش سے
ہر شور سے کوسوں دُور
گودی میں پہاڑوں کی　　یہ وادیٔ دلکش ہے

کیا حُسن کی دُنیا ہے　　اِک نقشۂ رعنائی!
سوئے ہوئے سبزے پر　　دھوئی ہوئی شبنم سے
ہر رنگ کی کلیاں ہیں　　اَور پھُول ہیں یا ساغر
بکھرے ہوئے سایوں میں　　نکھری ہوئی کرنیں ہیں
بہتے ہوئے پانی میں　　اِک راگ ہے دھیما سا
سُکھ چین درختوں کا　　چشموں کے کنارے پر

اک ناچ سا پھولوں کا جھونکوں کے اشارے پر
جب چاندنی راتوں میں چاند آ کے چمکتا ہے
کہسار کے سینے پر موتی سا دمکتا ہے

اِس وادیٔ دلکش کے چُپ چاپ سے جنگل میں
پھیلی ہیں چراگاہیں حاصل ہے جو کچھ چاہیں
پھولوں کی فراوانی پھل پات کی ارزانی
زوروں پہ ہے رنگینی جوبن پہ ہے شیرینی
آنسو ہیں نہ آہیں ہیں مسرور نگاہیں ہیں
پھل پھول بھی آہو بھی انساں بھی پکھیرو بھی
رہتے ہیں سبھی مل کر جنگل ہے خدا کا گھر
اُلفت کی وفا کا گھر راحت کی بقا کا گھر
چڑیاں ہیں رنگیلی سی پیاری سی رسیلی سی
پر دیکھو تو نیلی سی سر دیکھو تو پیلی سی
انسان سے آہو کو آہو سے پکھیرو کو
کھٹکا ہی نہیں مطلق
کھانے کا نہ پینے کا مرنے کا نہ جینے کا
جھگڑا ہی نہیں مطلق
آیا یہ مرے جی میں دُنیا سے نکل بھاگوں
کچھ دن تو وہاں چل کر دیکھوں کہ ہے کیا عالم

کچھ دن تو رہائی ہو　　کچھ دن تو ملے فرصت
دن رات کے کاموں سے　　چھوٹے بڑے ناموں سے
دُنیا کے سلاموں سے　　عُقبےٰ کے پیاموں سے
کچھ دن تو ہو چھٹکارا

پَر جوڑ کے جب لیکن　　چاہا کہ میں اُڑ نکلوں
دیکھا تو میں قیدی تھا　　تقدیر کے پنجرے میں
بے پر تھا مرا بازو　　بے دِل تھا مرا پہلو
میں عقل کا قیدی تھا　　اِس نقل کا قیدی تھا
میں فہم کا بندہ تھا　　اِس وہم کا بندہ تھا
آواز مگر آئی　　اے خوشیوں کے شیدائی!
خوشیوں کی غلامی میں　　جو آپ کو کھوتا ہے
ہنسنے کی تمنّا میں　　دن رات جو روتا ہے
دُکھ درد کی کُلفت میں　　سر کو جو پٹکتا ہے!
غیروں کی جو صُحبت میں　　بے سُود بھٹکتا ہے
آپ اپنا تو رہبر ہو　　اِس کوہ و بیاباں میں
اِس ظلمتِ گرداں میں　　اپنا ہو تُو آپ اختر
تُو غم کا مداوا بن　　تُو لُطف کا چشمہ بن
غم آئے تو غم سہہ کر　　خوش تر ہو دلِ مضطر
فطرت میں وہ قوت ہو　　خود زیست ہی راحت ہو
سمجھے جو حقیقت کو　　دُکھ سُکھ اُسے یکساں ہے

دل جس کے ہو سینے میں   مشکل اُسے آساں ہے
باراں مسرّت ہیں   طوفانِ مصیبت میں
دل غرق ہے گر اُس کا   اُونچا ہی ہے سر اُس کا
اے امن کے سودائی   اے خوشیوں کے شیدائی
شورش گہہِ دُنیا میں   کاوش گہہِ دُنیا میں
دیکھے گا یونہی کب تک   خواب امن کی وادی کے
دوڑے گا یونہی کب تک   پیچھے غم و شادی کے
خود تجھ میں ترے دل میں   بزمِ غم و شادی ہے
خود تجھ میں ترے دل میں   اک امن کی وادی ہے
نزہت کا چمن ہے جو   خوبی کا وطن ہے جو
جو باغِ محبّت ہے   جو خُلدِ مسرّت ہے
غم بھی ہے جہاں شاداں   آزاد ہے اور رقصاں
اُس وادیٔ دلکش کی   خاموش فضاؤں میں
اُس جنّتِ ارضی کی   مدہوش ہواؤں میں
اُڑتا ہُوا گائے جا
گا اور سُنائے جا

بشیر احمد

سکینہ

پروفیسر نیاز محمود پنجابی ہیں اس لئے ان کے افسانوں میں پنجابی معاشرت کی جیتی جاگتی، دم لیتی ہوئی تصویریں نظر آتی ہیں اگر کسی قوم کے ادب کا مقصد اُس کی زندگی کی روح پیش کرنا ہے تو اہلِ پنجاب کو لازم ہے کہ اپنے افسانوں میں یو۔ پی درصوبجاتِ متحدہ کی معاشرت کی ناکام نقالی سے احتراز کریں کوئی قوم کسی دوسری قوم کی زندگی کی سچی تصویریں پیش کرنے کے قابل نہیں ہے، یہ ہر قوم کا اپنا کام ہے۔ اگر اردو پنجاب کی زبان ہے تو پنجاب کو چاہئے کہ اپنی حقیقی روح اردو ادب کی نذر کرے۔ یہ کام نہ صرف پنجاب کے لئے بلکہ دوسروں کے لئے بھی مفید ہوگا۔ زیرِ بحث افسانوں میں پنجابی انداز بیان، پنجابی محاورہ بلکہ بعض پنجابی الفاظ بھی نظر آتے ہیں۔ یہ پنجابی معاشرت کی کامیاب مصوری کے لئے ناگزیر ہے۔

اہلِ زبان پنجابیت پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ اہلِ پنجاب شاید اس بات میں "اہلِ زبان" سے بھی دو قدم آگے ہیں حالانکہ اس کے بغیر پنجاب میں حقیقی ادب پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ پنجابیت کی ملونی کے بغیر پنجاب میں اردو کی نشوونما ہی محال ہے۔ جب مشرق و مغرب کی تقریباً ہر زبان کے الفاظ و محاورات اردو میں قابلِ قبول ہیں تو کیا پنجاب کی زبان محض اس لئے اردو کے لئے باعثِ ننگ ہے کہ اساسی طور پر یہ اردو سے قریب ترین مناسبت رکھتی ہے۔ اگر پنجاب کی اردو پنجابیت سے بالکل بے بہرہ رہی تو پنجاب کا ادب اصلیت سے کوسوں دور رہے گا، اور اس کے دھندلے بے جان مرقعے دنیا کے ادب میں کوئی حیثیت نہ رکھیں گے۔ پنجابی انداز بیان سے یکسر روگرداں ہو کر پنجاب کوئی حقیقی ادب پیدا نہیں کر سکتا، اور نہ اردو پنجاب کی زبان رہ سکتی ہے۔

حامد علی خاں

کریم اُس دن صبح صبح اٹھا۔ مارچ کا اخیر تھا۔ ان کے غریبانہ سے گھر میں بھی گھاس اور نئے پتوں کی بُو سے بسے ہوئے ہوا کے خوشگوار جھونکے ٹھہر ٹھہر کے آ رہے تھے۔ کریم نے نہا کے کپڑے بدلے۔ شاید جمعہ تھا۔ اپنی بڑھیا ماں سے کہا "بی بی" (وہ اپنی ماں کو اپنے مرحوم ماموں کی طرح بچپن سے بی بی ہی کہا کرتا تھا) "مجھے جلدی جلدی ایک روٹی ڈال دو۔ اگر شکر ہو تو تھوڑی سی دے دینا۔ مجھے آج جلدی جانا ہے۔ وہ ہے نا نیا مکان بابو رحیم بخش کا، اس کا کام میرے ہی سپرد ہے۔"

ماں نے تھوڑا سا آٹا گوندھ رکھا تھا اور آگ جلا رہی تھی۔ رات کو کہیں چولہا ننگا رہ گیا تھا اس لئے اوس سے بھیگ گیا تھا۔ رات کی آدھی جلی ہوئی لکڑی بھی کچھ کچھ گیلی سی تھی۔ اس لئے بیچاری پھکنی سے ہوا تو دے رہی تھی مگر دھوئیں کے سوا اور کچھ بنتا نہیں تھا۔ کریم ایک ساعت تک تو دیکھا کیا پھر چولھے پاس جا ماں سے پھکنی لے لی اور دو ایک جوان سانسوں سے پُر زور پھونک ماری۔ آگ جل اٹھی۔ ماں نے بھیگی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے کچھ فخر بہ خوشی سے کہا "نہ بیٹا تو نہ کپڑے خراب کر، اٹھ جا چارپائی پر بیٹھ۔ میں ابھی تیری روٹی لاتی ہوں۔" روٹی کھا کے وہ اندر سے اپنی تھاپی اور رلیسولی نکال لایا اور ماں کو سلام کر کے کام کو چل دیا۔

کریم تیرہ برس کا تھا جب اس کا باپ انتقال کر گیا تھا۔ وہ اس وقت پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ماں کے پاس تھوڑا سا اندوختہ اور کچھ گہنا تھا۔ کچھ عرصہ تو کریم کو پڑھاتی رہی مگر دو سال کے بعد بالکل استطاعت نہ پا کر ناچار سکول سے اٹھوا لیا اور اُس کے باپ کے کام میں لگا دیا۔ اب وہ دونوں اپنے چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے جو شہر کے جنوب مشرقی گوشے میں تھا۔ محلہ کو املی محلہ کہتے تھے۔ شاید کبھی یہاں دو ایک املی کے پیڑ رہے ہوں گے۔ محلہ کے اکثر مکان یک منزلے اور مختصر سے تھے۔ گلیاں پیچ در پیچ اور تنگ تھیں۔ اکثر گلیوں کی نالیاں عین درمیان سے گزرتی تھیں۔ کئی دفعہ آتے جاتے لوگوں کے بازو یا کاندھے ایک دوسرے سے بھڑ جاتے تھے۔ اور یہ تو روزمرہ کی بات تھی کہ گلیوں میں چونکہ موڑ

بہت تھے اور بعض موڑ دائیں بائیں فوراً ہی گھوم جاتے تھے اس لئے جلدی سے موڑ مڑنے والے اشخاص ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے تھے۔ مکانات اکثر چکنی مٹی سے پیے ہوئے تھے اور اجنبیوں کے لئے اگر کوئی شناخت کی صورت ہو سکتی تھی تو وہ یہ تھی کہ بعض گھروں پر بالاخانے بھی تھے اور بعض کی دیواروں پر یا کہیں کونے پر کسی مٹکے کے پیندے یا مٹی کی بڑی ہنڈیا میں ناز بو، یا گلو، یا موتیا کے پودے لگے ہوئے تھے +

کریم اپنے گھر سے نکل، دو ایک مکان گزر، بائیں طرف کو گھوما۔ گلی میں کیچڑ تھی۔ اس لئے بیچ بیچ کے چلتا تھا۔ دوسری گلی کچھ صاف تھی اور نالی کے دائیں طرف کا رستہ قدرے چوڑا تھا، وہ اسی پر ہو لیا۔ اس کے دائیں ہاتھ کے گھروں کے دروازے کھلے تھے اور ان کے چھوٹے چھوٹے صحن نظر آسکتے تھے + کریم ایک معمار ہونے کے باوجود اپنے تئیں معماروں، بڑھیوں، اور کسانوں سے الگ سمجھا کرتا تھا۔ کچھ تعلیم کا اثر، کچھ ماں کی تربیت کا اثر، کچھ غربت، کچھ اپنی فطرت، جس نے اُسے خوبصورت چیزوں سے انس رکھنا سکھایا تھا۔ محلے کے اکثر لوگ مزدور یا بڑھئی وغیرہ تھے اس لئے کوئی خاص پردہ نہیں کرتے تھے مگر کریم ایسی سادہ طبیعت کا مالک تھا کہ اس نے کبھی کوشش سے لوگوں کے گھروں کے اندر جھانکا نہ تھا + کچھ لوگ شہر سے باہر کھیتی باڑی بھی کرتے تھے + گاؤں میں عام طور پر بھی ہر شخص اپنے کام میں ایسا مصروف نظر آتا تھا کہ کسی کو نہ فرصت تھی نہ تجسس کہ ٹھہر کر گھروں میں جھانکتا پھرے + کریم تو بجز اپنی خاص گلی کی مُسن عورتوں کے جن میں وہ پیدا ہوا، کھیلا اور بڑھا اور چند ہم سن لڑکیوں کے جن کے ساتھ وہ بچپنے میں کھیلا کرتا تھا اور جو تقریباً سب بیاہی جا چکی تھیں کسی غیر عورت سے کبھی ہم کلام بھی نہ ہوا تھا اگرچہ اب وہ اکیس سال کا ایک خوش شکل، جوان اور تندرست لڑکا تھا مگر اتنا شرمیلا کہ گلی میں اگر کہیں دو یا تین عورتیں راستے میں کھڑی باتیں کر رہی ہوتیں تو وہ گلی چھوڑ دیتا +

ایسے ہی بائیں ہاتھ میں تھالی اور لسبولی پکڑے نیچی نظر کئے جا رہا تھا کہ اس کے پاؤں کے نیچے ایک موتیا کا پھول آتا آتا رہ گیا + کریم کو موتیا بہت پسند تھا۔ جب وہ چھوٹا تھا تو ان کے اپنے گھر میں دو موتیا کے پودے ہوا کرتے تھے اور اس کی ماں صبح اٹھ کر موسم بہار میں جب پھولوں کو توڑتی تو دو ایک پھول ضرور کریم کو دیا کرتی تھی۔ اب اگرچہ نہ وہ پودے ہی تھے نہ پھول مگر کریم کو موتیا سے وہی انس تھا + اُس نے وہ پھول اٹھا لیا۔ سوچا یہ کیسے یہاں آیا۔ یونہی اوپر نظر اٹھائی تو دیوار پر ایک گھڑے کے پیندے میں اسے موتیے کا پھولوں سے لدا ہوا پودا دکھائی دیا۔ ابھی اس کی نظر وہاں سے ہٹی نہ تھی کہ اسے ایک گندمی ہاتھ پھول توڑتا دکھائی دیا۔ اس نے نظر ہٹالی۔ پھول کو سونگھتا ہوا آگے بڑھا تو بے اختیار اور غیر شعوری طور پر نگاہ دائیں طرف پھر کر کھلے ہوئے دروازے سے اندر گزر گئی اور چونکہ دروازے کے ساتھ ہی گلی پھر دائیں جانب کو مڑ جاتی تھی اس لئے اُسے اس چھوٹے سے صحن کا کافی حصہ نظر آ گیا۔ اور ساتھ ہی پھول توڑنے والی کی ایک جھلک +

لڑکی اُسی طرح کھڑی پھول توڑ رہی تھی نہ تو اسے معلوم تھا کہ پھول نیچے گر پڑا ہے اور نہ یہ کہ کسی نے اُٹھا لیا ہے اور وہ ایک چھپلتی ہوئی نظر ان کے صحن میں ڈال گزر رہا ہے۔ جو کچھ کریم نے دیکھا وہ ایک جوان لڑکی کے کالے بال اور کالی اور بھری ہوئی چوٹی تھی جو اس کے سفید سادہ سے دوپٹے کے نیچے سے بھی جھلک رہی تھی اور اس کی کمر کا خم تھا جو اس جیسے انجان کی سرسری نگاہ سے بھی نہ چھپ سکا۔ اس کا جسم خوبصورت اور قد خوب کھنچا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کریم گزر گیا۔ اتنی جلدی، کہ اور کچھ نہ دیکھا۔ دیکھا تو فقط دوپٹہ جو آ

سر سے ذرا ڈھلک گیا تھا۔ مگر اُس نے اِس موتیا کے پھول کو اور احتیاط سے پکڑ لیا اور بغور اسے دس ایک قدم تک دیکھا کیا۔

معاً اسے خیال آیا کہ مجھے کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ اس نے اِدھر، اُدھر چاروں طرف دیکھا۔ اتفاق سے اور سویرا ہونے کی وجہ سے کوئی اس جگہ موجود نہ تھا۔ اُس کے دل کو تسلی ہوئی۔ سوچنے لگا کہ یہ لڑکی کون ہے، کس کا گھر ہے، شاید کسی گوجر کا ہو گا، مگر وہ لڑکی تو گوجروں کی لڑکی نہیں معلوم ہوتی، وہ تو ذرا اچھے گھر کی لڑکی دکھائی دیتی ہے جیسے مثلاً ان شیخ صاحب کے گھر کی ہو جنہوں نے ابھی مہینہ ہوا ہی صحن میں فرش کرایا تھا، مگر نہیں تو کپڑے تو سادہ ہی تھے۔ چوٹی کیسی خوبصورت تھی اور لمبے لمبے بال، اس کی کمر پر پڑی ہوئی چوٹی کیسی اچھی لگتی تھی۔ وہ گلیاں ٹاپتا گیا اور یہ خیالات بہت سرعت سے آتے گئے اور مٹتے گئے۔ پھر یک دم شرما گیا کہ کسی لڑکی کے متعلق وہ یوں بیباکانہ اور شوق سے سوچ رہا ہے۔

اس کے کرتے کی جیب پہلو میں تھی، خیال کیا کہ پھول کو کیا کیا جائے، پھول موتیا کا تھا، موتیا اِسے بے انتہا پسند تھا موتیا کا پھول اتنا اچھا پھول کیا وہ پھینک دے؟ اور پھر ایسی اچھی خوشبو، ایسی نازک پنکھڑیاں اِتنی گول سی لوٹی، اسے پھینک دے؟ نہیں۔ تو پھر اسے رکھے کہاں؟ جیب میں تو ہے چابی اور وہ بھی بھدی سی میلی، دیسی تالے کی۔ تو کیا پگڑی میں؟ مگر کہاں؟ شملہ میں؟ یا اوپر یا کہیں پیچوں میں؟ اوہ! قمیص کے نیچے صدری جو ہے، اس کی جیب میں اور کچھ ہے بھی نہیں اور پھول محفوظ بھی رہے گا۔ اس لئے کریم نے نہایت احتیاط سے اِس موتیا کے پھول کو، جس کی خوشبو اسے اتنی پسند تھی، جس کا رنگ اسے اتنا پسند تھا، اتنا پیارا لگتا تھا، اس پھول کو نہایت احتیاط سے دائیں بائیں دیکھ کر اپنی صدری کی جیب میں رکھ لیا۔

دوپہر کے بارہ بج گئے۔ بابو رحیم بخش کے مکان پر دو معمار اور بھی کام کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ ڈھیلے پڑنے گئے۔ اس وقت کھانے کے لئے چھٹی ہو جایا کرتی تھی۔ ایک بوڑھا مستری بھی کام کر رہا تھا۔ وہ بار بار ایک جوان، خوش شکل سے مستری کی طرف دیکھتا جو اپنے کام میں مشغول اینٹوں پر اینٹیں جڑ رہا تھا۔ تیسرے راج نے دو اینٹیں اور لگا کر ہاتھ روک لیا اور بوڑھے راج سے کہا "کیوں بھئی بھوک نہیں لگی"۔ اس نے کہا "میاں کریم آج جمعہ ہے"۔ کریم نے جواب دیا "اوہو آج تو واقعی جمعہ ہے۔ لے لو، یہ بس ہے اور آخری اینٹ اپنے کونے میں جڑ، اوزار صاف کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بوڑھا مستری تو وہیں حقہ کھینچ کش لینے لگا مگر باقی دونوں معمار، کریم اور دوسرا کپڑے جھاڑتے ہوئے پاڑ سے اُترنے لگے۔

کریم سیدھا گھر کو ہو لیا۔ لمبے لمبے قدم اٹھاتا اپنے محلے سے گزر رہا تھا کہ ایک موڑ پر اسے دُور سے تین چار عورتیں کھڑی ہوئی نظر آئیں۔ اسے بڑی گھبراہٹ ہوئی اس امر سے اور بھی کہ یہ وہی موڑ تھا جس کے پاس اسے وہ پھول صبح کو پڑا ملا تھا۔ اس کا ہاتھ اٹھ کے سینہ تک آیا اور اُس نے صدری کو ٹٹولا۔ ٹھیک، پھول تو وہیں تھا۔ مگر اس جگہ سے گزر کیسے جائے وہ تو بیچ راستے میں کھڑی ہیں۔ انہیں کیسے کہا جائے کہ راستہ دے دو۔ یہ تو جس جگہ کھڑی ہو جائیں ہٹا ہی نہیں کرتیں۔ مگر اب وہ اس مکان کو کیسے دیکھ سکے گا۔ اب وہ لڑکی کیسے نظر آئے گی۔ اب تو دوسرا راستہ بھی پیچھے رہ گیا۔ اور، یہ لو انہوں نے دیکھ بھی لیا، شاید وہ بھی انہیں میں کھڑی ہے۔ وہ تو شاید باتیں بھی اسی کے متعلق کرنے لگ گئی ہیں۔ اُس نے جلدی سے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی، کپڑے تو میلے نہیں ہیں۔ آج ہی تو بدلے تھے پگڑی بھی صبح ہی باندھی تھی۔ اب تو بالکل دس قدم رہ گئے۔ اب نظر کیسے اٹھے گی۔ اب یکھا کدھر جائے گا۔ یہ گلی سیدھی بھی جاتی ہے مگر سامنے تو محلہ کی مسجد ہے۔ اوہو! جمعہ

آکر پڑھنا ہے۔ بہت دن ہوئے نماز بھی نہیں پڑھی، کتنی بُری بات ہے، بی بی روز ہی تو کہتی ہے کہ بیٹا اب تو نماز چھوڑ نا جاتا ہے نہیں نماز ضرور پڑھنی چاہیئے، ابھی واپس آتا ہوں اب سے باقاعدہ پڑھا کروں گا مسجد بھی تو پاس ہی ہے بلکہ راستے ہی میں ہے، کیسی اچھی بات ہے۔ باقاعدہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کروں گا۔ ان نیک ارادوں سے دل کو مضبوط کر کے کریم اس جگہ سے گزر تو گیا مگر اُس کا منہ سُرخ ہو رہا تھا۔

بیس منٹ کے بعد کریم کھانا کھا کے مسجد کو آیا۔ دل میں ارادہ تھا کہ خواہ کچھ ہو اب ضرور کوشش کروں گا اسے دیکھنے کی۔ دروازہ تو اُن کا کھُلا ہی رہتا ہے اور شاید اب وہ عورتیں وہاں ہوں گی بھی نہیں۔ کریم جب اُس مکان کے نزدیک آیا تو دیکھا کہ واقعی اب جگہ صاف ہے۔ پہلے تو اُس نے گردو پیش دیکھا اور پھر اوپر، تمام جگہ سنسان تھی جیسے کوئی بستا ہی نہیں۔ مسجد کی طرف مُڑنے لگا تو اُس کمال تہور سے اُس گھر پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ مگر وہاں اسے کوئی فردِ بشر دکھائی نہ دیا۔ اسے بہت مایوسی ہوئی۔ ساری نماز کا مزا کرکرا ہو گیا مگر وہ جلدی جلدی نماز ختم کر کے سب سے اول مسجد سے نکلا کہ اب تو دروازہ بالکل سامنے ہوگا، اب تو مڑنا نہیں پڑے گا۔ اب تو اچھی طرح دیکھنے کا موقع مل ہی جائے گا۔ وہ جلدی جلدی آ رہا تھا کہ عین موڑ پر اُسے ایک لڑکی دائیں طرف کے کسی گھر سے نکلتی ہوئی ملی۔ بس کریم کا اور اس کا ایک بالشت کا فرق ہی رہا ہوگا کہ کریم رُک گیا ورنہ دونوں آپس میں ٹکرا جاتے۔ کریم گھبرا سا گیا۔ اتنی عمر میں کسی اجنبی لڑکی سے اتنا قرب کبھی حاصل نہ ہُوا تھا۔ اسے کچھ نہ سوجھا، وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا لڑکی کو دیکھا تو اس کی آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا اور وہ آنکھیں اتنی جاذب تھیں کہ جب تک وہ کریم کو دیکھا کیں وہ وہیں بت بنا کھڑا رہا۔ اسے بعد میں یہ بھی یاد نہ رہا کہ آنکھیں بھوری تھیں کہ کالی۔ ان کی چمک ہی ایسی تھی کہ وہ اور کچھ دیکھ ہی نہ سکا۔ کوئی خط و خال پہچان نہ سکا اور یہ سب کچھ دو لمحوں میں ختم بھی ہو گیا۔ وُہ لڑکی اُسی گھر میں داخل ہو گئی اور جب کریم نے اُس کی پشت کو دیکھا تو اسے وہی لمبی سیاہ چوٹی، وہی کمر کا خم نظر آیا۔ اُس نے پہچان لیا کہ یہ وہی پھول والی لڑکی ہے۔

بعد میں اُسے یاد آیا کہ اس کا رنگ نکھرا ہُوا گندمی تھا، نقشے نازک اور خوش ساخت تھے۔ جسم گدرایا ہُوا تھا۔ کپڑے بالکل سادہ تھے اور وہ ننگے پاؤں تھی۔ شام کو جب کام سے واپس آیا تو دل میں دعائیں مانگتا آیا کہ ایک دفعہ اور نظر آ جائے مگر سوائے دیواروں اور موتیا کے پودے کے اسے کچھ نظر نہ آیا البتہ ان کے گھر سے دھوأں ضرور اُٹھ رہا تھا۔ اگرچہ اس نے اس شام مغرب کی نماز باجماعت ادا کی مگر اس عبادت سے اسے کوئی خوشی نصیب نہ ہوئی اور نہ رات کو بستر پر لیٹتے وقت اسے پہلے جیسی بے فکری اور سکون ہی حاصل تھا۔

رات کو دیر تک سوچتا رہا کہ یہ ہیں کون لوگ، زمیندار تو لگتے نہیں، زمینداروں اور ان کی لڑکیوں کو کیا کبھی دیکھا نہیں؟ کچھ بھی ایک دوسری میں فرق نہیں ہوتا، سب کی سب بھاری، بھر کم ہوتی ہیں موٹی موٹی چادریں لئے ہوئے تنگ پائنچے کی شلواریں اُف! مگر یہ لڑکی تو بہت ستھری اور خوش وضع تھی۔ اور آنکھیں تھیں کہ غضب! مگر بھلا اس کا نام کیا ہوگا؟ یہ کیسے معلوم ہو؟ نام تو ضرور ہی اچھا ہوگا یہ نہیں کہ غلام فاطمہ، زینب، ریشم بی بی اور جانے کیا کیا۔ یہ بھی کیا نام ہوئے؟ مگر اس محلے میں تو اور کوئی بڑے لوگ رہتے

ہی نہیں اور پاؤں بھی تو ننگے تھے، تو ہُوا کیا بھدّے بھی تو نہیں تھے۔ بہت ہی تو اچھے تھے، اور جسم کتنا سیدھا تھا اور کمر میں لچک کتنی تھی جب وہ دروازے میں داخل ہو رہی تھی تو بایاں پاؤں پہلے اندر رکھا تھا اس وقت کمر کا خم کتنا خوبصورت ہو گیا تھا کتنا ہی اچھا لگتا تھا! بھلا اُس کی عمر کیا ہوگی، مجھ سے تو بہت چھوٹی ہوگی، یہی کوئی سترہ سال کی ہوگی، مگر اس کا باپ کون ہے؟ اور یہ آئی کہاں سے ہے؟ پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ اگر یہیں رہتی تھی تو کتنا اندھا تھا میں کہ کبھی دیکھا ہی نہیں۔ آخر اللہ نے آنکھیں دی ہیں تو کیوں نہیں دیکھا۔ اللہ نے خوبصورتی بھی کسی کام کے لئے پیدا کی ہے، مثلاً یہ پھول ہیں یہ موتیا ہی لے لو، اور وہ موتیا، وہ پھول کہاں گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صدری میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صدری تو وہ پہنے ہوئے ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ہے نا وہ پھول ۔ ۔ ۔ ۔ کہیں پس نہ جائے ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا اب صبح ہی سہی ۔ ۔ ۔ ۔ صبح کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

صبح ہوئی تو کریم حسبِ معمول جلد ہی تیار ہو گیا۔ ماں نے تھوڑا بہت ناشتہ دیا۔ روٹی کے دو ایک لقمے کئے، جلدی سے فارغ ہو کر، اوزار لے کام کو روانہ ہو گیا، مگر جوں ہی دوسرا موڑ مُڑا اُس کے قدم سُست ہوتے گئے اور جب وہ اس مکان کے قریب پہنچا تو اور بھی آہستہ چلنے لگا، موتیا کے پودے کو دیکھا، وہاں کوئی نہ تھا، مگر جب دروازے سے اندر جھانکا اور وہ بھی دھڑکتے ہوئے دل سے تو اسے ایک معمر شخص چارپائی پر حقہ پیتا نظر پڑا اور اُس کے پاس ایک عورت، کوئی اور ہی، مگر اس لڑکی کا نام نہ نشان! اس نے فوراً ہی نظر ہٹالی کہ کہیں کوئی یا ان دونوں میں سے کوئی نہ دیکھ لے۔ کام پر پہنچ گیا مگر ایک ایک اینٹ آج دگنے وزن کی محسوس ہو رہی تھی اور پھر اینٹیں جڑنے میں اس جیسے کاریگر نے جو باوجود نوعمر ہونے کے ابھی سے بڑے بڑے کاریگروں جتنی اجرت لیتا تھا، کئی ہی دفعہ تو بھول کی، خیال کہیں تھا، جھنجھلاتا کہ آخر ہُوا کیا۔ یہ بھی کیا لغویت ہے کہ ایک دفعہ دیکھا ہے اور اُس کا خیال جنون بن کر دماغ پر سوار ہے اور وہ جانتی بھی نہیں، پھر خیال آتا کہ اگر اسے معلوم نہیں تو ضرورت ہی کیا ہے، نہ معلوم ہو۔ وہ خود تو اسے دیکھ ہی لیا کرے گا۔ ظہر کے وقت سہی، آج عصر کے وقت ہی سہی۔ کام بھی نہ چھوڑنا پڑے، آخر عصر کی نماز بھی تو پڑھنی ہوتی ہے اور یہ بھی کیا اچھی بات ہے کہ مسجد بھی بالکل نزدیک ہی ہے اور یہ بھی کتنی خوش قسمتی ہے کہ کام بھی نزدیک ہی ملا ہُوا ہے۔ کوئی دو ایک مہینے تو رہے گا، مکان بڑا ہے؛ پھر مغرب کا وقت ہے، تو نام کیا ہُوا اس کا، یہ اینٹ بھی کس قدر خراب ہے، دیکھ کے نہیں لاتے کم بخت! (مزدور سے) اوغلامُو! یہ اینٹیں دیکھ کے لایا ہے، یہ دیکھ بالکل ہی کچی ہے اور سوکھی اور یہ بالکل ہی جلی ہوئی پتھر کی پتھر! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بے ربط سے خیالات اُس کے دل میں آتے اور گزر جاتے مگر اسے قرار نہیں تھا یہی سوچتا کہ اب چھٹی ہو تو پھر ادھر سے گزروں، اب تو دیکھ ہی لوں گا، وہ جو بوڑھا تھا اس کا باپ ہے؟ کون ہے؟ یہ آدمی کبھی دیکھا نہیں، شاید کبھی دیکھا ہو، نام کیا ہوگا؟ اور کام کیا کرتا ہے؟ اب میں پوچھوں کس سے، پھر خیال آتا کہ پہلے اسے دیکھا تو جائے، ابھی تو اچھی طرح دیکھا بھی نہیں مگر جسم کس قدر خوبصورت ہے کتنا پیارا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دوپہر کو جب اس گھر کے نزدیک پہنچا تو اسے ایک چال سوجھی، اچانک ———، عین ان کے دروازے کے سامنے جھکا، اپنا جوتا اتار کر اسے جھاڑا، اندر ہاتھ ڈال کر دیکھا کہ صاف ہے یا کوئی کنکر وغیرہ ہے اور پھر پاؤں ہاتھ سے صاف کر کے جوتا پہننے

لگا۔ جس وقت پاؤں جھاڑ رہا تھا اس نے مکان کی طرف نظر پھرائی، اُس کا جوتا وہیں کا وہیں رہ گیا۔ اندر سے وہی لڑکی نہایت غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی نظر میں پہچان تھی۔ کریم کا یہ حال ہُوا گویا کسی نے کوئی جرم کرتے اسے پکڑ لیا ہو، جوتی گھسیٹ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ حالت یہ تھی کہ پسینہ چھوٹ گیا۔ دل دھک دھک کرنے لگ گیا۔ بغیر پیچھے دیکھنے کے سیدھا گھر پہنچا۔ اُس دن اسے جرات نہ ہوئی کہ نماز کے لئے مسجد میں جائے۔ دوسرے رستے سے کام پر پہنچا اور شام کو جب دل کو بہت سی ڈھارس دے کر اسی راستے سے گھر پہنچا تو اسے راستے میں کوئی نہ ملا۔ مگر کب تک! دوسرے دن جب پھر ادھر سے گزر ہوا تو مونیا کے بوٹے کو بھی دیکھنا پڑا اور وہاں وہی لڑکی کھڑی تھی اور اس دفعہ تو نیچے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ شرما تو گیا مگر اتنا نہیں کہ بھاگ کھڑا ہو۔ چار قدم پرے وہ موڑ مڑتا تھا۔ اب کی بھی اُس نے مکان کے اندر نظر ڈالی اور دیکھا کہ چارپائی گھسیٹ کر دیوار کے قریب کی گئی ہے اور لڑکی اس پر کھڑی ہے۔ مگر گردن پھرا کر دروازے کی طرف یعنی اس کی طرف بھی دیکھ رہی ہے۔ کریم کو گھبراہٹ تو ہوئی مگر خوشی سے ملی ہوئی کہ اب تو اُس نے بھی دیکھ لیا ہے اور خود میں نے بھی اسے اچھی طرح دیکھ لیا ہے اور اب تو ایک ایک نقش یاد ہو گیا ہے۔ جی چاہا کہ ایک دفعہ بس ایک دفعہ ایک منٹ کے لئے یونہی کسی بہانے سے پھر ادھر سے گزرے دم بھر کے لئے رکا بھی مگر جرات نہ پڑی۔ برابر چلتا گیا اور کام پر پہنچ گیا۔

بس پھر تو معمول ہو گیا۔ صبح کو، دوپہر کو، شام کو وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لیتے۔ صبح تو مونیا کے بوٹے کے پاس جس کی بدولت دو ایک دن بعد کریم کو روزانہ ایک پھول وہاں سے ملنے بھی لگ گیا۔ یعنی اتفاقیہ! جب وہ مکان کے قریب پہنچتا تو ایک آدھ پھول ضرور اوپر سے آ گرتا اور جب کوئی گلی میں نہ ہوتا تو وہ ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیتے۔ اچھی طرح سے۔ شوق سے۔ اور دوپہر کو دروازے پر یا موڑ پر یا گھر کے اندر سے ان کی آنکھیں ضرور دوچار ہو جاتیں۔ البتہ شام کو کبھی اتفاق ہوتا اور کبھی نہیں۔ اور جب کریم کو کام سے آتے دیکھنے کا موقع نہ ملتا تو وہ ضرور نماز مسجد میں باجماعت پڑھتا اور سب سے اول فارغ ہو کر واپس چلا آتا۔ اکثر ایسا اتفاق ہو جاتا کہ وہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ٹکراتے بچ جاتے۔

ماں بہت خوش ہوتی کہ کریم نمازی ہوتا جاتا ہے اور کام پر بھی بہت باقاعدہ جاتا ہے، مگر کبھی کبھی صبح اور دوپہر کے وقت کریم کے جلدی جلدی کھانا کھانے سے جھنجھلاتی بھی مگر کریم یہی کہتا کہ کام بہت ہے، جلدی جانا ہے، نماز پڑھنی ہے اور کبھی وہ دو ایک لقمے آہستہ آہستہ منہ میں ڈال کر، پھر جلدی شروع کر دیتا، مگر وہ کیا سمجھتی کہ اسے آج کل کیوں اس قدر جلدی کی عادت ہو گئی ہے۔ ہفتے کے ہفتے کریم کو ساڑھے سترہ روپے اڑھائی روپے روزانہ کے حساب سے ملتے جو وہ پورے کے پورے اپنی ماں کو دے دیتا۔ اس لئے بھی ماں کو یہ خیال نہ آتا کہ کریم اب کیوں گھر میں نہیں ٹھہرتا۔ جب کبھی جمعہ کو دو ایک گھنٹے کی چھٹی ہوتی تو کریم بس ایک پل کے لئے ہی گھر آتا، دو ایک نوالے منہ میں ڈال یہ جا وہ جا، یا کبھی نماز ہو جاتی، یا کسی نئے مولوی کا وعظ یا کوئی جلسہ۔ ماں کو اس پر بھی حیرانی نہ ہوتی کہ کریم اب کیوں اکثر ایک آدھ اوزار صبح بھول جاتا ہے، حالانکہ اوزار سب ایک ہی جگہ پڑے ہوتے ہیں اور پھر نصف راستے سے واپس آ کر لے جاتا ہے۔

ادھر کریم بیچارے کا دماغ سوچتے رہنے میں بہت خرچ ہوتا۔ ہر وقت کام پر ہو یا فارغ سوتے وقت یا نماز پڑھتے وقت یہی فکر

ہوناکہ اس سے بات کس طرح کی جائے، اس کا نام کس طرح پوچھا جائے۔ اب پندرہ روز گزر گئے ہیں، کئی دفعہ بہت نزدیک سے بھی دیکھا ہے۔ مانا کہ ہر روز ایک آدھ دفعہ، اکثر دو چار مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھ لینے کا موقع مل جاتا ہے مگر ایک دوسرے کے ناموں کا بھی تو پتا نہیں۔ کرے تو کیا کرے، ماں سے پوچھے؟ کیا پوچھے؟ کہ مجھے ایک لڑکی کا نام بتا دے، یا یہ کہ فلاں لڑکی کا باپ کیا کام کرتا ہے؟ مسجد میں وہ ڈھونڈتا کہ شاید کہیں وہ بوڑھا جو اُس کے گھر میں دیکھا تھا نظر آجائے۔ تو کسی سے پوچھا جائے، یوں دوست بھی ہیں، ایک دو تو بہت گہرے دوست ہیں، ان سے بھی کیا پوچھتا پھرے۔ اور پھر وہ رہتے بھی تو محلے کے دوسرے کنارے پر ہیں اور اپنے اپنے کام پر رہتے ہیں۔ . . . .

زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اپنی ماں کے علاوہ کسی اور عورت سے اُسے دلچسپی ہوئی اور دلچسپی بھی ایسی کہ اُس کے سان گمان میں بھی نہ کبھی آئی تھی۔ ہر گھڑی، ہر پل، ہر لمحہ اسی دھیان میں کہ آج اُس نے بادامی دوپٹہ پہنا تھا، بادامی رنگ بھی کتنا خوشنما رنگ ہے، آج اُس کے ہونٹ کیوں اتنے سُرخ تھے؟ دوپہر کا وقت تھا اور وہ دھوپ میں کھڑی تھی مگر اتنے سُرخ ہونٹ، اتنے سُرخ، سانس رُک جاتی تھی خیال کرتے کرتے۔ اور پھر جب وہ مسکرائی تھی تو اُس کے دانت کیا یک لخت چمک اٹھے تھے، اتنے چمکیلے بھی کسی کے دانت ہو سکتے ہیں! یا آج اُس نے فیروزی پھولوں والی چھینٹ کی شلوار پہن رکھی تھی، فیروزی بھی کتنا اچھا رنگ ہے کبھی خیال ہی نہیں آیا اور وہ پھول کتنے خوبصورت تھے اور شلوار اس کی کمر میں کتنی ہی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ آج شاید دوپہر کو گرمی زیادہ تھی، اُس کے گریباں کا بٹن کھلا ہوا تھا، توبہ، توبہ کتنی سفید گردن ہے! اتنی سفید! اتنی سفید بھی کوئی گردن ہو سکتی ہے ..... ایسے چمک رہی تھی جیسے سیپ کی بنی ہوئی ہو . . . .

بس سارا دن اسی ادھیڑبُن میں گزر جاتا۔ روز کریم اپنے آپ سے عہد کرتا کہ آج شام کو اگر وہ نماز سے آتے وقت مل گئی تو اُس کا نام ضرور پوچھ لوں گا۔ مگر جب موقع ملتا تو اسے ایسی چپ لگتی کہ کچھ بن نہ آتا۔ اس کی تمام روح کھنچ کے اس کی آنکھوں میں آجاتی، اپنے جذبات کی تمام کوشش اور قوت سے اسے دیکھتا، سر سے پاؤں تک دیکھتا، ٹھہر بھی جاتا، بھول بھی جاتا کہ کوئی دیکھ رہا ہے کہ نہیں، مگر منہ سے یہ نہ نکلتا کہ تمہارا نام کیا ہے۔ روز اپنے آپ کو کوستا کہ آج تو ذرا ایک سکینڈ کے لئے وہ بھی ٹھہر گئی تھی، یونہی ایک لمحے کے لئے، بس آنکھ کے پلکارے کے لئے اس وقت ذرا آہستہ سے اگر پوچھ لیتا کہ تمہارا نام کیا ہے تو کیا حرج ہوتا۔ وہ تو ضرور ہی بتا دیتی یا شاید نہ بتاتی۔ نہیں تو ضرور ہی بتا دیتی۔ اب تو شاید اسے بھی ذرا سا خیال ہو گیا ہو گا کہ میں کیوں اُس کی طرف دیکھتا ہوں، مگر نہیں جی! اسے کیا خیال ہو سکتا ہے۔ یہ تو اتفاق ہو جاتا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے مل پڑتے ہیں مگر دو تین دفعہ اس نے میری طرف دیکھ کے پھول تو پھینکا ہے! تو اس میں کیا بات ہو گئی، یونہی پھینک دیا یا ہاتھ ہی سے گر پڑا ہو گا . . . . . یہی جواب و سوال دل میں ہوتے رہتے۔

نماز پڑھ کے وہ دعائیں مانگتا: یا اللہ مجھے اس کے گھر والوں کا پتا لگ جائے، یا اللہ اس کا نام معلوم ہو جائے۔ یا اللہ مجھے کہیں سے روپیہ مل جائے، یا اللہ مجھے تو امیر کر دے، یا اللہ مجھے تو اس کی بہت سی محبت دے دے۔ مگر ایک دن اچانک اس نے بہت خشوع سے یہ دعا مانگی یا اللہ تو اس کے دل میں میری محبت ڈال دے، اور پھر اسی دن سے اسے ایک ذوق سا ہو گیا کہ ہاں مجھے وہ چاہنے لگ جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ مجھے وہ پیار کرنے لگے تو کیا حرج ہو گا اس کا۔ نماز کے بعد بہت خلوص سے دعا مانگتا، کبھی سجدہ میں گر کے کبھی مسجد

کے کسی کونے میں سب سے علیحدہ ہو کر کہ کوئی سُن نہ لے، کہیں کسی کو پتا نہ چل جائے۔ بہت لجاجت سے وہ دعائیں مانگتا کہ یا اللہ! اسے میری محبت دے، یا اللہ اِس کے دل میں میری محبت ڈال دے، یا اللہ مجھے وہ بہت پیار کرنے لگ جائے، یا اللہ مجھے وہ ہر وقت یاد کرتی رہے: جیسے میں کرتا رہتا ہوں......

جب دعا مانگ کے آتا تو آکے اسے بہت متجسس نظروں سے دیکھتا کہ شاید دعا قبول ہو گئی ہو، یہ خیال نہ آتا کہ اگر ہو جائے تو اسے کیسے پتا چلے گا مگر اسے یقین ہوتا کہ اگر اسے بھی میرے جیسی محبت ہو تو ضرور معلوم ہو جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ معلوم نہ ہو۔ پھر سوچتا کہ نہ سہی پتا چلے مگر اسے محبت ہو تو جائے نا۔ یہ تو نہ ہو کہ میں تو سارا دن اُس کے خیال میں ڈوبا رہوں اور اسے معلوم بھی نہ ہو پھر کہتا کہ اچھا نہ بھی معلوم ہو تو کیا ہے۔ مجھے تو ہے نا۔ اس کا ذمہ تو میں نے نہیں لیا، اسے نہ معلوم ہو اور اسے ہو بھی کیسے؟ میں کوئی خوبصورت نہیں ہمارے محلے میں بھی تو کئی جوان اور خوبصورت لوگ ہیں، جو اس کے گھر کے قریب ہی رہتے ہیں جنہیں وہ ہر روز دیکھتی ہے، اُس کے بھی تو رشتہ دار ہوں گے نا، ابھی پرسوں اُن کا سارا گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا، کتنے ہی آدمی تھے، سارا دن مجھے دکھائی بھی تو نہیں دی شام کو کہیں یونہی ایک جھلک دیکھی تھی، سارا دن ہی ضائع ہو گیا! اتنے لوگ تھے، رشتہ دار ہوں گے اور کون ہو سکتا ہے؟ اب بہت دن گزرتے جاتے ہیں، پتا تو لینا چاہیے، کس سے پوچھوں، بی بی سے اس سے کیا پوچھوں؟ یہی پوچھ لوں گا کہ کل پرسوں محلے میں ایک جگہ بہت سے لوگ اکٹھے تھے کیا بات تھی، مگر اسے کیا پتا ہو گا۔ بی بی تو نہیں گلی ہی میں آتی جاتی ہے، اسے کیا پتا یہ کون ہیں اور ان کے گھر میں کیا ہو رہا تھا۔

ایک شام تو وہ بیہوش ہی ہونے کو تھا مغرب کی نماز پڑھ کے وہ حسب معمول جلدی جلدی گھر آ رہا تھا کہ اسی موڑ پر وہ لڑکی سامنے سے آتی ہوئی اس طرح اس سے بھڑ کر گزری کہ اس کا رواں رواں تھرک اٹھا۔ اسے اتنی حیرانی ہوئی کہ وہ کچھ کہہ نہ سکا مگر اُس کے رگ و ریشہ میں آگ دوڑ گئی۔ گھر وہ جوں توں کر کے پہنچ تو گیا مگر باوجود دن بھر کام کرنے کے وہ بہت عرصہ تک رات کو بالکل نہ سو سکا۔ اس پل بھر کے لمس نے اس کے بہت سے نامعلوم محسوسات کو جگا دیا اُس وقت سے یہ خیال بھی اُس کے دل میں جگہ پا گیا کہ یہ مجھے کسی طرح مل جائے میں کسی طور سے اسے پا لوں، میں کسی طریقے سے اسے اپنا بنا لوں، رات بھر سوچتا رہا اگر کوئی ترکیب کوئی ذریعہ ایسا نہ ملا جس کی بدولت اس کی شادی اس سے ہو سکے۔ بی بی سے وہ کیسے کہے کہ میری شادی ہاں کر دو شرم کے مارے مر ہی نہ جائے، اور اگر بی بی کو پتا بھی چل جائے تو روپے کہاں سے آئیں مانا کہ دو سال سے اس کی روزانہ اجرت اٹھائی روپے ہو گئی مکان تو تمام تر اسی کی نگرانی میں بنے اور چونکہ حساب وغیرہ بھی جانتا تھا اس مزید کام اور بعض دفعہ منشی گری کے بھی کہیں سے بیس پچیس روپے زائد مل جاتے تھے مگر بی بی کے سر پر قرضہ بھی تو تھا اور اگر کچھ جمع بھی کیا ہو، جس کا اسے علم نہیں تو اتنا تو ہرگز نہیں ہو گا کہ شادی ہو جائے اور جب کریم شادی کے متعلق سوچتا تو اُس کے دل کی حرکت تک بند ہوتی معلوم ہوتی۔ مگر اسے پتا نہیں کہ وہ ہیں کون اسے لڑکی دینا پسند کریں نہ کریں۔ نہ کوئی اُس کی جائداد تھی نہ زمین، صرف وہ مختصر سا مکان تھا نہ کوئی امیر رشتہ دار ہی تھا......اپنی مایوسی اور بے بسی کے باعث اور اس اور بھی کہ اُس کے متعلق اسے کچھ بھی علم نہ تھا اسے رات بھر بہت کاوش ہوئی۔ ڈر کے مارے کہ کہیں بی بی نہ جاگ اٹھے کروٹیں بھی نہ لیتا اور ایک طرف پڑا پڑا تھک بھی جاتا۔ جی چاہتا کہ باہر چلا جائے کہیں پھر پھرا آئے مگر اس خوف سے کہ کہیں بی بی کی نیند کھل گئی تو دیکھ کے کیا کہے گی، وہیں لیٹا رہا۔

صبح اٹھا ہاتھ منہ دھو کر ابھی ناشتہ نہیں کیا تھا کہ ماں نے پوچھا بیٹا رات تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں تھی۔ اچھی طرح سوئے نہیں کریم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، کہنے لگا بی بی نہیں تو میں تو اچھی طرح سویا تمہیں کیوں خیال آیا، ماں نے کہا نہیں تو تم بہت رات تک بے آرام رہے میں جانتی

ہوں جس طرح تم سوتے ہو، رات تم بہت دیر تک سیدھے ہی لیٹے رہے۔ کریم نے کہا اچھا! مجھے تو خیال نہیں تھا! کچھ یونہی سوچ رہا ہوں گا۔ ماں نے اور کچھ نہ پوچھا مگر اس استفسار نے اس کی ہمت اور بھی پست کر دی۔ اس سے پہلے تو شاید ماں کو کچھ پوچھ ہی بیٹھتا اب حسب معمول جلدی جلدی روٹی کھا کے ویسے ہی چل دیا۔

مگر چہرہ بشاش نہیں تھا۔ ماں نے جاتی دفعہ پھر غور سے کریم کو دیکھا مگر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ موتیا کے پاس جب پہنچا تو وہاں کسی کو نہ دیکھا۔ اندر نظر دوڑائی تو لڑکی کے بجائے دو شخص آپس میں باتیں کرتے نظر آئے۔ کریم اور بھی افسردہ خاطر ہوا۔ دوپہر بھی یونہی گزری مگر شام آئی تو ایسی کہ سارے دن کو رنگین بنا گئی۔ شام کے دھندلکے میں وہی ایک روشن لمحہ تھا، مگر فقط ایک لمحہ، وہی جگہ تھی، وہی در و دیوار مگر اُسے کچھ یاد نہ رہا، نمازی بھی یاد نہ رہے، محلہ دار بھی یاد نہ رہے۔

ایک لمحہ مگر ایسا طویل لمحہ! ایک سکینڈ کے لئے اُس کے پاؤں کریم کے سامنے آ کر رک گئے، اُس کا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے چھو گیا، کریم کے سارے عزائم کمزور، تمام منصوبے فراموش ہو گئے۔ خیالات، ارادے، خواہشات ایک دوسرے میں جذب ہو کر، اس کے دماغ پر دھند بن کے چھا گئے۔ اور یہ سب کچھ اس سرعت سے ہوا کہ اس لمحے کے بہت تھوڑے حصے میں کریم بت بن کے رہ گیا۔ آخر اُس نے کہا "بولتے ہی نہیں؟" کریم سے بمشکل ادا ہو سکا "جی، مگر پہلے اپنا نام بتا دیجئے" "نام! بس!!" اور پھر ایک متحیر وقفہ کے بعد "سکینہ"! یہ تھا وہ لمحہ! اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ کریم کے لئے کچھ ایسا جنون انگیز تھا کہ وہ مدت تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کس طرح ہوا۔ مگر ایسے محسوس ہوا کہ دو بجلیاں ایک پل کے لئے اسے لپٹ گئی ہیں۔ اور پھر! وہی گلی! وہی دیواریں ہوئی مکان اور کریم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس رات کریم بہت دیر سے واپس لوٹا۔ وہ رات عجیب جذبات کی رات تھی۔ کریم نے نہ کبھی ایسی رات دیکھی تھی اور نہ پھر اسے کبھی ایسی رات نصیب ہوئی۔ اس کا خون شعلے بن بن کے اس کے دل میں جا رہا تھا۔ اس کا دماغ خیالات کی یورش سے بے بس ہو رہا تھا، جذبات طوفان کی طرح اٹھتے تھے اور کریم کے لئے اپنے حواس قابو میں رکھنا مشکل ہو ہو جاتا تھا، مگر ایسی رات اسے پھر کبھی نصیب نہ ہوئی +

دوسرے دن کی صبح ہی مختلف تھی، اس کے بعد ہر صبح ہی مختلف تھی۔ موتیا کا بوٹا بھی وہیں تھا، ان کا دروازہ بھی وہیں تھا، پھول بھی کھلتے تھے مگر کریم نے وہ ہاتھ، وہ چہرہ وہ جسم پھر کبھی نہ دیکھا۔ صبح ہوتی تھی، دوپہر ہوتی تھی، شام بھی ہوتی تھی مگر وہ مسکراہٹ، وہ لچک، وہ آواز پھر کریم کو کبھی نصیب نہ ہوئی +

آسمان زمین سبھی موجود تھے، مگر سکینہ معلوم نہیں کہاں چلی گئی تھی، دن پر دن گزرتے گئے، کریم پاگل سا پھرتا رہا، اُس گھر کے بیسیوں چکر لگاتا رہا۔ مگر وہ شکل اسے پھر نظر نہ آئی۔ کھانا بھول گیا، کام تک بے قاعدہ ہو گیا، مگر وہ شام پھر نہ آئی۔ ماں بے چین ہو گئی، سب دوست حیران رہ گئے، مزدور، راستری تک بھی آپس میں چہ میگوئیاں کئے بغیر نہ رہ سکے۔ مگر کریم نہ دیکھنے والی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا اور کرتا۔ اسے اپنے ذہنی عذاب ہی سے فرصت کہاں ملتی کہ اور چیزوں کی طرف توجہ دے سکتا، جو اس کی موجودگی میں یہ نہ معلوم کر سکا کہ وہ کون ہے، وہ اُن کے جانے کے بعد کیا کسی سے پوچھتا کہ وہ کون تھی؟ کہاں چلی گئی؟ اس کا کون

جواب دیتا؛ اُس کے خیالات اُس کے دماغ کو جھلس دیتے۔ مگر اپنے فطری ضبط کے باعث وہ کسی سے کچھ نہ پوچھتا +
سب حیران تھے۔ مگر کریم کے دل میں جو تاریکی تھی اس کا کسی کو علم نہ تھا۔ کریم کی صدری میں جو خشک موتیا کے کچھ پھول تھے وہ کبھی کسی نے نہ دیکھے۔ کریم کو بھی سمجھ آتے آتے ہی آئی، مدت کے بعد ہی اس کے دل نے فیصلہ کیا کہ شاید وہ یہاں کی رہنے والی ہی نہ ہوگی، شاید کہیں سے مہمان بن کے ہی آئی ہوگی اور دس پندرہ دن رہ کے اسی بوڑھے کے ساتھ واپس چلی گئی ہوگی۔ مگر اس شام کو، جو آگ وہ اس کے سینے میں لگا گئی تھی، کبھی نہ بجھی +

فیاض محمود

غزل

میں گردشِ جامِ شہادت ہوں۔ مرہونِ صلائے عام نہیں
فرہاد کا خونیں افسانہ ہوں شیریں کا پیغام نہیں

آفات کی بجلی کوندتی ہے۔ طوفانِ حوادث برپا ہے
میں اُس عالم میں رہتا ہوں جو واقفِ صُبح و شام نہیں

کیا لطف ہے پینے کا ہمدم جب جام بنے کشکولِ گدا
جو پیرِ مُغاں کے دست نگر ہوں ہم وہ مے آشام نہیں

دریا میں اُتر۔ کیا ڈرتا ہے گرداب و نہنگ و اژدر سے
خود موجِ بلا کشتی ہے تری کشتی سے تجھے کچھ کام نہیں

صیّاد اِ قفس میں جینا کیا۔ یا پھیر چھری۔ یا چھوڑ مجھے
ہے آرزوئے آرام مگر پابندی کا آرام نہیں

ساقی کے تصوّرِ رنگیں میں پی ساغرِ چشم سے خونِ جگر
اس مے سی کوئی مے تُند نہیں اِس جام سی بہتر جام نہیں

اب نشتر بسترِ مرگ پہ ہے دُنیا مُنہ دیکھنے آتی ہے
بس کوئی دم کا مہماں ہے وہ صُبح نہیں یا شام نہیں

نشتر جالندھری

حضرت نشتر کا مجموعۂ کلام "زبورِ ہند" کے نام سے عنقریب شائع ہو رہا ہے +

میرا انجلی

(ٹیگور کی ایک نظم)

میں بھکارن جھولی پھیلائے، سڑک پر بھیک مانگ رہی تھی،
اتفاق سے اسی وقت تم بھی، اپنے رتھ پر سوار ہو کر نکلے تھے،

* * * * *

میری نگاہوں میں وہ سماں، خواب سا معلوم ہو رہا تھا،
تمہاری سج دھج، تمہاری موتی کی لڑیاں، سبھی چیزیں۔

* * * * *

میں نے سوچا، اچھی ساعت میں صبح ہوئی ہے
آج مجھے در در کی ٹھوکر نہ کھانا پڑے گی۔

* * * * *

تمہارا رتھ دوڑے گا، خیرات سے سڑک کے دونوں اطراف بھر جائیں گے،
میں لوٹ لوٹ کر اپنی جھونپڑی کے کونے کونے کو بھر دوں گی۔

* * * * *

لیکن میں نے دیکھا کہ یکایک تمہارا رتھ میرے پاس آ کر رُک گیا،
تم ہنستے ہوئے اُترے اور تم نے میرا رستہ روک لیا۔

* * * * *

تمہارا جلوہ دیکھ کر میں اپنی ساری مصیبتیں بھول گئی،
میرے دل کی تمام سوزشیں سرد ہو گئیں، اور مصیبت ناک راتوں کی یاد فراموش ہو گئی۔

* * * * *

اسی اثنا میں معلوم نہیں کیوں، تم نے یہ کہہ کر کہ :-
"مجھے کچھ بھیک دو" جلدی سے اپنا نازک ہاتھ پھیلا دیا۔

※ ※ ※ ※ ※

اے مالک! یہ کیا معاملہ؟ تم نے یہ کیسی بات کہہ دی؟
میں حیران ہو کر، کچھ دیر خاموش سر جھکائے کھڑی رہی۔

※ ※ ※ ※ ※

تم کھڑے تھے، میں نے ہچکچاہٹ میں ایک چھوٹا سا کنکر
تم کو دے دیا، تم اسی کو لے کر فوراً چلے گئے۔

※ ※ ※ ※ ※

گھر آ کر میں نے جھولی کھولی اور بے دلی کے ساتھ اس کو دیکھنا شروع کیا،
میں نے کہا کیا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟ اس میں یہ کیا چمک رہا ہے!

※ ※ ※ ※ ※

خیرات کی دوسری چیزوں کے درمیان، سونے کی ایک ڈلی پڑی ہوئی تھی،
میں نے بادشاہ بھکاری کو جو کنکر دیا تھا وہ اسی وقت سونا بن کر لوٹ آیا۔

※ ※ ※ ※

اُسی وقت سے ہر آن اور ہر گھڑی آنکھوں میں آنسو بھرے،
یہ سوچ سوچ کر روتی رہتی ہوں کہ میں نے اپنا سب کچھ تم پر کیوں نثار نہ کر دیا۔

ابو محمد امام الدین

نپولین محض بدخط نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ جرمنی سے اُس نے جو محبت نامے اپنی بیوی جوزفین کو لکھے اُن کے متعلق پہلے یہ غلط فہمی ہوئی کہ وہ جنگی محاذ کے جلدی سے کھینچے ہوئے خراب نقشے ہیں +

بائرن انگریزی شاعر کا خط شکستہ تھا اور پروف پڑھتے وقت وہ متن کے ساتھ بہت سی نئی چیزیں لکھ دیتا تھا۔ ایک نظم جس کے دو سو اشعار تھے پروف درست کرتے وقت شاعر موصوف نے اُس میں پانچ سو شعر اور اِزاد کر دیئے +

گلچیں

زاہدہ

زاہدہ روحِ باغِ جنت ہے — کیسی من موہنی سی مورت ہے
رخِ روشن پہ شانِ معصومی — ہے مری جان جانِ معصومی
اس کی غوں غوں سے بیقرار ہے دل — سوزِ الفت سے شعلہ زار ہے دل
مجھ کو یہ جان سے بھی پیاری ہے — بلکہ ایمان سے بھی پیاری ہے
یہ مرا مرکزِ محبت ہے — ثمرِ اولینِ اُلفت ہے
مئے سرجوشِ عشق کا وہ سرور — ہوگیا ہے عیاں بصورتِ نور
کیا ہی نکلی بہ فضلِ ربِّ قدیر — میرے خوابِ وفا کی یہ تعبیر

تو اگر سن لے اے خدا میری — مختصر سی ہے یہ دعا میری
پیروِ شیوۂ بتول ہو یہ
باغِ نسوانیت کا پھول ہو یہ

جلال الدین اکبر

چاننی رات کی سیل

(کارخانے کے ایک کاریگر کی زبانی)

ذیل کی عبارت پڑھتے وقت زیروزبر اور الفاظ کی عجیب وغریب تبدیلیوں کو ضرور ملحوظ خاطر رکھئے۔

روٹی کا ٹکڑا کھا کے میں نے ذری کے ذری کمر ٹکائی تھی کہ اتنے میں کِسو نے مجھے آواز دی۔ میں ذلدی سے کرتا گلے میں ڈال باہر گیا مگر واں کِسو کا بھی پتہ نئیں۔ ذرا اور اگاڑو بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گلی کے نکڑ پہ کمیٹی کی لالٹین کے نیچو بیچ امتیاز کالمڈا امتیاز کھڑا وا ہنس رہا ہے۔ میں نے وِس سے کیا کہ بے یہ کیا بے وحدت پنا ہے کہ اواز لگا کے یاں آن کھڑا ہوا اور میں اس فکر میں ہوں کہ جنے کون تھا؟ منتیاز بولا خلیفہ میں کیا کروں تماری نالی راتی سٹر رئی ہے۔ کہ میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ مجبوراً بنا چاری امر میں یاں آن کھڑا ہوا۔ میں نے کیا ہاں مجھے داروغہ صفائی کی رپٹ کروانی پڑے گی۔ مگر ہاں یہ تو بتاؤ کہ تمارا کِس طریوں آنا ہوا۔ وہ بولا خلیفہ دیکھ رئے ہو چودھویں رات کا چاند کھل رہا ہے۔ میں نے سونچا اِس وخت چاننی کی سیل میں بڑا لُطف آئیگا اس لئے گھر سے چل نکلا۔ رستے میں خیال آیا کہ تم کو بھی لیتا چلوں۔ میں نے کیا۔ آؤ تو خوفی دروزے تو ڑی تک ہو آئیں۔ یہ کیکے ہم دونوں ٹھنڈی سڑک پہ ہو لئے۔ منتیاز بولا خلیفہ میری چندیا میں کھجلی ہو رئی ہے میں نے کیا خدا خیر کرے تماری نٹ کھلا رئی ہے کہیں تمارے جوتے نہ پڑ جائیں وہ بولا کدڑ نی جیسی ہوگی دیکھی جائے گی۔ اب قضا کار انفاخ ایسا آن کے پڑا کہ ہمارے آگو سے ایک عورت برخا اوڑھے دے اکیلی آتی نظر آئی۔ منتیار وِسے دیکھ کے بولا او خلیفہ چپڑی اور دو دو۔ چاننی کی سیل میں وِس عورت سے ذرا دل لگی ہی رہے گی۔ میں نے کیا کہ بے تو بھی بڑا بے شحور اہے کہ بنا جانے بوجھے بغیر کِسو عورت سے چھیڑ خانی کرنے کی سونچ رہا ہے مگر یہ جان لے کہ اِس کا انجام کار اچھا نہیں یوں کہ اگر وہ ہوئی کِسو بڑے خاندان کی تو پھر اُلٹی آنتیں گلے پڑیں گی اور پیچھا چھٹانا مشکل ہو جائے گا۔ وہ بولا اگر خاندانی عورت ہوتی تو اس طریوں اکیلی نہ نکلتی۔ میں نے کیا وہ زمانہ لد گیا ابتو سب جگہ بڑے بڑے رئیسوں کی عورتیں یونہی پھرتی ہیں کیونکہ آج کل کا فاشن ہی یہی ہے۔ غرض مُتیرا میں نے منتیاز کو سمجھایا مگر وِس پہ تو شیطان سوار تھا، وہ بھلا کد مانتا۔ میں نے بھی کہدیا اچھا پیارے جو تیرا مجاز چاہے کر۔ میں تو پرے سے تیری سیل دیکھوں گا۔ اِتنے میں وہ برخے والی عورت برابر میں آگئی میں تو پرے ہٹ گیا تھا منتیاز نے وِس سے ہنس کے کیا کیوں سرکار ہم بھی تمارے ساتھ چلیں۔ وہ عورت پہلے تو چپ ہوگئی اور ذرا تیزی سے چلنے لگی مگر جد منتیاز نے وِس کا پیچھا کیا اور پھر وِس پہ کچھ آوازہ کسا تو وِس نے نہ ایک کہی نہ دو سنی نکال پیر سے اونچی ایڑی کا جوتا اور اب جو منتیاز کے سر پہ تڑا تڑ رسید کیا تو منتیاز تو اپنی چوکڑی بھول گیا۔ اِتنے میں وِس عورت کے بھائی بند جو دوسری پٹڑی پہ چل رے تھے وہ بھی واں آدھمکے۔ وِنہوں نے جو یہ ماجرا سنا اور دیکھا تو وہ بھی منتیاز کو جمٹ گئے اور مار مار کے وِس کا بھرکس

نکال دیا۔ اِتنے ہیں واں پہ بوت سی خلقِ خدا جمع ہوگئی۔ ایک سپاہی بھی آگیا وِس نے منتیاز سے دریافت کیا کہ کیا بات تھی۔ منتیاز بولا میں نے وِن سے یہ کہا تھا کہ بی تم اکیلی جارئی ہو کوئی بدماشں تمیں رستے میں چھیڑے نئی۔ تم کہو تو میں تمیں تمارے گھر توڑی پونچا دوں۔ سپاہی بولا یقیں بھی تو تیری اماں کہ تجھے وِن کا درد آیا۔ وہ عورت بولی کہ اس بدماش کو کتوالی لے جاؤ۔ اِتنے میں ایک جنٹلمین آگو آن کے بولا کہ ایسے لوگوں کو ضرور سزا ملنی چہیے اور پھر وِس عورت کے بھائی بندوں سے بولا کہ آپ چاہئے خفا کیوں نہ ہوں تھوڑی سی غلطی آپ کی بھی ہے کہ آپ اپنی عورت کے ساتھ اِسی پٹڑی پہ کیوں نہ چلے دوسری پٹڑی پہ کیوں چلتے رئے بھلا اپنے گھر کی عورت کے ساتھ ساتھ چلنے میں کیا ہرجہ ہے۔ میں تو کیتا ہوں کہ اگر آپ پرے نہ چلتے بلکن ساتھ چلتے تو اس بدماش کو اِتّی ہمت ہی نہ ہوتی۔ خیر اسی اثنا کے بیچ میں وہ سپاہی منتیاز کو کتوالی کی طرف لے کر چل چکا تھا میں لپک کے وِس کے پاس پہنچ گیا۔ اور اگرچہ وِس سپاہی کا اور میرا برا یارانہ تھا۔ مگر جد میں نے کِیا کہ دروغہ جی منتیاز کو چھوڑ دو تو وِس نے صاف جواب دیدیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ جد توڑی وِس کی مٹھی گرم نہ کروگے کام نئی بنے گا۔ خیر میں نے ایسا ہی کیا اور منتیاز کو چھڑا کے میں نے وِس سے کِیا کہ جاؤ اب چاننی رات کی سیل تو دیکھ لی۔ گھر جا کے ائینہ میں اپنی حالت بھی دیکھ لو اور آج سے پیچھو کدھی ایسی حرکت نہ کرنا ورنہ یہ سمجھ لو کہ آج تو تم بچ گئے مگر آئندہ بڑے گھر کی ہی ہوا کھاؤ گے۔ مانو یا نہ مانو یہ تمارا کام ہے۔ مگر ہم تو تم کو یہ وصیت کئے جائیں گے۔

ایم اے مغنی دہلوی

اگر تمہیں حقیقی زندگی کی جستجو ہے۔ تو فراخ سڑکیں اور عظیم الشان عمارتیں چھوڑ کر تنگ و تاریک گلی کوچوں اور ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں میں چلے جاؤ۔

امارت کی زندگی تصنع کا دوسرا نام ہے اور تہذیب انسانی فطرت کی منافقت کا۔

غریب اصلی زندگی بسر کرتے ہیں اور امرا مصنوعی۔ امیر چند ہیں اور غریب لاتعداد۔

حامد

---

*

قوسِ قزح

حسنِ فطرت کس نرالی شان سے ہے جلوہ گر
لوٹتا ہے دِل مرا قوسِ قزح کو دیکھ کر

زلف و ابروئے بتِ دلجو میں ایسا خم کہاں
ماہِ نَو کے خم میں یہ اندازِ یہ عالم کہاں

ہے ہلال اک خطِ سیمیں جس میں تھوڑی سی چمک
حسنِ گلکار رنگ کی مظہر ہے یہ پیاری دھنک

کہکشاں گو گر کبھی آئے نظر اس کی بہار
مثلِ گوہر اس پہ کر دے اپنے تاروں کو نثار

چاند کے ہالے میں کب ہیں ایسی دل آویزیاں
اس طرح کی جلوہ ریزی ایسی رنگ آمیزیاں

گر کبھی بادل کے پردے سے نکل آتی ہے برق
رُوپ اس کا دیکھ کر روپوش ہو جاتی ہے برق

اس کے آگے لاجوردی اُفق کیا چیز ہے
رنگِ گل، رنگِ سحر، رنگِ شفق کیا چیز ہے

موج پانی کی کبھی دم بھر ٹھہر سکتی نہیں
کس طرح یہ رنگ کی امواج ساکن ہو گئیں

اتنے رنگوں کی نہیں عالم میں کوئی ایسی شے
قصرِ فردوسِ بریں کی یہ کوئی محراب ہے

وجد آور گرچہ ہیں آثار و انوارِ سحر
پر کہاں اس طرح کی جدول بیاضِ صبح پر

لو وہ آئی رعد سے توپوں کے دغنے کی صدا   ابر کی فوجوں کے رایت کا یہ پرچم کھل گیا
ہو گیا ہے کیا سے کیا مارنگِ فضا تو دیکھئے   ابر کی پیاری ردا کا حاشیہ تو دیکھئے
یا ہوا سے مور کا مُو باف اُڑ کر آ گیا   جو فضا میں رہ گیا اس طرح لہراتا ہُوا

ہر کماں کے تیر نو کرتے ہیں جانوں کا شکار   یہ کماں ایسی ہے جس کا تیر ہے بارش کی دھار
واہ کیا پیاری کماں ہے کیا نرالے ہیں خدنگ   کھیتیاں سرسبز چمن سے اور گلشن لالہ رنگ
اب پڑیں گے ڈونگرے جھڑیاں بھی اب لگ جائینگی   اب تمنائیں ہر اک جاندار کی بر آئیں گی
ندیاں ہوں گی رواں نالے بہیں گے زور سے   گونج اُٹھے گی وادیٔ خاموش جن کے شور سے
بیل بوٹے ، روکھ ، پودے پُر فضا ہو جائیں گے   دو ہی دن میں کوہ و صحرا کیا سے کیا ہو جائینگے

مرحبا اے قاصدِ بارانِ رحمت مرحبا
باعثِ تسکینِ عالم ہے نظر آنا ترا

میر سعادت حسین نجیب

چند بیل

ایک بیل کو میں نے دیکھا کہ خاموش بیٹھا جگالی کر رہا ہے۔ آنکھیں نیم باز ہیں۔ ما دسا ایک کتا بڑی مشقت، تن دہی اور انہماک کے ساتھ اُس کے مُنہ کے سامنے کھڑا بھونک رہا ہے۔ بھونکے جا رہا ہے۔ بڑھ بڑھ کر بھونکتا ہے اور پیچھے ہٹتا ہے۔ آخر جب کتا بہت قریب پہنچ گیا تو بیل نے زور سے "سوں" کر کے یوں سر ہلا دیا جیسے ہم آپ نفی کے طور پر سر ہلاتے ہیں۔ کتا پچھاڑ کھا کر بھاگا اور بدحواسی میں ایک آدمی سے جس کے سر پر ایک ٹوکرا تھا الجھ گیا اور ٹوکرا گر گیا۔ بیل خاموش بیٹھا جگالی کرتا رہا۔

~~~~~~~~

ایک بیل کو میں نے دیکھا کہ اُس کے پیچھے ایک چھوٹا کتا اور دو عدد پاؤ ڈیڑھ پاؤ وزن کے پلّے دوڑ رہے ہیں۔ بیل نے بدحواس ہو کر ہاکی فیلڈ کا رُخ کیا۔ ایک خوانچہ لوٹ دیا۔ ایک بنچ مع لڑکوں کے پھاند گیا۔ میدان میں جب لڑکے دوڑے تو گول میں گھس پڑا، اِس طرح کہ جالی توڑ کر پار نکل گیا۔ سوچتا ہو گا کہ آج بال بال بچے۔ کیونکہ کتے اُس سے الگ ہو گئے۔

~~~~~~~~

ایک بیل کو میں نے دیکھا کہ اُدھر سے آ رہا ہے۔ اِدھر سے میں جا رہا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب سے گزرے۔ سردی کے دن تھے۔ وہ ٹاٹ کا اوورکوٹ پہنے ہوئے تھا اور میں اُون کا اوورکوٹ پہنے تھا۔

~~~~~~~~

ایک بیل نے (جس کا لقب سانڈ تھا) ایک چھوٹی سی بیل گاڑی پر حملہ کیا جس میں میں بیٹھا تھا۔ دو بیل گاڑی کے اور تیسرا یہ سانڈ، ان تینوں کی کوشش کئے بابد عنوانی سے نتیجہ یہ نکلا کہ گاڑی کا ایک پہیہ بڑے مزے سے ایک ڈیڑھ فٹ اونچی چبوتری پر چڑھ گیا۔ گاڑی ٹوٹ گئی۔ نیچے ہم لوگوں کے بھوسا رکھا تھا۔ چوٹ کم لگی مگر گت خوب بنی۔ سانڈ ادائے فرض کے بعد بھاگ گیا۔

~~~~~~~~

ایک مرتبہ میں بیل گاڑی پر بڑی دور جا رہا تھا۔ ایک بیل موٹا تھا اور ایک دبلا جو موٹا تھا وہ سُست چلتا تھا اور مار کو بھی کسی شمار قطار میں نہ لاتا تھا۔ میں نے تنگ آ کر گاڑی والے سے کہا کہ اس کو خوب مارو۔ وہ بولا کہ اسے زیادہ مارا تو یہ فوراً نان کوآپریشن کر دیگا۔ اور چلتے چلتے بیٹھ جائیگا پھر چاہے کاٹ ڈالو مگر یہ نہ اُٹھے گا۔ مجھے یہ بات ناممکن معلوم ہوئی اور اُس کو پٹوایا۔ نتیجہ یہ کہ وہ بیٹھ گیا۔ اور بری طرح مارا اور کھڑا کرنے کی کوشش کی تو وہ لیٹ گیا۔ اب قیاس میں آنا ناممکن ہے کہ کس کس طرح اُس کو مارا مگر نہ اُٹھنا تھا نہ اُٹھا۔ آنکھوں پر مارا، سینگوں پہ مارا، منہ توڑ دیا، مگر وہ لیٹا رہا۔ جب میں ہار گیا تو کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر دم لینے لگا کیونکہ مارتے مارتے تھک گیا تھا۔ سگرٹ سلگایا۔ گاڑی والے نے اپنی چلم سلگائی۔ نہ معلوم مجھے کیا سوجھی کہ گاڑی والے کی چلم لے کر بیل کی دم کے نیچے جلتی ہوئی مہر کی طرح لگا دی۔ بس آپ سے کیا عرض

کروں کہ کیسے وہ تڑپ کر اُٹھا ہے کہ بیان سے باہر۔ پھر لطف یہ کہ سولہ میل تک اُس کو ہر طرح مارا مگر پھر کبھی نہ بیٹھا۔ چند مہینے بعد گاڑی والا پھر ملا اور کہنے لگا کہ بس ایک دفعہ اور لیٹ گیا تھا مگر وہی ترکیب جو کی تو پھر کبھی بھول کر بھی اُس نے ایسی غلطی نہیں کی۔

ایک بیل کی طبیعت خراب ہوگئی یعنی ہماری اور آپ کی طرح زبان میں چھالے پڑ گئے۔ ایک دیہاتی سول سرجن آئے جو ذات کے چمار تھے۔ اُنھوں نے معائنہ کیا۔ تیل اور نمک طلب فرمایا۔ دونوں کو ملا کر ایک برتن میں رکھا۔ بیل کو پیر باندھ کر گرایا اور پھر زبان اُس کی باہر نکال کر ایک کھُرپے سے زبان کے چھالے بری طرح چھیلے۔ اُس کے بعد نمک اور تیل اچھی طرح زبان پر ملا اور اُس کے بعد بڑی صفائی سے اپنا جوتا اُتار کر زمین پر اُس کا تلا رگڑ رگڑ کر زور زور سے بیل کی زبان کو رگڑا۔ پھر چھوڑ دیا۔ بیل صاحب کھڑے کر دیئے گئے۔ ناک میں زبان بار بار ڈال رہے تھے۔ آپریشن نہایت ہی کامیاب رہا۔ بیل صاحب تیسرے ہی روز صحت یاب ہو گئے۔

ایک بیل صاحب کو میں نے دیکھا جن کی قیمت معلوم ہوا پانچ سو اسی روپے ہے۔ وہ اس طرح پر کہ اسی روپیہ کے تو وہ خود تھے اور پانچ سو روپیہ کا نوٹ کھا گئے تھے اور کھا کر فوراً بھاگ گئے اور دن بھر نہ ملے ورنہ غالباً قتل کر دیئے جاتے۔

ایک دفعہ ہم لوگ شکار کو گئے۔ مستقر سے شکارگاہ تک بیل گاڑی سے پہنچے۔ ایک مناسب مقام پر گاڑی چھوڑ دی اور شکار میں مشغول ہو گئے۔ ہم سب لوگوں کا اور بیلوں کا ناشتہ گاڑی میں رکھا تھا۔ ایک بیل صاحب اپنا ناشتہ کھاتے کھاتے ہم لوگوں کے ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سالن کی قسم سے جتنی چیزیں تھیں وہ زیادہ تر پھینک دیں۔ پراٹھے کل کے کل کھالئے اور دسترخوان کھا رہے تھے کہ ہم لوگ بھوک کے مارے تھکے ہوئے کھانے کے لئے پہنچے۔ جو ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیل صاحب دسترخوان کھانے میں مشغول ہیں۔ درحالیکہ ہم گیارہ بجے کے یہ سوچنے لگے کہ دسترخوان پراٹھوں سے پہلے کھایا جاتا ہے یا پراٹھوں کے بعد۔ معلوم یہ ہوا کہ پراٹھوں کے بعد کھایا جاتا ہے۔ مر مر گئے مارے بھوک کے۔ بس نہ تھا ورنہ جس نے ہمارا ناشتہ کھالیا ہم اس کا ناشتہ کھا جاتے۔ کچھ بھی ہو۔ یہ پتا چل گیا کہ شکار اِس کو کہتے ہیں۔

ایک بیل صاحب کے بے تکلف احباب میں سے ایک کتے صاحب تھے۔ جب بیل صاحب واپس تشریف لاتے تو کتے صاحب خوش ہو جاتے اور دو پیر سے کھڑے ہو کر اُن سے گلے ملتے۔ جھوٹ موٹ اُنکے پیروں میں کاٹ کاٹ کر بھاگتے اور یہ تمام باتیں بیل صاحب خندہ پیشانی سے گوارا فرماتے بلکہ جواباً کتے صاحب کو محبت کی نظر سے دیکھتے۔ صبح معمول تھا کہ بیل صاحب تشریف فرما ہیں اور اُن کے بے تکلف دوست صاحب اُن کے گلے میں باہیں ڈال کر اُن سے کھیل رہے ہیں۔ دوپہر کو کتے صاحب اپنے دوست کے بالکل ہی پاس آرام فرماتے تھے۔

آگرے میں ایک سانڈ صاحب ہیں۔ اُن کا دستور ہے کہ کسی مٹھائی گھٹائی کی دوکان پر کھڑے ہو کر کھانا شروع کر دیا۔ اب لوگ مار رہے ہیں تو وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ محبت ہے یعنی لوگ مار مار کر کھلا رہے ہیں۔ لہٰذا جہاں تک مار یا زور کی وجہ سے ہٹنے یا ہٹانے کا تعلق ہے وہاں تک ہٹنے سے کیا مطلب۔ یہ اور بات ہے کہ اُن کے سامنے ہی سے چیز اُٹھالی۔ چنانچہ جب میزبان کی اس طرح سے نیت معلوم کر لی تو پھر ٹھہرنا بیکار خیال فرماتے ہیں۔

ایک بیل ہیں بی اے (بیل والا) جن کا نام ایڈیٹر ہے اُنھوں نے ایک اعلیٰ درجے کا علمی وادبی سالہ جاری کر رکھا ہے اور لطف یہ کہ جنوری میں سالگرہ نمبر کا اہتمام بھی فرماتے ہیں۔ آپ کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ دسمبر کے پرچے میں ایک عجیب و غریب عنوان تجویز فرما کر میرا نام چھاپ دیا کہ ہمارے مشہور مزاحیہ نگار اس پر مضمون لکھیں گے اور یہ مضمون جانوروں کے مطالعہ کا ایک دلچسپ باب ہوگا۔ اب آپ ہی کہئے کہ میں کیونکر اُن کے اس عجیب و غریب مطالبہ سے عہدہ برا ہوں۔

عظیم بیگ چغتائی

رُباعیات

اِنّی اَعلم ما لا تعلمون

بیرون از حد خویش قدمن بین
در وادی ہولناک خفتن بین
چیزیکہ بجیب ہست ہمہ نباید در دست
شمعیست کہ طفل را گرفتن بین

فی انفسکم افلا تبصرون

وادم بہ تلاش او اوصلہ بہ ہمہ برد
درویش مثال در دو دیہم دارد
جائیش درین چشم و چشمیں سحر بیند نگاران
او را در بر و ما من بانتظارش دارد

اللہ نور السموات والارض

گہ دیدہ او ز چشم بدوز و بر دل
گہ چشمیں نہ سدا بکشا چشم ز دل
گفتم ہمہ را کجاست آخر آں پردہ نشین
دل گفت کہ بکشا چشم، چشم گفت اندر دل

وحدۃ الوجود

تا چند بکوہسار و دریا بینی
تا چند فضائے باغ و صحرا بینی
تا آئینۂ وحدت الوجود ار بینی
در خود ہمہ و در ہمہ خود را بینی

سیّد احمد حسین امجد

غمِ روزگار

(۱)

میں اک حکیم ہوں میرے حریمِ دانش میں
نوائے سازِ حقیقت ہے نغمۂ تمثیل

ضمیرِ دہر پہ فطرت کے راز کھل نہ سکیں
گرہ کشا جو نہ ہو میرا ناخنِ تاویل

مری نگاہ میں پنہاں حقائقِ تخلیق
مرے خیال میں رخشاں معارفِ تکمیل

بہارِ گلشنِ اسرار ہے مری توضیح
ضیائے جلوۂ پندار ہے مری تفصیل

میں اُس فضا میں ہوں سرگرمِ سیرِ شام و سحر
جہاں ہے عاجزِ پرواز شہپرِ جبریل

مگر بایں ہمہ دانش غمِ زمانۂ تلخ
بجھا رہا ہے مری بزمِ فکر کی قندیل

ہوئے ہیں جس سے اراداتِ دلنشیں مجروح
کیا ہے جس نے مری ہمتوں کو پست و ذلیل

تجھے دکھاؤں کہ کیا چیز ہے مری ہستی
ہزار جلوۂ باطن ہیں طالبِ تحصیل

یہ خار کاش مرے قلب سے نکل جائے

(۲)

میں ایک صاحبِ اہل و عیال، شوہر ہوں
مری مسرتِ معصوم صد چمن بردوش

طلوعِ صبح کے ہمراہ مسکراتی ہے
سکوتِ شب میں سناتی ہے نغمۂ خاموش

عطا ہوئی ہے وہ چھوٹی سی سلطنت مجھ کو
کنارِ امن ہے جس کا طرب فزا آغوش

مری حدودِ شہی میں عداوتیں مفقود!
مرے چمن کی فضا میں خزاں بہار فروش

مگر زمانۂ نا اہل کی ستم گاری
دبا رہی ہے مرے ولولوں کا پیہم جوش

مری جبیں سے عیاں ہے مری شکستہ دلی
اگرچہ شاہدِ عشرت ہے میری حلقہ بگوش

بتا کہ اُس کے سمجھنے کی تجھ کو قدرت ہے
وہ تلخ ساعتِ ہستی، وہ برقِ خرمنِ ہوش

کہ تیرے سامنے معصوم ہستیوں کے لئے | جب ایک چاند سے زائد حسین صہباپوش
سجی ہو جلوۂ عصمت سے جس کی پیشانی | جو نشۂ مئے پاکیزگی سے ہو مدہوش
کھڑی ہو چشمِ غزالیں میں ڈبڈبائے اشک | نگاہِ حُزن بہ دامن، نوائے غم بردوش
اور اس کی ہو نہ سکیں تجھ سے حاجتیں پوری | اگرچہ تو ہو خردآشنا و صاحب ہوش
غرض ہزار مصائب ہیں تلخ و صبر شکن | یہ زندگی ہے مرے حق میں موت کا آغوش

خدا کرے کہ زمانے کا رُخ بدل جائے!

(۳)

میں ایک شاعرِ رمزآشنائے فطرت ہوں | مری نگاہ میں ہے خوب ورزشِ شام وسحر
ہر ایک پھول ہے میرے لئے حریم جمال | کلی کلی میں ہیں صد جلوۂ بہشتِ نظر
اِدھر سحر ہے بہ اندازۂ ربابِ نشاط | اُدھر ہے شام بہ طرزِ سرود کیف اثر
تجھے ہے سطح کے جلووں سے یکسر اطمینان | مری نگاہ ہے باوصف نہ رسی مضطر
محاربات میں پاتا ہوں گاہ خاموشی | کبھی خموش فضاؤں میں شورشِ محشر
وہاں ہوئی ہے ضیا بار میری شمعِ دماغ | چراغ کشتہ ہیں جس انجمن میں شمس وقمر
مِری نگاہ سے تو کاش اِس کو دیکھ سکے | یہ کارخانۂ ہستی ہے اِک فریبِ نظر
مگر وہ رُوح کہ غمگینیوں سے ہے لبریز | رہینِ بیخبری ہے جو باوجودِ خبر
جسے کیا ہے زمانے کی سرد مہری نے | قفس رسیدۂ آلامِ طائرِ بے پر
حیات جس کے سبب سے ہوئی ہے "مرگِ حیات" | نشاط جس کے اثر سے ملالِ غم پرور
اِسی سے ہے مرے افکار کی جبیں تاریک | اِسی سے ہے مری لیلائے شعر خاک بسر

تجھے دکھاؤں جو حالت مری سنبھل جائے!

علی اختر
(از حیدرآباد دکن)

دوست یا دشمن

(۱)

چھ مہینے کے بعد کلکتہ سے گھر آنے پر دیا کرشن نے پہلا کام جو کیا وہ اپنے عزیز دوست سنگار سنگھ سے ماتم پرسی کرنے جانا تھا۔ سنگار سنگھ کے والد کا آج تین مہینے ہوئے انتقال ہو گیا تھا۔ دیا کرشن انتہائی مصروفیت کے باعث اُس وقت نہ آسکا تھا۔ تعزیت کی رسم خط سے ادا کر دی تھی۔ لیکن ایسا ایک بھی دن نہیں گزرا کہ اس کے دل نے سنگار سنگھ کے ساتھ دوستی کا فرض ادا کرنے کے لئے تحریک نہ کی ہو۔ شاید ابھی دو چار مہینے اور نہ آتا، کیونکہ کلکتہ میں اس نے جو کاروبار جاری کیا تھا اُسے مستقل صورت میں لانے کے لئے اُس کا وہاں موجود رہنا ضروری تھا اور اُس کی عارضی غیر حاضری سے بھی نقصان کا احتمال تھا مگر جب سنگار سنگھ کی بیوی لیلا کا اشد ضروری فرمان پہنچا تو وہ اپنے کو روک نہ سکا۔ لیلا نے صاف صاف تو کچھ نہ لکھا تھا اُسے فوراً بلایا تھا لیکن دیا کرشن کو بین السطور سے یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ وہاں کی حالت تشویش ناک ہے اور اس وقت اُس کی امداد ضروری ہے۔ سنگار خوشحال باپ کا بیٹا تھا، مگر بڑا ہی الھڑ، بڑا ہی ضدی، بڑا ہی آرام پسند، ارادہ یا استقلال اسے چھو بھی نہیں گیا تھا۔ اُس کی ماں اُس کے بچپن ہی میں مر چکی تھی اور باپ نے پدرانہ تادیب کی جگہ مادرانہ شفقت ہی سے اس کی پرورش کی تھی اور اس کا نتیجہ وہی ہوا تھا جو مرغن غذا کھانے والے نامحنت پسند نوجوانوں کا ہوتا ہے جو دیکھنے میں تو فربہ ہوتے ہیں مگر دس قدم چلنا مشکل۔ پودے کو محض پانی کی ضرورت نہیں ہوتی، اتنی ہی دھوپ کی بھی ضرورت ہوتی ہے ورنہ پودا ہرا بھرا ہونے پر بھی پھل پھول نہ لا سکے گا۔ سنگار کو والد سے بے انتہا محبت تھی، جوان ہو کر بھی وہ ذرا ذرا سی باتوں میں والد کی ہدایت کا محتاج تھا۔ باپ بھی شاید بھول گیا تھا کہ یہ نازبرداری سنگار کو تباہ کر رہی ہے۔ لڑکے کی یہ عقیدت اور تکیہ پسندی اُس کی پسر نواز آنکھوں میں سعادتمندی کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ اور اسے وہ اپنی خوش نصیبی سمجھتا تھا۔ سنگار جوان بچہ تھا، اتنا ہی خالی الذہن اتنا ہی متلون مزاج۔ وہ اتنے بڑے کاروبار کو کیسے سنبھال سکے گا؟ اس میں نہ وہ معاملہ فہمی تھی نہ وہ جزرسی، جو کاروبار کے لئے ضروری ہے۔ شاید اس کے والد نے اُسے دُنیا سے بے نیاز رکھنے کا بار بھی اپنے ہی سر پر لے لیا تھا۔ ایسا آدمی کارپردازوں اور مختاروں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بننے کے سوا اور کیا کر سکتا ہے۔ اسی قسم کے اندیشے دیا ناتھ کے دل میں پیدا ہوتے رہتے تھے۔

(۲)

اُس کی خبر پاتے ہی سنگار سنگھ باہر نکل آیا اور اس کے گلے سے لپٹ گیا۔ دیا کرشن اس کی وضع قطع دیکھ کر حیرت میں آگیا اُس نے سوچا تھا سنگار روتا ہوا باہر آئے گا، متفکر اور پریشان اور اپنے والدِ مرحوم کی وفات کی داستان بیان کرے گا لیکن سنگار کے چہرہ پر حزن و ملال کا نام بھی نہ تھا۔ وہ بہت ہی بشاش نظر آتا تھا، بال سنوارے، آنکھیں سُرخ، ریشمی مہین کرتا اور مخملی سلیپر پہنے

ہوئے۔ گویا محفلِ نشاط سے اُٹھا آتا ہو۔ دیا کرشن اس وقت کچھ طے نہ کرسکا ماتم پرسی کرے یا مبارکباد دے +

سنگار سنگھ نے شکوہ کے انداز میں کہا۔ آتے آتے اب آئے ہیں آپ۔ چھ مہینے بعد، بس ایک خط لکھ دیا اور فرصت ہوئی

دیا کرشن نے اپنی مجبوری اور معذوری کا اظہار کیا اور سردار صاحب مرحوم کی وفات سے جو صدمہ اُسے ہُوا تھا اس کا بھی ذکر کرنا چاہتا تھا کہ سنگار سنگھ نے بات کاٹ دی +

مرنا جینا تو دُنیا کا دھندا ہے جی۔ اسے کوئی کہاں تک روئے۔ پھر پاپا کی عمر بھی کافی تھی۔ اِس عمر میں انہیں مرنا ہی چاہئے تھا۔ مجھے تو ان بوڑھوں پر رحم آتا ہے جو خواہ مخواہ جیتے چلے جاتے ہیں۔ بھلے آدمی کے لئے پچاس ساٹھ سال بہت ہیں یہ نہیں کہ ستر سے آگے بھی جینے کی ہوس بنی رہے۔ اگر سب بوڑھے زندہ رہیں تو نوجوانوں کے لئے گنجائش کہاں سے آئے +

یہ کہہ کر اُس نے زور سے قہقہہ مارا۔

دیا کرشن نے اور بھی استعجاب میں آکر پوچھا۔ کاروبار تو اسی طرح چل رہا ہے؟ اگر میرے سپرد کوئی کام کرنا چاہتے ہو تو میں تمہاری خدمت کو حاضر ہوں۔ ابھی میں یہاں دو تین مہینے رہوں گا، اور کلکتہ بھی گیا تو ضرورت پڑنے پر آجایا کروں گا، تمہارے کاروبار میں نگرانی کی سخت ضرورت ہے +

سنگار نے گویا اس تذکرہ سے بیزار ہو کر کہا، بھئی میں اس جھنجھٹ میں نہیں پڑتا۔ تھوڑی سی زندگی ہے اسے اس خلجان میں کیوں برباد کردوں۔ مجھے تو چچا صاحب کی پالیسی پسند ہے۔ عیش کرو اور فکر کو کبھی پاس مت آنے دو۔ چچا صاحب اور پاپا دو متضاد طبیعت کے آدمی تھے۔ پاپا کو شب و روز کاروبار کی فکر رہتی تھی۔ اسی کا خواب بھی دیکھتے تھے۔ اپنی زندگی کے تیس سال اُسی کی نذر کر دیئے اور بالآخر پچپن سال کی عمر میں رحلت فرما گئے۔ چچا صاحب اُن سے دس سال بڑے ہیں کبھی کوئی مستقل کام نہیں کیا۔ ہمیشہ عیش سے رہے اور آج ۶۵ سال کی عمر میں زندگی کے مزے اڑا رہے ہیں۔ فرق یہی ہے کہ پاپا نیک نام تھے، چچا بدنام ہیں۔ لیکن مجھے نیک نامی کی پروا نہیں۔ جان دے کر نیک نامی حاصل کرنا میری سرشت میں نہیں ہے۔ میں نے اپنا سارا کاروبار انہیں سونپ دیا ہے، بلکہ یوں کہو کہ انہوں نے سارا بار اپنے اوپر لے لیا ہے۔ میں آزاد ہوں جو چاہوں کروں۔

دیا نے جس ابتری کا اندازہ کیا تھا، صورتِ حالات اس سے کہیں ابتر تھی۔ سنگار سنگھ کے چچا سردار کرتار سنگھ اُن ذات شریفوں میں تھے جو عیش پروری میں اپنا سب کچھ، یہاں تک کہ ضمیر بھی قربان کر دیتے ہیں۔ سنگار سنگھ کے والد سردار اوتار سنگھ اپنے بڑے بھائی کے سائے سے بھی بھاگتے رہتے تھے۔ بول چال تک نہ تھی۔ وہی کرتار سنگھ آج اتنے شائستہ مزاج اور شفیق ہو گئے ہیں اس پر دیا کرشن کو اتنی آسانی سے اعتبار نہ آسکتا تھا +

اُس نے پوچھا۔ مگر تمہارے چچا صاحب تو کبھی اتنے بڑے منتظم یا کارپرداز نہ تھے +

سنگار سنگھ نے عقیدت مندانہ انداز سے کہا۔ تمہارا خیال غلط ہے۔ پہلے وہ خانہ داری کی طرف زیادہ توجہ نہ دیتے تھے لیکن پاپا کے مرنے کے بعد ان کے مزاج میں ایک طرح کا انقلاب ہوگیا ہے۔ جتنے پرانے دغاباز ملازم تھے ان سبھوں کو نکال باہر کر دیا۔

اور اب سارا کاروبار اُن کے انتظام میں خوش اسلوبی سے چل رہا ہے۔ میرا ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔ میں پانچ سو روپے ماہوار لیتا ہوں اور چین کرتا ہوں +

دیا کرشن نے اُس کا کمرہ دیکھا تو پہلے سے کہیں زیادہ آراستہ تھا۔ مخملی گدّوں کی کرسیاں اور صوفے، شیشہ آلات پیتل کے گملے، اعلیٰ درجے کے قالین کا فرش، کئی ملازم۔ جب وہ خود اس انتظام سے مطمئن ہے تو دیا کرشن کو خواہ مخواہ دخل دینے کا کیا حق تھا مگر کرتار سنگھ نے کوئی گہری سازش کر رکھی ہے اس خیال کو وہ دل سے نہ نکال سکا اس نے پوچھا تو آج کل تمہارا کیا شغل رہتا ہے ؟

سنگار سنگھ نے مسکرا کر کہا۔ وہی جو ہر ایک نوجوان کا ہونا چاہئے۔ یاروں کی مجلس، شراب کباب کے دور معشوقوں سے چھیڑ چھاڑ اور اس زندگی میں کیا رکھا ہے۔ میں تو عمر خیام کا ہم مشرب ہوں شراب کا پیالہ ہاتھ میں ہو معشوق بغل میں، اور کسی چیز کی تمنا نہیں۔ آج تمہیں بازارِ حُسن کی سیر کراؤں گا نہیں اس پنڈت پن کو بالائے طاق رکھنا پڑے گا۔ اُس خشک زندگی کا تجربہ بہت کر چکے ذرا اس پُرفریب کوچہ کی بھی سیر کرو۔ بسم اللہ اسی وقت سے ہو گی +

یہ کہہ کر اُس نے گھنٹی بجائی۔ ایک وردی پوش کمسن لڑکا حاضر ہُوا شراب کی فرمائش ہوئی اور ایک لمحہ میں سارا سامان میز پر آراستہ کر دیا گیا +

سنگار سنگھ نے ایک پیالہ میں شراب ڈالی اور دیا کرشن کی طرف پیالہ بڑھاتے ہوئے کہا "یہ میرا جام صحت ہے" +

دیا کرشن کو کبھی شراب پینے کا اتفاق نہ ہُوا تھا۔ ایک تو ذات کا برہمن اُس پر سادہ اور فطری معاشرت کا قائل، شراب کی بو ہی اُسے نفرت ہو رہی تھی۔ مگر نہ جانے کیا سوچ کر اُس نے جام منہ سے لگا لیا اور آنکھیں بند کر کے دارو ئے تلخ کی طرح دو گھونٹ پی گیا۔ سنگار نے اسے گلے لگا کر کہا۔ جیتے رہو دوست، تمہاری دوست نوازی نے دل خوش کر دیا بس میں ایسا ہی بے تکلف آدمی چاہتا ہوں یہ تمہارا جام صحت ہے +

اُس نے ایک پیالہ بھرا اور ایک ہی سانس میں غٹ غٹ پی گیا۔ تب ایک سگار جلاتا ہُوا بولا۔ مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے جو شراب پینا گناہ سمجھتے ہیں، انگور کھانا گناہ نہیں ہے۔ مگر انگور کی شراب پینا گناہ ہے۔ اس حماقت کی بھی کوئی حد ہے۔ میں پوچھتا ہوں دنیا میں شراب اور معشوق کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔ آخر دولت کس مرض کی دوا ہے +

دیا کرشن نے دوبارہ گلاس منہ سے لگا کر کہا۔ مجھے تو بھئی اس کی لذت آج ہی ملی۔ دل کتنا ہی گرا ہُوا ہو، ایک گھونٹ پی اور تازگی آئی افسوس کہ اتنی عمر یونہی گزر گئی +

سنگار کی آنکھوں میں سُرخی آچلی تھی زبان میں لغزش کے ساتھ روانی پیدا ہو گئی تھی۔ دوسرا جام بھر کر بولا۔ دیا کرشن، تم واقعی شاعر ہو۔ تم نے چند الفاظ میں کتنی خوبصورتی سے اس کے سارے اوصاف کا خلاصہ بیان کر دیا۔ مانتا ہوں دل کو تازہ کرنے کا یہی ایک نسخہ ہے۔ اسی بوتل کے اندر وہ آبِ حیات ہے جس کا ایک گھونٹ مُردے کو بھی زندہ کر دیتا ہے (گاتا ہے)

ساقی مئے صاف، ارغوانی لانا ۔۔۔ کم جس سے ہو کچھ غمِ نہانی لانا

ترسی ہوئی مدتوں سے ہی روح مرداں　　سرچشمۂ بادۂ جوانی لانا

بھئی پیالہ جلد خالی کرو۔ دوسرا دور شروع ہو گیا۔ افسوس کہ اس وقت یہاں مادھری نہیں، واللہ اس کی صورت دیکھ کر فنا ہو جاؤ گے، فنا ہو جاؤ گے۔ سیدھے جنت میں پہنچ جاؤ گے۔ میں تو بھئی اس بتِ طناز پر فدا ہوں، اگر زندگی میں کوئی تمنا ہے تو بس یہی کہ اس کے قدموں پر سر رکھ کر اس دنیا سے گزر جاؤں۔ دنیا چند روزہ ہے بھائی بالکل نقش بر آب۔ اس میں دل لگانا حماقت ہی سراسر حماقت۔

اِک تری لَو لگائے بیٹھے ہیں　　اور سب کچھ بھلائے بیٹھے ہیں
تیری محفل میں تیرے پروانے　　شمعِ ہستی بجھائے بیٹھے ہیں

کئی منٹ تک سنگار سنگھ پر یہی عالمِ کیف طاری رہا۔ اشعار پڑھتا اُن کی توضیح و تشریح کرتا۔ دنیائے بے ثبات کے نام کو روتا۔ یہاں تک کہ اس کا سر جھک گیا اور وہ میز پر سر رکھ کر مدہوش ہو گیا۔

(۳)

اُسی وقت عقب کا پردہ کھلا اور لیلا نے اشارے سے دیا کرشن کو اندر بلایا۔ وہ نازنین جسے دیکھ کر آنکھوں میں طراوت آ جاتی تھی اُس پر اُس وقت حسرت چھائی ہوئی تھی گویا ابھی رو کر اُٹھی ہو۔ دیا کرشن نے اندر جا کر فرقِ نیاز خم کیا۔

لیلا نے اسے شکوہ آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ سمجھی تھی تم آ کر زخم پر مرہم رکھو گے، مگر تم نے بھی وہی مشقِ ستم شروع کی۔

دیا کرشن نے مسکرا کر کہا۔ مفت کی قاضی کو بھی حلال ہے لیلا!

لیلا چیں بہ جبیں ہو کر بولی۔ کیا بے حیاؤں کی سی باتیں کرتے ہو جی۔ مفت کی قاضی کو بھی حلال ہے۔ یہ مفت کی شراب نہیں ہے، تمہارے اس دوست کا خونِ جگر ہے اور میری آنکھوں کے آنسو۔ اس کا ایک ایک گھونٹ ان کو اور ان کے ساتھ مجھ کو جہنم کی طرف لے جا رہا ہے۔ مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔ اب تک اسی امید سے دل کو تسکین دیتی تھی کہ تم آ کر انہیں راہِ راست پر لاؤ گے۔ اب وہ امید بھی غائب ہوئی۔ پیر خود ماندے، علاج کیا کریں گے!

دیا کرشن ذرا بھی خفیف نہ ہوا۔ اسی تبسم ظریفانہ لہجہ میں بولا۔ تمہیں یقین ہے کہ میں انہیں راہِ راست پر لا سکتا ہوں؟

"اگر تم نہیں لا سکتے تو ان کی بہار بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ اگر اسی شہر میں بھیک نہ مانگتے پھریں تو مجھے کوسنا۔"

"آخر تم مجھ سے کیوں ایسی امید رکھتی ہو؟ ان کے اور احباب بھی تو ہیں۔ مجھی میں کوئی خصوصیت ہے؟"

"ہاں ہے؟ میں تمہیں ان کا دوست سمجھتی ہوں۔ یا سمجھتی تھی۔ اوروں کو میں ان کا دشمن سمجھتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"یہ مجھ سے مت پوچھو دیا کرشن۔ تمہیں کوئی فائدہ نہ ہو گا اور میرا بے انتہا نقصان۔ بس اتنا ہی سمجھ لو کہ مجھے تم پر اعتبار تھا اور یہ تماشا دیکھ کر بھی وہ اعتبار دل سے اٹھنا نہیں چاہتا۔

یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دیاکرشن کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے جسم کے ایک ایک ذرہ میں کوئی نغمہ گونج اٹھا۔ اس نے مخمور نظروں سے دیکھ کر کہا "تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں لیلا کہ تمہیں اس اعتبار کے لئے پچھتانا نہ پڑے گا۔ تمہارے لئے میں اپنے ضمیر کا خون کرنے میں بھی دریغ نہ کروں گا"۔

یہ کہتا ہوا وہ جلدی سے باہر نکل آیا اور گھر کی طرف چلا، اتنا خوش گویا اس کی زندگی کی ساری آرزوئیں پوری ہو گئی ہیں۔ اس کے قدموں پر گر کر اُس کی پرستش کرنے سے وہ اپنے کو بمشکل روک سکا۔ دنیا میں اس کی زندگی کا شکم پروری کے سوا کوئی دوسرا مصرف ہے، یہ خیال اُس کے تاریک خانۂ دل میں ایک شمع کی طرح روشن ہو گیا تھا۔ خاک میں پڑا ہوا پھول آج دیوتا کے قدموں پر چڑھا دیا گیا تھا۔

(۴)

ایک مہینہ گزر گیا۔ دیاکرشن جیسے سلیم المزاج اور فقیر منش نوجوان کی شوریدہ سری پر اپنے پرائے سبھی انگشت بدنداں تھے۔ سنگار سنگھ کے گھر میں دولت تھی۔ تھوڑی سی رنگین مزاجی اس کے لئے قابلِ معافی ہی نہیں، اس کی زیبائش تھی۔ امرا کی دولت آخر اور کس کام آئے۔ احباب کی بذلہ سنجی اور حسینوں کے حسن کے قدردان اگر یہ نہ ہوں تو کون ہو۔ لیکن دیاکرشن جو لنگوٹی میں پھاگ کھیل رہا ہے اُسے کون معاف کر سکتا ہے۔ برسوں کی عرق ریزی کے بعد کلکتہ میں جو چھوٹا سا کاروبار جما پایا تھا وہ تباہ ہو گیا تھا اور شاید اپنا مکان بھی رہن رکھ چکا تھا۔ ملنے والے سمجھاتے ہیں، نشیب و فراز سجھاتے ہیں۔ مگر اُس کی آنکھوں پر کچھ ایسا پردہ پڑ گیا ہے کہ کسی طرح نہیں اٹھتا۔

سنگار سنگھ سے اب اس کی دوستی نہیں رقابت ہے۔ دونوں ایک ہی صنم کے پجاری ہیں۔ مادھری کے زاہد فریب حسن نے دیاکرشن کو بھی اپنا دیوانہ بنا لیا ہے۔ سنگار سنگھ متکبر ہے، دیاکرشن حد درجہ منکسر۔ سنگار کی نظروں میں مادھری محض شوق کی ایک چیز ہے، محض تفریح کا ایک آلہ، دیاکرشن مادھری کا خادم ہے، محض اُس کے ایک تبسم کا بھوکا۔ سنگار مادھری کے التفات کو اپنا زرِ خرید حق سمجھتا ہے۔ دیاکرشن اسی میں خوش ہے کہ مادھری اس کی خدمتوں کو قبول کرتی ہے۔ مادھری کی جانب سے ذرا بھی بے اعتنائی دیکھ کر سنگار سنگھ اسی طرح غضب ناک ہو جایا کرتا جیسے اپنی عزیز گھوڑی کی شرارت پر۔ دیاکرشن اپنے کو التفات کا مستحق ہی نہیں سمجھتا تھا۔ سنگار جو کچھ مادھری کی نذر کرتا ہے ایک خود نمائی کی شان کے ساتھ۔ جیسے اس پر کوئی احسان کر رہا ہو۔ دیاکرشن اس سے زیادہ بیش بہا تحفے پیش کرتا ہے پر اس طرح جیسے دیوتا کو پھول چڑھاتا ہو۔ سنگار کا حریص نفس مادھری کو اپنے قفس میں بند رکھنا چاہتا ہے۔ دیاکرشن کا وسیع دل اس کے فروغ پر خوش ہوتا ہے۔ مادھری کو اب تک جتنے آدمیوں سے سابقہ پڑا تھا وہ سب سنگار ہی کی طرح نفس پرور، حاسد، خود پسند، نازک جذبات سے عاری تھے، حسن کو نشاط کی جنس سمجھنے والے۔ دیاکرشن ان سبھوں سے الگ تھا، پہلو میں دل رکھنے والا، بے نفس جس کے لئے حسن پرستش کی چیز تھی۔ مادھری کو اب اپنی زندگی میں کوئی ایسی چیز مل گئی ہے جسے وہ بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھنا چاہتی ہے۔ جڑاؤ گہنے اب اس کی نظروں میں اتنے قابلِ قدر نہیں ہیں جتنا یہ فقیر کا دیا ہوا تعویذ۔ جڑاؤ گہنے

ہمیشہ ملیں گے۔ یہ تعویذ کھو گیا تو پھر شاید ہی ملے۔ جڑاؤ گہنے محض اس کے شوق خود نمائی کو خوش کرتے ہیں۔ پر اس تعویذ میں تو روحانی تاثیر ہے جو نہ معلوم کیسے اس میں عقیدت اور خلوص پیدا کر دیتی ہے۔ دیا کرشن اظہار محبت نہیں کرتا۔ اپنی دیوانگی عشق کے راگ نہیں الاپتا۔ لیکن مادھری کو اس پر کامل اعتبار ہے۔ سنگار کی صحبت میں اسے تصنع کا احساس ہوتا ہے۔ وہ چاہتی ہے یہ جلد یہاں سے جائے۔ سنگار کا اظہار اس کے اوچھلے پن کا، اس کی کم ظرفی کا پردہ فاش کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن دیا کرشن کی خموشی میں اسے گہرائی اور گرانی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی صحبت سے اس کی طبیعت سیر نہیں ہوتی اوروں کی وہ معشوق ہے لیکن دیا کرشن کی عاشق۔ جس کے قدموں کی آہٹ پا کر اس کے دل میں ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے، اُس کی زندگی میں یہ ایک نیا تجربہ ہے۔ اب تک وہ دوسروں کے حظ نفس کی چیز تھی۔ اب کم سے کم ایک آدمی کی نگاہ میں وہ عزت اور اعتبار کی چیز ہے۔ جو اس کے لئے قربانیاں کر سکتا ہے، جان دے سکتا ہے +

سنگار سنگھ کے دل میں حسد کی آگ دہک رہی ہے۔ اُس نے دیا کرشن کے پیچھے کئی شہدے لگا رکھے ہیں کہ اُسے جہاں پائیں ذلیل کریں اگر موقع ملے تو اُس کی مرمت بھی کریں۔ وہ خود پستول لئے اُس کی تلاش میں رہتا ہے۔ دیا کرشن یا تو اس خطرے سے بے خبر ہے یا اُسے اپنی زندگی کی پروا نہیں ہے۔ وہ اپنے معین وقت پر مادھری کے پاس آجاتا ہے۔ شہدے اسے دیکھ کر بھی کترا کر نکل جاتے ہیں۔ موقع پا کر بھی کیوں اُس پر وار نہیں کرتے اس کا راز وہ کیا سمجھے +

ایک دن مادھری نے اُس سے کہا "کرشن جی، تم یہاں نہ آیا کرو نہیں تو خیر نہیں ہے، یہاں تمہارے بیسیوں دشمن ہیں میں ڈرتی ہوں کہ کسی دن کوئی حادثہ نہ ہو جائے"

دیا کرشن نے مطمئن انداز سے جواب دیا "میں تو کسی کی برائی نہیں کرتا۔ کوئی میرا دشمن کیوں ہو۔ میں یہاں آنے سے اپنے کو روک نہیں سکتا۔ داتا کے دروازے پر صدہا سائل آتے ہیں اپنی اپنی تقدیر ہے۔ کسی کو اس سے زیادہ فیض پہنچتا ہے کسی کو کم۔ تم اگر کسی سے زیادہ مانوس ہو تو میں اُسے خوش نصیب سمجھ کر اُس کی عزت کروں گا۔ جلنے کی کوئی وجہ نہیں لیکن تم مجھے یہاں آنے سے روک نہیں سکتیں۔ سائل ٹھکرایا جا سکتا ہے۔ روکا نہیں جا سکتا"

مادھری رحم کی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ ایک لمحہ کے بعد بولی۔ "کیا سب آدمی تمہارے ہی جیسے صاف دل ہیں"؟

"تو پھر میرا کیا اختیار ہے"؟

"ایک بات کہوں۔ چلو ہم تم کسی دوسرے شہر میں جا بسیں"

"محض اس خوف سے کہ کچھ لوگ مجھ سے بدظن ہیں"

"بدظن نہیں ہیں۔ تمہارے دشمنوں کے قتل پر آمادہ ہیں"

دیا کرشن اسی مطمئن انداز سے بولا "جس دن تمہاری محبت کا یہ صلہ ملے گا وہ میری نئی زندگی کا دن ہوگا۔ تب میں تم سے باہر نہ رہ کر تمہارے خیال میں، تمہارے دل میں رہوں گا +

مادھری نے نازک ہاتھوں سے اُس کے گال پر تھپکی دی۔ اُس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ ان الفاظ میں جو پیار بھرا ہوا تھا وہ جیسے

پچکاری کی دھار کی طرح اس کے دل میں سما گیا۔ ایسی سراسیمگی! ایسا نشہ! اسے وہ کیا کہے۔ درد میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں بولی "ایسی دل سوز باتیں نہ کیا کرو کرشن، نہیں میں سچ کہتی ہوں ایک دن زہر کھا کر تمہارے قدموں پر سو جاؤں گی۔ تمہارے ان الفاظ میں نہ جانے کیا جادو تھا۔ میں جیسے پھنک اٹھی۔ اب آپ خدا کے لئے یہاں تشریف نہ لایا کیجئے۔ تم کیا جانو ظالم سنگار کس بری طرح تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں اُس کے شہدوں کی خوشامد کرتے کرتے ہار گئی۔ کتنا کہتی ہوں دیا کرشن سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ سنگار کے سامنے نہیں برا بھلا کہتی ہوں تمہارا مذاق اڑاتی ہوں لیکن اسے مجھ پر اعتبار نہیں آتا۔ تمہارے لئے میں نے قاتلوں کی منتیں کی ہیں، ان کی کتنی بے جا فرمائشیں پوری کی ہیں، تم سے نہ کہنا ہی اچھا ہے جن سے باتیں کرنی بھی میں اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہوں اُن کے پیروں گری ہوں، لیکن یہ کتے ہڈیوں کے ریزے پا کر اور بھی شیر ہوتے جاتے ہیں۔ اب میں اُن سے تنگ آ گئی ہوں اور تم سے منت کرتی ہوں کہ یہاں سے کسی ایسی جگہ چلے چلو جہاں ہمیں کوئی نہ جانتا ہو۔ وہاں آرام سے زندگی بسر کریں۔ آج بغیر اس کا تصفیہ کرائے میں تمہیں یہاں سے نہ جانے دوں گی"

دفعتہً نیچے زینے پر ہلچل سنائی دی۔ پھر دھڑ سے دروازہ بند ہو گیا اور نیچے سے آدمی دوڑتا ہوا آ کر بولا "بائی جی! سردار صاحب آئے ہیں اور اوپر آنے کے لئے ضد کر رہے ہیں۔ تمہارے حکم کے مطابق میں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا ہے"

مادھری کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ گھبرا کر بولی "اکیلے ہیں یا ساتھ اور آدمی ہیں؟"

"نہیں دو آدمی اور لاٹھیاں لئے کھڑے ہیں"

مادھری نے سر پر ہاتھ مار کر کہا "یہ شیطان اس وقت کیا کرنے آیا؟ یہ تو اس کے آنے کا وقت نہ تھا۔ ضرور کسی مخبر نے خبر دے دی"

نیچے سے کسی نے زور زور سے دروازے کو کھٹکھٹانا شروع کیا۔ مادھری زینہ کی طرف دوڑی۔ اس وحشت میں عورت کا نازک دل اس کے چہرے پر آ کر کسی طائر کی طرح پھڑپھڑاتا ہوا معلوم ہوا۔ زینے کی طرف دو قدم جا کر وہ پھر لوٹ پڑی اور کھڑکی کے پاس جا کر نیچے دیکھ کر بولی "کیا ہے جی، کیوں دروازہ توڑے ڈالتے ہو؟"

سنگار نے خونبار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا "خیریت اسی میں ہے کہ دروازہ کھول دو۔ دیا کرشن اوپر بیٹھا ہوا ہے۔ آج اُس کی اور تمہاری دونوں کی مزاج پرسی کروں گا"

دیا کرشن نے سر نکال کر کہا "تو شوق سے آؤ میں تیار ہوں"

مادھری نے چھاتی پیٹ کر کہا "یہ کیا غضب کرتے ہو کرشن! ہائے کیوں اپنی جان کے دشمن ہوئے ہو۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں، مجھے اُس کی دولت نہ چاہئے۔ اس کے تحفے نہ چاہئیں۔ میرے لئے تو دنیا میں تم اور صرف تم ہو"

دھماکے کی آواز ہوئی۔ شکنی لاٹھیوں کی چوٹیں نہ سہہ سکی۔ زینے کے دونوں کواڑ کھل گئے اور سنگار اپنے دونوں غنڈوں کے ساتھ دھم دھم کرتا ہوا اوپر چڑھ آیا اور قبل اس کے کہ مادھری کچھ کہہ سکے تینوں آدمی دیا کرشن پر ٹوٹ پڑے اور اُسے ٹھوکروں اور لاٹھی کے کندوں سے مارنے لگے۔ مادھری بار بار اُسے بچانے کے لئے لپکتی تھی پر یہ شیطان اُسے بار بار دھکے دے کر ہٹا دیتے تھے۔ اُس کی ساری چوڑیاں ٹوٹ گئیں، مہین ریشمی ساڑھی کئی جگہ سے مسک گئی زلفیں کھل گئیں۔ ہونٹ خشک ہو گئے مگر ان ظالموں کو نہ اس پر رحم آتا تھا اور نہ دیا کرشن

پر۔ آخر جب وہ بیدم ہوگیا اور خون جاری ہونے سے اُس پر غشی کی کیفیت طاری ہوگئی تب سنگار نے کہا اب جانے دو نہیں مرجائے گا۔ بچہ کو کافی سبق مل گیا۔ کچھ دنوں یاد رہے گا۔"

مادھری نے آنکھوں میں آنسو بھرے خون کا گھونٹ پی کر کہا "نہیں نہیں کام تمام کر دو شاید ابھی کچھ جان باقی ہو۔ اپنی کسر کیوں رکھتے ہو۔ لیکن آج میں اس راز کو کھوئے دیتی ہوں جسے میں نے اب تک چھپایا تھا۔ کرشنا میرا ہے اور میں کرشنا کی ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔ بازاری عورت کے سینہ میں بھی دل ہوتا ہے اور اس دل میں بھی محبت ہوتی ہے، اسے ثابت کرنے کا تم نے مجھے موقع دے دیا اس کے لئے میں تمہاری مشکور ہوں۔ اس کی زندگی میں میری محبت غرض سے خالی نہ ہوسکتی تھی۔ میں شاید محبت کے عوض محبت کی خواستگار رہتی اب میری محبت غرض سے پاک ہوگی۔ وہ محبت کا دیوتا تھا، اُس محبت کا جو کوئی عوض نہیں چاہتی، محض قربان ہونا چاہتی ہے۔ تم مجھے دولت سے خریدنا چاہتے تھے۔ اس نے مجھے اپنی محبت سے خریدا جس پر آج میں تمہاری ساری دولت نثار کر دوں گی۔"

سنگار سنگھ کے سینے میں جلتی ہوئی دھات کی ایک لہر گھسی اور اس کے دل و دماغ کو چھن چھن جلاتی ہوئی اوپر نکل گئی وہ اس طرح دو قدم پیچھے ہٹ گیا گویا کسی ناگن نے پھنکارا ہو۔ مادھری نے اب تک اسے سبز باغ دکھایا تھا۔ ہمیشہ دیا کرشن کی بدگوئیاں کرتی رہتی تھی۔ اس سے سنگار سنگھ سمجھتا تھا دیا کرشن محض ضد سے یہاں آتا ہے۔ مادھری اس سے التفات نہیں کرتی۔ آج اس کی نظروں سے پردہ ہٹ گیا۔ اسے معلوم ہوا جسے اس نے وفا کی دیوی سمجھ رکھا تھا وہ زہریلی ناگن ہے۔ اس کی ساری دیوانگی، سارا محبت کا نشہ، ایک قاتل نفرت میں تبدیل ہوگیا۔ زندگی میں ایسی شکست اسے پہلی بار ملی، اور ایک حقیر دشمن کے مقابلہ میں۔ ہونٹ چبا کر بولا۔ "اب مجھے اپنی حرکت پر مطلق افسوس نہیں ہے۔ تم اسی برتاؤ کے قابل تھیں۔ میری ساری جاں نثاریوں کا یہی صلہ تھا جو تم نے مجھے دیا! عورت کتنی بے وفا ہے اس کا تم نے مجھے سبق دے دیا۔ کیا ستم ہے کہ جس پر میں اپنی جان تک نثار کرنے کو تیار تھا وہ یوں دغا کرے۔"

مادھری اپنا رومال تر کر کے دیا کرشن کا منہ دھو رہی تھی۔ تڑپ کر بولی۔ "کیا فضول بکتے ہو۔ تم جیسے نفس کے بندے جاں نثار نہیں نہیں ہوسکتے۔ تم میرے پاس تفریح کے لئے آتے تھے اور میں تمہاری تفریح کرتی تھی۔ تم میری صورت کے میری اداؤں کے خریدار تھے میں نے وہ چیزیں تمہیں دیں۔ پیسوں سے تم عورت کا دل نہیں خرید سکتے۔ تمہاری ساری جائداد اُس کے پاسنگ بھی نہیں۔ دل صرف دل سے ملتا ہے صرف دل سے، نہ عورت سے محبت کی اصلی اور نقلی صورت چھپی رہ سکتی ہے۔ اب للّٰہ جاؤ اور مجھے اپنی تقدیر پر رونے دو میں اسی وقت تمہیں پولیس کے سپرد کرسکتی ہوں لیکن میں جانتی ہوں کہ کرشنا کبھی اسے پسند نہ کرے گا۔"

سنگار نے غصہ سے کانپتے ہوئے کہا "تم نے میرے ساتھ بے وفائی کیوں کی؟"

مادھری نے اسی لہجہ میں جواب دیا "اگر تم نے اپنے کو میرے ہاتھ نہیں بیچا تو میں نے بھی اپنے کو تمہارے ہاتھ نہیں بیچا۔ جس طرح تم آزاد ہو اُسی طرح میں بھی آزاد ہوں۔ تم قسم کھا سکتے ہو کہ اس دوران میں تمہارا کسی اور سے تعلق نہیں رہا؟"

سنگار دم بخود کھڑا رہ گیا۔ اس سوال کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔ یہ قسم وہ نہ کھا سکتا تھا۔ ایک لمحہ تک وہ دل میں انتقام کے منصوبے سوچتا رہا۔ تب آہستہ آہستہ زینہ سے اتر گیا۔ اس کے غضبناک چہرے پر خفت کا شوخ رنگ جھلک رہا تھا جیسے اُس کی ساری

پونجی بازار میں لٹ گئی ہو۔ مادھری نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا+

(۵)

رات کو سنگار سنگھ کی محفل نہ جمی۔ احباب مبارکباد پیش کرنے آئے مگر سنگار سنگھ کی طبیعت مضمحل تھی۔ وہ کسی سے نہ مل سکا۔ اپنی خلوت گاہ میں بیٹھا ہوا پیگ پر پیگ پی رہا تھا پر اندر کی آگ نہ فرد ہوتی تھی۔ اس شعلہ نے نہ جانے کتنے خس و خاشاک کو جلا کر خاک کر دیا تھا، اور اب اوپر کی سطح سے گزر کر ایک حیات بخش حرارت کی صورت اختیار کر کے ندامت اور غیرت کے افسردہ اور زنگ نشین جذبات میں حرکت اور ہیجان پیدا کر رہا تھا۔ مادھری کی بے وفائی نے اس کے الھڑ اور نشاط پسند دل کو کچھ ایسا مجروح کر دیا تھا کہ اب ہمدردی کی آواز بھی اس کے زخم پر نمک سا چھڑک رہی تھی۔ مادھری اُس کی زندگی کی دلفریب ترین حقیقت تھی۔ اس کی زندگی کے سارے خطوط اسی مرکز پر مجتمع ہوتے تھے، وہ مرکز آج یکایک حباب کی طرح مٹ گیا اور اب وہ سارے خطوط، وہ ساری دلچسپیاں، وہ ساری کیفیتیں اُن تند اور غضبناک مکھیوں کی طرح بھنبھناتی پھرتی تھیں جن کا چھتہ شہد سے بھرا ہوا جلا دیا گیا ہو۔ جب مادھری نے بے وفائی کی تو اور کس سے وفا اور خلوص کی امید کی جائے۔ مادھری کے وہ دل آزار الفاظ رہ رہ کر اس کے جگر میں کسک پیدا کر رہے تھے۔ اس ویران زندگی کو لے کر اب وہ کیا کرے+

تین دن گزر گئے تھے۔ لیلا کو یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ ان دنوں میں محفل سُونی کیوں ہے۔ وہ احباب کہاں گئے جو صبح ہوتے ہی سوار ہو جاتے تھے اور آدھی رات کے قبل ٹلنے کا نام نہ لیتے تھے۔ کہیں سنگار سنگھ کی طبیعت ناساز تو نہیں ہے؟ اس نے سنگار سنگھ کے کسی معاملے میں دخل دینا ترک کر دیا تھا۔ اسے اس گھر سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ باہر کی جو کچھ فرمائش ہوتی تھی اس کی بے عذر تعمیل کو اس نے اپنی عادت بنا لیا تھا، نہ کسی شوق سے واسطہ تھا نہ آرائش سے۔ کوئی زاہد بھی شاید اس بے رحمی سے اپنے نفس کو پامال نہ کرتا۔ مگر آج اس اندیشہ نے اس کے زاہدانہ جمود میں حس پیدا کر دی۔ شادی کے بعد کچھ دنوں اس نے محبت کا مزا چکھا تھا۔ وہ پھول مرجھا گیا تھا لیکن سوکھی ہوئی پتیوں میں ابھی خوشبو باقی تھی۔ اس پھُول کی خوشبو میں، اس محبت کی یاد میں اب بھی دل کو دردناک مسرت حاصل ہوتی تھی وہ آہستہ آہستہ سنگار کی خلوت گاہ کے دروازے تک آئی اور کان لگا کر سنتی رہی۔ پر کوئی آہٹ نہ پا کر اس نے پردہ اٹھا کر اندر جھانکا۔ دیکھا سنگار سنگھ صوفے پر کہنی کے بل بے حس و حرکت لیٹا ہوا ہے جیسے کوئی درخت شام کے سکوت میں اپنی پتیوں کو سمیٹے ہوئے ہو۔

اس نے کمرے میں جا کر پوچھا "میری زبان پر تو قفل ڈال دیا گیا ہے لیکن کیا کروں، بغیر بولے نہیں رہا جاتا۔ کئی دن سے حضور کی محفل میں سناٹا کیوں ہے؟"

سنگار سنگھ نے آنکھیں اٹھائیں۔ ان میں ناقابلِ بیان درد بھرا ہوا تھا۔ حسرت ناک لہجہ میں بولا "تم اپنے میکے کیوں نہیں چلی جاتیں لیلا؟"

لیلا نے خود دارانہ انداز سے کہا "آپ کا جو ارشاد ہو گا اُس کی تعمیل میرا فرض ہے۔ مگر یہ تو میرے سوال کا جواب نہ تھا۔"

"وہ کوئی بات نہیں۔ میں بالکل اچھا ہوں۔ مگر اب اس زندگی سے سیر ہو گیا ہوں۔ جی چاہتا ہے کچھ دنوں دنیا کی ہوا کھاؤں

تم اپنے گھر چلی جاؤ تو مجھے تمہاری طرف سے اطمینان ہو جائے"+
"شکر ہے آپ کو میری اتنی فکر تو ہے۔ جب کہئیے چلی جاؤں۔ میری وجہ سے آپ کے اطمینان میں خلل پڑے میرے لئے اِس سے زیادہ بدنصیبی اور کیا ہوگی؟"
"تو تم اپنی تیاریاں کرو۔ میں تمہیں خود پہنچا دوں گا۔ اُدھر ہی سے چلا جاؤں گا"
"مجھے کوئی تیاری نہیں کرنی ہے اور نہ آپ کو میرے ساتھ جانے کی ضرورت ہے۔ کسی نوکر کو ساتھ لے لوں گی"
"میں ناراض ہو کر نہیں کہہ رہا ہوں لیلا۔ تم جو جو چیزیں چاہو لیتی جاؤ۔ تمہیں یہاں سے ماہوار خرچ ملتا رہے گا"
"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میں نے بہت دنوں سے اس گھر کی چیزوں کو اپنا سمجھنا چھوڑ دیا۔ اب تک آپ کی روٹیاں کھاتی تھی۔ آپ کو یہ بھی گراں گزر رہا ہے تو وہ بھی چھوڑ دوں گی"+
سنگار سنگھ نے لیلا کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا اور التجا کی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "ایشور کے لئے جلاؤ مت لیلا۔ مجھے اس وقت تمہارے رحم اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔ دغا اور بے وفائیوں نے سینہ کو چھلنی کر دیا ہے۔ اُس پر چھریاں نہ چلاؤ۔ میں جانتا ہوں مجھے تم سے کوئی التجا کرنے کا حق نہیں ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم میری التجا کو رد نہ کرو گی۔ اس دنیا سے جی بیزار ہو گیا۔ یہاں اپنے عزیز ترین دوست، جن کے لئے ہم مرنے کو آمادہ ہوتے ہیں، موقع پاکر گردن کاٹتے ہیں۔ ایسی زندگی پر اور ایسے آدمیوں پر لعنت ہے۔ دیا کرشن کو تم جانتی ہو۔ اسی گھر کے ٹکڑوں پر پلا، اسی گھر سے آدمی بنا، مگر آج وہ میرا جانی دشمن ہے۔"
سنگار یہ کہتا کہتا رُک گیا۔ لیلا اُس کے منہ کی طرف تکتی رہی، اُسے ایسا معلوم ہوا وہ کچھ اور کہنا چاہتا ہے۔ دو ایک بار الفاظ اُس کے لبوں تک آتے ہوئے معلوم ہوئے۔ لیکن باہر نہ نکل سکے+
آخر لیلا نے پوچھا۔ "دیا کرشن تو ایسا آدمی نہیں ہے ضرور کوئی نہ کوئی وجہ ہوگی"+
سنگار نے تند ہو کر کہا۔ "کوئی وجہ نہیں۔ محض اُس کی بدمعاشی ہے۔"
"میں اسے نہیں مانتی۔"
"وہ مجھے ذلیل اور بدنام کرنا چاہتا ہے"+
"آخر کیوں؟"
"یہ اُسی سے پوچھو۔ مگر میں نے بھی اُن کی ایسی مرمت کر دی ہے کہ شاید پھر کبھی میرے راستے میں نہ کھڑے ہوں"+
لیلا نے اسے نگاہِ ملامت سے دیکھا۔ اُس کی آواز میں لغزش تھی+
"تو یہاں تک نوبت پہنچ گئی؟"
سنگار نے اپنی صفائی دی۔ "کام تو حضرت نے وہ کیا ہے کہ میں انہیں قتل کر دینے میں بھی حق بجانب تھا لیکن میں نے طرح دی۔ اب آپ کو عشق کا شوق چرایا ہے۔ جب اس کوچہ سے رسوا ہو کر نکلیں گے تب ہوش آئے گا۔ میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں خود ہی تباہ ہوں گے جو کچھ

لیٹی پوچی تھی وہ نکل چکی ہوگی اب بے شرمی کی روٹیاں توڑنی پڑیں گی میں تو کبھی کبھی افسوس کرتا ہوں کہ ناحق اُس کے پیچھے پڑا۔ اُس نے تو ایک طرح سے مجھے ہشیار کر دیا۔ ایک طرح سے نہیں قطعی طور پر ہشیار کر دیا۔ تم سے کیا چھپاؤں لیلا میں نے تمہارے ساتھ دغا کی ہے۔ بیوفائی کی ہے بیرحمی کی ہے۔ اب میرا منہ نہیں ہے کہ تم سے ہمدردی کی التجا کروں میری غلطیوں کو معاف کرنا۔ میں تو کہیں کا نہ رہا۔ میری حالت تو بجنسہ اُس آدمی کی سی ہے جو ایک کانچ کے ٹکڑے کو پاکر ہیرا سمجھ بیٹھے اور اسی نشہ میں اپنا گھر جلا دے کہ اب تو وہ اپنے لئے محل بنوائے گا۔ اب تو میرے لئے اس کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہیں ہے کہ منہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جاؤں یا کہیں ڈوب مروں +

اُس نے پھر لیلا کی طرف دیکھا۔ ان آنکھوں میں شکست تھی، التجا تھی، درد تھا۔

(۶)

ایک مہینہ گزر گیا ہے۔ شام کا وقت ہے۔ سند گار سنگھ اور لیلا اپنے باغیچہ میں حوض کے کنارے ہری گھاس پر بیٹھے ٹھنڈی ہوا کا لُطف اٹھا رہے ہیں کہ دیا کرشن باغ کا پھاٹک کھول کر مسکراتا ہوا اندر آیا اور سند گار کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوا بولا "اب تو تم نے میرا قصور معاف کر دیا ہوگا" سند گار سنگھ اضطراری جوش میں اٹھ کر اُس کے گلے سے لپٹ گیا۔ ندامت اور افسوس کے آنسو اُس کی آنکھوں میں ڈبڈبا آئے۔ زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا +

لیلا نے دیکھا دیا کرشن بہت لاغر ہو گیا ہے اور اُس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی ہے مگر بشاش ہے۔ ترچھی نظروں سے دیکھ کر بولی "کیا ابھی کچھ کمزوری باقی ہے"؟

دیا کرشن نے گھاس پر بیٹھتے ہوئے کہا "آپ سے مطلب؟ آپ نے تو سمجھ لیا اچھا ہوا مر رہا ہے۔ خس کم جہاں پاک، مگر میری زندگی باقی تھی۔ بچ گیا۔ بھول کر بھی تو ایک بار دیکھ لیتیں کہ مرا یا جیتا ہے +

لیلا نے شرارت آمیز تبسم سے کہا "میں آپ کی نئی نویلی محبت کی دلچسپیوں میں کیوں مخل ہوتی۔ انہیں سمجھانے آئے تھے اور خود اُس کی اداؤں کا شکار ہو گئے۔ سچ کہا ہے مردوں کا کوئی اعتبار نہیں" +

دیا کرشن قہقہہ مار کر ہنسا۔ پھر بولا "میری فکر نہ کرو۔ میں شکار ہو گیا یا مر گیا۔ اس کا غم نہیں۔ تم دونوں کو آج یہاں یکجا بیٹھے دیکھ کر مجھے اپنی ساری تکلیفوں کا معاوضہ مل گیا۔ ادھر تو محض گھاتے میں ملی۔ کل ہماری شادی ہے تمہیں دعوت دینے آیا ہوں" +

لیلا حیرت سے اُس کے منہ کی طرف تکنے لگی اور سند گار "بڑے بدمعاش ہو، بڑے شیطان ہو" کہہ کر اُسے بار بار پیار کرنے لگا +

پریم چند

شعر گوئی

[illegible]

افضل النساء علی دہلوی

جذباتِ اعجاز

یہ مرزا اعجاز حسین مرحوم کی آخری غزل ہے جو انہوں نے ہمایوں کے سالگرہ نمبر کے لئے بھیجی تھی۔ اُن کا جو خط غزل کے ساتھ آیا تھا اس کا ترجمہ بھی ذیل میں بطورِ تبرک درج کیا جاتا ہے:-

عزیزِ مکرم میاں بشیر احمد صاحب

السلام علیکم۔ میں آج ایک غزل بھیج رہا ہوں۔ مدت ہوئی جب میں نے وعدہ کیا تھا کہ ہمایوں کے لئے کچھ بھیجوں گا لیکن خرابیٔ صحت اب تک مانع رہی۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ آپ نے مجھے میرے کچھ شعر ہارمونیم کے ساتھ گا کر سنائے تھے اور آپ کی مہارتِ فن نے ان اشعار میں روح پھونک دی تھی۔ اگر موجودہ غزل میں سے آپ نے کوئی شعر پسند کیا تو میری کوششوں کا یہی صلہ کافی ہوگا کہ آپ کی قدرتِ فن ایک دفعہ پھر ان بے جان خیالات میں جان ڈال دے۔

آپ کا مخلص
اعجاز حسین

دہلی۔ ۱۸ر اگست ۱۹۳۲ء

خوشی سے دن گزار اپنا شبِ آلام آنے تک — ذرا کھٹکا نہ رکھ انجام کا انجام آنے تک

یہ مانا ہاتھ میں ساغر ہے لیکن کیا بھروسا ہے — ہزاروں لغزشیں حائل ہیں لب تک جام آنے تک

مکافاتِ عمل میں دیر بھی اب تو نہیں لگتی — کرو جو صبح بدلہ مل رہے گا شام آنے تک

تکلف کیا تمہاری آنکھ بھی تو شیشۂ مے ہے — اسی شیشے سے کچھ دے دو مئے گلفام آنے تک

بڑے دعوے سے مے خانہ چلے ہیں حضرتِ واعظ — بڑی رونق رہے گی آپ کے ناکام آنے تک

چلا آتا ہی دورِ مے مگر دل میں یہ دھڑکا ہے — نظر ساقی کی پھر جائے نہ مجھ تک جام آنے تک

بتا دو تم ذرا خود ہی کہ کتنے سال گزریں گے — تمہاری صبح ہونے تک تمہاری شام آنے تک

یہی غفلت شعاری ہے تو تم کام آ چکے اپنے — کہ اپنا کام ہو لے گا تمہارے کام آنے تک

کبھی تو یاد فرمائیں گے اے اعجاز مت گھبرا
گزر ہی جائے گی سرکار کا پیغام آنے تک

شاعر اور لالۂ صحرا

شاعر

"لالۂ صحرا! بیاباں میں کھلا تھا کس لئے؟ یعنی تو رونق فزا بن میں ہوا تھا کس لئے؟
آہ تجھ کو دیکھنے والا نہیں بن میں کوئی آہ تیرا والہ و شیدا نہیں بن میں کوئی
بلبلیں تجھ پر نہ گائیں گی نہ گائیں گی کبھی قمریاں کو کو کہاں تجھ کو سنائیں گی کبھی
باغ کے طائر نہ تجھ پر پھڑ پھڑائیں گے یہاں شہد کے ماتے نہ آ کر بھنبھنائیں گے یہاں
موتیا کی کب میسر ہے یہاں ہمسائیگی نسترن کی شاخ جھک کر تجھ تلک کب آئے گی
باغ کے پودے نہ بن میں لہلہائیں گے کبھی دیکھ کر تجھ کو نہ غنچے مسکرائیں گے کبھی

رات شبنم رو رہی تھی بے کسی یہ دیکھ کر!
جل رہا ہے مہر تاباں زندگی یہ دیکھ کر!"

لالۂ صحرا

"واہ وا کی آرزو مجھ کو بیاباں میں نہیں اس کا غم مجھ کو نہیں گر میں گلستاں میں نہیں
خود مری ہستی ہے مجھ کو رونقِ صد گلستاں بن کی یہ بستی ہے مجھ کو خلد زار آسماں
آپ ہی اپنی حقیقت جاننا بس ہے مجھے آپ اپنی خوبیاں پہچاننا بس ہے مجھے
قدرداں ہے میری محبوبی کی فطرت آپ ہی سیر کرتی ہے مری خوبی کی فطرت آپ ہی
دادِ معصومی دیا کرتی ہے قدرت خود مجھے لیتی ہے آغوش میں آ کے رحمت خود مجھے
بلبلوں کا شور سننے کی کہاں فرصت مجھے وقت اپنا مفت کھونے کی نہیں عادت مجھے

داغِ الفت نے گلستاں کر دیا سینہ مرا
میرے دل میں ہو گیا محفوظ گنجینہ مرا"

ح۔ب

احسن الکلام

ہمایوں کے سالنامے کے لئے چند شعر ایک غزل کے حاضر کئے جاتے ہیں۔ ہمایوں کے لئے میری خدمات سب سے پیچھے ہیں۔ اس کا احساس مجھے ہمیشہ رہتا ہے مگر ساتھ ہی اس کوتاہی کے اسباب بھی ایسے دائمی اور مستقل ہیں کہ گویا وہ مجھ سے جدا ہونا خلافِ وضع سمجھتے ہیں سچ کہا ہے وضعداری بری بیماری ہے۔ دیکھئے یہ بیماری کب پیچھا چھوڑتی ہے اگرچہ دیر ہوگئی ہے مگر امید ہے کہ کسی نہ کسی آخری صفحے میں ابھی گنجائشِ اندراج باقی ہوگی۔

احسن مارہروی

حسن چاہے گا بہرحال نمایاں ہونا ... تم سے پردے میں بھی ممکن نہیں پنہاں ہونا
دردِ منظور، مداوا مجھے منظور نہیں ... ذلّتِ عشق ہے منت کشِ درماں ہونا
میرا مذہب ہے اگر عشق تو ایماں ہے تو ... تیرا نقصان ہے غارتگرِ ایماں ہونا
نہ ہنسا صبحِ شبِ وصل ہمیں اپنی طرح ... کچھ حقیقت نہیں رکھتا ترا خنداں ہونا
غم نہیں گردشِ ایام سے پس جانے کا ... ہو مقدر میں جو خاکِ درِ جاناں ہونا
دلِ مضطر سا نہیں کوئی عجیب الخلقت ... جس کی قسمت میں ہے گھر رہ کے پریشاں ہونا
مقصدِ زندگیِ دل ہے کسی پر مرنا ... حاصلِ عشق ہے جینے سے پشیماں ہونا
مرگِ وحشی پہ نہیں خاتمۂ جوشِ جنوں ... کہ کفن کو ابھی باقی ہے گریباں ہونا
تم نہ دو خواب میں تسکیں کہ ہم دیکھیں گے ... انہیں خوابوں سے خیالوں کا پریشاں ہونا
سنگ دل تو ہی نہیں نابلدِ راہِ عزا ... تیری آنکھوں نے بھی دیکھا نہیں گریاں ہونا
چشمِ تر ہجر میں کہتی ہے کہ جل تھل بھر دوں ... ضبط کہتا ہے خبردار نہ گریاں ہونا
ہے یہ نیرنگِ تصور کہ تری یاد کے ساتھ ... آپ ہنسنا مجھے اور آپ ہی گریاں ہونا

وہ مرے غم سے ہیں خوش، سوچ رہا ہوں احسن
چاہیئے مرثیہ پڑھنا کہ غزل خواں ہونا

ایاز کی قبر تک

جس وقت ہم پُل پر سے بے تحاشا دوڑتے ہوئے اُتر رہے تھے، انجن پہلے آہستہ اور پھر زور سے سیٹی دے چکا تھا، اور اب اپنے پہیوں کی پہلی گردش کے ساتھ دھوئیں کے دو ایک مرغولے بھک بھک کرتا ہُوا چھوڑ رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر اُترتے ہی ہم وحشیوں کی طرح تیز ہوتی ہوئی گاڑی کی طرف جھپٹے۔ اپنا اپنا ہینڈ بیگ بدحواسی کے عالم میں ہم نے گاڑی کے اندر پھینکا۔ اس کے بعد پہلے لپک کر میں سوار ہُوا اور پھر احسن صاحب کو تقریباً گھسیٹ کر میں نے گاڑی میں داخل کیا۔

جس ڈبے میں ہم سوار ہوئے تھے اُس میں چار حضرات پہلے سے بیٹھے تھے اور ہمارے خلفشار کو دیکھ کر سب ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ یہ بالکل قدرتی بات تھی اور اس سے زیادہ قدرتی یہ بات تھی کہ جب ہم نے منہ پھیر کر اُن کی صورتوں کا جائزہ لیا تو سب نے نگاہ نیچی کر لی اور یہ ظاہر کرنا چاہا۔ کہ گویا اُنھوں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ احسن صاحب اگرچہ عمر میں صرف سال بھر مجھ سے بڑے ہیں مگر اداشناسی میں مجھ سے دس گنا اور شرافت میں یقیناً ہزار گُنا بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ بہ ظاہر مجھ سے لیکن دراصل اپنے باقی ہم سفروں سے خطاب کر کے کسی قدر ہانپتے ہوئے بولے: "——— پورے سے سٹیشن تک پچیس منٹ میں۔ پورے دو میل تھے، اور پھر پیدل!"

اپنے ہنگامہ خیز داخلے کی یہ شرح پیش کر کے احسن صاحب نے اپنے ہمراہیوں کو مطمئن کر دیا اور وہ فرداً فرداً اونگھنے، نظریں گاڑ کر خلا میں دیکھنے یا اپنے گھٹنے کو ایک خاص تال پر اُچھالنے میں بدستور سابق مصروف ہو گئے۔ مگر ایک صاحب کو آداب مجلس کی یہ معمولی سی پاس داری شاید گوارا نہ تھی۔ یہ ایک نسبتہً سن رسیدہ بزرگ تھے جو صورت سے شائستہ اور تعلیم یافتہ معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی نگاہیں میری طرف اس بے تکلفی سے اُٹھی ہوئی تھیں گویا دنیا کی سب سے قدرتی بات میرے چہرے کا معائنہ ہے۔ میں نے اپنے پریشاں بالوں کو ہاتھ سے سلجھاتے ہوئے ایک تیز و تُند نگاہ اُن پر ڈالی اور پھر اپنے قہر آلود چہرے کی خشم ناکی کا پورا رخ اُن کی طرف پھیر کر اور اپنے پاؤں زیادہ سے زیادہ حد تک پسار کر اُن کے سامنے کی نشست پر ڈٹ گیا۔

"آپ سید ——— صاحب مرحوم کے صاحبزادے تو نہیں ہیں؟"

بندوق کی آواز سے جنگل کے پرندے شاید اس طرح نہیں چونکتے۔ میں یک بیک سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور میری ٹانگیں فوراً سمٹ کر اپنی قدرتی وضع میں آگئیں۔ یہ سوال اُنہیں صاحب نے کیا تھا جو میرے مقابل بیٹھے تھے۔ میں گھبرا کر صرف یہی کہہ سکا "جی ہاں ——— فرمائیے" اگرچہ فرمائیے کہنے سے میرا کوئی خاص مطلب نہ تھا۔

"میرا غور سے دیکھنا آپ کو شاید ناگوار ہُوا لیکن ———

"جی نہیں بالکل نہیں مطلق نہیں - میں نے تو کچھ محسوس ہی نہیں کیا "۔

" لیکن آپ کی صورت اپنے والد مرحوم سے بہت زیادہ ملتی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ آپ ہو بہو اُن کی تصویر ہیں - جب آپ نے اپنے گاؤں کا نام لیا - تو مجھے آپ کو پہچاننے میں کوئی دقت نہ رہی - آپ کے والد مرحوم میرے نہایت عزیز دوست تھے ——— "

اتنا سن کر احسن صاحب بھی اپنی جگہ سے سرکے اور ہمارے پاس آ بیٹھے - میں نے اُن کا تعارف کرایا "میر محمد احسن بی اے ، میرے چچیرے بھائی" ساتھ ہی اُن صاحب نے اپنا نام بتایا تو معلوم ہوا کہ مجھے اباجان کے دوست رائے بہادر پنڈت ——— لال سے شرفِ گفتگو حاصل ہے - میں نے کہا "ہمیں سخت ندامت ہے کہ ہم آپ کو پہچان نہ سکے - مگر والد مرحوم کے زمانے میں چونکہ ہم بالکل بچے ہی تھے ——— "

" جی ہاں ، انہیں گزرے اگرچہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ ہو گیا - مگر میرے دل میں اُن کی دوستی کا گہرا نقش اب تک محفوظ ہے اپنے مسلمان دوستوں کے ساتھ اُن کو وہ دلی ربط تھا - جو میرے ساتھ ، اور معاف کیجئے اگرچہ اب آپ کا علاقہ ہندو مسلم فسادات کا مرکز ہے ، میں نے وہ دن بھی دیکھے ہیں جب میر صاحب مرحوم زندہ تھے اور فخر سے کہا کرتے تھے - کہ ہمارے علاقے کے ہندو مسلمان دوست دوست نہیں بھائی بھائی ہیں - مگر یہ گزرے دنوں کی باتیں ہیں - وہ زمانہ کچھ عجیب زمانہ تھا - اب مجھے ہی دیکھئے - میں پرانی نسل کے آدمیوں میں سے ہوں اور ہندو ہونے کے باوجود میری ساری عمر اسلامی ہندوستان کے آثارِ قدیمہ کی تفتیش میں گزری ہے - ہندو تو اب ایک طرف رہے خود مسلمانوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ اپنی پرانی تہذیب اور اس تہذیب کے آثار سے بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں "

احسن صاحب نے ایم اے میں تاریخ لے رکھی ہے اور میں نے سائنس - سائنس میرے لئے حقائق کا ایک منظم مجموعہ ہے لیکن احسن صاحب کے لئے تاریخ محض شاعری کی ایک صنف ہے - وہ گذشتہ صدیوں کے واقعات کو اپنے تخیل کی آنکھ سے اس طرح دیکھتے ہیں گویا ایک طویل افسانہ ہے جس کی نمایاں خصوصیت اس کا شکوہ و طمطراق ہے - یوں بھی طبیعت ذرا پُر جوش ہے - اب انہوں نے مسلمانوں کی موجودہ نسل پر رائے بہادر صاحب کی تنقید سنی تو بے تاب ہو گئے اور یہ ثابت کرنے پر اُتر آئے - کہ ماضی کے ساتھ شدید وابستگی مسلمانوں کی سب سے بڑی قومی خصوصیت ہے - آپ نے تاریخ میں سے بہت سے شواہد پیش کئے اور اسی دوران میں کہا کہ مسلمانوں کی قبریں ہی ایک حد تک اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ وہ زندگی کے بعد بھی گزشتہ تعلقات کی یاد کو قائم رکھنا چاہتے ہیں -

رائے بہادر صاحب اُن کے اس جوش و خروش پر مسکراتے رہے لیکن یہ آخری دلیل سن کر انہوں نے ایک انگڑائی لی اور کہا "قبروں کے متعلق آپ کا استدلال شاید صحیح ہو لیکن قبریں بنانا اور پھر انہیں منہدم ہونے کے لئے چھوڑ دینا یقیناً زندگی کے آثار میں سے نہیں ہے "۔

" مگر کیا صرف لاہور دہلی اور آگرے کے مغلیہ مقبرے آپ کے دعوے کے خلاف ایک زبردست دلیل نہیں ہیں "؟

" مجھے یہ تسلیم ہے کہ دنیا کے بہت سے بہترین مقابر اسلامی تہذیب کی یادگاریں ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر میں یہ کہوں گا کہ قدیم یونانیوں کے بعد کتبہ نگاری کے فن کو اگر کسی قوم نے سمجھا تو وہ مسلمان ہی تھے - مثلاً دلی میں جہاں آرا بیگم کی قبر پر لکھا ہوا یہ شعر دیکھئے -

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا ۔۔۔ کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیاہ بس است

!: لاہور میں انار کلی کی قبر پر یہ شعر

تا قیامت شکر گویم کردگار خویش را ‏ ‏ ‏ ‏ آہ اگر من باز بینم روئے یار خویش را

" یا پھر ہندوستان سے باہر مثلاً مرو میں الپ ارسلان کی تربت کا کتبہ

سر الپ ارسلاں دیدی ز رفعت رفتہ بر گردوں؟ ‏ ‏ ‏ بمرو آ تا بخاک اندر سر الپ ارسلاں بینی!

کیا حسن و زیبائی میں اس سے بہتر کتابے تصور میں آ سکتے تھے؟ جن لوگوں کی قبروں پر یہ شعر درج ہیں اُن کی زندگی کی کتنی صاف اور سچی تصویر صرف ایک ایک شعر میں کھینچ دی گئی ہے۔ یہ سب درست ہے لیکن ان قبروں کی کس مپرسی پر بھی کبھی آپ نے غور کیا ہے"؟

احسن صاحب اگرچہ مرعوب ہو چکے تھے تاہم انہوں نے اتنا کہنے کی ہمت پھر کی کہ مسلمان اپنے مشاہیر کے مقبروں کو ایک طرح کے قومی ادارات خیال کرتے ہیں اور عوام و خواص سب اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ قوم کی زندگی میں ان مقابر کی اہمیت کیا ہے۔ یہ دلائل تو نہایت شاندار تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع پر رائے بہادر صاحب کی وسیع واقفیت اختلاف کا یارا نہ دیتی تھی۔ مثلاً احسن صاحب گفتگو کی روانی میں جب سعدی کا ایک مصرع پڑھ گئے تو رائے بہادر صاحب نے مسکرا کر کہا: "بچارے شیخ سعدی کا مزار شیراز میں ایک دردناک نظارہ ہے" ـــــــــ (پھر تھوڑی دیر ٹھہر کر) "آپ لاہور ہی کو لیجئے۔ جہانگیر، نور جہاں اور آصف جاہ کے مقبرے اچھی حالت میں ہیں اور ان کو مسلمان صرف اس لئے جانتے ہیں کہ یہ اُن کی ہفتہ وار سیرگاہ ہیں۔ لیکن عرفی، قطب الدین ایبک اور زیب النسا بیگم کی قبروں کو جاننے والے بہت کم نکلیں گے اور یہ سب نہایت درماندہ حالت میں ہیں"۔

ہم اگرچہ رائے بہادر صاحب کے تبحر علمی سے بہت متاثر ہو رہے تھے مگر اس موقع پر ہم نے فخر سے ذرا مسکرا کر کہا: "ہم نے تو انہیں دیکھا ہے"

"مجھے یہ سن کر دلی خوشی ہوئی ورنہ خیال کا عام مسلمان تو ان چیزوں سے بے حد غافل ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ لاہور میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک محفل میں جب میں نے تذکرۃً یہ کہا کہ لاہور کا تمام سول ایریا جہاں اب ٹھنڈی سڑک اور لارنس باغ پھیلے ہوئے ہیں کسی زمانے میں مسلمانوں کا قبرستان تھا۔ یہ سن کر سب لوگ سخت متعجب ہوئے۔ اسی طرح ایاز جس کی ذات تک مسلمانوں کی بہت سی تاریخی اور ادبی روایات پہنچتی ہیں، اُس کی قبر اگرچہ لاہور میں ہے ـــــــــ

ایاز کی قبر! لاہور میں!! احسن صاحب تو جوش میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور میں اسی طرح ہونچکا بیٹھا رہا۔ ہماری آنکھیں خود بخود ایک دوسرے کی طرف اُٹھیں اور ایک ہی نگاہ میں ہم نے اپنی جہالت کا اعتراف کیا۔

لاہور کا اسٹیشن اب آ پہنچا تھا ہم نے نہایت شوق سے ایاز کی قبر کا پتا پوری تفصیل کے ساتھ رائے بہادر صاحب سے پوچھا۔ اور اُن کے سامنے اپنے اس عہد کا اظہار کیا کہ سب سے پہلی فرصت میں ہم ضرور وہاں جائیں گے۔ اس کے بعد ہم نے اُن کا بیحد شکریہ ادا کیا اور اپنی نالائقی اور غفلت کا مرثیہ پڑھتے ہوئے گاڑی سے اُترے۔

۲

چار دن بعد

سڑک کے ایک طرف ہندوؤں کے تنور اور دوسری طرف بنیوں کی دکانیں جن کے چبوتروں پر آٹے دال چاول سے بھری ہوئی بوریاں سجی تھیں۔ اسی جگہ دہات سے آئے ہوئے چندگراں ڈیل کسانوں کا ایک جھنڈا اپنے گاڑھے کے تہمد اور گھٹنوں سے نیچے پہنچتے ہوئے کُرتے پہنے، اپنے لمبے بالوں پر مختصر سی پگڑیاں رکھے اور ہاتھ میں قدآدم لاٹھیاں لئے ہوئے معمول سے زیادہ بلند آہنگی اور دست و بازو کی تمام آزادانہ جنبشوں کے ساتھ آپس میں کچھ مشورہ کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ سڑک کی معمولی آوازوں کی بھنبھناہٹ اگر کسی چیز سے ٹوٹتی تھی تو وہ یہ صدا تھی:

پیسے کی پونا پا، لا! پیسے کی پونا پا، لا!!

یہ گنڈیری والے کی آواز تھی اور سچ تو یہ ہے کہ اس آواز کو برسوں سنتے رہنے کے باوجود میں آج تک اُس صنعت کو نہیں سمجھ سکا جس سے گنڈیری والا "تو کو" "لا" کہہ جاتا ہے اور کسی کو معلوم ہی نہیں ہوتا۔ سڑک پر دو تین گنڈیری والے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بیٹھے لکڑی کا ایک ایک تختہ اپنے سامنے زمین پر لگائے، بڑی پھرتی سے گنا چھیلنے میں لگے ہوئے تھے۔ ہر شخص نے اپنا اپنا پونڈے کا گٹھا اپنے ساتھ ہی زمین پر جما رکھا تھا اور وقتاً فوقتاً وہی رٹ لگائے جا رہا تھا: "پیسے کی پونا پا، لا! پیسے کی پونا، پا لا!!"

اس سے آگے پھل کی ایک آدھ دکان کیلوں سنگتروں اور سیبوں سے سجی ہوئی، پھر سبزی کی چند دکانیں جن میں انڈوں سے بھرے ہوئے چھینکے چھت سے لٹکے ہوئے۔ اُس کے بعد ایک پرانی محراب جس میں سے گزرتے ہی ایک پر رونق بازار اور اس کی ہوا ہلدی سونٹھ اور مہندی کی بو سے بسی ہوئی ــــ ہم شاہ عالمی دروازے کے اندر تھے اور سلطان محمود کے صوبہ دار پنجاب کے دربار میں جا رہے تھے!

احسن صاحب کے اصرار پر ہم دونوں نیو ہوسٹل سے اپنی اپنی بائیسکل پر سوار ہو کر آئے تھے۔ لیکن جلد ہی ہمیں معلوم ہو گیا کہ دانائی پیدل آنے میں تھی (نوجوان بے وقوف ہوتے ہیں ــــ یہ ایک "مقولہ" ہے اور اپنے بزرگوں کی زبانی اس کے سننے کا اتفاق اکثر ہوتا رہتا ہے) تھوڑی دور تک ہم اسی طرح بائیسکلوں پر سوار گھنٹی زور زور سے بجاتے، اچکتے مڑتے، سمٹتے کتراتے ہوئے چلے گئے۔ لیکن رستے میں یوں ہوا کہ ایک خوش عقیدہ بنئے کی دکان پر نمک کا ایک بڑا سا ڈلا پڑا ہوا تھا اور ایک موٹا تازہ سانڈ اُسے خوب دل لگا کر چاٹ رہا تھا۔ پاس سے دس بارہ سال کا ایک لڑکا تنک یا شکر کی پڑیا ہاتھ میں لئے گزرا۔ اُس نے چپکے سے آگے بڑھ کر سانڈ کی دم پر ہاتھ رکھا اور پھر زور سے ایک چٹکی لے کر یہ جا وہ جا ہوا ہو گیا۔ بچے آخر بچے ہوتے ہیں (مقولہ نمبر ۲۔ یہ بھی بزرگوں سے سنا ہے) لیکن اس معصوم کی شرارت سے یہ ہوا کہ سانڈ کلبلا کر پیچھے ہٹا اور ہم جو بالکل پاس پہنچے ہوئے تھے۔ یکا یکی بائیسکلوں سے اُتر کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد سانڈ اپنے معمولی سست انداز میں مڑا اور اپنی بے ڈھنگی چال سے بازار میں چلنے لگا۔

شاہ عالمی دروازے سے رنگ محل تک یوں بھی اتنی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور اکیلا آدمی بھی بارہا سامنے سے آنے والوں کے ساتھ بھڑ جاتا ہے چہ جائیکہ دو آدمی ایک ایک دو چرخی ہاتھ میں تھامے اکٹھے چل رہے ہوں، یا کم از کم اکٹھے چلنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ہم نے بائیسکل سے اتر کر خیریت اسی میں سمجھی کہ سانڈ کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیں۔ یہ احسن صاحب کو اُس کی دم کے حیاتیاتی

و خائف، اُس کی رانوں کے اُبھار اور اُس کی چھاتی کے عضلات کی ساخت پر ایک عالمانہ درس دینے لگا اور اس تمام دوران میں ہم اپنی اپنی بائیسکل پکڑے برابر سانڈ کے پیچھے چلتے رہے۔

ہم نے اس طرح چلتے چلتے ابھی زیادہ فاصلہ طے نہ کیا تھا اور حیوانیات پر میرا درس ابھی نا تمام ہی تھا کہ سامنے سے پچاس ساٹھ آدمیوں کا ایک انبوہ ایک دوسرے پر گرتا پڑتا تیزی سے بڑھتا ہوا آگے کو آیا۔ ہم ان لوگوں کو رستہ دینے کے لیے ایک طرف کو ہٹ کر ایک دکان کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ حسنِ اتفاق سے یہ ایک نان والے کی دکان تھی اور جب تک ہمیں وہاں ٹھہرنا پڑا ہم اُس کے بڑے آئینے میں جی بھر کر اپنا اپنا منہ دیکھ سکتے تھے۔ لیکن اس بھیڑ کے پہلے چند آدمی تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے جب گزر گئے تو ہم نے سر اُٹھا کر دیکھا کہ ابھی اور بھی ہیں جو زیادہ اطمینان سے چل رہے ہیں اور ان کے بعد بھی اور، اور پھر ہمارا رہنما سانڈ اب تک اسی بھیڑ میں کہیں غائب ہو چکا تھا اور ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جس طرح بھی بنے اس سست رفتار ہجوم کو چیر کر آگے بڑھیں۔ چنانچہ خدا کا نام لے کر آگے آگے احسن صاحب اور پیچھے پیچھے میں چل پڑا۔

ہم شاید پندرہ قدم چلے ہوں گے یا بیس قدم کہ ہمیں بھیڑ میں ایک متحرک مچان نظر آیا جس پر ایک سفید ریش سکھ بزرگ کالی سیاہ پگڑی پہنے کھڑے کچھ گا رہے تھے۔ یکایک مچان کی حرکت رک گئی۔ اور سکھ بزرگ نے تقریر شروع کی۔ مچان کے رکتے ہی ہم کو بھی ٹھہرنا پڑا۔ میرا رستہ ایک لمبے تڑنگے توی ہیکل اکالی نے جس کی کمر میں ایک غیر معمولی طور پر لمبی کرپان حائل تھی، ایک سنگین دیوار بن کر روک رکھا تھا۔ میں نے بھیڑ سے فائدہ اُٹھا کر اُسے دو چار دھکے بھی دیئے۔ لیکن وہ سنگلاخ کی طرح اپنی جگہ پر پیوست تھا اور اُسے خبر بھی نہ ہوئی تھی۔ دو ایک بار میں نے جھک کر اُس کی ٹانگوں کے درمیان سر ڈالا اور ادھر اُدھر جھانکنے کی کوشش کی مگر کوئی راہِ فرار نظر نہ آئی۔ تنگ آ کر آخر میں نے اُس کا ہاتھ زور سے ہلایا اور اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ جب اُس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور میری نظر اس کی شاندار ڈاڑھی پر پڑی تو مجھے سخت ندامت ہوئی اور میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ پر نفرین بھیجی کہ میں نے بھیڑ میں ایسا ناجائز فائدہ کیوں اُٹھایا۔

بہر حال میں نے اپنی مصیبت اُس سے کہی اور دریافت کیا کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے۔ وہ مسکرایا اور اُس کی لمبی ڈاڑھی اور زیادہ شاندار ہو گئی۔ حقیقت یہ کھلی کہ آج خوش قسمتی سے گورو گوبند سنگھ جی کا جنم دن ہے اور اس قسم کی بھجن منڈلیاں تمام شہر میں گشت لگا رہی ہیں۔ ساتھ ہی اکالی نے ایک تبسم کے ساتھ ہمیں مشورہ دیا کہ یہیں سے اُلٹے پاؤں پھر جانا اور کسی دوسرے رستے سے شہر میں داخل ہونا ہمارے لیے اچھا ہو گا۔ کیونکہ اس بھجن منڈلی کے پیچھے ابھی اور بھی منڈلیاں ہیں۔

یہ حال خدا کو معلوم ہے کہ ہم اپنی بائیسکلوں کو گھسیٹتے ہوئے کس طرح واپس پلٹے اور کس طرح اس بھجن منڈلی کو قطع کر کے صحیح و سلامت نکل آئے لیکن اتنا شکر ہم نے ضرور کیا کہ بھیڑ میں ہم بہت آگے نہیں بڑھے تھے اور تھوڑی سی کشمکش کے بعد ہی مخلصی ہو گئی۔

شاہ عالمی دروازے سے نکل کر کچھ دیر ہم باغ میں بیٹھے اور بھیڑ میں جو تجربات ہمیں فرداً فرداً ہوئے تھے انہیں دہراتے رہے۔ اس کے بعد رائے یہ قرار پائی کہ اس دفعہ موچی دروازے کی طرف سے رنگ محل پر دھاوا کرنا چاہیئے۔

موچی دروازہ جو نہ تو مدارہ ہے اور نہ کفش دوزی کے کام ہی سے کوئی نسبت رکھتا ہے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ پانچ منٹ میں وہاں آ پہنچے اور اندر داخل ہو کر رنگ محل کی سمت میں چل پڑے۔ رونق یہاں بھی ہے لیکن وہ رونق نہیں جس کے متعلق ہر گھر میں دھڑکا

لگا ہے کہ بس ابھی بلوہ ہوا کہ ہوا۔ ہم مزے مزے باتیں کرتے جا رہے تھے اور لاہور کے دو مشہور حلوائیوں کی آراستہ دکانوں کے پاس سے گزرتے ہوئے تفریح کے لئے شاید ایک آدھ نظر اُن پر ڈال رہے تھے کہ ڈھوروں کے ایک گلّے کو رستہ دینے کے لئے ہمیں ایک طرف کو ہٹنا پڑا۔ گائے بھینس کے ریوڑ چونکہ ہر روز ان بازاروں میں سے گزرتے ہیں اس لئے ہم بلا تکلف اسی طرح اطمینان کے ساتھ باتیں کرتے کرتے ہٹ کر ایک گلی کے نکڑ پر کھڑے ہو گئے

ہمارے پاس ہی ایک مشٹنڈا سا گورا چٹا پہلوان صورت آدمی بھی کھڑا تھا۔ اس کی وضع قطع ویسی ہی تھی جیسی موچی دروازے کے اکثر بیفکروں کی ہوتی ہے۔ یعنی ڈاڑھی صفا چٹ، بڑی بڑی بل کھائی ہوئی مونچھیں، سر پر سفید کپڑے کی ٹوپی، گلے میں لٹھے کی قمیص اور ململ کی صدری اور نیچے لٹھے کی سفید براق چادر اور قصوری جوتا۔ ہاتھ میں ایک پتّے پر حلوا پوری رکھے وہ بظاہر ذوق و شوق سے کھا رہا تھا۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ جونہی اسی گلی کے ایک مکان میں سے اٹھارہ بیس سال کا ایک نوجوان باہر نکلا اس نے اپنا حلوا پوری ساتھ کے چھجّے پر رکھ دیا اور مونچھوں پر ہاتھ پھیر منہ پونچھ ذرا تن کر کھڑا ہو گیا۔ ایک طرف ہم کھڑے تھے دوسری طرف صدری پوش نے رستہ روک رکھا تھا۔ نوجوان نے سمٹ کر گزر جانا چاہا لیکن صدری پوش نے ہمارے دیکھتے دیکھتے اسے زور سے اپنا کندھا مارا اور پھر ناگہاں اس کا گلا دبوچ لیا۔ اور ساتھ ہی یہ کہہ کر اُسے مارنا شروع کر دیا "کیوں بے گالی کیوں بکتا ہے؟ ہیں بے گالی کیوں بکتا ہے؟"

ہم حیران اور ششدر رہ گئے کیونکہ لباس سے نوجوان تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ اس کی طرّہ دار پگڑی اب زمین پر گر پڑی تھی مگر اُس کا کوٹ شلوار اور بوٹ زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ ہمارا پہننے والا اس سلوک کا عادی نہیں ہے۔ ایک لمحے کے بعد ہمارے استعجاب نے ہمیں زبان کھولنے کا یارا دیا۔

"ہیں یہ کیا؟ ابے بھئی یہ کون ہے جس کو مار رہے ہو؟"

جناب یہ چنگی خانے کا منشی ہے"

اس کو ہمارے سوال کا نہایت قدرتی جواب سمجھ کر اُس نے زناٹے کا ایک اور گھونسا اُسے رسید کیا"۔ اس کی گالی کی ایسی تیسی! کیوں بے اب دے گالی، اب دے۔ اب دے گالی، دیتا ہے اب" اور ساتھ ہی ایک اور زنّاٹا ہوا ہاتھ بیچارے نوجوان کی پیٹھ پر آ رہا۔

میں نے اور احسن صاحب نے مل کر بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کیا۔ وہ بیچارا تو اپنی پگڑی سنبھال فوراً چلتا بنا اور اس نے کپڑے ہاتھ سے جھٹک حلوا پوری پھر اُٹھالی گائیں بھینسیں اور اُن کے ہانکنے والے گو جواب سب گزر چکے تھے لیکن ہم تھوڑی دیر تک وہیں کھڑے حیرت سے اُس شخص کا منہ تکتے رہے۔ آخر میں نے پوچھا:

"کیوں بھئی آخر یہ قصّہ تھا کیا؟"

"جناب آپ کیا بتاؤں۔ یہ کمین لوگ دو حرف پڑھ جائیں، اکرسی بیٹھنے کو مل جائے تو سمجھنے لگتے ہیں کہ رب نے شاید ہمیں ہی کُل عالم پر لاٹ بنا کر بھیجا ہے۔ اشرافوں پر تو لیوں نے دنیا تنگ کر رکھی ہے۔ میں نے بھی کہا آؤ آج لگے ہاتھ اس کی تھوڑی سی مرمت ہی کر دو۔ بنا پھرتا ہے بابو"

"بھئی سمجھ میں نہ آئی یہ بات ———"

"جناب آپ اس کا بڑا بھائی فضل دین ہے پتیس میں مگر بڑا ظالم پلیا ہے۔ غریب پر اس کا ہاتھ بڑا سخت ہے۔ ابھی پچھلی جمعرات کی بات ہے کہ میری گلی میں ہے قدر داد۔ بڑا شریف آدمی ہے میں آپ کو کیا بتاؤں حد شریف آدمی ہے۔ چار بچے ہیں۔ وہ شُہدہ (شہدہ = غریب) اپنی ہاتھ گاڑی پر کچھ سنترے مالٹے لگا کر دروازے سے باہر نکلا۔ کہ سڑکوں پر ادھر اُدھر ذرا پھیری لگا آئے۔ اب یہ فضل دین دروازے سے باہر سڑک پر کھڑا

تانگے ٹمٹم کو ہاتھ دے رہا تھا۔ شدہ قدر داد شریف آدمی، اشرافوں کی اولاد، وہ کیا جانے ان باتوں کو فضل دین نے دوسری طرف ہاتھ دیا، اس نے اپنی گاڑی ٹھیل دی۔ سو جناب فضل دین کہتا ہے کہ قدر داد کو اُسی جگہ دھر نہیں لیتا اور پھر کاظم بیگ مجسٹریٹ کی عدالت میں چالان نہیں کر دیتا۔ اُدھر حاکموں کے کان ہی کان ہیں آج کل آنکھیں ہیں نہیں۔ کاظم بیگ نے فٹ پانچ روپے جرمانہ کر دیا اور منہ میں حلوے کا ایک لقمہ ڈال کر اور آنکھیں ذرا بند کر کے افسوس کے انداز میں سر ہلا کر دیکھ لینا جناب ایک نہ ایک دن اس کاظم بیگ کو کسی غریب غربے کی ہائے لگ جائے گی۔ باقی رہا یہ فضل دین اور اُس کا بھائی جو پاس کھڑا تھا سو میں نے دل میں کہا اچھا بچو رہ تو جاؤ۔ کسی دن اندھیرے اُجالے میں مل گئے اور مُرمت نہ کر دی تو میرا نام مرھاج دین (معراج دین) نہیں۔ کیا بتاؤں جناب ان پُلسیوں نے تو آج کل خدائی دعویٰ باندھ رکھا ہے۔ ہمہ شمہ کو تو کتا سمجھتے ہیں کتا ———"

اس عجیب و غریب منطق سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہم نے پھر رنگ محل اور ایاز کی قبر کا رخ کیا لیکن یہ بازار ہی شاید زندہ دلانِ لاہور کی تمام ہنگامہ خیزیوں کی جولاں گاہ تھا کہ چند قدم چل کر ایک نئی دلچسپی ہماری توجہ کا مرکز بن گئی۔

ایک ہنستا کھیلتا ہُوا ہجوم خوشی کے نعرے لگاتا دوسری طرف سے ہماری طرف بڑھا چلا آتا تھا۔ پہلے ہمیں شبہ ہُوا کہ یہ شاید کسی لیڈر کا جلوس ہے لیکن پھر خیال آیا کہ لیڈر تو آج کل سبھی جیل میں ہیں۔ ہو نہ ہو یہ کسی اور قسم کے آدمی کا جلوس ہے۔ معاً ایک عجیب نظارہ میں دکھائی دیا۔ تین چار آدمیوں نے بازو پھیلا کر ایک نشست سی بنا رکھی تھی جس پر ایک شخص برہنہ تن صرف لنگوٹی باندھے بیٹھا تھا۔ اب لیڈر کے جلوس کا رہا سہا شبہ بھی جاتا رہا کیونکہ مہاتما گاندھی کے سوا کوئی لیڈر اس پوشش میں جلوس نکلوانا گوارا نہ کر سکتا تھا اور مہاتما گاندھی کو ہم نے بارہا دیکھا تھا۔

وہ شخص جس کو لوگ اپنے ہاتھوں پر اُٹھائے ہوئے تھے سرسوں کے ہرے ہرے پودوں کے "ہار" گلے میں، بانہوں میں، کندھوں پر، گود میں لئے ہوئے تھا۔ لوگ خوشی کے نعرے مارتے تھے کچھ شاید دلی مسرت سے کچھ محض مسخرہ پن سے اور وہ اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر اُنہیں سلام کرتا تھا۔ اس سلام میں اختیار یا ارادے کو کوئی دخل نظر آتا تھا بلکہ اُس کے دونوں ہاتھ کسی خفیہ کل کے اشارے سے اضطراراً ایک خاص تال پر اچھلتے معلوم ہوتے تھے اور اُن میں ایک مبہم متوازی جنبش پیدا تھی۔ اس کے دھڑ کے اندر بھی شاید کوئی ایسی ہی کل لگی تھی کیونکہ اپنے عجیب و غریب دودستی سلام کے ساتھ ساتھ وہ اپنی نشست پر بیٹھا اس تسلسل سے پُھدک رہا تھا کہ مجھے بے اختیار وہ کمانی دار کھلونے یاد آنے لگے۔ جو بچپن میں مجھے ابا جان مرحوم لا کر دیا کرتے تھے۔ اِن کھلونوں کو ہاتھ سے ذرا چھیڑ دیا جاتا تو اُن کے سر بازو یا دھڑ پر بہت دیر تک اہتزاز کی کیفیت طاری رہتی۔ اس شخص کے ہاتھوں کا اچھلنا اور دھڑ کا پھدکنا بھی اتنا ہی یکساں ہموار اور بے معنی تھا۔ اگر کوئی تبدیلی ہوتی بھی تو اُس وقت جب ہجوم میں سے کوئی شخص ہری سرسوں کا ایک نیا مُٹھا اُس پر نچھاور کرتا۔ اُس وقت پھدکتے ہوئے دھڑ کا سر نچھاور کرنے والے کی سمت میں مڑتا اور ہاتھوں کی پیہم متوازی جنبش کسی قدر زیادہ تیز ہو جاتی۔

لاہور میں رہتے ہوئے ہم کو سال ہا سال ہو گئے تھے لیکن یہ نظارہ ہمارے لئے یکسر اسرار تھا۔ آخر خوشی کے مارے بوکھلائے

ہوئے ایک فداکار کو آستین سے پکڑ کر ہم نے اس معاملے کی حقیقت پوچھی تو اُس نے کہا "آپ نے سنا نہیں، پرپٹ (ریپڈ) میں آج بڑا معرکہ ہُوا ہے"۔ احسن صاحب بیچارے شریف آدمی گھبرا کر پوچھنے لگے: "کیوں بھئی کوئی خون تو نہیں ہُوا؟" اُس نے مڑ کر اُن کی طرف دیکھا اور ہنس کر کہا "اجی نہیں بابوجی مینڈھوں کی لڑائی ہی تو تھی جس میں دین اور غلام محمد کے مینڈھے بھڑے۔ غلام محمد کی جیت رہی۔ اب غلام محمد کو اُٹھا کر اپنے کوچے کو لے جا رہے ہیں"۔ احسن صاحب نے مسکرا کر مجھ سے کہا "خیر بدیر شو یا موز۔ لیکن حیرانی یہ ہے کہ لڑائی تو اس کے مینڈھے کی ہوئی اور یہ خود کیوں ململ کا لباسِ عریانی پہن کر پریڈ سے آرہا ہے اور پھر اس سردی میں"۔

اتنے میں ہم دیکھتے کیا ہیں کہ ہمارا وہی صدری پوش دوست ہمارے پیچھے کھڑا ہے۔ اُس نے وہیں سے چلا کر کہا "یار گامے! لاکھ لاکھ مبارکباد ہوں۔ ارے یار ہم کو زمانے پر بڑا افسوس ہے ہم کو تم نے پتا ہی نہ دیا اور مینڈھے کو پریٹ لے گئے۔ اگر ہم کو خبر کر دیتے تو باجے گاجے کا کچھ بندوبست ہو جاتا۔ گھڑی دو گھڑی دل بہل جاتا۔ تم کو یاد ہے نہ پرار سال 'غلاب دین کے مینڈھے کو ہم ماسٹر گلزار کے بینڈ کے ساتھ گھر لائے تھے"۔ "یار گامے" نے جواب دینے کے لئے سر پھیرا ہی تھا کہ ہجوم میں سے سرمیں کا ایک اور مٹھا نازل ہوا اور اُس نے پھر عہد کرنا شروع کر دیا کہ مانی پہ چوٹ لگ چکی تھی جلوس آگے بڑھ گیا۔

اب رستے میں نہ کوئی نئی دلچسپی تھی اور نہ رکاوٹ بجز اس کے کہ کہیں کہیں انگریزی کوئی دوپٹہ یا پگڑی رنگ کر اُسے سکھانے کے لئے اپنی دکان کے سامنے سڑک کے آر پار پھیلاتے ہوئے ملتے تھے۔ جب کوئی راہگیر آتا تو اُن کے سبک رفتار ہاتھ ہوا سے پھولی ہوئی ململ کو اوپر دائیں بائیں اس پھرتی کے ساتھ لے جاتے کہ راہگیر کو چلنے میں کوئی دقت نہ ہوتی اور وہ اپنی دُھن میں گزر جاتا۔ ہم کو بچنا اگر پڑتا تھا تو اُن کوّوں اور کبوتروں سے جو جابجا سر کے عین اوپر بجلی کے تاروں پر بیٹھے تھے۔ اِن کے ہاں قضائے حاجت کی ایک خاص رسم ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی شخص نیچے سے گزر رہا ہو تو نشانہ تاک کر ٹھیک اس کے سر پر بیٹ کرتے ہیں۔

بازار میں آنے جانے والے اس قدر کم تھے کہ بائیسکل کی سواری بآسانی ہو سکتی تھی لیکن اب ہم خود بخود پیدل چلنے کو ترجیح دے رہے تھے۔ ایاز کی قبر کا خیال ایک قریب تر حقیقت کی حیثیت سے ہمارے دماغ پر اپنی پوری جذباتی کیفیتوں کے ساتھ روشن ہو رہا تھا۔ فارسی اور اُردو ادب کی تمام مشہور چیزیں جن کی تلمیح ایاز کی زندگی کی طرف جاتی ہے ہم نے دل ہی دل میں دہرا ڈالی تھیں مگر سچ یہ ہے کہ میرے مقابلے میں احسن صاحب بہت زیادہ متاثر معلوم ہو رہے تھے۔ یا یوں کہئے کہ اگر اُن کے دل پر اس وقت

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

کی شاعرانہ کیفیت طاری تھی تو میرا دل

ایاز قدرِ خود بشناس

کی نثریت کا حامل تھا۔

اسی محویت کے عالم میں ہم رنگ محل پہنچے اور مشن سکول سے گزرتے ہی میں نے احسن صاحب کو بیدار کیا کہ حضرت اب ذرا آپ بھی بائیں ہاتھ نظر ڈالتے جائیے۔ پچاس ساٹھ قدم چل کر ٹکسال بازار کی تختی ہمیں صاف نظر آ گئی۔ کوچے میں مڑتے ہی ہم نے ڈیوڑھی میں بیٹھے ہوئے ایک شخص سے پوچھا "کیا ایاز کی قبر یہیں ہے؟" اُس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا "جی ہاں ملک ایاز کی خانقاہ یہی ہے"۔

سامنے درزی کی دکان تھی جہاں وہ اپنے شاگردوں کو لئے بیٹھا تھا۔ اس کی دکان سے ملی ہوئی ایک چھوٹی سی مسجد نما عمارت تھی۔ عمارت کیا تھی تین محراب کا ایک دالان اور اس کے سامنے ایک مختصر سا صحن تھا۔ دالان کے اندر چند شہتیریاں اور کڑیاں پڑی تھیں اور ایک بڑھئی کا لڑکا ان پر رندہ کر رہا تھا۔ درزی کی دکان سے اس کی مشینوں کے گھمر گھمر چلنے کی آواز صاف آتی تھی۔ ان آوازوں کے درمیان صحن کے عین وسط میں ایاز کا جسدِ خاکی ہمیشہ کی نیند سو رہا تھا۔ ایک چھوٹا سا چبوترا تھا اور اس کے بیچ میں دو فٹ کے قریب اُٹھا ہوا تعویذ قبر کا نشان دے رہا تھا۔ قبر پر سبز کپڑے کا ایک غلاف چڑھا ہوا تھا اور سرہانے کی طرف گیندے کے پھولوں کا ایک ہار پڑا تھا۔ چبوترے کی اینٹوں پر برسوں کے تیل کے نشان تھے۔ پاس ہی زمین پر کچھ لنگنی بکھری ہوئی تھی اور دو چار چڑیاں اُسے چگ رہی تھیں۔ چند پھول چند پودے اور ایک سدا بہار بیل کے پتے اب اُس شخص کے ہمسائے تھے جس کی ہمت نے نو سو سال ہوئے لاہور کو نیست سے ہست کیا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ایاز کا پُر جلال آقا لاہور کے برہمن جے پالوں کی بدعہدی کی سزا دیتا ہوا اپنے قہر کا نقش ایک ویران شہر کی شکل میں پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ اس کے بعد ایاز نے کس محبت سے اس ویرانے کو پُر رونق بازاروں اور رنگین نظاروں سے آباد کیا تھا۔ آج اس شہر میں بسنے والوں کے لئے وہ خود ایک نظارہ تھا۔

فاتحہ کے لئے ہم دونوں کے ہاتھ اُٹھے۔ اس وقت میری نظر بھائی احسن کے منہ پر پڑی۔ میں اُن کی حساس طبیعت سے واقف تھا لیکن اب اُن کے چہرے کے نازک خد و خال پر وفورِ جذبات سے ایک کیفیت طاری دیکھ کر میں بھی چونک گیا۔ ان کے طاقتور تخیل نے انہیں لاہور کے ایک تنگ کوچے کی فضا سے اُٹھا کر نو سو سال قبل کی دنیا میں ڈال دیا تھا۔ شاید اُن کی آنکھ محمود غزنوی کے اس عظیم الشان یلغار کو دیکھ رہی تھی جو دنیا کی تاریخ کشور کشائی میں اب بھی ایک کارنامے کی حیثیت سے یادگار ہے۔ کس طرح محمود برق و باد کی طرح غزنی سے ملتان پہنچا اور ملتان سے بڑھ کر اس بے برگ و گیاہ ریگستان کو جو اجمیر تک پھیلا تھا گویا طرفۃ العین میں طے کر گیا اور پھر اس شہر پر جا پڑا جس کی تصویر کو پیارے لال نے اپنے زورِ بیان سے زندہ کر دیا ہے۔ وہ شہر جو سمندر کے کنارے آباد تھا، بڑا گلزار، دولت سے مالا مال، یہاں بلند قلعے کے نیچے پانی لہراتا تھا اور اونچی اونچی فصیلوں سے ٹکرا کر جھکولے مارتا تھا۔ اور پھر قلعے کے اندر جا کر سومنات جی کا مندر جس کی چھت کو چھپّن ستون سنبھالے کھڑے تھے جس میں رات دن صرف ایک چراغ جلتا تھا اُس کی روشنی جواہرات پر پڑتی تھی اور اُن کی جوت سے سارا مکان جگمگ جگمگ کرتا تھا ———

یہ کیفیت تھی جب قبر کا مجاور ہمارے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ احسن صاحب نے شاید قبر کے کچھ حالات اس سے پوچھنے چاہے۔ اور گفتگو شروع کرنے کے لئے کسی قدر کانپتی ہوئی آواز میں اُس سے پوچھا

"یہ ایاز کی ——— ملک ایاز کی قبر ہے؟"

"جی ہاں جناب یہ ملک الیاس صاحب کی خانگاہ ہی ہے۔"

اس جواب پر میں بہ مشکل مُسکرائے بغیر رہ سکا۔ احسن صاحب بھی کچھ گھبرائے لیکن ہمت کر کے پھر پوچھنے لگے:

"تم لوگ کب سے اس خانقاہ کے مجاور ہو؟"

"جناب ہم اپنے باپ دادا کے وقت سے اسی خانگاہ کی خدمت کرتے چلے آئے ہیں۔"

احسن صاحب کی آنکھیں اس جواب پر چمک اٹھیں۔ مورخانہ تحقیق کی روح پھر بیدار ہو گئی۔

"پھر تو اس خانقاہ کے متعلق کچھ روایتیں بھی تم نے ضرور سُنی ہوں گی؟ مثلاً پہلے تو یہی بتاؤ کہ تمہارے باپ دادا کے پاس یہ خانقاہ کس زمانے میں آئی؟"

"جناب اس خانگاہ کی نسبت جھوٹی سچی من گھڑت کہانیاں اگر آپ سُننا چاہیں تو آپ کو کتابوں میں بھی بہتیری مل جائیں گی کیونکہ خانگاہ کا ذکر بڑی بڑی کتابوں میں جگہ جگہ آیا ہے۔ لیکن سچی واردات اگر آپ چاہیں تو پھر وہ ہمارے خاندان کے سوا کہیں نہیں ملے گی"۔

"اسی لئے تو پوچھا ہے کہ تم لوگ کب سے اس خانقاہ کے مجاور ہو"؟

"ہم کو اس خانگاہ پر بیٹھے عرصہ دو ہزار سال کا ہو گیا ہے۔ مَلکُ الیاس صاحب سلطان محمود کے وزیر تھے۔ سومنات کا معرکہ جو بڑا مشہور ہے انہیں کی ہمت سے سر ہُوا۔ ان کے بھائی خواجہ خضر صاحب بھی انہیں کی طرح بڑے جوانمرد تھے چنانچہ سلطان محمود جب کل عالم کو فتح کر چکا تو اُس نے ملکُ الیاس کو خشکی اور خواجہ خضر کو تری بخش دی جب سکندر بادشاہ نے لاہور پر چڑھائی کی ہے تو ہم کو اس خانگاہ پر عرصہ نو سو سال کا ہو گیا تھا۔ سکندر نے خانگاہ کی بے حرمتی کرنی چاہی لیکن اس وقت خواجہ خضر راوی کے پانی میں سے اٹھے اور ——"

احسن صاحب کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہنسی کو ضبط کرتے کرتے میرا برا حال ہو گیا تھا۔ آخر میں نے احسن صاحب کا ہاتھ کھینچا اور زبان کو دانتوں تلے دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "اب ذرا جلد چلنا چاہئے آپ کو یاد ہے نہ —— آج خوش قسمتی سے گورو گوبند سنگھ جی کا ——"

حمید احمد خاں

ایک شخص نے ڈاکٹر جانسن سے کہا میں ایک خاتون سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر اس سے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھ سے زیادہ عقلمند اور ہوشیار ہے"۔ جانسن نے کہا ڈرو مت اور اُس سے شادی کرلو اور یقین جانو کہ سال سے پہلے پہلے اُس کی عقل و ذکاوت دونوں میں کمی آجائے گی

نیوٹن مشہور انگریزی سائنسدان اپنی انگیٹھی کے سامنے بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ آگ تیز تھی۔ نیوٹن وہاں بیٹھا گرمی سے بے تاب ہونے لگا۔ اُس نے اپنے ملازم کو آواز دی اور کہا "آگ بہت تیز ہے اسے ہلکی کردو۔ ملازم بولا حضور اگر آپ اپنی کرسی ذرا پیچھے سرکا لیں تو آپ کو اتنی گرمی نہ لگے۔ نیوٹن نے کہا عجیب بات ہے کہ اس کا مجھے خیال تک نہ آیا

ایک بڑا باتونی نوجوان سقراط کے پاس خطابت سیکھنے آیا۔ یونانی فلسفی نے اُس سے دو چند مشاہرہ طلب کیا یہ کہہ کر کہ مجھے تم کو دو علم سکھانے ہیں ایک نہ بولنے کا علم دوسرا بولنے کا

ایک شخص سے جو محفل میں خاموش بیٹھا تھا یونانی حکیم تھیوفراسٹس نے کہا "اگر تم بے وقوف ہو تو تم عقلمندی برت رہے ہو اور اگر تم عقلمند ہو تو تم بے وقوفی سے کام لے رہے ہو۔

گلچیں

محفلِ ادب

پرتوِ خواب

سنّاٹا پچھلی رات کا ہے مخلوق خدا کی خواب میں ہے
تاروں کی نگاہیں نیچی ہیں ہلکی سی چمک مہتاب میں ہے

اطراف میں روشندانوں کے کچھ نور سا دھیما دھیما ہے
دیواروں کے نیچے گلیوں میں پرہول اندھیرا چھایا ہے

پتوں کو سمیٹے خواب میں ہیں ہیں دوڑی ہوئی بیلیں کانوں پر
بول اُٹھتا ہے بے ہنگام کبھی ایک آدھ پرندہ شاخوں پر

اللہ یہ کیسی بے چینی اس وقت دلِ بے تاب میں ہے
پرتو ہے یہ کس کا ذرّوں پر کس کی یہ جھلک مہتاب میں ہے

فردوس کی شمعیں روشن ہیں یا عکسِ چراغِ طور ہے یہ
گھر بھر میں یہ کس کا پرتو ہے ہر چیز پہ کیسا نور ہے یہ

حلقے میں گھرا ہوں جلووں کے ہستی کا نہیں کچھ ہوش مجھے
اس وقت یقیناً خواب میں کوئی دیکھ رہا ہے جوش مجھے

غربت میں ہے لطفِ صبحِ وطن ہر چیز پہ وہ رعنائی ہے
ویرانے میں اپنے مجنوں کی تسکین کو لیلیٰ آئی ہے

اک رنگ سا دل میں رقصاں ہے اک نور سا مجھ پہ چھایا ہے
ان ہونٹوں پہ شاید سوتے میں ہلکا سا تبسم آیا ہے!

نظام المشائخ

غزل گوئی پر تنگ دامانی کا الزام

ختم پہنائے دو عالم پہ ہے پایانِ غزل
پوچھئے حافظِ شیراز سے امکانِ غزل

فارسی اور اردو کے غزل گو شاعروں نے خواجہ حافظ کے چشمۂ سرمدی سے فیض یاب ہو کر ان کے نقشِ قدم پر چلنے اور غزل میں ہر قسم کے خیالات اور جذبات ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو شخص تمثیل و کنایہ اور تشبیہ و استعارہ کی گفتگو سمجھنے سے قاصر ہے اُسے غزل گوئی میں صرف گل و بلبل کی حکایت ملے گی لیکن جو لوگ بحرِ معنی کے غوّاص ہیں وہ قلزمِ غزل سے ہر قسم کے موتی رولتے ہیں کچھ غزل ہی پر موقوف نہیں بلکہ ہر صنفِ سخن کی کامیابی کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ حقیقت کو مجاز کے لباس میں جلوہ گر کیا جائے۔ موجودہ زمانے کے سب سے بڑے معجز بیان شاعر سر اقبال مئے حجازی کے لذت آشنا ہیں۔ ان کو حافظ شیرازی کی عجمی صہبا پسند نہیں۔ وہ فلسفی اور قومی شاعر کہلاتے ہیں لیکن کلام میں دلکشی و تاثیر پیدا کرنے اور شاہدِ کامیابی سے ہمکنار ہونے کے لئے وہ بھی حافظ شیرازی کا رنگین پیرایۂ بیان اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ اگرچہ وہ عشقیہ مضامین پر طبع آزمائی نہیں کرتے تاہم ان کا اندازِ تکلم عاشقانہ ہے۔ وہ قومی جذبات فلسفۂ حیات، حکیمانہ نکات، سیاسی معاملات وغیرہ کی ترجمانی کے لئے بھی وہی حسن و عشق کی زبان۔ وہی صنم پرستی کی اصطلاحیں وہی رندی

سرمستی کی تمثیلیں۔ وہی قدما کی رنگین نوائی۔ وہی تشبیہ۔ وہی استعارے۔ وہی رنگ وہی راگ وہی سُر استعمال کرتے ہیں جو عشقیہ شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں۔ یوں تو ان کے سارے کلام کا یہی انداز ہے۔ لیکن یہاں بطور نمونہ ان کی ایک پُرجوش و پرتاثیر نظم "تصویرِ درد" کا صرف ایک بند پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ شاعر کے خیال میں ہندوستان کی بدنصیبی مفلسی اور غلامی کی ذمہ داریہاں کی فرقہ آرائیاں اور انجمن سازیاں ہیں۔ فرقہ وارانہ منافقتات شاعر کو خون کے آنسو رُلاتے ہیں۔ وہ اہلِ ہند کو تمام تنازعات دور کر کے ایک ہی رشتۂ اخوت میں منسلک ہو جانے اور آپس میں اتحاد و اتفاق قائم کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ وہ خود ہی اتحاد و اخوت کا زبردست علمبردار بن کر آگے بڑھتا ہے اور اس مشکل مہم کو سر کرنے کا نہایت پرجوش الفاظ میں دعویٰ کرتا ہے۔ اس کی حیثیت اگرچہ خطیبانہ ہے لیکن اس کا اندازِ تکلم بالکل عاشقانہ ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ ؎

ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

جلانا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے
تری ظلمت میں مَیں روشن چراغاں کر کے چھوڑوں گا

مگر غنچوں کی صورت ہوں دلِ درد آشنا پیدا
چمن میں مشتِ خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا

پروتا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

مجھے اے ہم نشیں رہنے دے شغلِ سینہ کاوی میں
کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا

دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

غزل گوئی پر تنگ دامانی کا الزام عاید کرنے والا سطح آشنا معترض تو کہے گا کہ ان اشعار میں دھرا ہی کیا ہے۔ زخمِ پنہاں کی نمائش۔ آنسو کے بدلے لہو رونا۔ محفل و گلستاں۔ شمع و چراغاں۔ غنچۂ دل مشتِ خاک کی پریشانی تسبیح کے دانے، سینہ کاوی کا شغل داغِ محبت، آئینۂ حیراں یہ سب کے سب قدیم رسمی و مبتذل فقرے ہیں۔ جو مدت سے ہر غزل گو شاعر کی زبان پر جاری چلے آرہے ہیں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ فی الحقیقت یہ منتر کے الفاظ ہیں۔ ان کی طلسمی قوت آن کی آن میں مجمع کو مسحور کر لیتی ہے۔ ان کی فسوں کاری معمولی سے معمولی مضمون کو نوکِ دلنشتر بنا دیتی ہے۔

سطحی خیال کے آدمیوں کو غزل کے اسلوبِ بیان سے اکثر دھوکا ہوتا ہے۔ وہ صرف الفاظ کو دیکھتے ہیں اور ان کے ظاہری معنی سے نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ غزل میں صرف حسن و عشق کے معاملات بیان ہوتے ہیں اس لئے اس کا دامن نہایت تنگ و محدود ہے۔ اگر وہ تمثیل و کنایہ کا پردہ چاک کر کے اشعار کے بطن و ماہیت پر نظر کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ "ایں خانہ تمام آفتاب است" حیاتِ انسانی کا وہ کون سا فلسفہ ہے معاملاتِ زندگی کا وہ کون سا پہلو ہے۔ رموزِ ہستی کا وہ کون سا نکتہ ہے جس پر غزل گو شعرا نے روشنی نہ ڈالی ہو۔ تشبیہ و استعارہ کے پسِ پردہ جو گنجینۂ معنی پوشیدہ ہے وہاں تک اگر کسی سطح بین معترض کی ذہنی رسائی نہ ہو تو اس میں شاعر کا کیا قصور ہے؟

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

(جہانگیر)

———

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ فروری سنہ ۱۹۳۳ء

تصویر:- ماں اور بچہ

قیمت فی پرچہ ۶ر — ویلر بک سٹال پر ۸ر — چندہ سالانہ ۵ر

طلسمِ زندگی

یعنی

جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا مدیر ہمایوں

کے

ادبی مضامین کا دلکش مجموعہ

چھپ کر تیار ہے طلسمِ زندگی میاں صاحب کی پندرہ سال کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس میں تقریباً سو چھوٹے مضمون اور پونے دو سو چھوٹے چھوٹے شہ پارے ہیں جو مناظرِ صدائے روح، آئینۂ دل، جد و جہد، سرگوشیاں، خیالات پریشاں چھ مختلف باب ہیں جن میں مضامین تقسیم کئے گئے ہیں۔ طلسمِ زندگی حسنِ فطرت، اخلاق، تصوف، نفسیات اور محبت کے پاکیزہ جذبات کا ایک بوقلموں نگارخانہ ہے جس میں زندگی کے صحیح اور فلسفیانہ مطالعہ کے بدیع المثال اور دلآویز مرقعے پیش کئے گئے ہیں۔

کتاب کا ایک حصہ ایسے مضامین کے لئے وقف کیا گیا ہے جنہیں مشرق و مغرب کے تمدن و معاشرت پر مزاحیہ انداز میں نظر ڈالی گئی ہے۔ چونکہ یہ مضامین مختلف اوقات میں مختلف جذبات کے زیرِ اثر لکھے گئے۔ اس لئے ان میں قدرتاً ایک ایسا دلآویز تنوع پیدا ہو گیا ہے جس سے مختلف طبیعتیں تسکین و تفریح کا سامان حاصل کر سکتی ہیں۔ "طلسمِ زندگی" میں اکیس رنگین بلاک ہیں جن میں سے اکثر ہفت رنگ و سہ رنگ ہیں۔ ہر باب کا آغاز ایک رنگین صفحۂ جمیل سے ہوتا ہے جو بجائے خود قدیم اسلامی نقاشی کا ایک لازوال نمونہ ہے۔ مصنف کی تصویر کے علاوہ تیرہ دلکش تصویریں ہیں جو اپنی جگہ استادانِ فن کے بہترین مصورانہ کمالات کا مظہر سمجھی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ سرورق سے لے کر خاتمے تک کتاب ماہرِ فن مصوروں کے مشورے کے مطابق آراستہ و پیراستہ کی گئی ہے۔ کتاب کی پہلی تصویر "طلسمِ زندگی" رنگو تخیل کا ایک بے نظیر مرقع ہے جس کی بجائے خود ایک الگ قدر و قیمت ہے۔ کتابت پنجاب کے ایک بہترین خوشنویس کی محنت کا نتیجہ ہے۔ طباعت اعلیٰ درجے کے حسنِ اہتمام کی مثال ہے۔ جلد نفیس سنہری نقاشی سے مزین ہے۔ کتاب اتنی خوبصورت ہے کہ موجودہ اردو تصانیف میں اس کی مثال ڈھونڈے سے نہیں مل سکتی۔

حجم تین سو دس صفحات ہے۔ تمام کتاب دبیز آرٹ پیپر پر چھپی ہے قیمت مجلد پانچ روپیہ (علاوہ محصول ڈاک) کہ تقریباً یہی کتاب کی اصلی لاگت ہے چند کتابوں کی جلدیں زیادہ نفیس تیار کرائی گئی ہے جن کی قیمت سات روپے فی جلد ہے۔ یہ مجموعہ محدود تعداد میں شائع ہو رہا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے ایڈیشن تک انتظار کی زحمت برداشت نہ کرنی پڑے تو فی الفور اپنی فرمائش بھیج دیجئے۔ جن حضرات کی فرمائشیں پہلے پہنچیں گی ان کا حق فائق سمجھا جائے گا۔

سید عبداللطیف کوٹھی میاں بشیر احمد صاحب ۲۳ لارنس روڈ۔ لاہور

جہاں نما

فضا کی انتہائی وسعتیں

سر جیمس جینز نے کیمبرج میں ہنری سجوک میموریل لکچر کے دوران میں ستاروں اور کائنات کے متعلق عجیب وغریب حقائق بے نقاب کئے۔

انہوں نے کہا یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ستاروں کا نظام پہنائے کائنات میں ہر جگہ پھیلا ہوا نہیں ہے۔ یہ ایک خاص منظم ہیئت میں ہیں جو ایک قرص یا سکے یا گاڑی کے پہیئے سے مشابہ ہے۔ چند سال قبل یہ تینوں تشبیہیں یکساں صحیح سمجھی جاتیں لیکن اب ہمیں ان میں سے آخری کو یقیناً ترجیح دینی چاہئے، کیوں کہ حال ہی میں یہ انکشاف ہوا ہے کہ ستاروں کا تمام نظام ایک مرکز کے گرد اُسی طرح چکر کھا رہا ہے جیسے ایک گاڑی کا پہیہ اپنی دُھری کے گرد گردش کرتا ہے۔

پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ آفتاب ستاروں کے اس نظام کے بالکل قریب ہے۔ لیکن ہمیں اب معلوم ہو گیا ہے کہ یہ بہت دُور ہے۔ دُھری اتنی دور ہے کہ ہم کسی دُوربین کی مدد کے بغیر اس کے روشن ترین ستاروں کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔ آنکھوں کو صرف وہی ستارے نظر آتے ہیں جن کی روشنی تین ہزار سال میں ہم تک پہنچ جاتی ہے لیکن دھری اتنی دُور ہے کہ وہاں سے روشنی کو زمین تک پہنچنے میں چالیس ہزار سال لگ جاتے ہیں۔ یہ بااصطلاح ماہرانِ ہیئت دُھری چالیس ہزار نوری سالوں کے فاصلے پر واقع ہے۔

اس دُھری کے پہیئے کا قطر ہم ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتے، لیکن غالباً یہ دو لاکھ نوری سالوں کے فاصلے کے برابر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آفتاب اس پہیے کے اروں کے نصف طول سے بھی کم فاصلے پر واقع ہے۔ اس پہیے کی گردش آفتاب کو فضا میں دو سو میل فی سیکنڈ کے حساب سے گھماتی ہے، تاہم پہیا اتنا بڑا ہے کہ اسی رفتار پر سفر کرنے کے باوجود آفتاب بیس کروڑ سال میں ایک دفعہ دُھری کا چکر لگا سکتا ہے۔

اگر دوسرے ستاروں کی قوتِ جاذبہ بروئے کار نہ آئے تو آفتاب فضا میں اس طرح چکر کھا کر گرے جس طرح بائیسکل کے پہیئے سے کیچڑ کا ایک ذرّہ اُڑ کر گرتا ہے۔ یہ جاذبیت اُسے اسی طرح اپنے مدار پر قائم رکھے ہوئے ہے جس طرح زمین کو آفتاب کی جاذبیت نے تھام رکھا ہے۔

ایک زمانے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ فضا ایک ایسے جوہر (ایتھر) سے پُر ہے جو تمام اُن اعمال کی ذمہ دار ہے جو خالی فضا میں وقوع پذیر ہوتے نظر آتے ہیں۔ جس طرح ہوا موسیقی یا بولنے والی آواز کو صوتی لہروں کی شکل میں ایک فاصلے تک لے جاتی ہے۔ اسی طرح ایتھر کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ آفتاب کی روشنی اور حرارت کو ایتھر کی لہروں کی شکل میں فضا کا فاصلہ طے کراتا ہے۔

مائیکل سن اور مارلے کے مشہور تجربے نے اس نظریے کو پاش پاش کر دیا ہے۔ اگر تمام فضا ایتھر سے بھری ہوئی ہوتی تو فضا میں زمین کی حرکت سے ایتھر کی ایک آندھی سی پیدا ہوجاتی جو زمین کے پاس سے گزرتی۔ تجربے کا مقصد یہ تھا کہ اس ایتھری آندھی کی رفتار معلوم کی جائے۔ لیکن اس کے نتائج نہایت غیر متوقع ظہور میں آئے۔ بجائے اس کے کہ ایتھری آندھی کی رفتار معلوم ہوتی معلوم یہ ہوا کہ فضا میں ایتھری آندھی کا وجود ہی نہیں ہے۔

آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت نے اس عقدے کو نہایت اچھی طرح حل کر دیا ہے۔ ہم اب فضا کو ایتھر سے یکساں طور پر بھرا ہوا نہیں سمجھتے بلکہ اس کی ایک اپنی الگ ساخت اور شکل سمجھتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک کامل طور پر مسطح بلیرڈ میز اور ایک گیند بلا کھیلنے والے میدان کی کوئی خاص ساخت اور شکل نہیں ہوتی کیوں کہ اس کا ہر ٹکڑا ہر دوسرے ٹکڑے سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہ ایک اس قسم کی سطح ہوتی ہے جس پر ہم کھیل سکتے ہیں۔ ہم جس طرف گیند کو پھینکتے ہیں ہم جانتے کہ وہ سیدھی اُس طرف چلی جائے گی لیکن اگر ایک بلیرڈ میز کی ساخت میں اونچ نیچ ہو یا ایک گیند بلا کھیلنے کے میدان میں گڑھے پڑے ہوئے ہوں تو پھر ہم گیند کو سیدھا نہیں پھینک سکتے۔ ہماری گیند نشیب و فراز میں گرتی پڑتی کہیں کی کہیں نکل جائے گی۔

اضافیت کا نظریہ ثابت کرتا ہے کہ فضا کی ساخت اسی قسم کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیارے اور نجوم مذنبہ آفتاب کے گرد خم دار مدارات پر گردش کرتے ہیں۔ ٹینس کی گیند نیچے کو زمین کی طرف خم کھاتی ہے اور برقیہ ایک برقی یا مقناطیسی مقام میں خم کھا کر چلتا ہے۔

جب ایک معمولی سطح میں کوئی خاص بناوٹ ہو یا اس میں خم ہوں تو ہم اسے ہموار اور ناہموار دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ یہی حال فضا کا ہے۔ اس میں بھی ایک ہموار بناوٹ ہے جو برقیے کو اس کے مدار میں محفوظ رکھتی ہے، ایک ناہموار اور بالکل مختلف ساخت ہے جو ٹینس کی گیند کو خواہ ہم اُسے کتنے زور سے پھینکیں کامل طور پر سیدھا جانے سے روکتی ہے۔ ان دو ساختوں میں اضافیت کے نظریے نے ایک تیسری ساخت کا اضافہ کیا ہے جو ان دونوں سے زیادہ

ناہموار ہے اور جو اسی عام نوع کی ہے. جیسی سطح زمین کے انحنا میں ہمیں ملتی ہے۔

زمین کے انحنا کی وجہ سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہم ایک مربع کی صحیح صحیح شکل سطح زمین پر بنا سکیں۔ ایک صحیح مربعے کی شکل ہم اُسی صورت میں بنا سکتے ہیں جب ہم سطح زمین سے گزر کر کسی ایسی چیز پر بھی پہنچ جائیں جو سطح زمین نہ ہو۔ اسی طرح نظریۂ اضافیت نے جو انحنا فضا میں دریافت کئے ہیں، انہوں نے ہمارے لئے فضا میں ایک چوکور کا بنا سکنا ممکن کر دیا ہے۔ ایک صحیح صحیح چوکور بنانی اُسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم فضا میں سے گزر کر کسی ایسی چیز پر بھی پہنچ جائیں جو فضا نہ ہو۔

یہ ممکن نہیں کہ ہم فضا میں ایک پدم میل کا ایک مربع بنا سکیں اور پھر یہ بھی معلوم کر سکیں کہ آیا اس کے چاروں ضلعے برابر ہیں یا نہیں، لیکن یہ ممکن ہے کہ ہم سحابیاتِ نجمی کو تنکوں کی ایک مٹھی سمجھ کر اُس فضا کا بہاؤ معلوم کرنے کے لئے پھینک دیں جس میں وہ گھرے ہوئے ہیں اور معلوم کریں کہ آیا فضا حقیقت میں پھیل رہی ہے یا نہیں؛ اگر فضا اُسی طرح خم دار ہے جس طرح آئن سٹائن کے تخیل نے اُسے محسوس کیا تو یہ پھیل بھی ضرور رہی ہوگی، اس طرح کہ سحابیات نجمی ایک دوسرے سے پیچھے ہٹ رہے ہوں گے، اور اسی طرح ہم سے بھی، اور اُن کی رفتار کو اُن فاصلوں سے ایک نسبت ہوگی۔

یہ اندازہ کرنا ممکن ہے کہ کائنات کی ارتقائی عمر کیا ہوگی ـــ یعنی وہ عرصہ جو کائنات کو اپنی موجودہ حالت اور ہیئت اختیار کرتے ہوئے منقضی ہوا۔ جن مختلف ذرائع سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں، مثلاً مدارات نجومِ ثنویہ، امواج نجوم کا پھیلاؤ، ستاروں کی حرکات میں توانائی کی تقریباً یکساں تقسیم تمام ثابت کرتے تھے کہ یہ ارتقائی زمانہ لاکھوں کروڑوں سال پر حاوی ہے اس کے برخلاف سحابیاتِ نجمی کے پیچھے ہٹنے کی رفتار جس کو ہم نے ستارہ بین نے دیکھا اس قدر تیز تھی کہ اگر وہ حقیقی ہوتی تو کائنات کو ہر دس ارب سال کے بعد اپنی حدود دُگنی کر دینی پڑتیں صحیح مدت غالباً ایک ارب تیس کروڑ سال ہے۔

خوشی کی تسخیر

(گزشتہ سے پیوستہ)

خوشی؛ غم و رنج، مقابلہ و مجادلہ۔ بیزاری و بے تابی، اضمحلال و حسد، گناہ احساسی و ایذا رسانی اور ہمہ گیر ظلم و ستم کی اس دُنیا میں کیا **خوشی ہنوز ممکن ہے؟**

رسل کہتا ہے کہ اپنے بعض دوستوں سے گفتگو کرنے اور اُن کی بعض تصنیفات کا مطالعہ کرنے کے بعد میں تقریباً اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ خوشی دُنیائے حاضر میں ناممکن ہے لیکن غور و خوض کرنے سے، دور دراز ملکوں کی سیر و سیاحت سے اور اپنے باغ کے مالی سے بات چیت کرکے یہ خیال بتدریج دُور ہو رہا ہے۔ جب میں لڑکا تھا تو میں ایک شخص کو جانتا تھا جو کنوئیں کھودنے کا کام کرتا تھا جو بہت لانبا تھا، اس کے پٹھے پہلوانوں کی طرح مضبوط تھے، وہ پڑھ لکھ نہ سکتا تھا اور جب ۱۸۸۵ء میں اُسے پارلیمنٹ کے لئے حق رائے ملا تو اُسے پہلی مرتبہ معلوم ہُوا کہ پارلیمنٹ بھی کوئی شے ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ اُس کی خوشی جسمانی طاقت، وافر کام اور چٹانیں کاٹنے سے حاصل ہوتی تھی۔ میرے مالی کی خوشی بھی اس سے ملتی جلتی ہے۔ وہ اپنے پودوں کی نگہداشت کے لئے خرگوشوں کی سرکوبی کرتا رہتا ہے جنہیں وہ بھیانک چالاک اور خونخوار پکارتا ہے کچھ اس طرح جیسے انگریز خفیہ پولیس والے ردسیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ہر روز اُسے اس سے واسطہ پڑتا ہے اور اُس کا کام برابر جوش کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ اگرچہ وہ ستر برس سے زائد عمر کا ہے وہ دن بھر اپنے کام میں مصروف رہتا ہے اور اپنے کام پر آنے کے لئے پہاڑی علاقے میں بلا ناغہ پورے سولہ میل بائیسکل چلاتا ہے لیکن اُس کی خوشی کا چشمہ کبھی سوکھتا نہیں اور اس کی وجہ محض "وہ خرگوش ہیں"۔ تم کہوگے لیکن اس قسم کی سادہ خوشیاں ہم عالی دماغ لوگوں کو خوش نہیں کرسکتیں۔ میرے خیال میں یہ دلیل محض غلط ہے۔ عقلمند آدمی بھی اپنے اپنے کاموں میں یہ سادہ خوشیاں حاصل کرسکتے ہیں۔ بہرحالت میں تکمیل کار کی خوشی محض ایسی مشکلات کی متقاضی ہے جو شروع میں سخت دشوار معلوم ہوں لیکن جو بالعموم استقلال سے آسان ہوتی جائیں۔ آج کل تمدن کے زمانے میں سب سے خوش لوگ طبیعیات دان ہیں جو اس بات میں ادیبوں کی جماعت سے مختلف ہیں کہ وہ اپنی خانگی زندگی میں بھی مسرور نظر آتے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اُن کی عقل کلیتہً مصروف کار رہتی ہے اور ایسی باتوں میں دخل در معقولات نہیں دیتی رہتی جہاں اُس کی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ دُنیائے حاضر میں طبیعیات کی قدردانی ہے اور کسی کو اُس کی اہمیت میں شبہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ طبیعیات دان مزے کرتے ہیں اور کئی نقاش اور ادیب

بھوکوں مرتے ہیں اور ناخوش ہیں جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ عوام الناس کے شکوک وشبہات کے ساتھ ہر وقت دست وگریباں رہنا خوشی کا موجب نہیں ہوسکتا۔ یہ امر واقع ہے کہ مغربی ملکوں میں اکثر فہیم نوجوانوں کی عقل وفہم بیکار پڑی رہتی ہے۔ اس کے برخلاف روس چین جاپان اور حال ہی میں ہندوستان میں بھی اُنہیں کوئی نہ کوئی ایسا اصطلاحی یا سیاسی کام کرنے کو مل جاتا ہے جس میں گو اُن کے سولی پر چڑھ جانے کا خطرہ لاحق ہو لیکن جس سے اُنہیں وہ خوشی حاصل ہوتی ہے جو مغرب میں آرام اور کم اختیار کی زندگی سے کبھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ عسیر الحصول خوشیاں اکثر لوگوں کے بس کی نہیں۔ لیکن اکثر لوگوں کے بس کی یہ بات ضرور ہے کہ وہ اپنے کام میں خاص مہارت پیدا کریں بشرطیکہ انہیں یہ خواہش نہ ہو کہ ساری دُنیا ہمیں اس مُہارت پر سراہے۔ ایک شخص کا ذکر ہے کہ نوجوانی ہی میں اس کی دونوں ٹانگیں بیکار ہوگئیں لیکن وہ اپنی طویل عمر کے آخری دنوں تک بغایت خوش رہا اور وہ اس طرح کہ اُس نے پانچ جلدوں میں ایک کتاب گلاب اور یا لاپر لکھی جو اس موضوع پر ایک مستند تصنیف مانی جاتی ہے۔ کسب کمال کُن کہ عزیز جہاں شوی بلکہ کسی کام میں کمال پیدا کرنے سے سارے جہان میں ہر دلعزیز ہوئے بغیر بھی انسان خوش دل رہ سکتا ہے۔ یہ خوشی کی ایک آسان راہ ہے جو ہر ایک کے لئے کُھلی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آج کل کلوں کے دور میں یہ ناممکن یا سخت دشوار ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ کلوں کے کام میں جس قدر مصاحبت اور تعامل ہوتا ہے وہ زراعت کے نام نہاد فطری کام میں میسر نہیں کسی خاص مقصد میں محکم یقین اور اُس کے لئے پیہم عمل خوشی کا موجب ہوتا ہے۔ محض بم اندازوں کا سا مقصد ہی نہیں بلکہ سینکڑوں اور مقاصد جن میں اکثر لوگ دلچسپی لے سکتے ہیں مثلاً کسی مدرسے کسی یتیم خانے کسی انجمن کے مقاصد میں دلچسپی لینا۔ اسی طرح کسی تفریحی شے میں دلچسپی لینا انسان کے مخصوص کام کے لئے بھی مفید ہوتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آج کل کا ایک شہرۂ آفاق ریاضی دان جتنا وقت ریاضی کے لئے وقف کرتا ہے اتنا ہی وقت پرانے ٹکٹ اکٹھے کرنے میں صرف کر دیتا ہے۔ ٹکٹوں کی فراہمی صرف ریاضی کی مشکلات کو حل نہیں کرتی اور نہ ٹکٹ صرف ایسی شے ہیں جنہیں اکٹھا کیا جاسکتا ہے۔ اس دلچسپ متمدن دُنیا میں ہزاروں اور ایسے تفریحی مشاغل ہیں۔ پُرانے سکوں پُرانے ہتھیاروں، پُرانے برتنوں کا اکٹھا کرنا، فوٹو اتارنا، اشعار کا انتخاب، بہترین تقریروں تحریروں کا انتخاب اور بیسیوں ایسی ہی اور چیزیں ہیں جو کی جاسکتی ہیں اور جن کا کرنا انسان کے لئے خوشی کا باعث ہے۔ یہ خیال کہ یہ ذرا ذرا سی باتیں ایک بالغ یا عمر رسیدہ کے لئے ناموزوں ہیں محض فضول ہے۔ ہر وہ خوشی جو دوسروں کے لئے نقصان رساں نہ ہو مفید ہے۔ رسل کہتا ہے کہ "میرا یہ حال ہے کہ میں دریا اکٹھے کرتا رہتا ہوں روس کے دریاے والگا میں میں نے سفر کیا چین کے یانگ سی پر میں گیا اور مجھے بہت ہی افسوس ہے کہ میں نے تا حال ایمزان یا اورینوکو کی سیر کیوں نہیں کی۔ یہ جذبات سادہ ہیں لیکن میں ان پر شرمندہ نہیں ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی بار امریکہ کے ایک مشہور ادیب سے ملا جس کی کتابوں کے مطالعہ سے مجھے خیال ہوا تھا کہ

ہر شے جو اچھی طرح کی جا سکے کرنے کے قابل ہے۔

عقلمند آدمی کبھی صرف اپنے کام میں منہمک نہیں رہتا۔ تم ہر روز چھ گھنٹے اپنا کام کرتے ہو تو ہر روز آدھ گھنٹہ زندگی کے بعض اور پہلوؤں پر بھی نظر دوڑایا کرو۔

وہ ایک غم پسند آدمی ہے تو اُس وقت "بیس بال" (ایک قسم کا کھیل) کے مقابلوں کی خبریں برقی خبررساں پر آرہی تھیں اور وہ اس پر کان لگائے ہوئے تھا۔ اُس وقت وہ مجھے اور اپنے علم ادب کو اور اس دُنیا کے سارے افکار و مصائب سب کو قطعاً بھول گیا تھا اور جب اس کے کسی واقف یا دوست کی جیت کی خبر آتی تھی تو وہ خوشی کے مارے اس طرح چلاتا تھا جیسے کوئی بچہ یا لڑکا چلائے۔ تاہم یہ درست ہے کہ تفریحات عموماً اصلی خوشی کا موجب نہیں ہوتیں وہ تو صرف کسی خاص وقت میں دُنیا کے بکھیڑوں کو بھول جانے کا ذریعہ ہیں اور بس۔ اصلی خوشی سب سے زیادہ اس پر منحصر ہے کہ انسان اپنے ہم جنسوں اور چیزوں میں ہمدردانہ دلچسپی لے۔ اپنے ہم جنسوں میں صحیح نوع کی دلچسپی وہ ہے جس میں اُلفت کی آمیزش ہو گو وہ اُلفت ایسی نہ ہونی چاہئے جو کسی کو صرف اپنا بنالینا چاہے بلکہ ایسی جو دوسروں کو دیکھے، اُن کی انفرادی باتوں میں لطف حاصل کرے، اُن کے مخصوص مفاد اور مسرتوں کے لئے تسلی و تکمیل کی راہیں ڈھونڈے بغیر اس خواہش کے کہ وہ اُس کے ممنون ہوں یا وہ خود اُن پر قبضہ پالے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ نا احسان مندی سے اپنا جی بُرا نہ کرے اور دوسروں کی عجیب و غریب عادتوں سے غصے میں آنے کی بجائے ان پر ہنس دیا کرے۔ اگر کوئی شخص اپنے دل میں خوش ہوگا تو وہ دوسروں کے لئے بھی خود بخود ایک پُرلطف ساتھی بن جائے گا اور اس سے پھر اُس کی اپنی خوشی دوبالا ہو جائے گی۔ لیکن یہ سب کچھ بناوٹی نہ ہونا چاہئے نہ اس خیال سے کہ یہ ایک ایثار ہو یا ایک مقررہ فرض۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بہت سے اشخاص سے از خود اور بغیر کوشش کے دوستداری کا سلوک کرتا ہے خود بخود مسرور و مطمئن رہتا ہے۔ اسی طرح جو شخص مختلف اشیا میں ہمدردانہ دلچسپی لے اس کی خوشی میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک ہر ریاضیات کو پتھروں اور چیونٹیوں سے دلچسپی ہے ایک ماہر اثریات کو پرانی عمارتوں اور کھنڈروں سے لیکن ہمیں بھی کسی نہ کسی شے یا اشیا سے دلچسپی لینی چاہئے۔ دُنیا ایک وسیع عجائب خانہ ہے۔ ہم یہاں اگر صرف اپنے مفاد سے دلچسپی لیں گے تو ہماری زندگی بہت جلد غیر دلچسپ ہو جائے گی۔ ایک مختلف چیزوں میں دلچسپی لینے والا جب مثلاً ستاروں کی تاریخ یا قدیم ہندوؤں یا قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے کارناموں کا حال پڑھ کر پھر اپنے کاروبار یا ذاتی معاملات کی طرف متوجہ ہوگا تو وہ دیکھے گا کہ اُس کی فکر و تشویش میں خاصی کمی واقع ہوگئی ہے۔ خوشی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ تمہارے مفاد جتنے وسیع ہوسکیں ہوں اور چیزوں اور لوگوں کی طرف تمہارا رویہ دوستانہ ہو نہ کہ معاندانہ۔ اب ہم خوشی کے ذرائع پر بہ تفصیل غور کرتے ہیں۔

مسرور اشخاص کی ایک عالمگیر اور ممتاز خصوصیت ہے **انہماک**۔ انہماک زندگی کے لئے ہے جیسے اشتہا کھانے کے لئے انہماک کے بخوبی سمجھنے کے لئے تمثیلاً دیکھنا چاہئے کہ لوگ اپنا اپنا کھانا کیونکر کھاتے ہیں۔ بعض لوگ کھاتے وقت بیزار نظر آتے ہیں خواہ ان کا کھانا کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، دراصل اُن کو ہمیشہ اچھا کھانا ملتا رہا ہے اور انہیں کبھی معلوم نہیں ہوا کہ تڑپا دینے والی

۱؎ جس شخص میں ظرافت کا مادہ ہے وہ ضرور خوش اطوار ہوگا کیونکہ اگر وہ اوروں پر ہنسے گا تو بعض اوقات اپنے آپ پر بھی ہنس دے گا۔

۲؎ تم کسی کی دوستی چاہتے ہو تو پہلے خود اُس کے دوست بن جاؤ۔

۳؎ دوستی وہ چشمہ ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔

بھوک کیا بلا ہوتی ہے۔ وہ کھاتے ہیں کیونکہ دنیا میں کھانے کی رسم پڑگئی ہے اور یہ گویا ایک فیشن ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کھانا اُکتا دینے والی شے ہے مگر کیا کیا جائے یہ نہ جی اکتائے گی تو کوئی اور شے جی اکتا دے گی اور بعض بیمار لوگ ہیں جن کے معالج نے انہیں بتایا ہے کہ کھانا ضروری ہے کیونکہ اس سے طاقت قائم رہتی ہے اور بعض چٹورے ہیں جو کھانا شروع تو کرتے ہیں خوشی سے لیکن تھوڑا کھانے کے بعد دیکھتے ہیں کہ اس کھانے میں مرچ کم ہے اس میں چینی زیادہ ہے یہ پورا پکا نہیں وہ بے مزہ سا ہوگیا ہے وغیرہ وغیرہ اور بعض پیٹو ہیں جو کھانے پر اس طرح گر پڑتے ہیں جس طرح گدھ مردار پر۔ وہ پیٹ بھر کر کھاتے ہیں اور پھر نڈھال ہوکر پڑ جاتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو خوب بھوک سے کھانا شروع کرتے ہیں کھانے میں لطف بھی اٹھاتے ہیں اور جب کھا چکتے ہیں تو کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔ زندگی کے دسترخوان پر بھی مختلف لوگوں کا یہی حال ہے۔ مسرور آدمی موخرالذکر کھانے والے کی قسم سے ہے۔ کھانے سے بیزار ہوجانے والا اللّھی ناخوشی کے شکار کی طرح ہے۔ بیمار آدمی جو اپنا فرض سمجھ کر کھاتا ہے گویا تارک الدنیا ہے پیٹو عیاش ہے اور چٹورا اُس مدمغ کی طرح ہے جسے زندگی کی اکثر خوشیاں کثیف معلوم ہوتی ہیں شاید پیٹو کے سوا باقی یہ سب آدمی ایک صحت مند آدمی کو جو اپنے کھانے سے فطری طور پر لطف اٹھائے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ہم سے کم ظرف آدمی ہے گویا بھوک لگنے پر کھانا کوئی کمینہ حرکت ہے یا زندگی کی مسرتوں سے لُطف اندوز ہونا کوئی برائی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ نیکی اُن پر منکشف ہوچکی ہے۔ اپنی انکشاف کی چوٹیوں سے "فریب خوردہ" نوعِ انسان کو رحم اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس نوع کے تمام "انکشافات" درحقیقت عوارض ہیں جو نفس کو بتدریج کمزور اور کھوکھلا کردیتے ہیں اور ان سے جس قدر جلد بھی رہائی پائی جائے بہتر ہے۔ فرض کرو کہ ایک آدمی کو بیر پسند ہیں دوسرے کو پسند نہیں ہیں تو دوسرا آدمی کس طرح پہلے آدمی سے بہتر ہوگیا + بیر نہ اچھے ہیں نہ بُرے۔ جو بیر پسند کرتا ہے اس کے لئے وہ اچھے ہیں جو ناپسند کرتا ہے اس کے لئے بُرے ہیں لیکن جسے وہ پسند ہیں اُس کی زندگی نہ پسند کرنے والے سے زیادہ مزے دار ہوتی ہے اور وہ دنیا میں زیادہ خوش رہتا ہے۔

اِسی طرح کھیلوں سے دلچسپی لینے والا یا کتابوں سے لطف اٹھانے والا اپنی دلچسپی اور لطف میں خوش ہے اور جسے یہ دلچسپی نہیں وہ اس خوشی سے محروم ہے۔ جتنی زیادہ چیزوں میں بھی ایک آدمی دلچسپی لے گا اتنا ہی زیادہ اُس کی خوشیوں میں اضافہ ہوگا اور اتنا ہی کم وہ قسمت کے رحم پر زندگی گزارے گا اس لئے کہ اگر اُس سے ایک چیز چھن جائے گی تو وہ دوسری طرف رجوع کرے گا۔ انسان کی زندگی اتنی طویل تو نہیں کہ وہ ہر شے میں دلچسپی لے سکے لیکن پھر بھی جتنی اچھی چیزوں میں بھی ہم دلچسپی لیں گے اتنی ہی ہماری زندگی زیادہ مطمئن اور مسرور ہوگی۔ الٹی کھوپری والا آدمی چیزوں سے منہ پھیر کر اپنے اندر محصور رہتا ہے لیکن یاد رکھو کہ ایسے غلط اندیش فلسفیوں کی ناخوشی میں کوئی بڑی ناقابل الفہم نیکو کاری چھپی ہوئی نہیں ہے + انسان کا دل ایک عجیب الخلقت کل ہے کہ وہ اُس تمام مواد سے جو اس میں ڈالا جائے نئی سے نئی چیز بن ساخت

وہی شخص زندگی سے اچھی طرح حظ اٹھا سکتا ہے جس کے دل کو تفتیش و دریافت کی دُھن لگی ہے +

کرتی ہے لیکن اگر اُس میں کچھ نہ ڈالا جائے تو وہ ایک بے سُود سی شے ہو کر رہ جاتی ہے۔ دنیا کی مادّی چیزیں اُس دلچسپی کی وجہ سے جو ہم ان میں لیں واقعات بن جاتی ہیں اور مختلف النوع واقعات کا تواتر صحیح زندگی ہے۔ وہ فرد بشر جس کی توجہ بالعموم بیرونی طرف کو مبذول ہو جب گا ہے گا ہے اپنے اندرونِ نفس میں نگاہ ڈالتا ہے تو وہ اس میں رنگ رنگ کے نوادر پاتا ہے جس سے اُس کی زیست گویا روز بروز مرصّع ہوتی جاتی ہے +

انہماک کی بے شمار صورتیں ہیں۔ ایک انہماک پسند آدمی کو باغ کی ایک گشت میں، کھیتوں کی سیر میں، شہروں کی عمارات میں، پرانے زمانے کی تعمیروں میں، نئے زمانے کے کارخانوں میں بیسیوں دلچسپ حقائق نظر آتے ہیں اور ایک چیز دل میں دلچسپی رکھنے والا شخص اس مادّی دُنیا کا بہتر اور زیادہ کامیاب باشندہ ہوتا ہے۔ سیر و سیاحت ہی کو لو۔ ایک قسم کا شخص دُنیا بھر میں گھومنے کو نکلے گا، بہترین ہوٹلوں میں قیام کرے گا، وہی خوراک کھائے گا جو اپنے گھر میں کھاتا تھا، اسی طرح کے بے فکروں سے ملے گا جن سے اپنے وطن میں ملتا تھا، اُسی قسم کی باتیں کرے گا جو اپنے گول کمرے یا کھانے کے کمرے میں کیا کرتا تھا وہ گھر واپس آئے گا تو وہ اس بیزار کرنے والے تجربے سے رہائی پانے پر فقط خدا کا شکر ادا کرے گا۔ لیکن ایک دوسری قسم کا شخص ہر مقام کی خصوصیتیں دیکھے گا، نئے نئے آدمیوں سے ملے گا، تاریخی یا معاشری دلچسپی کی چیزیں ملاحظہ کرے گا جس جگہ جائے گا وہاں کی مخصوص خوراک کھائے گا، وہاں کی زبان اور وہاں کے طور طریقے سیکھے گا اور جب گھر واپس لوٹے گا تو اس کے دماغ میں سردی کی راتوں کے لئے آپ بیتی کا ایک ایسا ذخیرہ جمع ہو گا جو مدتوں تک ختم نہ ہو گا۔ ان سب مختلف حالات میں منہمک آدمی غیر منہمک آدمی سے فائدے میں رہے گا۔ اس کے لئے نامرغوب تجربے بھی مفید ثابت ہوں گے۔ جہاز کی غرقابی، بغاوت، زلزلہ آتش زدگی ایک باہمت آدمی کے لئے ایسے حادثات اور اُن کی یاد عموماً مسرت خیز ہوتی ہے۔ لیکن ہر انسان کی ہمت کی ایک حد ہے صحت برباد ہو جائے تو بہت کم آدمیوں میں انہماک باقی رہتا ہے اگرچہ کبھی کبھی اس کے خلاف بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ بعض آدمی بڑی جاں گسل تکلیفیں سہتے رہتے ہیں لیکن پھر بھی اپنی ہمت اور اپنی انہماک پسندی نہیں کھوتے +

مختلف آدمیوں کو مختلف باتوں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ ہر شخص کو خود غور کرنا چاہئے کہ اسے کس چیز سے شغف ہے

حسن بینی زندگی کی مکمل لطف اندوزی کا آغاز ہے

حسن خدا کے چہرے کا ایک پہلو ہے۔

پاکیزگی پاکیزگی نہیں جب تک وہ خوبصورتی بھی نہ ہو +

تعلیم کا ایک مقصد حسن کی پسندیدگی ہونا چاہئے جس شخص میں یہ وصف پیدا ہو گیا تو اس پر گویا رنگارنگ نعمتوں کی بارش ہوتی رہی +

ہم میں سے اکثروں کو زندگی میں ایسے ایسے موقع پیش آتے ہیں کہ اگر ہم اُن سے پوری طرح فائدہ اٹھائیں تو اس سے ہم اپنی خوشیوں میں گراں قدر اضافہ کر سکتے ہیں +

ہم انسان ایک دوسرے کے دست و بازو ہیں۔ بغیر ایک دوسرے کے ہم بیکار ہیں پھول باہر دھوپ اور ہوا میں کھلتے اور لہلہاتے ہیں اندر کوٹھڑیوں میں وہ مرجھا کر رہ جاتے ہیں

جب وہ ایسی چیز کو پانے کی کوشش میں مصروف ہوگا تو اُس کی زندگی غیر دلچسپ نہ رہے گی۔ لیکن ان جزوی دلچسپیوں سے زیادہ دل خوش کن ہے زندگی میں ایک عام انہماک جس کے لئے اعتدال پر عمل درآمد ضروری ہے۔ ایک اچھی زندگی میں مختلف باتوں میں توازن قائم رہنا چاہئیے۔ ہمارے مختلف ذوق اور مختلف خواہشیں جب تک دنیا کے چوکھٹے میں پوری نہ آئیں گی دیر تک لطف نہ دیں گی۔ یعنی یہ لازم ہے کہ وہ ہماری صحت سے ہمارے تعلقاتِ محبت سے اور اس معاشرہ کی قدرو منزلت سے جس میں ہمیں رہنا ہے مطابقت کریں ورنہ وہ بجائے خوشی کے ہماری ناخوشی کا موجب ہو جائیں گی۔ ہاں بعض کارنامے مثلاً کوئی اصلاحی تحریک کوئی بغاوت کوئی زبردست ایثار یہ اس قدر عظیم الشان ہیں کہ اُن کے لئے انسان اگر بہت سی نعمتیں ضائع بھی کر دے تو مضائقہ نہیں بلکہ حق یہ ہے کہ ایسے کام ایسی ہی قربانیوں سے ممکن العمل ہوتے ہیں۔ لیکن بالعموم وہ آدمی جس میں کوئی خاص خواہش حد سے بڑھ جائے کسی تکلیف یا خوف یا ہول کا شکار ہوتا ہے جس سے وہ اس طریقے سے گریز کرنا چاہتا ہے۔ کبھی کبھی یہ گریز ضروری بھی ہو جاتا ہے لیکن جہاں بھی اس کی خاص ضرورت نہ ہو۔ یہ محض کسی نفسی خرابی کا نشان ہوتا ہے۔ غرض ایک عام انہماک انسانی فطرت کی ایک ضروری خصوصیت ہے۔ متمدن معاشرت میں عام انہماک کی کمی زیادہ تر ان بندشوں کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے جو قانون یا رواج نے نوعِ انسان پر عائد کر رکھی ہیں کہ ان بندشوں سے بالا بالا زندگی بسر کر سکنے کے لئے جسمانی صحت مندی اور غیر معمولی توانائی کی ضرورت ہے یا پھر کسی نہایت ہی دلچسپ کام کی۔ اس توانائی کی دراصل صاحبِ انہماک کو غایت درجہ حاجت ہے اور یہ توانائی اُسی صورت میں عمل میں آتی ہے جب نفس کی کُل باقاعدہ طور پر بغیر رکاوٹ کے اپنا کام کئے جائے۔

الفت کئے جانے کا خیال انہماک کا معاون ہے اور یہ خیال کہ کسی کو مجھ سے لگاؤ نہیں انہماک کو برباد کر دیتا ہے محرومِ الفت شخص بعض دفعہ اپنی نیکی و احسان سے انتہائی کوشش کرتا ہے کہ لوگ اُس سے الفت کریں لیکن اس میں وہ عموماً ناکام رہتا ہے کیونکہ یہ ایک فطری امر ہے کہ لوگ اکثر اسی سے اُلفت کرتے ہیں جو الفت کا مطالبہ نہ کرے۔ ناکام مطالبہ کرنے والا سمجھتا ہے کہ دنیا درشت آدمیوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ غلط ہے فی الحقیقت دُنیا میں خوش طینتی زیادہ ہے بدطینتی کم۔ ایسا محرومِ الفت شخص بالعموم خود اندیشی اور تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ ایک ایسی بے اطمینانی ہوتا ہے جس سے رہائی پانے کے لئے وہ دُنیا سے بے تعلق ہو کر اپنی ہی عزلت میں جا گزیں ہو جاتا ہے جو لوگ الفت پا کر مصون زندگی گزارتے ہیں وہ بہت زیادہ خوش رہتے ہیں اور عموماً اس صیانت کے احساس کے باعث ایک انسان بہت سے خطروں سے

ناخوش ناتجربہ کاروں کو ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ خود دیکھو اور دیکھ لو۔

اپنے آپ کو جان لو تو تمہاری زندگی میں خود بخود اضافہ ہو جائے گا۔

دوست از خود منتخب ہوتے ہیں۔

بچ جاتا ہے۔ زندگی میں خود اعتمادی بہت حد تک صحیح قسم کی الفت ملنے سے آتی ہے یہ اطمینان و اعتماد بہ نسبت الفت کرنے کے زیادہ الفت کئے جانے سے حاصل ہوتا ہے اگرچہ باہمی الفت ان دونوں سے افضل و بہتر ہے۔ تعریف و ثنا سے بھی یہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سیاسی رہنماؤں کو دیکھو جن کے کام کا دارومدار زیادہ تر دوسروں کی ستائش پر ہے۔ بچوں کے لئے اُن کے والدین کی الفت لابدی ہے۔ جس بچے کو بچپن میں والدین کی محبت نہیں ملتی وہ بہت جلد فنا و بقا اور تقدیر کے مسائل پر غور و خوض کرنے لگ جاتا ہے وہ بڑا ہو کر دُنیا کو جہنم تصور کرنے لگتا ہے اور اِس جہنم کو قابل سکونت بنانے کے لئے وہ خود ہی اپنے فلسفے کی ایک دُنیا بناتا ہے اور اپنے گھر یا اپنے کتب خانے میں گھسا رہتا ہے تاکہ وہاں اپنے خیالوں کے ساتھ مصون و مامون رہے۔ اگر اسے بچپن میں اُلفت ملتی تو وہ اہل دنیا سے زیادہ خود اعتمادی کے ساتھ دو چار ہو سکتا۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ الفتِ مطلوبہ مضبوط ہو نہ کہ پھسپھسی۔ اس لئے ماں باپ کو چاہئے کہ وہ اپنے بچے کو گلے سے نہ لگائے رکھیں، اُس کی آٹھوں پہر حفاظت نہ کرتے رہیں بلکہ صرف بقدر ضرورت اس کی مدد کر کے اس سے استعداد و خوبی پیدا کرنے کی توقع رکھیں۔ جس بچے سے اس کی ماں بہت زیادہ لاڈ پیار کرے گی وہ بیاہا جا کر اپنی بیوی سے بھی روز و شب لاڈ پیار چاہے گا اور عموماً اس کا نتیجہ میاں بیوی کا بگاڑ ہوگا۔ الفت میں مصیبت کے وقت ہمدردی اچھی ہے لیکن مصیبت آنے سے پہلے اُس کے متعلق ہمدردانہ خوف کا اظہار بُرا ہے۔ دوسرے کی طرف سے ڈرنا بھی اتنا ہی بُرا ہے جتنا خود ڈرنا اور الفت میں بہت زیادہ خاطر مدارات اُسی شخص کے لئے مفید ہوتی ہے جو دلیر اور قوی دل ہو۔ الفت ملنے کی ایک اور نہایت ہی مرغوب اور مسرت خیز صورت ہے اور وہ ہے جنسی الفت یعنی مرد عورت کی باہمی کشش۔ جس مرد یا عورت کو کسی عورت یا مرد کی اُلفت نہ ملے وہ کبھی اپنے کام میں منہمک یا مسرور نہ ہوگا۔ یہ الفت ملنے کی کیفیت تھی۔ الفت کرنے کی دو قسمیں ہیں ایک قسم انہماک کا اظہار ہوتی ہے دوسری خوف کا۔ جو الفت اس وجہ سے کی جائے کہ کوئی خوف دور ہو یا کوئی ناخوشی کم ہو وہ اس قدر حیات انگیز نہیں ہوتی جتنی وہ الفت جس میں ایک نئی خوشی کی توقع ہو۔ البتہ "انہماکی" الفت کی ایک مذموم شکل یک طرفہ الفت ہے وہ جس میں ایک شخص بیسیوں سے الفت پا کر اور گویا انہیں چوس کر اور بے جان کر کے خود کسی ایک سے بھی الفت نہیں کرتا۔ غرض بہترین الفت وہی ہے جو باہمی ہو، جو جانبین میں فطری طور پر پیدا ہو، جو محض ایک دوسرے کی بھلائی کی غرض سے قائم نہ کی جائے بلکہ جو ایک مرکب ہو جس کا نتیجہ خود بخود دونوں کی بہتری ہو کر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ شخص جو اپنی خودی کی چاردیواری میں محصور ہے خواہ وہ دنیا میں لاکھ کامیاب ہو، خواہ اُس کے پاس بے انتہا زر و مال کا خزانہ موجود ہو بغیر الفت پانے اور الفت کرنے کے کبھی زیادہ مسرور و شاد کام نہیں ہو سکتا۔ حال کے

کوئی شے دوستی سے زیادہ گراں بہا نہیں +

صحیح تنقیدی دوستی ایک نوع کی ربانی بصیرت پر مبنی ہوتی ہے +

عظیم الشان رفاقت صرف ایک عظیم الشان روح کا کام ہے +

حریت پسند نوجوان پرانی احتیاطوں اور نام نہاد نیکوکاریوں کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں کہ مرد اور عورتیں جنہیں ایک دوسرے کی کشش محسوس ہوتی ہے اس بات کے مجاز نہیں کہ ایک دوسرے سے فطری الفت و محبت کا اظہار کر سکیں۔ رسمی جنسی تعلقات بالعموم خشک و بے الفت ہوتے ہیں اور وہی جنسی تعلقات ترقیٔ انسان کے لئے بار آور ثابت ہو سکتے ہیں جن میں علیحدگی اور اور غلط حیاداری مطلق نہ ہو اور جس میں طرفین کی شخصیت ایک نئی مجتمع شخصیت میں مدغم ہو جائے۔ احتیاطیں اور معقول پر اچھی ہوں تو ہوں لیکن محبت میں احتیاط انسانی خوشی کے لئے عموماً زہر قاتل ثابت ہوتی ہے۔

جتنے ادارے پرانے زمانے سے چلے آتے ہیں ان میں اس وقت کوئی ادارہ اس قدر درہم برہم نظر نہیں آرہا جتنا کہ خاندان۔ خاندانی زندگی آج کل بجائے خوشی کے ناخوشی کا گہوارہ بن رہی ہے۔ جتنی ناخوشی اور کرب و اندوہ آج ایک گھرانے کے ارکان کے مابین نظر آرہا ہے کہیں اور نظر نہیں آتا (اور یہ ناخوشی مشرق میں ابھی کم نظر آتی ہے لیکن مغرب میں تو گویا خاندانی زندگی پر آفت ٹوٹ رہی ہے) لڑکے لڑکیاں ننھے بچیاں تک گستاخ ہو گئے ہیں۔ ماں باپ کا وہ اقتدار اور وہ اثر نہیں رہا جو پہلے تھا۔ اکثر گھروں میں وہ سکون و مسرت اور وہ امن و امان قائم نہیں رہا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ اس کے کئی سبب ہیں۔ عورتیں بیوی بننے اور بچے جننے کو وبالِ جان سمجھنے لگی ہیں کیونکہ اب وہ آپ اپنی روزی کما سکتی ہیں اور اس طرح محض خانہ داری کے انتظام اور بدمزاج اور اکھڑ نوکروں نوکرنیوں کے اہتمام سے نجات پا سکتی ہیں۔ ہر عورت جو آپ اپنی روزی کمائے آزاد ہوتی ہے جہاں چاہتی ہے جاتی ہے جو چاہتی ہے کرتی ہے اُسے کسی شوہر کی دلداری اور خاطر مدارات مقصود نہیں وہ مکان کی محتاج نہیں اسے بچوں کی گستاخی اور احسان ناشناسی سے واسطہ نہیں۔ اس کے برخلاف جو لوگ شادی شدہ ہیں وہ ان تمام مشکلوں میں گرفتار ہیں۔ انہیں نہیں معلوم کہ اپنے بچوں سے کیا توقع رکھیں کیا نہ رکھیں وہ بات بات میں جھجکتے ہیں کیونکہ والدین کے احکام یا خواہشات کی بجا آوری اب عقلی فیشن کے خلاف ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شادی شدہ اور خصوصاً سمجھدار شادی شدہ اولاد کی زیادہ خواہش نہیں رکھتے بلکہ ہر ممکن ذریعہ اختیار کرتے ہیں جس سے وہ اس "نعمتِ خداوندی" سے محروم رہیں۔ مغربی تمدن بانجھ ہو رہا ہے اگر یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں جب وہ ناپید ہو جائے گا۔ مذہبی آدمی بہتیرا چلاتے ہیں کہ اولاد روکنا گناہ ہے، خدائی احکام اور مشیتِ ایزدی کے خلاف ہے اس کا نتیجہ عذاب ہوگا اور مصیبتیں نوعِ انسان پر نازل ہوں گی لیکن وہاں کون سنتا ہے احکام اور مشیت پر اب کون کان دھرتا ہے کہ ان چیزوں کے زمانے ہو چکے۔ تاہم نفسیاتی مفکرین اور دوسرے رہنماؤں کو تشویش ہو رہی ہے کہ کس طرح اس صورتِ حالات کا تدارک کریں۔ وہ سمجھتے ہیں، کم از کم ان میں اعتدال پسند صاف صاف کہتے ہیں کہ عیالداری یا زیادہ صریح لفظوں میں خاندانی زندگی سے جو خوشیاں انسان کو حاصل ہو سکتی ہیں وہ دوسری سب خوشیوں سے زیادہ دلخوش کن اور پائدار ہوتی ہیں۔ رسل کو اس کا یقین واثق ہے اور ذاتی تجربہ ہے۔ رسل کی بیوی ڈورا رسل نے بھی اپنی تصنیف "خوش رہنے کا حق" میں اس کا اعتراف کیا ہے اگرچہ اس کی انقلاب پسندی جنسی آزادی کی زبردست حامی و مؤید ہے اور اس لئے وہ چاہتی ہے کہ شادی شدہ حالت میں بھی میاں بیوی کو انتہائی آزادی دی جائے جس میں وہ کھُلّم کھُلّا جو خود مناسب

سمجھیں کریں۔ رسل کہتا ہے کہ جوانی کے گزر جانے کے بعد اس دنیا میں خوش رہنے کا آسان ترین ذریعہ یہ ہے کہ انسان محسوس کرے کہ میں ایک تن تنہا فرد نہیں بلکہ زندگی کی بہتی ہوئی ندی کا جزو ہوں جو نہیں معلوم کب سے بہہ رہی ہے اور نہیں معلوم کب تک بہے جائے گی۔ تخلیق کی حس ہمیں اس ندی سے وابستہ رکھتی ہے۔ ہمیں اپنے بعد میں آنے والی دنیا سے دلچسپی رہتی ہے ہم یہ نہیں سمجھ لیتے کہ زندگی محض فضول ہے اور دنیا فقط فانی۔ ماں باپ کی محبت ایک خاص نوع کی انوکھی محبت ہے جو بچوں کو کسی اور سے کبھی میسر نہیں آسکتی اور اس محبت کا اثر طرفین کے لئے کارآمد ہے۔ والدین کی محبت بچوں کے لئے ایک بے غرض محبت ہوتی ہے مصیبت اور آفت کے وقت اس سے ایک ایسی تسکین ہوتی ہے اور ایک ایسا اطمینان ملتا ہے جو کہیں اور دستیاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن محبت کے تمام تعلقات میں پوری خوشی جب ہی حاصل ہو سکتی ہے کہ محبت دو طرفہ یکساں ہو۔ والدین بچوں سے محبت رکھتے ہیں تو بچوں کو بھی لازم ہے کہ والدین سے محبت رکھیں اگرچہ یہ توقع مشکل ہے اور غیر ضروری کہ بچے بھی والدین سے پوری اتنی ہی محبت رکھیں جتنی والدین بچوں سے رکھتے ہیں عیالداری کی مسرت کے دو وجوہ ہیں ایک یہ ہے کہ ہمارا وجود اور جسم وسعت پاتا ہے ہم اپنے آپ کو ایک دوسری شخصیت میں مجسم دیکھتے ہیں۔ دوسری یہ کہ اس میں طاقت اور نزاکت کا ایک نہایت نفیس امتزاج ہوتا ہے۔ والدین کے لئے ایک ننھے وجود کی حفاظت اور پرورش تکلیف سے زیادہ خوشی کا موجب ہے لیکن والدین کا یہ خواہش رکھنا کہ ہمارا بچہ ہمیشہ ہی ہماری حفاظت میں رہے وہ بڑا بھی ہو جائے تو ہم گویا اُس کی پرورش ہی کرتے ہیں بچے کے لئے غایت درجہ ضرر رساں ہے۔ دراصل یہ محض والدین کی قبضہ کئے رکھنے کی خواہش ہے اور فہیم اور صحیح محبت کرنے والے والدین کو چاہئے کہ وہ بچے کی شخصیت کو جلد سے جلد آزاد اور خود مختار ہو جانے دیں تاکہ اس میں خود اعتمادی پیدا ہو وہ اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونا سیکھے اور وہ دنیا میں خود کچھ کرنے کے قابل ہو +

عیالداری کی مکمل خوشی وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو بچے کی شخصیت کو عزت آمیز محبت کی نگاہ سے دیکھیں کہ اُن کو نہ غیر ضروری توقعات ہوں گی نہ خود غرضانہ خواہشات۔ اس قسم کی آزاد محبت سے جو دلی اور روحانی خوشی محبت کرنے والے کو ہو سکتی ہے۔ وہ جبر و قبضہ سے کبھی نہیں ہو سکتی لیکن اس کے یہ بھی معنی نہیں کہ والدین اپنے بچوں کے غلام بن جائیں۔ والدین کے لئے نری والدیت ہی زندگی نہیں اور جن ماں باپ پر بچوں کا زیادہ بوجھ پڑے گا جو بچوں کے لئے روز و شب کچھ نہ کچھ کرتے رہیں گے انہیں یقینی طور پر اپنی اولاد سے زیادہ توقعات وابستہ ہوں گی اور اس لئے ان کا اور ان کی اولاد کا باہمی تعلق کبھی دیر تک تسلی بخش نہ رہے گا۔ ماؤں نے جس طرح صدیوں سے اپنی ساری کی ساری عمریں اپنے بچوں اور اُن کے باپوں کی نگہداشت اور خاطر مدارات میں کاٹی ہیں وقت آگیا ہے کہ اب انہیں اس دن رات کی غلامی سے نجات دلائی جائے اور ایک ایسا طریقۂ عمل اختیار کیا جائے جس سے ماں اور باپ اور بچوں سب کی انفرادی خصوصیات اور قوتیں نشو و نما پائیں اور زندگی کے کاموں میں بروئے کار آئیں +

کام میں مشغولیت خوشی کا موجب ہے بشرطیکہ کام کا بوجھ زیادہ نہ ہو۔ کام کے بغیر نکمے امیروں کی زندگی اُن کے لئے

بیزاری اور بےچینی سے لبریز ہوجاتی ہے۔ کام کرنے سے بیزاری کا احساس دور رہتا ہے کیونکہ وہ بیزاری جو غیر دلچسپ کام سے بھی پیدا ہو اتنی بیزار کن نہیں ہوتی جتنی نری طبعی فراغت کی بیزاری۔ کام کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اِس سے کامیابی اور ترقی کے موقع دستیاب ہوتے ہیں اور انسان کی شخصیت جلا پاتی ہے۔ مقصد کا تسلسل پائدار خوشی کا ایک نہایت اہم اور ضروری جزو ہے اور یہ تسلسل عموماً کام ہی کے ذریعے سے حاصل ہوسکتا ہے۔ کام دو باتوں سے دلچسپ بنتا ہے اول مہارات کے استعمال سے دوم تعمیریت سے۔ ماہر آدمی ہمیشہ اپنے کام سے ایک خاص نوع کی خوشی پاتا ہے اور جب تک وہ ترقی کرتا رہے اُس کی خوشی بڑھتی رہتی ہے۔ مہارت کی لطف اندوزی ہوابازوں سے قلابازیاں لگواتی ہے اور کھلاڑیوں کو بعض اوقات جان پر کھیل جانا سکھاتی ہے۔ مغرب میں ستر ستر برس کے بوڑھے ماہرین سیاست ہو کر مسرور زندگی کے بامراد عاشق بنے رہتے ہیں۔ تعمیریت تباہ کاری کی بہ نسبت زیادہ پائدار خوشی پیدا کرتی ہے کیونکہ وہ مقاصد سب سے بڑھ کر تسکین دہ ہوتے ہیں جو انسان کو ایک کامیابی سے دوسری کامیابی کی طرف لے چلیں اور یہ بات کبھی تباہ کاری کو حاصل نہیں ہوسکتی۔ کسی بڑے تعمیری کام کے کرنے میں جو تسکین ہوتی ہے وہ زندگی کی سب سے بڑی خوشیوں میں شامل ہے اگرچہ بدقسمتی سے یہ تسکین صرف بڑے بڑوں کو میسر آسکتی ہے۔ طبیعات دانوں اور بعض ادبا و شعرا کی مسرت کچھ ان کی عام قدردانی کا نتیجہ ہوتی ہے اور کچھ اس وجہ سے ہوتی ہے کہ تخلیقی و طبع زاد کام خود بخود دل کو مسرور کردیتا ہے۔ کم از کم یہ ضرور ہوتا ہے کہ اُن کا کام ان کی ناخوشی کو کچھ نہ کچھ کم کردیتا ہے شیکسپیر اپنے کلام کے متعلق کہتا ہے کہ جب تک انسان سانس لے گا اور جب تک آنکھ دیکھے گی تب تک یہ بھی زندہ رہے گا اور اس میں شبہ نہیں کہ اس خیال سے اس کی کلفتوں میں کمی ہوتی تھی۔ اپنے ایک سانیٹ میں وہ کہتا ہے کہ اپنے دوست کے خیال نے زندگی کو میرے لئے قابل برداشت بنا دیا لیکن یہ نتیجہ غالباً دوست کے خیال سے نہیں بلکہ خود اُن عشقیہ نظموں ہی سے ظہور میں آیا۔ عام طور پر علم و ادب کے دائرے میں ناخوشی کا زیادہ دور دورہ ہے اور اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ بہت سے علما و ادبا کو اپنی قابلیت کے لئے مناسب موقع دستیاب نہیں ہوتے کبھی انہیں ایسا کام کرنا پڑتا ہے جو ان کی پسند کے مطابق نہیں ہوتا کبھی ایسا جو اُن کے ضمیر کے خلاف ہوتا ہے۔ اس سے اُن کی خودداری کو ٹھیس لگتی ہے اور بغیر خودداری کے اصلی خوشی بے انتہا عسیر الحصول ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ تعمیری کام صرف بڑے بڑوں کے نصیب میں نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے تعمیری کاموں میں بھی زندگی کی خوشیاں مضمر ہیں لہٰذا ہر شخص کو وہ کام کرنے کی کوشش کرنا چاہیے جس کی اُس میں صلاحیت ہو جس میں وہ دلچسپی لے سکے، جو وہ کسی انوکھے طریقے سے کرسکے اور یہ شرائط بہت سے معمولی کاموں میں پوری ہوسکتی ہے۔ بچوں کی پرورش، دستکاری کا کام، کسی قسم کی تصنیف یا تالیف، غرض بیسیوں معمولی معمولی کام ہیں جن کا ذکر کرنا انسان کے اپنے اور دوسروں کے لئے مفید اور موجب

زندگی مسلسل تجربے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ جو شخص زندگی سے لطف اٹھانا چاہے اسے تفتیش و دریافت میں منہمک رہنا چاہئے۔

تم کو جس کام کا ملکہ ہو صرف اُسی کے کرنے کی عادت ڈالو۔

مسرت ہو سکتا ہے۔+اس کے علاوہ بعض لوگوں کا رجحان ہے کہ وہ اپنی ساری زندگی کو بیک نظر دیکھ سکتے ہیں یعنی انہیں اپنی زندگی مربوط نظر آتی ہے اس کے برعکس بعض لوگوں کو اپنی زندگی پارہ پارہ دکھائی دیتی ہے۔جس میں الگ الگ بکھرے ہوئے واقعات ہوتے ہیں۔زندگی کو مجموعاً دیکھنے کی عادت خوشی کی معاون ہے اسی لئے ایک ایسا مقصدِ زندگی جو یکسانیت لئے ہوئے ہو عموماً زیادہ مسرت خیز ہوتا ہے۔

بے غرضانہ دلچسپیاں زندگی کی مصروفیت کا جزو ہوں تو زندگی میں خوش رہنا زیادہ آسان ہو جاتا ہے صرف رنج کے مفید کاروباری معاملات میں منہمک رہنا زندگی کو غیر دلچسپ بنا دیتا ہے۔اس سے انسان کے نفس میں بے کلی، کم اندیشی، تنک مزاجی اور عدمِ تناسب پیدا ہوتا ہے اور ان چیزوں سے تھکن پیدا ہوتی ہے اور تھکن پھر ان چیزوں میں اضافہ کر دیتی ہے جس کا آخری نتیجہ یقینی طور پر جسمانی ونفسی علالت ہوتا ہے۔جو لوگ کبھی کبھی اپنے کام سے بے پرواہو جاتے ہیں گویا جنہیں اپنے کام میں اونگھ جانے کی عادت ہے وہ بسا اوقات اپنا کام زیادہ خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتے ہیں وہ شخص جو کام ہو چکنے کے بعد اپنے کام کو بالکل بھلا دیتا ہے۔اپنا کام بدرجہا بہتر کرتا ہے اس شخص سے جس کا کام ہو چکنے کے بعد بھی اُس کے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔اس لئے لازم ہے کہ ہر کام کرنے والا ایسی باتوں سے بھی دلچسپی لینا سیکھے جن کو اس کے کام سے کوئی تعلق نہیں اور جن میں وہ قویٰ معطل رہتے ہیں جن پر کاروبار کی انجام دہی میں زور پڑے تفریحات تماشے، کھیل، کتب بینی، سیر وسیاحت اور سیبیوں اور ایسی باتیں تضیعِ اوقات کا موجب نہیں بلکہ ان میں دلچسپی لینے سے ہم نہ صرف اپنے کام کو بہتر سرانجام دیتے ہیں بلکہ ہمیں دنیا کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں اور ہماری زندگی زیادہ دل آویز ہمارا نفس زیادہ مکمل اور ہماری روح زیادہ حقیقت آشنا ہو جاتی ہے ہم پھر اس دھوکے میں نہیں پڑے رہتے کہ دنیا میں صرف دو ہی چیزیں ہیں ہم اور ہمارا کام+یوں دنیا کی ایک زیادہ صحیح تصویر ہماری آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ہمیں اس عجیب وغریب مقام میں صرف تھوڑا عرصہ رہنا ہے+اس تھوڑے عرصے میں ہم جتنا کچھ بھی دیکھ سکیں اچھا ہے۔کہیں تماشا دیکھنے کو جانا اور بعض منظروں کے دوران میں آنکھیں بند کئے رہنا کون سی عقلمندی ہے۔دیکھنے اور جاننے اور سمجھنے اور لطف اٹھانے کے جتنے موقع بھی ہمیں ملیں ہمیں اُن کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہئے۔یہاں رونے کی باتیں بھی ہیں ہنسنے کی چیزیں بھی ہیں تعجب کی حالتیں بھی ہیں، غرض رنگ رنگ کی کیفیتیں ہیں۔عقلمند آدمی کو چاہئے کہ ان چیزوں میں سے جتنی بھی ہو سکے وہ دیکھے

زندگی کے کئی مواقع جو زیادہ اہمیت نہیں رکھتے فی الحقیقت اہم ہیں کیونکہ عموماً ایسے ہی اوقات میں خوش طبعی بنپتی اور دوستی جلا پاتی ہے۔حسن ادب کا تقاضا ہے کہ ہم بڑی سے بڑی باتوں کو بھی تھوڑی دیر کے لئے بھول جائیں اس سے ہمارے اصولوں کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔

✓ ایک مکمل کتب خانے کے دریچوں سے ساری دنیا کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

✓ کائنات کی عظیم الشان وسعت اور عمق جس دل میں گھر کر جائے وہ کبھی زندگی سے بیزار نہیں ہو سکتا۔

اور اُن سے اپنی شخصیت کو مالا مال بنا دے۔ دُنیا کے اس ذرا سے کونے میں جس میں ہم رہتے سہتے ہیں ہم اپنے کاموں میں اس قدر منہمک و مستغرق ہو جاتے ہیں۔ اس قدر ہمہ تن توجہ اور ہمہ تن اضطراب ہو جاتے ہیں کہ ہمیں کسی اور شے کی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ جد و جہد کی زندگی کے پجاری ہمیں بتاتے ہیں کہ اس طریقے سے ہم زیادہ کام کر سکتے ہیں ہاں زیادہ کام شاید کر لیتے ہوں لیکن اس طریقے سے ہم بہتر کام نہیں کر سکتے۔ انسان اس دُنیا میں کیا اک ذرا سا کیڑا ہے اور یہ دُنیا نظامِ شمسی میں کیا اک ذرا سا خطہ ہے اور نظامِ شمسی کائنات میں کیا اک ذرا سا ذرہ ہے! یہ باتیں ہم کو بھول نہ جانی چاہئیں اور وہ شخص جو صرف اپنے کام میں روز و شب منہمک ہے بھول جاتا ہے کہ اُس کے کام کی اہمیت جتنی وہ سمجھتا ہے اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ تمدنِ حاضر کی تعلیم اس بارے میں ناقص ہے متمدن انسان کسی قسم کی مخصوص مہارت حاصل کر لیتا ہے اور اُسی میں غرق ہو جاتا ہے۔ اُس کا نفس اور اُس کا دل وسیع نظری سے وسعت نہیں پکڑتے۔ وہ کسی کونسل کی رُکنیت کے لئے امیدوار بنتا ہے تقریریں کرتا ہے لوگوں کی خاطر مدارات کرتا ہے۔ اپنے مخالفین پر نکتہ چینی کرتا ہے جھوٹے سچے وعدے کرتا ہے، کسی قوم کی برائی کرتا ہے، کسی بُرے جذبے کو ابھارتا ہے ان ذرائع سے وہ غالباً کامیاب تو ہو جاتا ہے اس کا فوری مقصد اسے حاصل ہو جاتا ہے لیکن کم از کم تمدن کے انتہائی مفاد کو اس سے ایک سخت صدمہ پہنچتا ہے اس کے برخلاف اگر اُسے خیال ہو کہ زمین کیوں کر کروڑوں سالوں میں اپنی موجودہ حالت میں آئی، انسان کیوں کر لاکھوں سالوں میں انسان بنا ساری کائنات کتنی بڑی اور حیرت انگیز ہے۔ ہماری دُنیا کتنی چھوٹی اور ہم کیسے معمولی وجود ہیں تو وہ اپنے جنگ و جدل کی مساعی میں زیادہ وسعتِ نظر اور زیادہ عاقبت بینی سے کام لے سکے اُس کے سامنے ایسے مقاصد اور اک ایسا نصب العین قائم ہو جائے جن کے ہوتے ہوئے اُس کا نفس ایک نوع کی پائدار خوشی سے روز بروز زیادہ مضبوط اور مطمئن ہوتا جائے نوجوانوں کی تعلیم کس قدر بہتر و بار آور ہو اگر اپنی تعلیم سے وہ اُدھر تو یہ محسوس کریں کہ زندگی اس سیارے پر محض ایک عارضی حادثہ ہے اور ادھر یہ سمجھ لیں کہ ہر روز کتنی کچھ جدت اور کتنی کچھ عظمت کی قابلیت رکھتا ہے! وہ شخص جس کی رُوح میں ترقی کی صلاحیت ہے اپنے نفس کے دریچے کھلے چھوڑ دیتا ہے کہ شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کی ہوائیں کائنات کے کونے کونے سے اُس کی بند کوٹھڑی میں خوب چلیں اور وہ اس سے لُطف اٹھائے اور اپنا آپ بڑھائے۔ وہ شخص جس کا نفس دُنیا کا آئینہ ہے اُس کا نفس دُنیا ہی کی طرح وسیع ہو جاتا ہے۔ نشیب و فراز زندگی میں اسے ایک نوع کا اطمینان حاصل رہتا ہے جو گویا اس کا باطنی رفیق و مددگار ہے۔ ہر فردِ بشر کی زندگی میں ایسے وقت آتے ہیں جب مصیبتیں چاروں طرف سے ٹوٹ پڑتی ہیں جب ہر درست شے گویا غلط ہو جاتی ہے، روپیہ لٹ جاتا ہے، عزیز مر جاتے ہیں، دوست رفوچکر ہو جاتے ہیں، کام بے مزہ ہو جاتا ہے ایسے وقتوں میں کسی اور بات میں جی کو لگا سکنا ایک نعمت ہے جو بسا غنیمت ہے۔ کوئی ایسے آڑے وقت میں شطرنج کھیلنے لگ جائے گا، کوئی سراغ رسانی کے افسانے سنے گا، کوئی ستاروں کی حرکات میں دلچسپی لے گا، کوئی کلدانیوں کے کھنڈروں کے حالات پڑھے گا۔ غرض کوئی کسی چیز سے اپنا جی بہلائے گا کوئی کسی چیز سے اور یہ سمجھ داری اور دُور اندیشی ہے تکلیف، مصیبت، موت، انسانی زندگی میں ان کا دور دورہ تو ہو کر رہے گا۔ یہ غیر اغلب نہیں کہ انسان پر مصیبت کا ایسا پہاڑ ٹوٹ پڑے

کہ اُس کا دل پاش پاش ہوجائے لیکن دل کے ان ٹکڑوں کو پھر بھی جوڑنا یہ ہے عقلمند اور دور اندیش انسان کا کام۔ ایک دوسرا طریقہ ہے اپنی تکلیفوں کو بھولنے کی کوشش کرنا افیم اور شراب اور رندی سے لیکن یہ فقط اپنی روح کو برباد کرنا ہے البتہ بعض نامساعد حالات میں مختلف باتوں میں اپنے جی کو لگا لینا جو اگر مفید نہ ہوں تو کسی کے لئے ضرر رساں بھی نہوں بلاشبہ مفید اور کارآمد ہے کیونکہ اس سے زندگی کی ندی محض ایک بدررو ہو جانے سے بچ جاتی ہے اور اس کا بہاؤ اور اُس کی وسعت کم ہونے نہیں پاتی +

سعی و تسلیم کا صحیح امتزاج زندگی کے توازن کے لئے ضروری ہے۔ اعتدال کا نظریہ جو زندگی کے اکثر مرحلوں میں صحیح رہنمائی کا کام دیتا ہے اس باب میں بھی ہماری نفسی مشکلات کا بہترین حل ہے۔ ایک حد تک پوری کوشش کرو اور پھر قسمت پر چھوڑ دو اور سر تسلیم خم کر دو۔ انسان کا اولین فرض سعی اور جدوجہد ہے۔ دنیا کی معاشرت کا ایسا انداز ہے کہ یہاں روٹی بھی بغیر ہاتھ پاؤں ہلانے کے میسر نہیں آتی۔ اور تو اور فریب کار فقیروں کو بھی اپنی روزی کمانے کے لئے سو ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ دنیائے حاضر کی مقابلہ بھری زندگی میں کوشش کے بغیر گزارہ نہیں۔ رفیق زندگی کے حصول میں بچوں کی پرورش میں کسی قسم کی بہتری کے حصول میں، غرض زندگی کے ہر شعبے میں توجہ اور کوشش کی ضرورت ہے مثلاً قوت جو زندگی کی بہترین خواہشات میں سے ہے اور جن کے حصول سے وہی شخص بے پرواہ ہوتا ہے جو اپنے ہم جنسوں سے بے پرواہ ہو کوشش بلکہ طویل کوشش ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اُدھر تسلیم خوشی کے حصول کا ایک لازمی ذریعہ ہے عقلمند آدمی مناسب کوشش کرنے کے بعد نتیجہ مستقبل پر چھوڑ دیتا ہے جو ہو سو ہو کہہ کر سکون و آرام کے مزے لیتا ہے تسلیم یاس انگیز نہ ہونی چاہئے۔ یقین میں ان خیالات کا دور دورہ نہ ہونا چاہئے کہ انسان تو محض ہیچ ہے اور تدبیر قطعاً لاحاصل ہے اور تقدیر ہی ہے جو ہے اور انسان کی اصل زندگی تخیلات اور غور و خوض و مراقبہ میں مضمر ہے نہیں بلکہ صحیح تسلیم میں ایک ناقابل تسخیر امید کی ایک ہمہ گیر غیر ذاتی امید کی روشنی پر تو افگن ہونی چاہئے۔ اگر انسان کی ذاتی توقعات میں نوع انسان کی غیر ذاتی عالمگیر امیدوں کی آمیزش ہو گی تو مصیبت و نکبت کبھی آکر اُس کی رُوح کو ہمیشہ کے لئے بیکار نہ کر سکیں گی۔ ایک ایسا موجد جسے اپنی ایجاد میں ہزاروں مشکلوں کا سامنا ہو جسے بالآخر اپنے تجربے چھوڑ کرنا کامی کا منہ ہی دیکھنا پڑے اگر اُس نے زیادہ تر علمی ترقی کی خاطر تکلیفیں جھیلی ہیں اور کوششیں کی ہیں تو ناکامی اُسے کبھی قطعاً مایوس نہ کر دے گی لیکن اگر اُس کا مُدعا

بغیر جدوجہد اور مسلسل مشغولیت کے زندگی سے لُطف اٹھانا ممکن نہیں۔

ذاتی کوشش علم کوشش کے ماحول میں پھولتی پھلتی ہے اگر تم اچھی طرح زندگی گزارنا چاہتے ہو تو دیکھو کہ کس طرح دوسروں نے خوبی کے ساتھ اپنی زندگی گزاری

خزانے بغیر کوشش کے شاذ و نادر ہی دستیاب ہوتے ہیں +

ہم انسانوں کا رستہ تاریکیوں میں سے ہو کر گزرتا ہے، لیکن ہماری آنکھیں تاروں پر لگی ہوئی ہیں +

محض حصولِ زر تھا تو نتیجہ دگرگوں ہوگا۔ بعض لوگ زندگی کی معمولی معمولی تکلیفوں میں بے صبر و بے تاب ہو جاتے ہیں۔ اگر ریل وقت پر چھوٹ جائے اور وہ اس میں سوار نہ ہو سکیں تو وہ غصے سے بے تاب ہو جاتے ہیں اور زمین پر پاؤں دے دے مارتے ہیں۔ کھانا ذرا خراب پکا ہو تو وہ نوکروں کے لئے قیامت برپا کر دیتے ہیں۔ اُن کی انگیٹھی دھواں دینے لگے تو وہ مایوسی سے مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسے زود رنج آدمی اُس توانائی کو محفوظ رکھیں جو وہ اس طرح بے موقع بے ضرورت ضائع کرتے رہتے ہیں تو شاید وہ ملک کے ملک فتح کرلیں اور خدا جانے کیسی کیسی اور مہمیں نہ سر کرلیں۔ سمجھدار آدمی خیال ہی نہیں کرتا کہ ملازم نے ایک تپائی پر سے گرد کیوں نہیں صاف کی، باورچی نے ایک آلو نیم پخت کیوں چھوڑ دیا، خاکروب نے چالیس پچاس تنکوں پر اپنی جھاڑو کیوں نہیں پھیری یعنی ایسی چیزوں کا جب وہ تدارک کرتا ہے تو بغیر جذبے اور جوش کے کرتا ہے۔ ذرا ذراسی بات پر تشویش، ذرا ذراسی چیز پر غصہ لاحاصل ہے، ضرررساں ہے بلکہ مضحکہ خیز ہے۔ جو کہتے ہیں کہ یہ ان کے بس کی باتیں نہیں وہ ان باتوں میں تسلیم کی خو ڈالیں پھر دیکھیں کہ کیوں کر بڑی اور چھوٹی سب باتوں میں اُن کا نفس زیادہ مطمئن اور خوش رہتا ہے پھر لوگوں کی عجب عادتوں پر انہیں محض ہنسی آئے گی۔ پھر کسی دعوت پر جاتے وقت اگر اُن کے بوٹ کا تسمہ کھل جائے گا یا ٹوپی کا پھندنا لوٹ جائے گا تو وہ سمجھیں گے کہ کائنات کی تاریخ میں کوئی ایسا اہم واقعہ ظہور پذیر نہیں ہو گیا جس کا دُور تک اور دیر تک اثر پڑ گیا ہو۔ چھوٹی چھوٹی تکلیفیں ظریفانہ خیالوں اور مذاقیہ مثالوں سے آپ سے آپ اڑان چھو ہو جاتی ہیں۔ یہ اچھا نہیں کہ ہم دن بھر اپنے آپ کو ایک الم انگیز داستان کا مصیبت زدہ ہیرو تصور کئے رہیں۔ ہر حالت کے لئے مناسب اور بہتر بن رویہ اختیار کرنا ذرا عقل و تجربہ چاہتا ہے اور عقل و تجربہ سے ظاہر ہے کہ جب تک انسان میں کچھ نہ کچھ تسلیم کی عادت نہ ہوگی وہ اکثر فکر و تشویش کا شکار بنا رہے گا۔ بعض سعی پسندوں کو وہم ہے کہ تسلیم کی عادت کامیابی کے لئے مفید نہیں کیونکہ وہ توانائی کی راہ میں روڑا اٹکاتی ہے یہ غلط ہے کام کام کے متعلق دھوکے میں پڑے رہنے سے بہتر سر انجام نہیں ہو جاتا، نا سے مشکل تصور کرنے سے وہ آسانی سے ختم ہو جاتا ہے وہ کام جس کے کرنے میں اپنے آپ کو سارا وقت اکسلاتے رہنا ضروری ہو مفید ہے لیکن مضر بھی ضرور ثابت ہوگا اس کے برخلاف ایسا کام جس کے کرنے سے پہلے یا کرتے وقت انسان اونچ نیچ کو خوب سوچ سمجھ لے کبھی مایوسی یا غلط فہمی کا موجب نہیں ہو سکتا +

غرض ہم دیکھ چکے ہیں کہ خوشی کا انحصار دو باتوں پر ہے دُنیا کے بیرونی اسباب پر اور انسان کے اپنے رویہ پر۔ خوشی کے لئے جس نسخے کی ضرورت ہے وہ بالکل سادہ ہے (بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے لئے ایک خاص قسم کے مذہبی اعتقاد کی ضرورت ہے۔ مذہب

صحیح قسم کی حقیقت بینی کا لازمی نتیجہ صحیح قسم کی تصوریت ہے +

اس سے بڑی غلطی کوئی نہیں کہ ہم سمجھ بیٹھیں کہ زندگی سنجیدہ ہی ہمیشہ سنجیدہ ہے اور محض سنجیدہ ہے کسی نے خوب کہا ہے کہ یہ دُنیا تو ایک تماشا گاہ ہے۔

مذہب انسانی تمدن کا ایک لازمی جزو ہے۔ وہ فریب کاری کے کہر کو دُور کر دیتا ہے اور حقیقت بینی اور مسرت کو دو چند کر دیتا ہے

انسان کے لئے کہاں تک ضروری ہے وہ کیسا ہو کیسا نہ ہو یہ ایک دوسرا سوال ہے لیکن محض خوش رہنے کیلئے مذہب پر اعتقاد مذہب پر اعتقاد نہیں بلکہ سوداگری ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اُن کی مصیبتوں اور غموں کے اسباب نہایت پیچیدہ اور "عقلی" ہیں۔ یہ سب فضول ہے۔ ناخوش آدمی عموماً ایک غم انگیز فلسفے یا یاس خیز خیالات پر یقین کرلیتا ہے اور مسرور انسان خود بخود خوشی کا مذہب اختیار کرتا ہے۔ بعض چیزیں اکثر لوگوں کی خوشی کے لئے لابدی ہیں مثلاً خوراک، مکان، صحت، محبت۔ کام میں کامیابی، دوسروں میں عزت، بعضوں کے لئے بچے بھی ضروری ہوتے ہیں۔ جہاں یہ چیزیں نہ ہوں وہاں صرف ایک غیر معمولی آدمی خوشی حاصل کر سکتا ہے لیکن یہ چیزیں میسر ہوں اور پھر بھی آدمی ناخوش ہو تو وہ یقیناً کسی قسم کی نفسی بے ترتیبی کا شکار ہے جس کا علاج اگر وہ معمولی سمجھ کا مالک بھی ہو تو خود کرسکتا ہے۔ جہاں بیرونی حالات خاص طور پر ناموافق نہ ہوں وہاں خوشی کا حصول بآسانی ہوسکتا ہے بشرطیکہ انسان کے جذبات اور دلچسپیوں کا رجوع باطن کی طرف نہ ہو بلکہ خارج کی طرف۔ اس لئے تعلیم اور ہماری ذاتی مساعی کا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے خود اندیش جذبات وشہوات مثلاً خوف، حسد، گناہ احساسی، خودپسندی کو روکیں تاکہ ہم اپنی ذات یا اپنی ہی شخصیت کے اندر نہ گھرے بیٹھے رہیں بلکہ دنیا اور کائنات سے ایک صحیح اور پائدار واسطہ پیدا کریں۔

مسرور انسان وہ ہے جس کی زندگی کو زیادہ تر دوسروں سے واسطہ ہو، جس کی الفتیں آزاد اور جس کی دلچسپیاں متنوع ہوں، جس سے دوسرے اُس کے لئے اور وہ دوسروں کے لئے ایک دل آویز وجود بن جائے۔ الفت کئے جانے سے خوشی حاصل ہوتی ہے لیکن عام طور پر الفت ملتی بھی اُسی کو ہے جو خود الفت کرے بشرطیکہ وہ شروع سے لین دین کی طرح الفت سے تجارت نہ کرے۔ سوال یہ ہے کہ ایک انسان کو جو ناخوش ہو کیا کرنا چاہئے؟ ایک ناخوش آدمی جب تک اپنی ناخوشی کے خیال میں غرق رہے فی الحقیقت اپنے آپ میں غرق رہتا ہے۔ اگر وہ خود اندیشی اور ناخوشی سے رہائی چاہتا ہے تو اسے غیر مصنوعی طور پر بیرونی دلچسپیوں میں مصروف ہونا چاہئے۔ اگر وہ گناہ احساسی کا شکار ہے تو اسے اپنے آپ کو سمجھانا چاہئے کہ میں نے کوئی ایسا گناہ نہیں کیا جس سے میری روح تباہ ہوگئی ہو۔ اگر وہ اپنے آپ کو بہت بدقسمت سمجھتا ہے تو اُسے غور کرنا چاہئے کہ وہ کچھ اتنا بدبخت نہیں جتنا اُسے وہم ہے اگر وہ خوف سے کانپتا ہے تو اسے نڈر بننے کی مشق کرنی چاہئے۔ ناخوش آدمی کو کئی قسم کی روزانہ مشقوں کی ضرورت ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ ہر روز کم از کم اپنی ایک کمی کا جی میں اعتراف کرلیا کرے۔ البتہ ناخوش آدمی کو کمیوں کے اعتراف کے ساتھ اپنی خوبیوں پر اصرار بھی کرنا چاہئے مثلاً وہ اپنے جی سے کہے کہ میں جو ان دو ایک باتوں میں فلاں شخص سے بہتر ہوں اگر ان دو ایک باتوں میں اس سے فروتر بھی ہوں تو میری زندگی اس سے کچھ ایسی خراب نہیں ہوگئی۔ اس قسم کی روزانہ مشقیں اگر برسوں تک جاری رکھی جائیں تو انسان یقیناً زیادہ دلیر اور زیادہ خوش ہوسکتا ہے۔

کونسی بیرونی چیزیں اور دلچسپیاں ہیں جن میں تم کو مصروف ہونا چاہئے؟ اس سوال کا جواب خود تمہاری فطرت کا میلان اور تمہارے حالات مہیا کریں گے۔ ابتدا ہی میں اپنے آپ کو یوں نہ کہو کہ "میری زندگی خوب مزے میں گزرے اگر میں ٹکٹ جمع کرنے شروع کردوں" اور پھر لگو ٹکٹ جمع کرنے۔ اس طرح کی جھوٹ موٹ مسرت جوئی سے مسرت حاصل نہ ہوگی۔ دلچسپی ہمیشہ غیر مصنوعی اور اصلی ہونی چاہئے جس میں نفس حقیقتاً مصروف ہو۔

رسل کہتا ہے کہ ایک مسرور زندگی عموماً حیرت انگیز حد تک ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ ایک نیکوکار زندگی۔ اخلاقی واعظین ایثار پر بہت زور دیتے ہیں۔ جو شخص اپنے ایثار سے آگاہ ہو وہ اپنے آپ میں منہمک اور اپنے ایثار کے خیال میں غرق رہتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ اس کا فوری اور نہ اس کا انتہائی مقصد حاصل ہوتا ہے۔ ضرورت ایثار کی نہیں بلکہ دلچسپیوں کو اس طرح بیرونی اشیا کی طرف مبذول کرنے کی ہے کہ ایک انسان خود بخود بے جانے ایسے کام کرتا ہے جو ایک "نیکی پیشہ" سمجھ سوچ کر کرتا ہے۔ عام واعظ نیکی کے کام پر زیادہ زور دیتا ہے لیکن نیکی کی نیت پر کم توجہ کرتا ہے۔ اسی طرح وہ ایثار ذات پر زیادہ زور دیتا ہے۔ فقط ذات پر کم۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ محبت بے غرضانہ ہونی چاہئے۔ بے شک محبت کا ایک حد تک بے غرضانہ ہونا اچھا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم دوسروں کو اسی طرح مسرور بنا سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو مسرت سے محروم رکھیں۔ ذات اور ایثار ذات کا سارا جھگڑا مٹ جاتا ہے اگر ہم لوگوں کی زندگی ہیں، اگر ہم دُنیا کی مختلف چیزوں میں نیک نیتی سے اور غیر مصنوعی طور پر دلچسپی لیں۔ ایسا کریں گے تو ہم خود بخود دریائے زندگی کی ایک اٹھتی ہوئی موج بن جائیں گے اور ہم محض ایک الگ تھلگ پڑی ہوئی گیند نہ ہوں گے جسے میدان ہستی میں کسی سے کچھ سروکار نہیں +

ہر قسم کی ناخوشی کسی نہ کسی بے ترتیبی، کسی نہ کسی تخریب، کسی نہ کسی نامطابقت کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے یا تو ایک بے ترتیبی و تخریب اپنے نفس کے اندر، ایک لڑائی سی اپنے آپ سے یا ایک نامطابقت اپنے اور دوسروں کے درمیان جو منتشر مفاد اور باہمی الفت کی عدم موجودگی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مسرور انسان وہ ہے جس کے نفس میں اس قسم کی کوئی خرابی نہ ہو، جس کی شخصیت نہ اپنے اندر مشوش ہو نہ دوسروں سے برسرپیکار۔ ایسا انسان اپنے آپ کو کائنات کا باشندہ سمجھتا ہے۔ وہ اُس کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اُس کی خوشیوں سے مسرور، اُسے موت کی فکر نہیں ہوتی کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ اور اُس کے بعد میں آنے والے لوگ دراصل ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے وابستہ و متحد ہیں اس سے وہ جُدا ہے نہ اُس سے وہ الگ۔ ایسے ہی سچے اور گہرے باہمی اتحاد میں دُنیا کی سب سے پائدار خوشیاں جلوہ گر ہیں +

بشیر احمد

ہنسو اور موٹے ہو جاؤ یہ تھا پرانا مقولہ۔ نیا فلسفہ ہے ہنسو اور نیک بن جاؤ۔

ہر شخص سے کچھ نہ کچھ حاصل ہو سکتا ہے عقلمند آدمی جہاں سے جو کچھ حاصل ہو سکے سمیٹ لیتا ہے +

مے دو آتشہ

حکیم عمر خیام کی بعض مشہور رباعیوں کے ترجمے

عمر خیام

دورے کہ درو آمدن و رفتن ماست آنرا نہ بدایت نہ نہایت پیداست
کس می نہ زند دمے دریں معنی راست کایں آمدن از کجا و رفتن بہ کجاست

ترجمہ

یہ دہر کہ اپنی آمد و شد ہے جہاں ہے اُس کی بدایت بھی نہایت بھی نہاں
اے کاش! کوئی یہ عقدہ حل کر سکتا آئے ہیں کہاں سے اور جانا ہے کہاں

عمر خیام

دریاب! کہ از روح جدا خواہی رفت در پردۂ اسرارِ فنا خواہی رفت
مے خور کہ ندانی ز کجا آمدۂ خوش زی کہ ندانی بہ کجا خواہی رفت

ترجمہ

جانا ہے، تجھے یہاں سے ہاں جانا ہے آیا ہے تو بے شبہ و گماں جانا ہے
مے پی کہ نہ آگہ ہو، کہاں سے آیا خوش جی کہ نہ واقف ہو، کہاں جانا ہے

عمر خیام

بر سینۂ غم پذیرِ من رحمت کن بر جان و دلِ اسیرِ من رحمت کن

بر پائے خرابات رو من بخشائے　　بر دستِ پیالہ گیرِ من رحمت کن

ترجمہ

اِس سینۂ غم پذیر پر رحمت کر　　اِس جانِ الم اسیر پر رحمت کر
اِس میکدہ رو پاؤں کو دوزخ میں نہ جھونک　　اِس دستِ پیالہ گیر پر رحمت کر

عمر خیام

مے نوش کہ عمرِ جاودانی این است　　خود خاصیتِ دورِ جوانی این ست
ہنگام گل و مل است و یاراں سرمست　　خوش باش دمے کہ زندگانی این ست

ترجمہ

مے پی کہ حصولِ کامرانی ہے یہی　　خوش جی کہ حیاتِ جاودانی ہے یہی
بے خوف مے و نغمۂ شاہد میں گزار　　کھُل کھیل کہ اصلِ زندگانی ہے یہی

عمر خیام

یارب! تو گلم سرشتۂ من چہ کنم　　پشم و قصبم تو رشتۂ من چہ کنم
ہر نیک و بدے کہ از من آمد بہ وجود　　تو بر سرِ من نوشتۂ من چہ کنم

ترجمہ

یارب! مری کیا خطا ہے، میرا کیا جرم　　ناحق یہ سرِ سزا ہے، میرا کیا جرم
ہر لمحہ مری ذات سے عصیاں کا صدور　　تیرا ہی لکھا ہوا ہے، میرا کیا جرم

آزاد انصاری

نالدیرہ

شملے سے مشوبرہ، مشوبرے سے نالدیرہ کسی زمانہ میں کافی کٹھن منزل تھی۔ موٹر نے (جسے شملہ میں میسر ہو سکے) اس کٹھن گھاٹی کو کھیل بنا دیا ہے۔

مشوبرے داخل ہوتے ہی وہ خوشنما باغیچے نظر آتے ہیں جن پر جا بجا شدومد سے اعلان ہے "Private Grounds" بعض دلفریب کونوں پر جلی حروف سے پک نک (Picnic) کرنے والوں کو قانونی دھمکیاں ہیں۔ اف رے غرورِ ملکیت! زر ہو کہ زمین ہو کہ زن ہو مالک پھولا نہیں سماتا۔ "میری چیز ہے، خبردار کوئی ہاتھ نہ لگائے" یہ ہے شخصی ملکیت کا آئین و مذہب۔

Private Grounds کے ناپرائیویٹ حسن سے مسحور نالدیرہ کی طرف انسان بڑھا چلا جاتا ہے۔ رستے میں ایک خطہ ہے جہاں خزاں کی ملکہ نے سبز پتوں سے زمردی وردی اتروا کر سنہری اور ارغوانی وردی کی شان دکھائی ہے۔ ہائے خزاں کی بہار انسان دیکھتے کا دیکھتا رہ جائے۔ خدا سمجھے ان جفا پیشہ ادیبوں سے جو محض زورِ قلم سے خزاں جیسی پری کو بدنام کرتے ہیں۔ میں خزاں کو کبھی بُرا نہیں کہتا۔ اس جادو کی ملکہ کا میرے سر پر احسان ہے۔ سیاہی لے گئی ہے سفیدی دے گئی ہے۔ لوہے کے بدلے چاندی۔

موٹر جوں جوں آگے بڑھتی ہے خوف کے مارے دل میں دعائیں یوں چمکتی ہیں جیسے ریت میں ذرّے۔ تنگ سڑک جب کسی ٹکر پر بائیں ہاتھ کو اوجھل ہو جاتی ہے اور سامنے ایک عمیق کھڈ منہ پھیلائے موٹر کو ہڑپ کرنے کے لئے طیار دکھائی دیتا ہے تو خواہ مخواہ منہ سے نکلتا ہے "آہستہ، روکو" جو ذرا اس سے بھی زیادہ دل کو دہلانے والا موقع ہو یعنی سڑک تنگ ہو، پہاڑ بائیں ہاتھ ہو، مڑنا دائیں طرف کھڈ کی جانب ہو اور عین وہیں کھڈ کی طرف نہ جنگلا نہ پتھر کی دیوار اور ہو باریک سا کونا تو زبان کہے یا نہ کہے دل کہتا ہے

"اے خدا بچانا"

دعا کی ایجاد غالباً کشتی کے سفر سے ہوئی۔ کشتی کھیتے وقت ہر ناخدا خدا کو یاد کرتا ہے۔ جو زیادہ خوش عقیدہ ہیں وہ پیر دستگیر کا نام لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جب تک سفر ہے اور سقر ہے دعا زبانوں سے مٹ جائے تو مٹ جائے دلوں میں ضرور گونجتی رہے گی۔

نالدیرہ آ گیا۔ بنگلہ پہاڑ کے پہلو میں ہے۔ مختصر سا ٹیلا ہے درخت البتہ شاندار ہیں اور خصوصیت یہ ہے کہ سفر

کہیں نظر نہیں آتا۔ درختوں کے نیچے ہری ہری دوب کی عجب بہار ہے۔ چوٹی پر ایک دوسرے سے ملے ہوئے کئی تنگ کئی فراخ ناہموار سے مرغزار ہیں۔ پانی نہیں ہے ورنہ یہ خیال ہوتا کہ قدرت شالامار بناتے بناتے کسی اور کام میں لگ گئی۔ علاوہ ڈاک بنگلے کے ایک چھوٹا سا خوشنما Pavilion ہے۔ انگریزوں نے یہاں Golf Course بنایا ہے شوخ و شنگ مسیں بانکے بانکے گھوڑوں پر سوار شملہ سے اڑتی ہیں یہاں آنکلتی ہیں۔ کھیلتی ہیں کھاتی ہیں حسینوں کی شوخی کے لئے نالدیرہ مقناطیس ہے۔

میں نالدیرے کیوں آنکلا؟ دنیا میں دو چیزیں عنقا ہیں، ایک تنہائی دوسرے خموشی۔ ان کی تلاش میں۔ موٹر، نوکر نیچے رہ گئے۔ میں اس فراخ چوٹی کی سیر میں مصروف ہوا۔ ایک پہاڑی لڑکا آنکلا۔ مجھے اور موٹر کو دیکھ کر آیا۔ غالباً وہ Golf کھیلنے والوں کے ساتھ Caddy کا کام کرتا ہوگا۔ اسے ایک دونی دی اور کہا کہ بھاگو وہ چلا گیا۔ تنہائی تھی مگر خموشی نہ تھی۔ پہاڑی کوّے چلاّ چکتے تو کم بخت جھینگر اپنی نہ تھمنے والی سیٹی شروع کر دیتا۔ خدا خدا کر کے شاید دو ثانیے کامل خموشی نصیب ہوئی۔ کان جب مایوس ہو گئے تو آنکھوں کی باری آئی۔ دور بہت دور سربہ فلک برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ نظر آئے۔ برف سے لدے ہوئے پہاڑوں پر پھرا ہوں۔ برسوں سے دیکھنے کا عادی ہوں مگر یہ نظارہ کچھ اور تھا۔ ابر کا نام نشان نہ تھا۔ سورج کی شعاعیں اپنی پوری طاقت سے برف کو سیماب بنا رہی تھیں۔ برف پوری دلی محبت سے ان شعاعوں کو سمیٹ رہی تھی پھیلا رہی تھی۔ دنگ رہ گیا۔ خدا جانے فطرت نے کیوں یہ کئی سو میل لمبا تین میل بلند شاندار بجلی کے لمپوں کو مات کرنے والا لمپ دن کے وقت روشن کر رکھا تھا۔ کیا فطرت کو بھی عشق کا مرض ہے؟ کہاں آفتاب کہاں برف مگر فطرت ان دونوں کا عقد کر کے مزہ لے رہی ہے۔

جن لوگوں کو پہاڑوں سے عشق ہے وہ آبادیوں سے بھاگتے ہیں اور ہونا بھی یوں ہی چاہیئے۔ آبادیوں کے رہنے والے زمین کے شیدائی۔ ان میں جو سب سے بڑا وہ سب سے بڑا زمیندار۔ پہاڑ زمین سے باغی۔ آبادیوں میں رہنے والے ترتیب کے متوالے۔ اُن کے ہر بات کے متعلق قاعدے ہیں۔ سڑکیں سیدھی، گھر چوکونے، کمرے گول، چارپائیاں مستطیل۔ پہاڑ بے ترتیبی کی زندہ تصویر، اونچے، نیچے، ٹیڑھے کہیں پتھر کہیں پھول کہیں بے پھل کے درخت اور کہیں بے پانی کی ندی اے باغی پہاڑو! تمہارے طفیل نالدیرے میں مجھ سے دو نیک کام ہوئے ایک یہ کہ بنگلہ میں قدم نہ رکھا اور دوسرا یہ کہ نالدیرے کی چوٹی پر سگرٹ نہ جلایا۔ اس لطیف پاکیزہ ہوا کو سگرٹ کے دھوئیں سے زخمی کرنا میری حسن پرست طبیعت کے لئے قتل سے بدتر جرم تھا۔ آبادیوں میں جہاں ہوا کثیف ہے اور دل پتھر ہیں کافی سگرٹ جلاتا ہوں۔ نالدیرے میں نہ سگرٹ جلایا نہ خود جلا۔ زمین سے دور تھا آسمان کے قریب تھا۔

فلک پیما

معمورِ تمنّا

اے فریبِ التفاتِ حسن یہ کیا کر دیا
پھر مجھے آمادۂ عرضِ تمنّا کر دیا

شیخ کعبے سے نکل آیا برہمن دیر سے
تو نے کیا آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارا کر دیا

ہم نشیں رازِ شکستِ دل بتاؤں کیا تجھے
کچھ تو تھا دو آنسوؤں کو جس نے رسوا کر دیا

چاکِ داماں کو لئے پھرتے ہیں دیوانے ترے
او خود آرا! تو نے اُن کو بھی خود آرا کر دیا

تم ہی تھے وہ یا "فریبِ شوق" یہ کس کو خبر
ہم نے تو آنکھوں کو قربانِ نظارا کر دیا

اب کہاں کا حشر کیسی داد، سب خاموش ہیں
ہائے اے حسنِ پشیماں! تو نے یہ کیا کر دیا!

بھیجتا ہی کون چھپ چھپ کر پیامِ مشکبو
کس نے راتوں کو مری، خوابِ زلیخا کر دیا

حسن کے رُخ پر تو اے منصور پردہ ہی رہا
عشق کی مجبوریوں کو تُو نے رسوا کر دیا!

کیوں وہ بیزارِ تمنّا ہی کہ جس نے اے روشؔ
دل کے ہر ذرّے کو معمورِ تمنّا کر دیا

روشؔ صدیقی

اشتراکی

(ایک روسی افسانہ اردو لباس میں)

اگر میرے فاضل وکیل اجازت دیں تو میں اپنی طرف سے اُن کی اس قابل یادگار بحثِ صفائی کے لیے جس کی جامعیت اور دل نشینی کے باوجود مجھے پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈالنا ہی پڑے گا۔ ان کا مخلصانہ شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میری اس گزارش اور خواہش میں طنز یا عناد کا کوئی جذبہ موجود نہیں کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ دنیا کی نظر میں میرا گناہ قابلِ عفو و لائق درگزر نہیں۔

میں خود بھی کسی رحم کی التجا نہیں کرتا۔ لیکن اس جہانِ فانی کو خیرباد کہنے سے پیشتر چند گزارشات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جن کی بنا پر مجھے پورا یقین ہے کہ مستقبل کا ماہرِ نفسیات انسانوں کے ایک ایسے گروہ کے وارداتِ قلبی کے سمجھنے کی کوشش کرے گا جس میں میرا شمار ہے۔ میری سرگزشت اور گزارش حسب ذیل ہے:-

میں ایک قصبہ کے افسرِ محاصل کا پانچواں اور سب سے چھوٹا بیٹا ہوں۔ میری تین بہنیں اور ایک بھائی مجھ سے عمر میں بڑے ہیں۔ میرا باپ تین بیٹیوں کی پے بہ پے تشریف آوری سے ذرا کھسیانا سا ہو چکا تھا لہٰذا جب میرا بڑا بھائی پیدا ہوا تو میرا باپ مارے خوشی کے جامے میں پھولا نہیں سماتا تھا۔ بھائی جان کا ورودِ مسعود بھی والد بزرگوار کے لئے کچھ مستقل طور پر خوشگوار ثابت نہ ہوا کیونکہ بڑے بھائی فطرتاً کمزور اور ضعیف پیدا ہوئے تھے جہاں سردی کا موسم آیا اُن کی جان کے لالے پڑے۔

اب والدِ بزرگوار کی تمام امیدیں خود میری ذات سے وابستہ ہو گئیں۔ اللہ کے فضل سے قصبہ میں سب سے پہلے ربڑ کے پہیوں والی گاڑی میں سیر کرنا مجھے ہی نصیب ہوا۔ میری بچپن کی اس خوش نصیبی اور امارت کا قصبے میں گھر گھر چرچا رہا۔ جب میں گھر سے باہر نکلتا تھا تو میرا لباس نئی دُلہنوں کی زرق برق پوشاک کو مات کرتا تھا۔ لہٰذا جس طرف میں نکل جاتا نگاہیں میرے تعاقب میں بے تاب رہا کرتیں۔ اور ایک مرتبہ تو ہمارے قصبے کے بڑے زمیندار کی بیگم نے عین بازار میں اپنی گاڑی سے اتر میری پیشانی چٹاق پٹاق بوسوں سے منور کر دی۔

جناب والا میرے والد کی خوش نصیبی ملاحظہ ہو وہ ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ حالات نے مساعدت کی تو انہوں نے نہ صرف بی اے پاس کر لیا بلکہ ایک متمول عورت سے اُن کی شادی بھی ہو گئی۔ والد چونکہ جاہ و منزلت کے پرستار تو

میں سے تھے لہٰذا اُن کی تمنا تھی کہ اُن کی اولاد دُنیا میں ترقی کرے اور اُن کا نام روشن ہو مگر مصیبت یہ پیش آئی کہ میرے سب بھائی بہنوں نے والدہ کی سادگی بلکہ سادہ لوحی ورثے میں پائی +

ان حالات میں والدِ بزرگوار لگے سمجھنے کے کہ ع فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص۔ دنیا جہان کی کوئی امید ایسی نہ تھی جس کا مرکز میری ذات شریف نہ قرار دی گئی ہو۔ ان امیدوں اور تمناؤں کی وسعت کے ساتھ ساتھ مجھے ہر قسم کے امتیازات اور اختیارات عطا کئے گئے۔ آپا کو چٹیا اور بھائی بہنوں کو گھوڑا بنانا تو میرے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ میرے خوبصورت بال بڑھتے بڑھتے کندھوں تک لٹک گئے اور میری رسیلی آنکھیں اور عمدہ پوشاک شہزادوں سے سوا جلوہ پیدا کرتی تھی + میری جادو بھری نگاہیں اور وجد انگیز تبسم ہر طرح کی شرارتوں کی پردہ پوشی و تلافی کے لئے کافی تھا +

رفتہ رفتہ میری شرارتیں دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگیں ایک مرتبہ پھولوں کی ایک کیاری یوں تباہ کر کے رکھ دی کہ اُس کا نام ونشان تک نظر نہ آتا تھا۔ ایک دفعہ جناب مالی کے بیٹے کی آنکھ پردہ تاک کر نشانہ بٹھایا کہ بیچارا نیم گل ہی ہو گیا ایک روز بندوق سے پردے پر ایسا نشانہ لگایا کہ گھو کا گھر جلتے جلتے بچ گیا۔ مگر معمولی شرارتوں پر تو کوئی باز پُرس ہوا ہی نہیں کرتی تھی۔ ہاں اگر کوئی غیر معمولی کارنامہ معرضِ ظہور میں آئے تو والد اپنی ناراضی کا اظہار ضرور فرمایا کرتے تھے۔

والد ہوئے خفا اور ہم نے رکھا چُپ کا روزہ۔ میری خاموشی کیسے اور کیوں کر گوارا ہوسکتی تھی، وہ منٹوں میں منا لیا کرتے تھے۔ پہلے سے زیادہ پیار بھی کرتے اور ایک پیسہ نقد بھی جیبِ خاص سے مرحمت فرماتے۔ پیسہ دیکھتے ہی میرا سب رنج حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتا اور پیسہ جیب میں ڈال میں بھاگتا بازار سے برف کے طوطے خریدنے +

دس برس کی عمر سے پہلے میں سکول میں داخل ہُوا۔ استاد تو لگے میرے ذوق و شوقِ علم کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے اور یہاں یہ حالت تھی کہ کس کافر کا سکول میں جی لگتا تھا۔ سکول کے بند کمروں کی ہوا میں دن بھر یوں بندھے بیٹھے رہنا خالہ جی کا گھر تھوڑا ہی تھا۔ دردِ سر کی شکایت پیدا ہوئی اور صحت نے جواب دینا شروع کیا۔ خدا ان سے سمجھے ماسٹر صاحبان بھی دوسرے شاگردوں سے مجھے زیادہ سمجھنے لگے اور یہاں یہ کیفیت تھی کہ سکول تو کبھی کبھار یار دوستوں سے ملنے چلے ہی جایا کرتے تھے لیکن تعلیم سے تو دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ میں اپنے ہم جماعتوں کو جاہل اور احمق تو سمجھتا ہی تھا اب اس کا ثبوت انھوں نے مجھ پر آوازے کسنے اور پھبتیاں اُڑانے میں مہیا کرنا شروع کیا۔ سکول پہنچ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ بندروں کے نرغے میں گھر گیا ہوں۔ بیماری کی وجہ سے شراب کی ایک چھوٹی سی بوتل میرے پاس رہا کرتی تھی ستم کار ہم جماعت نہ صرف شراب کی بوتل ہی اُڑا لیتے بلکہ بسکٹ اور ڈبل روٹی سبھی کچھ چھین کر چُرا کر چٹ کر جاتے اور میں روتا ہُوا گھر پہنچتا۔ آخر ماں باپ نے سکول سے ہٹا لینے کی ٹھانی اور بندہ خوشی خوشی بستہ بغل میں دابے واپس پہنچا۔ میری واپسی نے گھر بار کو ایک معمورۂ مسرت بنا دیا +

کچھ عرصہ دم لیا مگر گردشِ فلک نے پھر ایک ہائی سکول میں لا داخل کیا۔ استادوں کی زائد از ضرورت شفقتیں یہاں بھی موجود پائیں۔ جب استاد پورے جوش سے سبق پڑھا رہا ہوتا تو میں اپنے قریبی ساتھی کے ساتھ اُس کی نظر سے اوجھل شطرنج کھیلا

کرتا تھا۔ استادوں کی متفقہ رائے تھی کہ بندہ پرلے درجے کا ذہین تو ہے مگر محنت سے جی چراتا ہے۔

جب میری عمر تیرہ برس کی ہوئی تو والد کو ملازمت کے سلسلہ میں پریگ جانا پڑا۔ میرے گردوپیش کے حالات میں یہ پہلی تبدیلی تھی جو آئندہ بدبختیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ وہ دن اور یہ دن کبھی چین نصیب ہوا ہی نہیں۔ اپنے قصبے میں ہمارا شمار رؤسا میں سے تھا۔ اب ہم پہنچے پریگ۔ وہاں چہل پہل کا عالم ہی دوسرا تھا۔ وہاں عورتوں کی فیشن پرستی اور فضول خرچی کی وہ انتہا کہ ہم دل ہی دل میں شرمندہ ہوئے جاتے تھے۔ والد بزرگوار کی حیثیت بھی ایک معمولی ملازم کی ثابت ہوئی۔

پریگ کے سکول کو جو اپنی شمولیت سے ہم نے مشرف فرمایا تو ایک نئی دنیا نظر آئی۔ پریگ کے سکول ماسٹر پہلے ہی سے فیصلہ کئے بیٹھے تھے کہ دیہاتی لڑکے پرلے درجے کے کندۂ ناتراش ہوتے ہیں۔ ان ماسٹروں نے جناب شیطان کی طرح میرا ناک میں دم کر دیا۔ خدا جانے ان پر وحی نازل ہوئی یا کیا ہوا انہوں نے مجھے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ یہ بڑا جاہل اور کھلنڈرا لڑکا ہے۔ مجھے بھی ایک مرتبہ جی کڑا کر کے لاطینی زبان پڑھانے والے ٹھگنے سے جسے لڑکوں کو فیل کرنے میں مزہ آتا تھا کہنا ہی پڑا کہ یہ شیوہ قرینِ دانش نہیں۔

بس صاحب پھر کیا تھا سکول ایک مقتل بن گیا جہاں ہر روز ماسٹر صاحبان ہماری کھال اُدھیڑنے لگے۔ ہر روز کی مصیبت نے دل و دماغ پر ایسا بُرا اثر ڈالا کہ کسی وقت تو میں بزدلوں کی جان کو رو دیا کرتا اور کبھی مارے غصے کے دیوانہ ہو جاتا۔ اور تو کچھ بن نہ پڑتا تھا البتہ ان استادوں کے جو منظور نظر ہوا کرتے تھے ان سے دھینگا مشتی ضرور ہوا کرتی تھی۔

امتحان ہوا نتیجے کا انتظار مجھے تو نہیں گھر والوں کو ضرور تھا۔ نتیجہ نکلا تو یہ نکلا کہ ہم پانچوں مضامین میں چاروں شانے چت۔ ماں باپ نے آخر میرے متعلق اپنی رائے تبدیل کی۔ بڑے بھائی جنہیں اب تک میرے مقابلے میں حماقت کی پوٹ سمجھا جاتا تھا ترقی پا گئے اور والد اپنی خوشنودیٔ مزاج کے اظہار اور ان کے مرتبہ کے اعتراف میں انہیں ہر اتوار کو سگریٹ دینے لگے۔ اب بھائی بھی میری آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا کیونکہ اُس نے میری گدی پر قبضہ جما لیا تھا۔ مجھے اُس کے اُترے ہوئے کپڑے پہننے پڑتے تھے۔ واللہ مجھے اُس سے بھی اتنی ہی نفرت پیدا ہو گئی جتنی ماسٹروں سے تھی۔

میرا ایک چچیرا بھائی فوج میں ملازم تھا۔ میں نے اُس سے ربط ضبط بڑھایا۔ چھاؤنی میں جا کر بندوقوں کی آواز کا سننا تو اعلیٰ میں سپاہیوں کا یکساں قدم اٹھانا۔ فوجی بینڈ کا بجنا اور "سٹینڈ ایٹ ایز" کے حکم پر فوج کا باتوں میں مشغول ہو جانا میرے لئے نہایت فرحت افزا نظارے تھے۔ چچیرے بھائی کے ساتھ ایک ہوٹل میں چائے پیتے پیتے جب عورتوں کے متعلق ذکر چھڑ گیا تو میں نے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ میرے تن بدن میں ایک بجلی کی سی لہر دوڑ گئی ہے۔ اُس وقت کا تصور جب میں چمکدار بٹنوں والی نیلی وردی پہنے، اپنے سفید دستانوں والے ہاتھوں کو کسی خوبصورت عورت کے نرم و نازک رخساروں پر پھیر رہا ہوں گا مجھے اس دنیا میں جنت کی امید بندھائے دیتا تھا۔

قرار یہ پایا کہ جھٹ فوج کی ملازمت کر لی جائے۔ طبی معاینہ جو ہوا تو پیدائشی کمزوری کی بنا پر میڈیکل آفیسر صاحب نے

کھٹ سے مجھے چلتا کیا۔ میں کمرے سے باہر نکل برآمدے میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جی چاہتا تھا کہ ماں باپ کو پانی پی پی کر کوسوں اور پیٹ بھر کر پیٹوں کہ انہوں نے اپنی نادانیوں سے یوں مجھے پیدائشی نکما بنا دیا تھا۔

زندگی کی رہی سہی امید کا حسرت ناک انجام طبیعت کو اور بھی اُچاٹ کرتا گیا۔ سوچ بچار کے بعد میں نے یہ رائے قائم کی کہ والدین کی نادانیوں سے پیدائشی طور پر کمزور تو تھا ہی، ان کا فرض تھا کہ اُس کی تلافی کسی بہتر طریق پر کرتے۔ اب تو وہ میرے دین دار ہیں میں اُن کا کسی طرح زیر بارِ احسان نہیں ہوں۔

اچھا جناب تو پھر میں ایک پڑاوے والے کے سپرد کر دیا گیا۔ فوجی بارکوں کے قریب ایک مکان کی تعمیر میں میں اپنے محترم اُستاد کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا لیکن دراصل قواعد کرنے سنگینیں چڑھانے، اور دشمنوں پر حملہ بولنے کے لئے میرا دل بے تاب ہوا کرتا تھا۔ ایک شخص کے ساتھ اینٹیں ڈھونا اور ایک شرابی جمعدار کے لئے تمباکو خرید لانا میرے لئے کوئی دلکش مشغلہ نہ تھا۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ والدین نے محسوس کیا کہ یہ صورتِ حالات ناقابل برداشت ہے۔ اس پڑاوے کے مالک سے تو چھٹکارا ہوا۔ میں ایک افسر محاصل کا منشی بنا تو ہر وقت روپلوں کی جھنکار سی کام رہا۔ ایک ڈاکٹر کی ملازمت کی تو دوائیں گھوٹتا پیتا رہا۔ شراب کی کشید کے کارخانے میں ملازم ہوا تو شراب کے سمندر میں تیرا۔ کبھی پار پڑ جیلے مگر کہیں جم کر نہ بیٹھنا تھا نہ بیٹھا۔ ہفتہ عشرہ یہاں تو مہینہ ڈیڑھ وہاں۔ خدا نے اس سے زیادہ کسی کا محتاج نہ ہونے دیا۔ ملکِ خدا تنگ نیست۔ پائے گدا لنگ نیست۔ پڑھا ایک کام چھوڑا دوسرے کے ہاں چلا گیا کیونکہ میری تربیت نے مجھے تن آسان اور کام چور بنا رکھا تھا۔ والد تو یہ لچھن دیکھ کر ایک روز اس قدر آشفتہ ہوئے کہ مجھے اصلاح خانہ میں بھیجنے پر آمادہ ہو گئے۔ وہ تو خدا والدہ کو جنت نصیب کرے اس خبر سے اُن کو ضعفِ قلب کا وہ دورہ ہوا کہ اپنی جان گنوا کر انہوں نے مجھے اس تجویز کی تکمیل سے نجات دلائی۔ اکیس برس کی عمر میں میرا کام صرف یہ تھا کہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے پریگ کے شہر میں آوارہ گردی کیا کروں دکانوں کی روشن کھڑکیوں میں سے چمکتی دمکتی چیزوں کا نظارہ مجھ پر وہی کیفیت طاری کیا کرتا تھا جو بھوکے پر پلاؤ کی خوشبو سے مسلط ہوا کرتی ہے۔ برسرِ راہ کھڑے ہوئے میں کوٹ پتلون کی ہر جیب کو پوری کوشش اور تیزی کے ساتھ ٹٹول جایا کرتا تھا۔ ع شاید درمے نہفتہ باشد۔ بازار کی دوسری کشاکش کی طرف تو میری توجہ کم مبذول ہوتی تھی البتہ میں دیکھتا تھا کہ بیشمار عورتیں آتی جاتی ہیں جنہوں نے چوڑی چوڑی لیس کی آڑ میں مختصر لباس سے اپنے حسن کی نمائش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہوتا تھا جہاں دیکھتا کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست کا عالم نظر آتا۔ ان عورتوں کے چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھ بے اختیار چوم لینے کو جی چاہتا تھا لیکن وائے محرومی حسن کے اس بحرِ ناپیدا کنار میں سے کسی ایک عورت کے دل میں اتنا بھی خدا کا خوف پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ایک نگاہ ہمارے حال پر بھی ڈالتی جائے ؎

من چشم نہ بردارم از روے نگارینش
آں مستِ تغافل را توفیقِ نگاہے نیست

ان حالات میں میری مایوسی لبسا اوقات جنون کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ میرا دماغ اس پریشانی کے عالم میں گھوڑوں کی ٹاپوں میں اس روپے کی جھنکار سنتا تھا جس کی کشش حسن و نخوت کی ان تپلیوں کو میرے زیب آغوش بنا دینے میں جادو کا سا اثر رکھتی تھی۔ جناب والا میری اس بے تابی کا جو ایسی پریوں سے ملاپ کے لئے مجھے لاحق تھی آپ کچھ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ خدا نے آپ کو دولتِ دنیا سے بہرۂ وافر عطا فرمایا۔ اس دولت کے بل پر لونڈیوں کی منہ مانگی تعداد آپ کے درِ دولت پر حاضر تھی اور جب یوں آپ کے دانت کھٹے ہوئے تو باقاعدہ شادی کی سوجھی اور آج آپ ایک حور سی بیوی اور چاند سی بچوں میں بیٹھے لطف اُڑا رہے ہیں +

جب مجھے اپنی طرح کے دوسرے محرومانِ قسمت سے سابقہ پڑا تو اشتغالِ طبع دوبالا ہو گیا۔ ہم ہر روز دنیا کی موجودہ حالت پر گرما گرم مباحثہ کیا کرتے اور بعض اوقات تو خود بھی اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ زار زار روتے ہوئے باہم یوں بغلگیر ہوتے تھے کہ بس کسی سمندر میں ڈوب مریں گے۔ ان حالات میں میں نے اشتراکیت کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا جن کے سُرخ سُرخ سرورقوں کا ایک جلوہ آپ جیسے دولتمندوں کے بدن میں لرزہ پیدا کر دیا کرتا ہے موجودہ معاشرت کے مسئلے کا حل بہت ڈھونڈا پر یہاں بھی نہ پایا۔ آج تک یہ عقدہ نہیں کھلا کہ آخر ایک دنیا تو عیش سے بسر کرے اور ہم رہیں پورے طور پر محروم تو کیوں۔

جناب عالی۔ اسی بنا پر میں نے اُس دولتمند پر تین گولیاں چلا کر اُسے ٹھنڈا کر دیا۔ اُس دولتمند کو میں صرف ایک ایسی جماعت کا نمائندہ سمجھتا ہوں جو ہماری طرح کام تو نہیں کرتی گلچھرّے ضرور اڑاتی ہے۔ مجھے ان بزرگوار سے کوئی ذاتی عناد نہ تھا۔ اگر اُس صبح آپ سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو آج اس فاضلانہ بحثِ صفائی سے مجھے اور اُس دن اپنی زندگی سے آپ کو محروم رہنا پڑتا۔ راحت و آسائش مجھ غریب کے نصیب میں نہ یہاں تھی اور نہ یقین ہے وہاں ہو گی جہاں دو ہاتھ رسی پر سوار ہفتے عشرے میں پہنچا چاہتا ہوں +

عطاءاللہ

صرف دوستی دنیا کی وہ چیز ہے جس کی سودمندی پر ساری نوعِ انسان متفق ہے۔

بھائی اتفاق سے ہیں دوست دل سے

دو شخص اصلی دوست اس وقت ہوتے ہیں جب اُن کی رائیں متضاد اُن کے اصول یکساں اور اُن کی پسند ناپسند مختلف ہو۔

خودکشی

مدتیں گزریں کہیں اک عاشقِ ناکام تھا
ہجر کے سنگیں شکنجوں میں اسیرِ دام تھا

زندگی تھی ہر نفس تازہ مصیبت سے دوچار
کٹ رہی تھی ہجرِ جاناں میں جوانی کی بہار

شوق پامالِ صعوبت، جوشِ تاراجِ ستم
کام اپنا کر چکا تھا عاشقی میں زہرِ غم

سابقہ خوشیوں کا بدلہ لے لیا تھا ہجر نے
ولولوں کا سر کچل کر رکھ دیا تھا ہجر نے

زنگ آلودہ تھی سعیِ نَو کی تیغِ آبدار
تھا پرانی آرزوؤں پر تخیل کا مدار

ہجر کے ہاتھوں جوانی اس قدر مغموم تھی
روحِ آزادی پرِ پرواز سے محروم تھی

تنگ آ کر ایک دن اُس نے کیا دل میں خیال
لاؤ سر سے پھینک بھی دوں زندگانی کا وبال

کر کے ہمت توڑ بھی ڈالوں یہ ربطِ جان و تن
پھاڑ بھی ڈالوں عناصر کا یہ خاکی پیرہن

توسنِ عمرِ رواں کو ایڑ دینا چاہیئے
دوسرے عالم میں چل کر سانس لینا چاہیئے

ہائے مرگِ ناگہانی بھی مگر ممکن نہیں!
اس گنہ کا بار لوں میں اپنے سر ممکن نہیں!

جان دینا پست ہمت بزدلوں کا کام ہے
لوگ کہتے ہیں کہ یوں مرنا جنونِ خام ہے

خودکشی کرنا ہے ان حالات میں امرِ محال
چھوڑ دینا چاہیئے پھر جاں سپاری کا خیال

یک بیک پھر خود ہی گویا چونک اٹھا خواب سے
خود بخود کرنے لگا باتیں دلِ بے تاب سے

"اے کمینہ، پست ہمت، ننگِ دل، بے ننگ و نام
کیوں سمجھ رکھا ہے تو نے خودکشی کرنا حرام"

"تو ابھی تک معنی و الفاظ کے چکر میں ہے
نورؔ واجی عہد کے دورِ سخن پرور میں ہے"

"ریل کی پٹڑی سے کٹ کر جان دینا کھیل ہے؟
بے دھڑک پھانسی گلے میں ڈال لینا کھیل ہے؟"

"مسکرا کر جان دینا بزدلی کا نام ہے؟
دل میں خنجر بھونک لینا کوئی آساں کام ہے؟"

"سہل ہے بے باک پینا زہر سے لبریز جام؟
کچھ ہنسی ہے اپنے ہاتھوں ختم کرنا اپنا کام؟"

"تیری نظریں سطح بیں ہیں ان میں گہرائی نہیں
تیری رو بھی عقل میں عرفاں کی رعنائی نہیں"

"اے اسیرِ رسمِ کہنہ! اے عقائد کے غلام!
کاٹ بھی دے تیغِ نو سے بدعتِ طاغی کا دام"

"سنگِ عزمِ مستقل سے توڑ دے رسم و رواج
کچھ تو کر انساں کی دیرینہ حماقت کا علاج"

"جان دینے سے حیاتِ جاوداں مل جائے گی
ایک پل میں رفعتِ روحانیاں مل جائے گی"

اتنا کہہ کر بھر گیا سعیٔ عمل کے جوش میں
اٹھ کے دوڑا بے تحاشا موت کی آغوش میں

زرد چہرے پر سرورِ جاودانی لے چلا
آنکھ میں غلطاں خمارِ کامرانی لے چلا

جلد اک دریا کے اونچے پل پر آ کر رک گیا
آستانِ شاہدِ مقصود پا کر رک گیا

دیر تک دیکھا کیا نیچے نگاہِ غور سے
عزم نکلا اک خیری کشمکش کے دور سے

قابلِ تحسین تھی اس جانباز کی تعجیل بھی
کر دکھائی اپنے فوری عزم کی تکمیل بھی

چند موجیں دفعتہً پانی میں اٹھیں بیقرار
نیم جاں اک جسم ڈوبا اور ابھرا چند بار

سطحِ دریا ایک لمحے میں برابر ہو گئی
بے شکن شفاف آئینے کی چادر ہو گئی

ذوقی

رتن ناتھ سرشار

یوں تو سرشار نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں مگر جس کتاب نے اس کا نام زبان زدِ خلائق کیا وہ فسانۂ آزاد ہے۔ یہ ایک طویل قصہ ہے جو چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ان دنوں لکھی گئی تھی جب سرشار اودھ اخبار لکھنؤ کا ایڈیٹر تھا چنانچہ یہ فسانہ ایک سال تک یعنی دسمبر ۱۸۷۸ء سے دسمبر ۱۸۷۹ء تک اودھ اخبار ہی میں نکلتا رہا۔ کتاب کی صورت میں ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا۔

فسانۂ آزاد یوں تو بہت ہی لمبا ناول ہے اور قصہ در قصہ بیان ہونے کی وجہ سے کہانی بہت الجھ گئی ہے مگر حشو و زوائد سے پاک ہو کر کہانی یوں بھی بیان کی جا سکتی ہے۔ قصہ کا ہیرو ایک سیلانی، علائق دنیوی سے پاک آزاد منش آدمی ہے ہر علم سے بہرور اور ہر ہنر سے فیض یاب ہے۔ فہم و ذکا میں ارسطوئے زماں، حسن میں یوسف ثانی، حاضر جواب، بذلہ سنج، لطیفہ گو یعنی خصائص عالیہ کا مخزن ہے ایسا بے سروپا ہے کہ دین دنیا کے دھندوں سے کوئی سروکار نہیں بس کام ہے تو یہ کہ کہیں لکھنؤ کا محرم دیکھنے جا نکلتا ہے کہیں عیش باغ کا میلہ، کہیں ہولی، کہیں دیوالی وغیرہ وغیرہ۔ اسی دوران میں ایک حسینہ کی تعریف سن لیتا ہے جس کا نام حسن آرا ہے۔ وہاں بھی جا دھمکتا ہے مگر حسن آرا ہر طلب گار کا امتحان لیتی ہے اور جہاں سینکڑوں امتحان میں ہار جاتے ہیں۔ آزاد پورا اترتا ہے۔ چنانچہ منتخب ہو جاتا ہے۔ مگر شرط یہ آن پڑی ہے کہ آزاد روم میں جا کر ترکوں کے ساتھ جنگِ روس میں شریک ہو اور وہاں سے سرخرو لوٹنے پر شادی ہو۔ اور اس دوران میں آزاد کسی اور سے نکاح نہ کرے۔ چنانچہ آزاد روانہ ہو جاتا ہے مگر جس سرائے میں آزاد ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں سرائے کی مالکہ مسماۃ اللہ رکھی سے آپ کو عشق ہو جاتا ہے۔ آزاد کے تعشق کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ایک ہی نظر میں دونوں فریق گھائل ہو جاتے ہیں۔ آخر آزاد اللہ رکھی کو بہزار دقت چھوڑ کر جاتا ہے بمبئی میں حسن آرا کی ایک رشتہ کی بہن کے ہاں ٹھہرنا ہو جاتا ہے۔ وہاں وہ آپ پر عاشق ہو جاتی ہے۔ مگر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ میاں آزاد کے ساتھ ایک ہمراہی بھی ہے جس کا اصل نام تو خواجہ بدیع الزمان ہے مگر جسے عرف عام میں خوجی کہا جاتا ہے۔ یہ حضرت ہر وقت افیون کی پینک میں رہتے ہیں کبھی کبھی ہوش میں آتے ہیں اور انہی اوقات میں جو الفاظ آپ کی زبان سے نکلتے ہیں وہ فسانہ میں عجیب چاشنی پیدا کر دیتے ہیں۔ جہاز میں آزاد کی ایک انگریز جوڑے سے دوستی ہو جاتی ہے جس میں میم صاحبہ، صاحب سے زیادہ آزاد کی طرف مائل ہو جاتی ہے قسطنطنیہ میں آزاد بیمار پڑ جاتا ہے اور ایک یہودی خاندان اس کی بہت مدد کرتا ہے۔ اس خاندان کی چشم و چراغ مس میڈا ہے جو حضرتِ آزاد پر اور جن پر حضرت آزاد عاشق ہو جاتے ہیں۔ جنگ میں آزاد بڑے بڑے کارنامے کرتا

ہے اور اسے بڑی ناموری حاصل ہوتی ہے۔ دوران جنگ میں روسیوں کی طرف سے ایک حوروش مردانہ بھیس میں جنگ آزمائی کرتی ہے۔ آزاد سے سامنا ہوجاتا ہے۔ میاں آزاد سدا کے عاشق، مبارزہ میں ایک دفعہ جو اچکتے ہیں تو اس نازنین (مس کلیرسا) کے گھوڑے پر جا پڑتے ہیں اور مس کلیرسا کو پکڑ کر میدان جنگ میں بوسوں کا تار باندھ دیتے ہیں۔ کلیرسا انہیں قید کرکے لے جاتی ہے اور آپ سائبیریا بھیج دئے جاتے ہیں۔ راستے میں دریائے ڈینیوب کے کنارے سوتے ہوئے پولینڈ کی ایک شہزادی انہیں اٹھوا کر لے جاتی ہے اور ان کا علاج کرکے ان سے شادی کی طلبگار ہوتی ہے۔ یہ اس پیمان کے مطابق جو حسن آرا سے بندھ چکا تھا انکار کر دیتے ہیں۔ شہزادی انہیں قید کر دیتی ہے۔ مگر خوجی آزاد کی تلاش میں یہاں بھی آنکلتا ہے اور شہزادی اور آزاد کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ کھول کر کسی طرح آزاد کو وہاں سے نکال لاتا ہے۔ آزاد جنگ کے بعد واپس آجاتا ہے اور حسن آرا سے شادی کر لیتا ہے۔ مس میڈا، مس کلیرسا، پولینڈ کی شہزادی، ثریا بیگم وغیرہا سب تکتی رہ جاتی ہیں۔

یہ تو رہی کہانی، اب فنی لحاظ سے دیکھتے ہیں کہ فسانۂ آزاد کی کیا وقعت ہے۔ ہمیں اس بات سے بحث نہیں ہے کہ فسانۂ آزاد ادبی نقطۂ نگاہ سے ناول کہلانے کا مستحق ہے یا نہیں۔ ناول کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں مگر سب سے جامع تعریف یہ ہے کہ ناول زندگی کا مرقع ہوتا ہے۔ ہمیں اس بحث میں پڑنے کی بھی ضرورت نہیں کہ اس مرقع کا کونسا پہلو اہم ہوتا ہے۔ آیا سیرت نگاری ہی ناول کی سب سے اہم چیز ہے، یا کہانی، خیال، انداز، گفتگو، تنقیدیات یا مصنف کی بصیرت[1]۔ بہرحال ایک بات جو نظرانداز کی ہی نہیں جاسکتی وہ واقعیت[2] ہے۔ کہانی خواہ حقیقت[3] نگاری کی مثال ہو یا مثالیت[4] کی، ہر حالت میں اسے زندگی سے بشریت سے منطبق کرنا پڑتا ہے۔

فسانۂ آزاد لکھنؤ کی زندگی کا مثالی مرقع ہے اور چونکہ اس میں اس خطہ کی معاشرت کی بہت سی تصاویر ہیں، اور وہاں کے لوگوں کے، وہاں کی سوسائٹی کے مختلف طبقات کے واقعات ہیں۔ اس لئے اُسے ناول کہنا کوئی جرم نہیں۔

یہ فسانہ سنا جاتا ہے سرشار کے ایک دوست پنڈت تربھون ناتھ ہجر کی تجویز کے مطابق وجود میں آیا۔ یعنی کسی صحبت میں ہجر نے یہ بات کہی کہ "اگر کوئی ناول ایسا ہے جس کا ایک صفحہ پڑھئے اور ممکن نہیں کہ بیس مرتبہ نہ ہنسئے تو وہ ڈان کوئک زوٹ ہے۔ اگر اردو میں ایسا ناول لکھا جائے تو خوب ہے" اور سرشار کے یہ بات دل کو لگی اور اس نے ایک ایسا ناول لکھنے کا ارادہ کر لیا جس کا نتیجہ ہمارا فسانۂ آزاد ہے۔ اب قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ بات کہاں تک صحیح ہے۔ مگر تاہم ایک بات بالکل واضح ہے کہ خواہ سرشار کو فسانۂ آزاد کا خیال اسی بات سے پیدا ہوا ہو مگر خود سرشار نے ڈان کوئک زوٹ اچھی طرح نہیں پڑھا اور اگر پڑھا بھی ہے تو سمجھا نہیں۔ ڈان کوئک زوٹ دُنیا کی عظیم ترین تصنیفات سے ہے۔ بظاہر تو سروینٹیز اس کے مصنف کو اس زمانہ کے مروجہ طلبیہ قصوں اور مثالی کہانیوں کا خاکہ اڑانا مقصود تھا۔ اس لحاظ سے بھی ڈان کوئک زوٹ دنیائے

1. Vision 2. Life-likeness 3. Realism 4. Idealism

ادب کی بہترین پھبتی[1] ہے، مگر اس کتاب میں اس قدر مضامین پنہاں ہیں۔ اس کے نکات اتنے جامع ہیں، مصنف کی نظر اتنی وسیع ہے۔ ڈان کوئک زوٹ کے تصورات اور دنیا کی حقیقت میں اتنا تفاوت ہے کہ یہی کتاب جو دنیا کی بہترین مزاحیہ کتاب کہلا سکتی ہے، دنیا کی سب سے بڑی حزنیہ کتاب بھی ہے۔ ستم یہ ہے کہ مصنف ہر وقت اپنے ہیرو پر خود ہنستا رہتا ہے۔ سرشار نے اگر بجز کے الفاظ اور ڈان کوئک زوٹ کی ورق گردانی سے کوئی مطلب اخذ کیا ہوگا تو یہی کہ کتاب ظریفانہ رنگ میں لکھی جائے اور آزاد کے ساتھ خوجی کو لگا دینے سے سانکو پینزا کی مثال پوری ہو جائے۔ جو ضد ڈان کوئک زوٹ کی بلند نظریوں اور سانکو پینزا کی بشریت میں ہے۔ وہی فرق قریب قریب آزاد کی بلند آہنگیوں اور خوجی کے نقطۂ نگاہ میں بھی ہے۔ جس طرح ڈان کوئک زوٹ اپنی خیالی محبوبہ ڈلسنیا کے لئے دنیا فتح کرنے جاتا ہے۔ اسی طرح آزاد بھی حسن آرا کے حکم کی تعمیل میں روم لڑنے جاتا ہے۔ مگر یہ باتیں سطحی مشابہت لئے ہوئے ہیں اسی لئے فسانۂ آزاد کو اردو کا ڈان کوئک زوٹ کہنا اتنا ہی لغو ہے جتنا حشر کو اردو کا شیکسپیئر۔

کسی ناول کی جانچ کئی طریقوں سے ہو سکتی ہے۔ آرنلڈ بینٹ مرحوم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ تین طریقے یا تین نقطۂ نگاہ یعنی ناولسٹ کا دائرۂ عمل، اس کی تنقید حیات، اور اپنے افراد قصہ سے اس کا برتاؤ، ایک ناولسٹ کو جانچنے کے لئے کافی ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ ناول کسی اور زاویۂ نگاہ سے یا کسی اور قاعدے کے مطابق یا کسی اور اصول کی رو سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ یا اچھی طرح سے نہیں جانچا جا سکتا۔ ناول کو پرکھنے کے بہت سے پہلو ہیں مگر ان تین نقطہ ہائے نگاہ سے دیکھنے میں بھی کسی ناول کی تمحیص میں فرق نہیں پڑتا۔ اسی لئے ہم ناولسٹ کے دائرۂ عمل کو پہلے لیں گے۔ اور باقی دونوں باتوں کو آخر میں علاوہ ان کے کئی معیار اور بھی ہیں جن کی رو سے فسانۂ آزاد پرکھا گیا ہے۔

پہلے پہل مصنف کا دائرۂ عمل[2] دیکھنا چاہئے۔ بہت سے ناولسٹ ایسے ہیں جو ایک مقام یا علاقے تک محدود رہتے ہیں ہمارے ہاں تو ناول کا اتنا عام رواج ہی نہیں کہ ناولسٹ خاص خاص علاقوں کے لوگوں کی طرز معاشرت اور زندگی کے متعلق ناول لکھیں۔ البتہ اور ملکوں میں یہ اکثر ہوتا ہے۔ اٹھارھویں صدی میں انگلستان کی ایک خاتون جین آسٹن نے اس رواج کی بنیاد ڈالی اور اب تو ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کوئی ہی ریاست ایسی ہوگی جس کی بابت عصری افسانے میں نہ ہو بلکہ ایک امریکن ناولسٹ جیک لنڈن نے تو اس دور و دراز ملک ایلاسکا کی زندگی اور ماحول کی کہانیاں لکھنا اپنے لئے مخصوص کر لیا انگلستان میں ٹامس ہارڈی مشہور ناولسٹ جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے انگلستان کے جنوب مغرب کے صوبجات کو ملا کر اور ایک فرضی نام یعنی وسیکس دے کر اس علاقہ کی زندگی کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ۱۹۲۷ء کا نوبل پرائز گریزیا ڈیلیڈا ایک اطالوی خاتون کو ملا تھا جس نے جزیرہ سارڈینیا کی معاشرت اور زندگی اپنے ناولوں میں پیش کر کے دکھائی ہے۔ یہ

1. Parody 2. Field

خطوسی ناولسٹ[1] بہت مقبول بھی ہوتے ہیں۔ مگر دنیا میں ایسے ناولسٹ مثلاً ٹالسٹائے اور ڈاسٹو دسکی اور گوگل وغیرہ اور چند فرانسیسی ناولسٹ بہت ممتاز ہیں۔

سرشار نے اپنے تئیں لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح تک محدود رکھا ہے۔ اس کی کہانی کا عمل سمندر پار بھی کیوں نہ ہو کسی ملک چھوڑ رولدچیا ہی میں کیوں نہ پہنچ جائے۔ مگر جو نقشہ سرشار وہاں کی زندگی کا دیتا ہے وہ چنداں قابل قدر نہیں ہوتا۔ خصوصاً پولینڈ کی شہزادی والاقصہ تو الف لیلہ کی یاد دلاتا ہے۔ ایسے ہی قسطنطنیہ کی معاشرت تو کیا آزاد کے وہاں قیام کا جو بیان کتاب میں ملتا ہے وہ غیر موثر ہے اور قرین حقیقت نہیں معلوم ہوتا۔ سرشار کبھی اپنے اصلی رنگ میں نہیں ملتا جب لکھنؤ کا ذکر نہ کر رہا ہو۔ وہاں کے باشندوں کے تمدن، بود و باش کے متعلق نہ لکھ رہا ہو۔ بعض ایسے کیرکٹر بھی ہیں جو لکھنو سے باہر رہتے ہیں مثلاً بہار النساء جو بمبئی میں رہتی ہے مگر بہار النسائکے وہاں قیام سے سرشار کو آزاد کے لئے ایک مستقر بنانا مقصود تھا چنانچہ بمبئی سے جہاز میں سوار ہونے تک آزاد اسی پری پیکر کے ہاں رہتا ہے۔ اور جو جھلک یہاں کی زندگی کی سرشار ہمیں دکھاتا ہے یعنی بہار النسائکے گھر کی، وہ بھی لکھنؤ کا پرتو لئے ہوئے ہے +

البتہ اپنی بساط کی وسعت کے لئے سرشار نوابوں، ٹھاکروں، پنڈتوں، ملانوں وغیرہ کے حالات کو کام میں لاتا ہے۔ یہ شخصیتیں اُس زمانہ میں ممتاز حیثیت رکھتی تھیں یہی لوگ اس سوسائٹی کے رکن رکین تھے۔ اگرچہ اودھ کا شاہی خاندان ۱۸۵۶ء ہی میں ختم ہو چکا تھا اور تمام صوبے پر انگریزی عملداری تھی۔ مگر نوابوں اور ٹھاکروں اور تعلقہ داروں کے ہاں وہی واجد علی کا زمانہ تھا ان کے مشاغل وہی دولت مغلیہ کے آخری زمانے کے مشاغل تھے۔ ان کی روایات بھی وہی تھیں۔ غرضکہ اُن کا تمدن وہی رکیک اور متبذل تمدن تھا۔ ان لوگوں کی زندگی کا نقشہ سرشار کی کتاب میں خوب دلکش انداز میں موجود ہے مگر اس ترکیب سے بھی کتاب کی وسعت میں بہت زیادہ ترقی نہیں ہوئی۔ علاقہ لکھنو کے باہر کوئی شہر ہو اس کا نام اگر بدل کر لکھنو ہی رکھ دیا جاتے تو کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا +

باقی رہا آزاد کی مہمات کا ذکر، تو وہ تو اپنی جگہ ایک علٰحدہ ناول ہے۔ دراصل فسانۂ آزاد دو ناولوں کا مجموعہ ہے جن کا واحد ہیرو آزاد ہے۔ آزاد کی بمبئی سے روانگی ناول کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے اور اس کی پردیسی زندگی اور اُس کے معرکے اور کارنامے ایک علٰحدہ ناول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر اس بات میں سرشار دُنیائے ادب میں اکیلا نہیں۔ ٹالسٹائے جو غالباً دُنیا کا سب سے بڑا ناولسٹ ہے وہ اپنے ناول "جنگ اور صلح" اور "انا کاری نینا" میں بھی دوہری دوہری کہانیاں وضع کرتا ہے اور پھر طرّہ یہ کہ ان دوہری کہانیوں کو آپس میں مربوط نہیں کر سکا۔ انیسویں صدی کے وسط میں انگلستان کے مصنف چارلس ریڈ کے مشہور ناول "کلوائسٹر اور ہارتھ" یعنی کلیسا اور گھر کے جوڑ بھی ڈھیلے ہی نظر آتے ہیں۔ یعنی اس کتاب کا ہیرو ناول کے درمیانی حصّہ میں کوئی دو سو صفحات تک فقط سفر ہی کرتا رہتا ہے۔ یعنی ہالینڈ سے روما تک کا سفر کوئی دو سو صفحات میں پورا کرتا ہے جس کا کہانی سے دُور کا ہی تعلق ہے۔ مگر سرشار نے تو ان دو حصوں کو ملانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ان کا درمیانی رشتہ بہت نازک ہے اور

1. Regional Novelists

آخر تک وہ دونوں قصے الگ الگ رہتے ہیں۔شاید اسی بات میں سرشار کی سب سے بڑی کمزوری نظر آتی ہے۔
مگر یہ صرف اسی پر موقوف نہیں۔اس فسانے میں اتنے قصے مختلف مقامات پر جڑ دیئے گئے ہیں کہ فسانۂ آزاد میں یک رنگی بالکل نہیں رہتی۔مثلاً آزاد کی زندگی کا وہ حصہ جو ہندوستان سے باہر گذرا ہے۔وہ بھی تین حصوں پر مشتمل ہے۔اول قسطنطنیہ اور آزاد کا مس منڈا سے عشق۔دوم محاذ جنگ اور آزاد کے کارنامے۔سوم پولینڈ کی شہزادی اور آزاد، ان سب میں پولینڈ کی شہزادی والا واقعہ نفس قصہ سے بالکل الگ ہے۔اگر اسے نکال دیا جائے تو ناول میں سر مو فرق نہیں آسکتا۔
فسانۂ آزاد کا وہ حصہ جو لکھنؤ یا گردو نواح سے تعلق رکھتا ہے۔اس میں بھرتی بہت ہے کہانی میں کہانی اور افسانے میں افسانہ نظر آتا ہے۔اگر ٹھاکروں، نوابوں، رئیسوں کے حالات چھوڑ بھی دیئے جائیں اور لکھنؤ کا محرم الحرام یا عیش باغ کا میلا یا بسنت کا میلا یا کسی امیر کی برات سے قطع نظر بھی کیا جائے پھر بھی کئی ذیلی قصے[1] ایسے ہیں جن کا اصلی فسانہ سے نام کو تعلق نہیں اور اگر تعلق ہے بھی تو ایسا جس سے کہانی میں بہت طوالت اور ضعف پیدا ہو جاتا ہے۔بلکہ اس تعلق کے بیان کرنے سے تو اصلی کہانی کئی جگہ ٹوٹ جاتی ہے۔ان ذیلی قصوں میں چند قصے جو نمایاں ہیں وہ یہ ہیں۔
اوّل:۔ اللہ رکھی عرف ثریا بیگم کی زندگی اور اس کی معاشرتی معرکہ آرائیاں۔ثریا بیگم کے کردار سے ہمیں اس وقت واسطہ نہیں۔اسے بعد میں دیکھیں گے۔فی الحال یہ بتانا مقصود ہے کہ اس سیماب فطرت عورت کی زندگی کے واقعات کو اصل پلاٹ سے جو تعلق ہے وہ اس کا آزاد سے عشق ہے اور یہ عشق ہی اسے سینکڑوں خطرات اور صعوبتوں میں لا ڈالتا ہے۔کہاں بھٹیاری کہاں ثریا بیگم اور بڑے بڑے خاندانوں سے میل ملاقات، کہاں کسی تھانیدار سے چہل، کہاں نقلی آزاد سے داؤ پیچ۔یہ سب باتیں آزاد کی کہانی سے لاتعلق ہیں۔
دوم سپہر آرا اور ہمایوں فر:۔ان دونوں کا عشق اگر سرسری طور پر کہانی میں موجود ہوتا تو کوئی حرج نہ تھا بلکہ اس سے فسانے میں شیرینی پیدا ہو جاتی کیونکہ سپہر آرا ہی دراصل سارے فسانے کی جان ہے وہی سب بہنوں سہیلیوں کے لئے حیات آفریں ہے مگر یہ عشق اور ہمایوں فر کی موت، اس کا احیا یعنی وہ پیر فقیر کا ڈھکوسلا اگرچہ اس روپ بہروپ سے سرشار کو فقیروں کی شعبدہ بازیوں کی خاک اڑانی مقصود تھی، نقلی آزاد کے دام، یہ سب باتیں بھی وسطی پلاٹ سے زیادہ واسطہ نہیں رکھتیں۔
سوئم:۔ نقلی آزاد بذاتِ خود۔یہ حضرت محض فسانے کو لمبا کرنے اور آزاد کی غیر حاضری میں ہندوستانی حصہ پلاٹ کو رونق دینے کے لئے داخل کئے گئے ہیں۔ان کا آزاد سے اور اس کے معاشقوں سے کوئی تعلق نہیں۔
ان سب کے علاوہ اگر ان معترضہ کہانیوں کو لیا جائے جو نوابوں، ٹھاکروں ملانوں سے متعلق ہیں تو معلوم ہو جائے کہ اصل کہانی نصف جلد میں ختم ہو سکتی تھی۔اس طرز نگارش کی کئی وجوہ ہیں یا ہو سکتی ہیں۔ایک تو یہ کہ سرشار کو فسانوں کی تعمیر سے

1. Subplot.

عزیز نہ تھی۔ یا اس نے تعمیر اور ساخت کے نکتے کو بہت اہم نہیں سمجھا۔ دوسرے۔ فسانۂ آزاد رسالے میں چھپتا تھا اس طریقۂ اشاعت کی وجہ سے کہانی میں بے ربطی پیدا ہو جانی لازمی تھی۔ اور یہ بات سرشار ہی پر موقوف نہیں تھی انگلستان میں اسی صدی کے نصف سے ذرا قبل ڈکنز اور زیادہ تر ٹھیکرے کے ناول رسالوں میں چھپنے کی وجہ سے ایسے ہی ڈھیلے ڈھالے اور قدرے بے ربط ہو گئے تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہو جاتا تھا کہ سرشار نے اور ادھر ڈکنز نے بھی فسانے کے لئے نئی قسط نہیں لکھی ہوتی تھی۔ اس لئے جو مضمون یا کہانی اس وقت موجود ہوتا معمولی ردوبدل سے رسالے میں درج کر دیا جاتا۔ یا اگر کوئی ایسا خیال سرشار کے دماغ میں موجود ہوتا جو صوبہ کی زندگی کے متعلق ہوتا خواہ حسن آرا سے اسے واسطہ ہو یا نہ ہو لکھ کے مطبع میں بھیج دیا جاتا۔ انہیں وجوہ سے فسانے میں ایسا ڈھیلا ڈھالا پن اور بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔

دوسرے جو بات سرشار میں کم پائی جاتی ہے وہ تناسب ہے۔ یعنی کہانی کے مختلف اجزا کو یا حصص کو ایک دوسرے سے پوری نسبت سے قائم کر دینا سرشار میں مفقود ہے۔ اس نقص نے اس امر سے اور بھی زور پکڑا ہے کہ سرشار کو طوالت کی عادت بھی تھی۔ یعنی ایک بات جو دو صفحوں میں لکھی جا سکتی تھی سرشار اسے چار صفحات میں لکھتا ہے۔ اسی طرح جتنے انحرافات[1] فسانے میں موجود ہیں ان میں سرشار بھٹک گیا ہے اور کامیاب نہیں ہو سکا۔ بلکہ کئی ایسے قصے بھی ہیں جو ادھورے چھوڑے گئے ہیں اور بعد میں ان کا ذکر تک نہیں۔ ایسے ہی ملانوں کے، حافظوں کے پنڈتوں کے معلموں کے جو قصے موجود ہیں انہیں کہانی میں صحیح طور پر منسلک نہیں کیا گیا بجائے خود ان کی خوبی میں کوئی شبہ نہیں۔ مگر ہر ایک چیز اپنی جگہ اچھی لگتی ہے۔ اگر ان سے سوائے قصہ کو طول دینے کے اور کوئی کام نہیں لیا گیا اور ان کی ترتیب بھی اس طرح نہیں کی گئی۔ جس سے نفس قصہ پر روشنی پڑے۔ سوائے اس کے کہ یہ نقائص میں شمار ہوں اور ان کی نسبت اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

سوم فسانۂ آزاد کا انجام مصنف کی تھکن کا نتیجہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے تھک کر کہانی کی رہی سہی باگ بھی چھوڑ، جوں توں کہانی کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یوں یہ بات بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ بڑے بڑے ادیب اور آرٹسٹ اپنے شاہکاروں کا اختتام ٹھیک طور پر نہیں کرتے۔ سر والٹر سکاٹ مشہور تاریخی ناولسٹ اپنے ناولوں کے خاتمے سمیٹ دینے میں مشہور رہے۔ ٹامس ہارڈی جیسا صناع اپنے ناول ٹیسٹرن آف دی نیٹوہ کا انجام افراتفری میں کر دیتا ہے یو سٹیشیا ناول کی ہیروئن کو اس کے عاشق وِلڈیو کے ساتھ ایک طوفان میں بہا دیتا ہے۔ خواجۂ خواجگان ادب یعنی شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے ہیملٹ کے اختتام میں اسی بے ترتیبی سے کام لیا ہے۔ اور بیسویں صدی میں آرنلڈ بینٹ نے بڑھیا کی کہانی میں اُن دو بہنوں کا جو ناول کی ہیروئین ہیں کے

1. Digressions

آخر میں گلا گھونٹ دیا ہے۔

سرشار کو جدید تنقیدی اصولوں سے جانچتے ہوئے اس بات کی توقع نہیں کرنی چاہیئے۔ کہ اس میں وضع، تعمیر اور بصیرت، اخلاقی اہمیت، یا دوسری باتیں موجود ہوں۔ ان باتوں کے ابتدائی اصولوں سے بھی وہ واقف نہیں۔ نہ وہ فسانے کی ساخت کی طرف ہی متوجہ رہتا ہے اور نہ سیرت نگاری ہی کی طرف۔ پلاٹ کی پیچیدگیاں اور ان کا سلجھانا اسے نہیں بھاتا ۔ نہ آخر میں کوئی حیرت انگیز انکشاف ہی ہوتا ہے اور نہ درمیان میں تذبذب رہتا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ تو آدمی اپنے آپ سے بے خبر بھی نہیں ہوتا۔ یعنی جیسے اکثر ناولوں کے پڑھتے وقت اپنے ماحول سے پڑھنے والا نجات پا لیتا ہے فسانہ آزاد کو پڑھتے وقت بعض دفعہ یہ حالت طاری نہیں ہوتی کئی دفعہ فسانۂ آزاد اتنا پھیکا ہو جاتا ہے کہ اپنے گردوپیش کو بھول جانا تو کجا، مشکل سے پڑھا جاتا ہے۔

اس لئے خیال ہوتا ہے کہ سرشار کے سامنے کون سی شئے تھی کون سا خیال تھا جس کے ماتحت اس نے اتنے فسانے لکھے۔ اس کے دوسرے ناول پڑھنے سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ لکھنؤ اور اس کے گردونواح کی سوسائٹی ہی ایک ایسی چیز تھی جس سے سرشار کو دلچسپی ہے۔ اور اس دلچسپی میں بھی اونچے طبقے کو خصوصیت حاصل ہے۔ یہی سوسائٹی اس کے دماغ سے کاغذ پر اترتے وقت عجیب رنگارنگ کیفیت حاصل کر لیتی ہے اس معاشرت کو وہ اپنے ناول میں پیش کرتا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ مرغ بازی، بٹیر کی پالیاں، دنگل، براتیں، جنازے، بازاری لڑائیاں، ایسی باتیں ہیں جن کے متعلق اسے لکھنا نہیں آتا۔ نہیں، بلکہ ان کے متعلق جب وہ لکھتا ہے تو اسکی قوت بیانیہ پورے زوروں پر ہوتی ہے۔ اور وہ حقیقت نگاری کے معراج پر جا پہنچتا ہے۔ مگر اسے زیادہ لگن اسلامی گھرانوں کے متعلق لکھنے کی تھی۔ نوابوں کے ڈیرے اور بیگمات کی زندگی، یہ دونوں چیزیں اسے بہت مرغوب تھیں۔ سیرت نگاری سے اسے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اور نہ سیرتوں کے تنوع سے کبھی سوسائٹی کی تصویر کھینچ لینا ہی اسے آتا تھا۔ بلکہ معاشرتی جزویات کو اس طرح کام میں لانا کہ ان کے تدریجی اجتماع سے پلاٹ کے واقعات خود بخود پیدا ہو جائیں یہ بھی اس کا مطمح نظر نہ تھا۔ اور لطف یہ کہ اپنے زمانے کی معاشرت کی تصاویر بھی پیش کرنا اسے مطلوب تھا۔ اور ان پہ تبصرہ کرنے کو بھی اسکا جی چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈان کوئکزوٹ کی برابری کرتے وقت اس کا فسانہ ناولسٹ سماٹیلٹ کے شاہکار راڈرک رینڈم کے زمرہ میں آشامل ہوا۔

راڈرک رینڈم کی قسم کے دو تین اور ناول دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ان میں گل بلاس اور ٹام جونس، اول فرانسیسی اور دوسرا انگریزی، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ ٹام جونس جو اٹھارھویں صدی میں ہنری فیلڈنگ نے لکھا تھا ان سب سے بلحاظ سیرت نگاری، ساخت اور کیفیت کے فوقیت رکھتا ہے۔ مگر یہ سب ناول پکارسک[1] ناول ہیں۔ اس طرز سے مراد وہ ناول ہیں جن میں ناولسٹ وسطی کیریکٹر یعنی بطل قصہ کو مختلف مناظر میں سے، مختلف واقعات

1. Picaresque.

میں سے یکے بعد دیگرے نکلتا ہے۔ اور انہیں واقعات کے ذریعے سے اور اشخاص قصے میں داخل کرتا ہے اور اس طرح کسی سوسائٹی کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ اس میں شرط یہ ہوتی ہے یا قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ ہیرو ہر واقعہ کی جان ہوتا ہے یعنی ہر جگہ وہ موجود ہوتا ہے۔ اور ناول کا ہر واقعہ اسکی موجودگی میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ گویا کہانی ہیرو کے گرد لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ مگر سرشار اس طرز پر بھی قائم نہیں رہتا۔ وہ آزاد کی موجودگی کو لازمی نہیں سمجھتا اور یہی وجہ ہے کہ کتاب میں یک رنگی موجود نہیں۔ کوئی ایسا مرکزی عمل[4] نہیں جس کی معاونت ہر واقعہ کرے۔ جس میں ہر واقعہ ایک کڑی کی صورت میں ملے اور عمل کی ترقی میں شامل ہو۔ افرادِ قصہ پلاٹ یا عمل کے اجزا کے طور پر وضع نہیں کئے گئے یعنی ان کا خلاّق پلاٹ نہیں۔ وہ پلاٹ کی وجہ سے ظاہر نہیں ہوئے۔ اور لطف یہ ہے کہ اگر وہ پلاٹ کے ماتحت نہیں تو آزادانہ طور پر انہیں زندہ رہنا چاہئے تھا۔ سو اس لحاظ سے بھی فقط ثریا بیگم یا سپہر آرا وغیرہ مستثنے ہیں جنکا اصل کہانی یعنی آزاد اور حسن آرا کی کہانی سے کوئی واسطہ نہیں۔

اگر فسانۂ آزاد میں صرف شرفائے لکھنؤ اور محلات کی طرزِ معاشرت ہی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اصلیت پر مبنی نہیں۔ مثلاً حسن آرا اور آزاد کی ملاقات ہی کو لے لیجئے۔ یہ طرز ملاقات واقعی چھوڑ رومانی[1] بھی نہیں۔ محض تصوری ہے۔ یو۔پی تو کیا ہندوستان بھر میں اور ہندوستان ہی پر کیا موقوف ہے باقی دنیا میں بھی جہاں معاشرتی آزادیاں بہت ہیں وہاں ایسا عجیب و غریب واقعہ شاید ہی کسی کو پیش آیا ہوگا۔ البتہ مثنویات میں جنوں اور پریوں کے قصوں اور ہماری جلیل القدر رومانسوں[2] میں ایسے واقعات ضرور ملتے ہیں۔ یہاں سرشار پہ مشرقی فسانوں مثلاً حاتم طائی کے قصے وغیرہ کا بہت اثر پڑا ہے۔ سپہر آرا اور ہمایوں فر کی عشق بازی بھی عصری زندگی کا عکس رنگیں ہے ہمایوں فر کا باغ میں مالی کے لڑکے کے بھیس میں آنا تو ہندوستانی قصوں سے ملتا جلتا ہے۔ آزاد کا یک دم عاشق ہو جانا بھی طلسم ہوشربا کی رسم ہے۔ اور اسی پر اکتفا نہیں بلکہ فریقین کے بیک وقت اور فوراً بیہوش ہو جانے کی رسم بھی طلسم ہوشربا کی شرمندۂ احسان ہے۔

لکھنؤ کے اسلامی طبقے کی معاشرت اور محلات، بیگمات، مغلانیوں وغیرہ کی زندگی جہاں تک اس کا تعلق طرزِ بیان اور گفتگو سے ہے بہت اچھی طرح ظاہر کی گئی ہے۔ گفتگو کی اصلیت اور سچائی میں یعنی واقعیت میں کسی کو کلام نہیں۔ بیگمات کے معاشرتی تعلقات، میل جول، رسوم، شادی بیاہ، تہوار ۔ ۔ بے نظیر انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ البتہ ان پر تخیلی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ مستورات کی بول چال گپ۔ شپ، ادھیڑ پن اسی

---

1. Romantic

Gil Blas 2. Tom Jones 3. Picaresque Novels 4. action

طرح بے ترتیب، بلا نتیجہ، اور بلا مقصد بیان کی گئی ہے جیسے زندگی میں ہوتی ہے۔ مگر بعض جگہ یہ گفتگو بہت ٹھوس اور علمی ہو جاتی ہے اور جوان لڑکیوں کی گفتگو میں تو اشعار کی بھرمار ہے۔ انہیں پر کیا منحصر فسانۂ آزاد میں سب کو شعر خوب یاد ہیں۔ طریقہ تصنع پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور اس سے بیان بے لطف ہو جاتا ہے۔ ان معاشرتی مرقعوں میں بعض جگہ نزاکتِ بیان اور لطافتِ حسن بلکہ روشن خیالی کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔ مگر اس کے باوجود ان میں گہرائی نہیں ملتی۔ سطحیت کا عیب عام ہے۔ افراد کی نفسیاتی تحلیل نہیں، انکے ارادوں کے پوشیدہ محرکات بھی واضح نہیں کئے گئے۔ جذباتی تفصیل، اور اس کا اثر افراد کے کردار پر کچھ موجود نہیں۔ سرشار نے اپنی تصویر کو کسی طرح میلا نہیں ہونے دیا۔ یعنی جذباتی تکدر سے یہ سنہری دھند جس میں وہ حسن آرا اور اسکی بہنوں اور سہیلیوں کو ملفوف کر دیتا ہے، ملوث نہیں ہوئی۔ اس لئے یہ تصویر بہت اُجلی ہے، بہت حسین ہے یہی وجہ ہے کہ حسن آرا کی زندگی دل پر زیادہ اثر نہیں کرتی شاید جو اثر پیدا بھی ہو سکتا تھا اسے سرشار کی عادتِ دیرینہ یعنی تسلسلِ مضمون نے ضائع کر دیا ہے کیونکہ بعض جگہ تو وہ ایسی غیر ضروری اور غیر متعلق باتیں شروع کر دیتا ہے کہ طبیعت منغص ہو جاتی ہے اور تمام اثر ضائع ہو جاتا ہے۔ دراصل سرشار ایک جرنلسٹ طبیعت اور انداز کا مالک تھا۔ ایسے انہی مضامین، یعنی شادی بیاہ کے چرچے، تعزیت و عبادت کے مواقع وغیرہ کے بیان کرنے میں ایسا لطف آتا تھا کہ وہ اصل موقع کو بھول جاتا تھا۔

جہاں تک آزاد کے ترکی میں قیام کا تعلق ناول سے ہے۔ اور جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں اس کے متعلق یہ کہہ دینا کافی ہے کہ یہاں سرشار نے اپنے تئیں دھوکا دیا۔ آزاد کی دوستیاں خواہ وہ تختۂ جہاز پر ہوں یا قسطنطنیہ میں، خواہ فوج کی قیادت کا سوال ہو یا ذاتی تہوار کا، یہ سب باتیں اسکی طبیعت کے منافی نہیں۔ مگر ہندوستان کا آزاد اور چیز ہے۔ اور اگر سرشار اسے ہندوستان یعنی صوبۂ اودھ تک ہی محدود رکھتا اور اس کی فطرت کی جولانی کے لئے اور معرکے وضع کرتا تو یقیناً آزاد موجودہ آزاد سے بہتر ہوتا۔ جنگ ایک ایسی چیز تھی جس کا علم سرشار کو نہ تھا اور نہ یہ مضمون اس سے اچھی طرح نبھ سکا۔ اگر کسی جگہ شرر کا اور سرشار کا مقابلہ یا موازنہ کیا جا سکتا ہے تو یہی جنگ کے بیانات ہیں۔ شرر ایک رومانی تھا اور سرشار ایک اصلیت نگار مگر جنگ کے اذکار اگرچہ شرر میں بھی اصلی معیار پر نہیں ملتے۔ جیسے کہ داستان پاستان میں ہیں، مگر سرشار سے بہتر ہونگے یعنی ملک عبدالعزیز ورجنا کا جنگی حصّہ تو سرشار کے بیان سے اچھا ہے۔ جہاں سرشار شرر سے قوتِ بیان اور مشاہدہ اور قوتِ تخلیق اور سیرت نگاری میں بہتر ہے وہیں شرر رزمیہ بیانوں میں سرشار سے بہتر ہے اس ضمن میں مس کلیر ساوالے واقعہ پہ نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔ یہ واقعہ تضنّع سے پُر ہے۔ یہاں بھی سرشار داستانِ امیر حمزہ کے زیرِ اثر ہے جہاں اس قسم کے نسائی شہسوار بہت سے ہیں۔ خصوصیت سے گیلی سوار جو بعد میں بدیع الزماں کی والدہ ہوئی۔ اگرچہ پیرایہ مختلف ہے۔ اور اس جگہ سرشار کے الفاظ اور اس کی تحریر مزاحیہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور مزاحیہ ہی نہیں بلکہ یہ مبارزہ بالکل کامک ہے یعنی انداز ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ سرشار کسی فرد کو اسوقت اسکی حقیقی حیثیت میں نہیں لے رہا بلکہ

ان کو اس حیثیت سے دیکھ رہا ہے کہ وہ فقط ہنسی اور ظرافت اور تفننِ طبع کے لئے وقف معلوم ہوتے ہیں۔ اور یہ بات سرشار کے کمالات میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے کہ وہ کسی واقعہ کو گرد و پیش کے فطری رشتوں سے توڑ کر ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جس کے باشندے عمرو عیار، خوجی، سانکو پینزا، فالسٹاف[1] جیسے افراد ہیں۔

پولینڈ کی شہزادی والا واقعہ بھی "داستان" کی یادگار ہے۔ اس میں بھی بار بار حسین جادوگرنیاں امیر حمزہ کے لڑکوں اور نبیروں پر عاشق ہو کر انہیں اٹھائے جاتی ہیں اور ان سے وصل کی خواہشمند ہوتی ہیں۔ بلکہ انکے انکار پر انہیں قید کر دیتی ہیں اور عذاب دیتی ہیں حتیٰ کہ شہزادوں کے عیار انہیں آ کر چھڑا دیتے ہیں۔ اس موقع پر بھی سرشار نے اپنا اصل رنگ کھو دیا ہے۔ اگرچہ خوجی کی آمد سے اور اسکی مصلحت آمیز صلح سے کہانی میں چاشنی پیدا ہو جاتی ہے مگر غیر ضروری۔ کیونکہ خوجی کا بھی اصل مقام ہندوستان یعنی لکھنؤ ہے۔ جہاں وہ ہر وقت اپنی حقیقی آب و تاب میں نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود کتاب کے اس حصے میں اگر کوئی چیز دلچسپی پیدا کرتی ہے تو وہ خوجی کی موجودگی ہی ہے۔ خوجی کا کردار دنیا کے ادبی جواہر ریزوں میں سے ہے۔ اسکا آزاد سے چمٹا رہنا اور اپنے افیونی فلسفہ سے دورانِ گفتگو میں آزاد کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہنا اپنے نقطۂ نظر کی وجہ سے آزاد کے مثالی عزائم اور تخیلات کی دنیا میں ہوش اور واقفیت "اور روز مرّگی" قائم کرنا۔ یہ باتیں اس ترکی حصۂ کتاب کی جان ہیں۔ جسطرح داستان اور طلسمات میں عمرو عیار رجو بذاتِ خود ایک عظیم ادبی کارنامہ اور اعلیٰ درجہ کی تخلیق ہے۔ امیر حمزہ کے ساتھ سایہ کی طرح رہتا ہے اور اپنی خست اور ہیبت کذائی سے داستان میں رنگینی اور ظرافت پیدا کرتا ہے ویسے ہی خوجی اپنے افیونی کیف سے کتاب کو لالہ زار بنا دیتا ہے۔ جہاں خوجی ہوتا ہے سورج چمکتا رہتا ہے افسردگی، ملال، تکدر، پاس نہیں پھٹکتا۔ اگرچہ بعض جگہ اسکی باتیں تکرار کے باعث بے مزہ اور بعض جگہ بھونڈی بھی ہو جاتی ہیں اور صحیح مذاق سے گر جاتی ہیں۔ مگر اکثر مقامات پہ خوجی ظرافت کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ اور اگر یہ ٹھیک بھی ہو کہ "ہائے نہ ہوئی میری قرولی" کی پکار کئی دفعہ پھیکی اور گراں ہو جاتی ہے۔ مگر دورانِ جنگ میں "خوجی دن" جب خواجہ بدیع الزماں پاشا و شکوہ روسیوں سے لڑتے جاتے ہیں اور واپسی پر ہندوستان میں اپنے حقیقی بھائی خواجہ رفیع الزماں سے انکی لڑائی، اور آزاد کی روانگی کا دن، ان چیزوں میں سے ہیں جن پر اردو کو ناز ہے انہیں میں سرشار کی ظرافت نگاری کا کمال ظاہر ہوتا ہے سیاحِ فسانے میں خوجی کی نکتہ آرائیاں خواہ وہ اپنے متعلق ہوں یا جنگ کے فواید اور نقصانات پر، یا ہتھیاروں پر یا آزادی پر یا اس کی محبتوں پر، بہت ہی پر لطف ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ انگلستان کے مشہور ناولسٹ چارلس ڈکنز کی طرح سرشار کو بھی بس کرنا نہیں آتا تھا ضبط ایک ایسی چیز ہے جس سے اسے قطعاً انس نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فسانے کا ڈھانچ بہت ڈھیلا ہے اور افراد قصہ بے وجہ طوالت اور افراطِ بیان کے باعث کئی جگہ مسخ ہوتے ہوتے رہ گئے ہیں۔

---

[1] شیکسپیر کے ڈرامے ہنری چہارم کا مشہور کردار۔

فسانۂ آزاد کے نسائی کیرکٹروں میں سپہر آرا سب سے کامیاب ہے اس کے مقابلے میں حسن آرا پھیکی، بے رنگ اور جذباتی[1] ہے سپہر آرا فسانے کی بہار ہے۔ اس کا الّہڑ پن، اس کی شوخی۔ اس کی حاضر جوابی، اس کی چلبلاہٹ، اس کا بانکپن بے حد دلنواز ہیں۔ حسن آرا، حسن کی، فہم کی، سیرت کی مثال ہے۔ اور اس کا حشر بھی مثال کا سا ہے وہ ایک نقش[2] ہے اور باقی سب کم وبیش اسی کی نقلیں ہیں اور اسی سے کسب زندگی کرتی ہیں۔ مگر سپہر آرا ایک نمایاں شخصیت کی مالک ہے اور ان سب سے زیادہ جان رکھتی ہے۔ شاید یہی ایک ایسا کردار ہے جس میں کسی قسم کا ارتقا پایا جاتا ہے ورنہ باقی سب کیرکٹر ساکن[3] ہیں۔ یعنی ان میں نشو ونما نہیں ہوتی۔ اور جن خاصیتوں کو لے کر وہ فسانے میں شامل ہوئے تھے بغیر کسی قسم کی کمی بیشی کے وہ اسی طرح فسانے کے اختتام تک موجود رہتے ہیں سپہر آرا کی زندگی ہی میں انقلاب آتا ہے اور اس کی شوخی اور خوشی اور رنگینئ طبع زائل ہو جاتی ہے۔ مگر جب تک ہمایوں فر کی موت نہیں واقع ہوتی سپہر آرا کی باتیں خواہ وہ حسن آرا سے ہوں یا بہار النسا اور دوسری بہنوں اور سہیلیوں سے بے حد دلکش ہوتی ہیں جب آزاد چلا جاتا ہے اور حسن آرا مغموم رہنے لگتی ہے تو سپہر آرا ہی اسے بہلاتی ہے اور جو تسلیاں اور دلاسے وہ حسن آرا کو دیتی ہے اگرچہ ان میں اکثر باتیں حسرت آمیز ہوتی ہیں مگر اس کی بذلہ سنجی ہمیشہ غم ربا اور دل خوش کن ہوتی ہے اور یہی باتیں اس حصہ کی روح ہیں +

دوسرا کردار جو خاص سرشار کی قوتِ تخلیق کا نتیجہ ہے وہ ثریا بیگم ہے۔ یہ عورت جو پہلے ایک ستر برس کے بوڑھے کی بیوی تھی اور پھر بھٹیاری بنی اور بعد میں آزاد پر عاشق ہو کر جہاں نور دین گئی اردو ناول میں ایک نئی چیز ہے۔ اگر اس کردار پر لفظ "واقعی" عاید کیا جائے تو شاید ٹھیک نہ ہو۔ "ثریا بیگم" دراصل سرشار کی ذہنی کیفیات کا اُبال ہے۔ سرشار نے اسے اتنی روح اور زندگی اور ہمت ودلیعت کی ہے کہ خواہ کیسی مشکل الجھن میں پھنسی ہو اس کی ذکاوت اسے وہاں سے صحیح وسالم نکال لاتی ہے۔ اور اپنی ہمت اور ہوشمندی کے طفیل وہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ گھرانوں میں اسے دیکھ لو۔ اور شہر کے مشکوک سے مشکوک طبقہ میں اسے پا لو۔ ہر جگہ اپنی زبان اپنی عقل، اور حسن کے طفیل رونق محفل ہو گی۔ اس کی سیماب فطرتی ہی اسے ایسی مصیبتوں میں پھنسا دیتی ہے جہاں وہ ایک امیر بیگم کی حیثیت سے رہتی ہے اور تھانیدار سے اور نقلی آزاد سے اسکی نوک جھونک ہوتی ہے وہاں وہ اپنے کمال پر ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود اس کا آزاد کے عشق میں ثابت قدم رہنا اور اسی کے باعث بہت سے جھگڑوں میں پڑنا اور دھوکے کھانا۔ اسکی سیرت کو کامل بنانے میں مدد دیتا ہے

مگر بحیثیتِ مجموعی یہ کہنا پڑتا ہے کہ سرشار کی سیرت نگاری میں بہت سی کمیاں ہیں۔ جذباتِ انسانی کا

---

1. Sentimental
2. Pattern
3. Static

اسے کوئی گہرا علم نہیں تھا۔ محبت کی بین القلبی کشاکشوں یا اسکے تیز و تند مظاہرات یا اسکی تحلیل، یا اسکے باہمی عمل وردِ عمل، یا اسکے لاگ لگاؤ سرشار کے دائرہ زندگی اور تخیل میں نہیں آئے تھے۔ اسے تو محبت کی سادہ کہانی کہنی آتی ہے اسکے ہاں تو قیس لیلی پر عاشق ہو جاتا ہے پھر کسی وجہ سے خواہ کسی اصول کے ماتحت خواہ والد یا والدہ کی بدولت، خواہ رسم و رواج کے طفیل ان میں علیحدگی ہو جاتی ہے فراق کی تصویریں ہوتی ہیں۔ رونا ہوتا ہے، بلکنا ہوتا ہے پھر ملاپ ہوتا ہے اور بعد میں ایک دوامی معانقہ ہوتا ہے۔ اگرچہ اُس کا دماغ اس کہانی میں کوئی جدت نہیں پیدا کر سکتا تھا پھر بھی اس نے آزاد کو بیسیوں ہی معاشقوں میں پھنسایا ہے۔ یہ علحدہ بات ہے کہ اس زمانے کے لکھنؤ میں ایک نوجوان کے لئے یہی مناسب ہو کہ جگہ جگہ عاشق ہوتا پھرے بات بات پر دل بیچتا پھرے، لمحہ لمحہ میں بیہوش ہوتا پھرے اور ہر فسانہ کے ہیرو کی بہترین خوبی یہ گنی جائے کہ سو صفحات میں دس دفعہ حضرت نت نئے، حسین پر جان دیں اور انکی زندگی تمام کیوپڈ (عشق کے دیوتا) کے جال میں پھنسنے، نکلنے اور پھر پھنسنے ہی میں گذر جائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر ضلع عصری فیشن اور ادبی رواج و روایات سے متاثر ہوتا ہے۔ سرشار کے دنوں میں یہ فیشن بہت مقبول تھا کہ نوجوانانِ لکھنؤ کی تعلیم میں، آداب میں، دماغی تکمیل اور اجتماعی ترکیب میں سریع الحسی اخل ہو۔ یعنی کسی چلمن سے کسی مہ پارہ کی جھلک پڑی اور فوراً اندھے ہو گئے کسی گاڑی سے گذرتے ہوئے کسی کا ہاتھ دکھائی دیا اور صبر و قرار کھو دیا۔ کسی طریقہ سے بیاہ میں میلے میں، عید کو، شب برات کو، ہولی کو، دیوالی کو کسی کو ایک پل کے لئے دیکھ لیا اور پھر آب و دانہ حرام، شب و روز آہ و زاری، بیقراری اور رہین اور فلکِ کجرفتار کو گالیاں۔ خون دل کھانے کو ہے اور لختِ جگر پینے کو ہے مسیحا کے لئے پکار ہے۔ اور قبر اور فاتحہ کے قصے ہیں۔ سرشار نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اس لئے ان اثرات سے اس جیسا آزاد دماغ بھی نہ بچ سکا۔

اگرچہ فسانۂ آزاد کے معاشقات میں لکھنؤ کی "مریضانہ جذبات پرستی"[1] نہیں۔ مگر انکی بہتات اور اُن کا تواتر عصری اثرات کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت آزاد کثیر المعشوق ہیں بیبات جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا سب سے زیادہ طلسم ہوشربا میں پائی جاتی ہے جس کا ترجمہ غالباً اسی صدی کے وسط میں اردو میں ترجمہ ہوا تھا۔ اور جس کا اثر ضرور ان سب کتابوں پر ہوا ہو گا جو اسی زمانہ میں شائع ہوئیں۔ مثلاً ہوش ربا کے ہیرو اسد نامدار، مہ جبین، لعل سخندان، لالارخ نقابَ بنت حکیم آزاد بخت وغیرہ کے علاوہ درجنوں حسینان ہوش ربا پر ہزار جان سے عاشق ہے۔ مگر وہاں اسد غازی میں اتنی شرافت موجود ہے کہ بیچارہ آخر میں چپ چاپ سب سے شادی کر لیتا ہے۔ مگر یہاں ثریا بیگم، بہار النسا (اگرچہ وہ شادی شدہ ہے) مس کلیرسا، مس مٹیڈا اور پولینڈ کی شہزادی سے بہت برا سلوک کیا جاتا ہے خصوصاً

1. Sickly sentimentality

مس کلیرسا اور مس میٹلڈا کو جب سرشار اور کچھ نہیں دے سکتا تو محکمۂ تعلیم ہی میں دھکیل دیتا ہے۔ اور بیچاری ثریا بیگم کے ساتھ جو آزاد کے عشق میں کہیں کی نہیں رہتی جو برتاؤ سرشار روا رکھتا ہے وہ نہ تو فنی لحاظ سے قابل ستائش ہے نہ مشرقی اخلاق و روایات کے مطابق ہے۔

آزاد کا حسن آرا سے عشق امیر حمزہ اور ملکہ مہر نگار کے عشق کا عکس لئے ہوئے ہے۔ فرق یہ ہے کہ داستان میں نوشیرواں اور اسکا وزیر بختک امیر حمزہ کو ملک بہ ملک نت نئی مہم پر بھیجتا رہتا ہے۔ اور یہاں حسن آرا یہ خدمت اپنے سر لے لیتی ہے۔ داستان میں حمزہ مفتوح بادشاہوں کی لڑکیاں، بہنیں، بیاہنے سے انکار کرتا ہے کیونکہ اس نے مہر نگار سے عہد باندھ رکھا ہے کہ اس سے شادی ہونے سے پہلے کہیں اور بیاہ نہیں کریگا۔ اگرچہ کوہ قاف میں امیر صاحبقران مدظلہ آسمان پری سے بے دریغ شادی کر لیتے ہیں۔ اور فسانۂ آزاد میں میاں آزاد سوائے پولینڈ کی شہزادی کے جس سے رہائی پانے کے لئے وہ خوجی کو مشورے کے مطابق مجبوراً عارضی نکاح کر لیتے ہیں۔ باقی سب حسینوں سے عجیب کج ادائی سے پیش آتے ہیں۔ معلوم نہیں اس طرح سرشار نے اپنے وطن کی کج ادا اور کم آمیز عورتوں سے انتقام لیا ہے یا کیا؟ —

آزاد ایک مثالی ہیرو[1] کا عمدہ نمونہ ہے یعنی تمام کمالات کا مجموعہ، تمام صوری اور باطنی خوبیوں کا مرجع رفتار میں گفتار میں، اخلاق میں، ہر بات میں بے نظیر ہے بہادری کا یہ عالم ہے کہ فرزندان حمزہ کی طرح یا پولینڈ کے مشہور ناولسٹ سنکی وکز[2] کے ہیرو مائیکل کی طرح ایک حملہ میں دستے کے دستے فوج کے تباہ کر دینے کی قوت رکھتا ہے۔

مگر سرشار کردار کی تخلیق میں یا فسانوی شخصیات کو زندہ کرنے میں زیادہ ماہر نہ تھا۔ مثلاً اسکے افرادِ قصہ ظاہری طور پر تو سبھی کچھ رکھتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ کاغذ اور سیاہی کے بنے ہوئے ہیں۔ گوشت پوست نام کو نہیں خیال ہوتا ہے کہ اگر فسانۂ آزاد کے جمیع افراد کو لیا جائے اور اندازہ کیا جائے کہ انسانی عناصر میں سے گوشت اور خون یعنی بشریت ان میں کس درجہ تک ہے۔ تو اس زبان زد خلائق مصرع کے مصداق ہو گا ؂

جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

انگریزی کا ایک نامور نقاد کہتا ہے کہ کیریکٹر یعنی کردار دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک جنکو وہ "چپٹا" کہتا ہے۔ دوسرے جنہیں وہ "گول" کہتا ہے "چپٹے" کردار سے اسکی مراد ان افرادِ قصہ سے ہے جو فقط مصنف کے سطحی مطالعۂ زندگی اور قدرتِ تخلیق کی وجہ سے فقط دو ابعاد کے مالک ہوتے ہیں۔ یعنی گہرائی بالکل نہیں رکھتے۔ مصنف کسی شخص کی دو ایک

1. Ideal Hero

2. Sienkiewicz

خصوصیات لے کر انہیں ایک نام دے دیتا ہے، مگر ان میں "زندگی" نام کو نہیں ہوتی۔ خود وہ کوئی ذاتی شخصیت نہیں رکھتے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو فقط کاغذی تصویریں ہوتے ہیں جنہیں مصنف اپنی قدرت سے ناطق اور متحرک بناتا ہے "گول" افراد سے مراد وہ فسانوی شخصیات ہیں جو فقط کاغذ کے نمونے کی طرح لمبائی اور چوڑائی ہی نہیں رکھتے بلکہ گہرائی بھی رکھتے ہیں۔ یعنی اُن کی شخصیت کامل ہے "آپ" پورے خواص بشری کے حامل ہوتے ہیں، ہماری طرح دل رکھتے ہیں، جان رکھتے ہیں، خون رکھتے ہیں اور کتاب میں ان کے متعلق کچھ پڑھنے سے ہمیں زندگی کا احساس ہوتا ہے۔

مگر "چپٹے" کردار کی ایک یہ خصوصیت ضرور ہے کہ وہ ان لوگوں کی طرح جنکی کوئی ذاتی خصوصیت بہت نمایاں ہو لوگوں کے ذہن میں اور یاد میں بہت جلد محفوظ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بعض لوگ بولتے وقت کسی جملے کو یا لفظ کو بار بار دہراتے ہیں۔ یا اُنکی عادت ایک آنکھ بند کر کے گفتگو کرنے کی ہوتی ہے۔ بعض لوگ جوش کے وقت موقع بے موقع تالی بجا دیتے ہیں یہ اور ایسی ہی دوسری عادات ہمیں بہت جلدی اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ جیسے فسانۂ آزاد میں خوجی ہے کہ ہر وقت "ہائے نہ ہوئی قرولی" کی رٹ لگائے رکھتا ہے یا افیون کی پینک میں غٹ رہتا ہے۔ یا آزاد کی یہ عادت کہ وہ ہر گھڑی اک تازہ حسین کو مقصودِ نظر رکھتا ہے لیکن آزاد ایک ایسا کردار ہے کہ اس کی ظاہری خصوصیات اسے کسی فسانے کے ہیرو سے ممتاز نہیں کرتیں۔ اس لئے آزاد میں ہم ایسی کوئی خصوصیت نہیں پاتے جس کی وجہ سے وہ ہماری یاد میں عرصہ تک قائم رہے۔

انگریزی میں چارلس ڈکنز ایسا ناولسٹ ہے جسکے افراد کسی نہ کسی خاصیت کی بدولت توجہ حاصل کر لیتے ہیں اور ہمیں بھولتے نہیں۔ مثلاً اسکا ناول ڈیوڈ کاپرفیلڈ لے لیجئے اس میں مسٹر مکابر اپنی طبیعت سے مجبور ہر وقت مستقبل پر بھروسہ رکھتے ہیں اور عرصۂ زندگی میں سے اس لا ابالیانہ انداز سے گذر جاتے ہیں کہ ان کا چہیتا فقرہ "کچھ نہ کچھ ضرور بن جائے گا" بھی گراں نہیں گذرتا حالانکہ ہم اس فقرہ کو جا و بے جا سنتے رہتے ہیں۔ اور اگرچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسٹر مکابر کے پاس اگر دوئی ہوتی ہے تو شام کے کھانے سے مستغنی ہو کر اسے فوراً ملائی یا کباب خرید کر خرچ کر دیتے ہیں اور جب کوئی مصیبت آن پڑتی ہے یا کوئی قرض خواہ دروازے کھٹکھٹاتا ہی یا مقدمہ کر کے ڈگری حاصل کر لیتا ہے تو آپ بے فکر ہو کر کسی دوست سے جو ئی ادھار لیکر سگرٹ وغیرہ اڑا لیتے ہیں اور کہتے ہیں تو یہ کہ "بس امید ہے" "کچھ نہ کچھ ضرور بن جائیگا" تاہم ان کی کیفیت پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اگرچہ مصنف نے اس کردار کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی فقط اسکی شخصیت کا ایک رُخ ہی ناظرین کے سامنے پیش کیا ہے پھر بھی زندگی سے اس آدمی کو نسبت ضرور ہے۔ ایسے ہی دوسرے افراد بھی کسی ذاتی عادت یا خاصیت کی بدولت جسے مصنف نے بڑھا کر بیان کیا ہو ہمیں زندہ ہونے کا دھوکا ضرور دے دیتے ہیں یہ کردار "چپٹے" ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ "چپٹی" قسم کی بہترین مثالیں ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ مگر فسانۂ آزاد میں سپہر آرا جو ہمایوں فر کے عشق کی بدولت جاندار معلوم ہوتی ہے) اور ثریا بیگم جو اپنے چنچل پن اور شوخی سے ضرور ایک جھلک ایسی دے جاتی ہے جس سے اسکے حقیقت سے نزدیک ہونے کا گمان ہوتا ہے باقی بہت سے ایسے افراد ہیں جو فقط ایک

ایک دو دو سانس لے کر بت بن جاتے ہیں جنہیں مصنف جہاں چاہتا ہے پھینک دیتا ہے۔

"گول" کردار سے مراد وہ شخصیت ہے جسکے ہر پہلو کو مصنف نے سچ کر دکھانے کی کوشش کی ہو گویا مسیحائی لمس سے زندہ کر دکھایا ہو۔ ایسے کردار فقط کتاب اور اس کہانی کے لئے ہی زندہ نہیں ہوتے بلکہ یوں بھی ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہماری ہی زمین کے باشندے ہیں اور ان کا ذکر اگرچہ ناول میں ہے لیکن وہ ضرور کہیں نہ کہیں رہتے ہونگے اگر ہم چاہیں یا وہ چاہیں تو ہم سے مل سکتے ہیں۔ کتاب سے اس زمین پر اتر کر اُن میں اور ہم میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ البتہ ان کی شخصیت جیسی کہ ہم نے ناول میں دیکھی ہے ہم سے چند باتوں کے سوا خاص طور پر ممتاز ہو گی۔ سرشار میں ہم اتنی قدرت نہیں دیکھتے اسنے ہمیں اودھ کی سوشل یا اجتماعی زندگی کی ایک وسیع تصویر دے دی ہے لیکن اس نے خاص خاص افراد پر غور کر کے، انہیں "زندہ" کر کے، انکے خیالات، عادات اطوار، انداز، مفصل اور بے تکلف طور پر واضح کرنے کی کوشش نہیں کی۔

سرشار تخیل[1] میں کسی سے کم نہیں واقعات کے تنوع اور انکی افراط کو دیکھکر سرشار کے اس کمال میں شک نہیں رہتا جہاں کہیں کوئی موقع ایسا آنکلتا ہے جسمیں وہ قوتِ بیان کے جوہر دکھا سکتا ہے۔ مثلاً کسی برات کا بیان یا محرم یا میلے وغیرہ کا ذکر، تو اس کا قلم اڑا چلا جاتا ہے جہاں موقع ملے سرشار کسی فرد قصہ کے متعلق ایک نیا قصہ گھڑ لیتا ہے پھر ایک نیا افسانہ در افسانہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان ضمنی افسانوں میں سے بعض سے تنگ آکر وہ انہیں ادھورا چھوڑ دیتا ہے۔ مگر ان افسانوں کی کثرت ہی اسکی قوتِ تخلیق کی شاہد ہے۔ دو ایک فسانے جو نامکمل رہ گئے ہیں ان میں وہ ٹھاکر صاحب کا قصہ مہاجن وغیرہ کے معاملے اور ان نواب صاحب کا قصہ قابلِ ذکر ہیں جن کے ہاں ایک بٹیر کے مر جانے پر صف ماتم بچھ جاتی ہے اور بٹیر کی الوہیت پر تقریریں ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ ایسے ہی کئی فسانے بے ترتیبی سے جابجا بکھرے ہوئے ہیں مگر ان سے سرشار کی فوق العادت تخیل کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے بلاشبہ وہ اپنی ان تھک طاقتوں کے ناقابل مدافعت تصرف سے مجبور ہو کر نئے فسانے نئے حوادث نئے واقعات تراشنے میں اردو ادب میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ مگر بعض جگہ وہ حد سے تجاوز کر جانے کے باعث لغزش کر جاتا ہے۔ جیسے ہمایوں فر کے زندہ ہو جانے والے واقعہ سے پتا چلتا ہے۔ خواہ اسکی ظرافت ہو یا اسکا طنز یہ نقطۂ نگاہ، کوئی چیز ایسی نہیں جو یہاں اسکی مدد کرے۔

سرشار کی قوتِ تحریر کے متعلق پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کسی چیز کی تصویر کھینچ کے رکھ دینا اسکے معمولی کمالات میں سے ہے۔ مگر جہاں کہیں برات کی دھوم دھام ہو تو وہ فقط بیان ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ساتھ ساتھ براتیوں کی گفتگو باجے والوں کی چشمکیں، تماشائیوں کی پھبتیاں، غرض کہ سبھی کچھ اس انداز اور اس خوبی سے بیان میں جڑتا چلا جاتا ہے کہ اس کا بیان پڑھ لینا کسی چیز کو آنکھ سے دیکھ لینے سے بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک عام آدمی خود سب کچھ ایک نظر میں نہیں

---

1. Imagination

دیکھ سکتا اور آرٹسٹ کی نظر ہر چیز کو قاعدہ اور تناسب کے ساتھ تصویر میں رکھ دیتی ہے۔ سرشار کی زبان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ کسی نصاب کو اٹھائے دیکھ لیا جائے، کوئی مؤلف ہو، دو ایک چیزیں سرشار کی ضرور شامل نظر آئیں گی محاورے کی صفائی اور روزمرہ کی تاذن کا یہ عالم ہے کہ زبان ہی کے زور سے وہ بعض دفعہ اپنے کردار "زندہ" کر دکھاتا ہے مگر ایک نقص سرشار میں ضرور ہے اور وہ معمولی نقص نہیں۔ وہ یہ کہ خواہ گفتگو ہو رہی ہو۔ خواہ بیان ہ راوی لکھتا ہے" کو وہ نہیں چھوڑتا۔ اس سے پڑھنے والے کو ایک صدمہ سا ہوتا ہے۔ اور کہانی یا گفتگو کا لطف اور اثر زائل ہونے لگتا ہے۔ بلکہ ایک لمحے کے لئے مصنف کی حقیقت نگاری میں شک ہونے لگتا ہے بلکہ افسانے کی زندگی سے جو مشابہت تھی زائل ہونے لگتی ہے۔ اور معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ مصنف تو محض ایک فسانہ لکھ رہا ہے جس کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں پڑھتے وقت اس قسم کا احساس پیدا ہوجانا فسانہ کی روح کو تقریباً تلف کر دیتا ہے۔ حالانکہ یوں بھی تقریباً ہر شخص افسانوں کو فرضی سمجھتا ہے۔

پھر بھی اس کی جادوگری کا یہ عالم ہے کہ فسانہ آزاد کو پڑھ کر اگرچہ ہم یہ محسوس نہیں کرتے کہ یہ اصلی زندگی کی تصویر ہے مگر دل پر یہ خیال ضرور مسلط ہوجاتا ہے کہ سرشار کی دنیا میں ان افراد کی ہستی موجود ہے۔ اور یوں سرشار ایک ماحول ضرور پیدا کر دیتا ہے جس کے اندر اگرچہ اسکے کردار کٹھ پتلیوں کی طرح حرکت کرتے ہیں لیکن ہمیں بہت دیر تک یہ دھوکا[1] ضرور رہتا ہے کہ یہ اصلی آدمی ہیں یہ دھوکا پیدا کرنا بھی ایک آرٹسٹ کا کام ہے۔

انیسویں صدی کے مشہور انگریزی شاعر اور نقاد میتھو آرنلڈ کا قول ہے کہ شاعری تنقید حیات کا نام ہے مراد یہ ہے کہ شاعر اپنے تجربۂ حیات سے متاثر ہو کر ایسے جذبات اظہار کے لئے چنتا ہے ایسے لمحات کا انتخاب کرتا ہے جو اسے اپنے خیال اور تجربے کے صحیح اور کامل اظہار میں مدد دیتے ہیں یہ اظہار اسکے مطالعۂ زندگی اور جذباتی سرمایۂ حیات سے ایسا متاثر ہوتا ہے، اس کے فلسفۂ زندگی سے جو اس کے تجربہ کا نچوڑ ہوتا ہے۔ ایسا رنگا جاتا ہے کہ اسکے اشعار کو اسکی تنقیدِ حیات ضرور کہا جاسکتا ہے۔ یہ بات شعر کے متعلق صحیح ہونے کے علاوہ ناول کے متعلق بھی بہت درست ہے اور یہاں جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، ہم آرنلڈ بینٹ کے دوسرے معیار پر پہنچ جاتے ہیں +

شاید ہی کوئی ناولسٹ ایسا ہوگا جو کسی شئے سے متاثر ہو کر یا کسی چیز سے متنفر یا دل برداشتہ ہو کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فسانے کے ذریعہ سے، نہ کرتا ہو۔ دنیا میں سینکڑوں چیزیں ایسی ہیں جو ہمیں پسند نہیں، جن سے ہمیں روحانی تکلیف پہنچتی ہے۔ ایک سادہ مثال لے لو۔ ایک جوان لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور انکے اقربا یا انکی سوسائٹی یا ان کے مذاہب یا رواجات انکے راستے میں حائل ہو کر انکی زندگی تباہ کر دیتے ہیں۔ ان حالات کو دیکھ کر ضرور سوسائٹی میں چند

1. Illusion

حسّاس آدمی ایسے نکل آئیں کے جوان کی حالت سے متاثر ہوکر ان دونوں کی زندگی کا اپنے ناولوں میں اپنے ڈراموں میں نقشہ کھینچینگے اور انکے طرز بیان میں انکے اپنے جذبات اس طرح ملے ہوئے ہونگے کہ فسانے کا رنگ مصنف کے نقطۂ نگاہ اور فلسفۂ حیات سے متاثر ہوکر رہیگا فسانہ نگار خواہ قنوطی ہو خواہ رجائی، بہرحال اس کا بیان اسکے ذہنی رنگ میں ڈوبا ہوا نظر آئے گا یہی اسکی تنقیدِ حیات ہوگی۔ بلکہ ایسے واقعات کا انتخاب ہی اسکی تنقید سے مملو ہوگا +

مگر مصنف کا کمال اس بات میں ہوتا ہے کہ وہ اپنی تنقید کو اسی طرح اپنی کہانی اور اپنے بیان میں جذب کر دے کہ بظاہر کہانی میں کوئی اجنبیت یعنی مصنف کے اپنے الفاظ سے یہ تنقیدِ حیات ظاہر نہ ہو مثلاً وہ "راوی کہتا ہے" کے ضمن ہی میں اپنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا اظہار نہ کرتا پھرے۔ مصنف کی اپنی رائے، اور اسکا اظہار کہانی کی ساخت میں، افراد کے انتخاب میں، ان کے تعلقات اور میل ملاپ اور بول چال میں مضمر ہو۔ اگر مصنف کوئی پیغام اپنے قارئین تک پہنچانا چاہتا ہے یا اس کا کہانی کے لکھنے سے کوئی خاص مدعا ہو تو اس کا علانیہ، بغیر صحیح فن کاری کے اظہار کر دینا بہت معیوب ہے۔ مصنف کا فرض ہے کہ اپنے خیالات کو اپنے جذبات کو کہانی میں اس طرح پرو کر دے کہ کہانی میں بھی نقص پیدا نہ ہو اور اسکا مقصد بھی پورا ہو جائے۔ اگرچہ یہ باتیں سرشار کے سلسلہ میں بظاہر کچھ بے تعلق ہی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر بغور دیکھنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ زیادہ بے تعلق بھی نہیں کیونکہ سرشار اچھا خاصا نقادِ حیات ہے۔ مگر اس کی تنقید نہایت دقیق اور خاموش ہے جب وہ اپنے فسانے میں ایک ہفتاد سالہ بوڑھے کی ایک کم سن لڑکی سے شادی کا ذکر، نوابوں کے ڈیرے کا بیان، اور گاؤں کے ساہوکار، منشی اور پٹواری اور ملا اور ایسے ہی دوسرے افراد لے آتا ہے تو معلوم ہوتا کہ وہ اپنے زمانے کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے واقف ہے اور خاص طور پر زندگی کے رکیک، سوتیانہ، مسرفانہ، قبیح اور شر انگیز پہلوؤں سے کافی واقفیت رکھتا ہے اور ان کا اظہار اس انداز سے کرتا ہے ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے کہ زندگی کے ان طریقوں سے پڑھنے والے کے دل کو الجھن، بے چینی اور پھر نفرت پیدا ہوجاتی ہے اس سلسلے میں وہ کہانی کو چھوڑ کر نوابی ٹھاٹھ اور بے مقصد زندگی کے خلاف کوئی تقریر نہیں کرنے لگتا کہ "اے جاہل ہندوستان اور اے تباہ ہوجانے والے ملک اور اے بد قسمت لوگو کس قعرِ مذلت میں گرے ہوئے ہو" وغیرہ وغیرہ۔ اور نہ کوئی بسیط مضمون ہی کہیں بے ربطی سے جڑ دیتا ہے۔ اور نہ اسکے افراد ایک دوسرے سے اس ذلیل طریق زندگی کے متعلق گفتگو ہی کرتے ہیں۔ بلکہ وہ فقط ان لوگوں کی زندگی کا ایک ایسا مبالغہ آمیز نقشہ کھینچتا ہے کہ ہم خود ہی جان لیتے ہیں کہ یہ زندگی لاحاصل، ذلیل اور بے معنی ہے مصنف اپنی رائے کا اظہار بھی وقتاً فوقتاً کرتا رہتا ہے۔ مگر اس دبی زبان سے، اس پوشیدہ طریقہ سے کہ معلوم نہیں ہوتا کہ مصنف کا مدعا اس زندگی کا خاکا اڑانا ہے۔ پڑھتے وقت تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرشار کو اس سے بہت لگاؤ ہے اور اس صداقت اور جوش سے وہ اس زندگی کی تصویر کھینچ رہا ہے کہ پڑھنے والے کی توجہ تمام تر اس کے محاسن کی طرف مبذول ہوجاتی ہے +

آخر میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سرشار اپنے تخلیق کردہ افرادِ قصہ سے کیوں کر بٹتا ہے۔ بعض مصنف اپنے افراد سے نہایت نرمی اور ہمدردی کے ساتھ پیش آتے ہیں بعض تو اپنی مخلوق کے عاشق ہوتے ہیں جیسے فرانس میں بالزک اور انگلستان میں فیلڈنگ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے روس میں ڈاسٹووسکی وغیرہ۔ ہندوستان کے ناولسٹ ابھی اس صنعت یعنی کردار کی تخلیق میں ایسے ماہر نہیں کہ کسی خاص ناولسٹ کی طرف اشارہ کیا جا سکے۔ نذیر احمد کے بعض افراد البتہ جیتے جاگتے محسوس ہوتے ہیں مگر جہاں تک اس کی انبساط میں ہے وہ اپنے افراد سے غیر جانبدارانہ اور منصفانہ برتاؤ روا رکھتا ہے خواہ وہ کلیم کی طرح بانکا اور آوارہ ہو خواہ مرزا ظاہر دار بیگ کی طرح ریاکار اور جھوٹا ہو۔ شرر کے افراد تمام تر خاص خاص تاریخی اوقات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اس لئے سب کے سب شہزادے اور ہم شکل اور ہم وضع اور ہم خصلت ہوتے ہیں۔ ان سب کی طرف شرر کی توجہ اتنی ہی ہوتی ہے جتنی توجہ ان کو کہانی میں استعمال کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے بھی کہ شرر عموماً کہانی کی ترکیب اور تعمیری دلچسپی کے پہلو کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے اور دلچسپی پیدا کرنے کو کردار پیدا کرنے پر ترجیح دیتا ہے۔

مگر چند مصنف ایسے بھی ہیں جن کے افراد ان کے تنفر سے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسے فسانہ نگار اپنے افراد سے ہمیشہ حقارت اور نفرت سے پیش آتے ہیں۔ آج کل ایک انگریز ناولسٹ آلڈس ہکسلے ہے جو اپنی فسانوی مخلوق سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔ پچھلی صدی میں چارلس ڈکنز ایک ایسا مصنف تھا جو چند افرادِ قصہ سے ضرور مخالفت سے پیش آتا تھا اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ افراد بالعموم کسی سماجی قباحت کے اظہار کے لئے تخلیق کئے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک ناول نکولس نکل بی میں وہ پرائیویٹ اسکولوں کے ظالم ہیڈ ماسٹروں کی گت بنانا چاہتا تھا۔ اس لئے اس ناول میں ایک ماسٹر تخلیق کرتا ہے جس کا نام ماسٹر سوکیٹیرز ہے۔ ایسے بے رحم ماسٹروں کی بیخ کنی ہو بھی اسی طرح سکتی تھی مگر سرشار ڈکنز سے زیادہ متین اور فراخ طبیعت کا مالک تھا۔ وہ اپنی نفرت کو اپنی طبیعت پر مسلط نہیں ہونے دیتا تھا۔ نیز اسے صرف کہانی کہنے ہی میں وہ لطف آتا تھا کہ سوسائٹی کی بہتری، خرابیوں کے استیصال، خوبیوں کے پرچار وغیرہ کو وہ کہانی پر کبھی ترجیح نہیں دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سرشار فسانۂ آزاد کے تین ہزار صفحات میں نہایت خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے سکراتا نظر آتا ہے۔

"اردو ناول" میں سرشار کی پوزیشن کے متعلق ابھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس باب میں نہ ابھی زیادہ لکھا ہی گیا ہے اور نہ کوئی تنقیدی کام ہی ہوا ہے۔ مگر چونکہ ہر ادبی تخلیق کی آخری منصف پبلک ہے اور سرشار اب بھی اتنا ہی مقبول ہے جتنا ۱۸۸۰ء میں تھا اور جہاں کہیں اردو پڑھی جاتی ہے سرشار کی شہرت اور مقبولیت بھی عام ہے اور پھر فسانۂ آزاد کی گوناگوں خوبیوں سے کوئی ہوشمند شخص انکار نہیں کر سکتا اس لئے ہم بلا خوفِ تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمد حسین آزاد کے "بقائے دوام کے دربار" میں سرشار کو ضرور ایک اعلیٰ مقام مل چکا ہوگا۔

فیاض محمود

سلمیٰ کے کھلونے

سوتے سوتے جو رات آنکھ کھلی — شعر کہنے کو بیقرار تھا جی
لمپ کی روشنی کو تیز کیا — اور اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا
ہر طرف چھا رہی تھی خاموشی — تھی تو آواز گرم سانسوں کی
اک طرف سو رہی تھی وہ دمساز — جس کے دم سے ہے زندگی میں گداز
رہروِ راہِ صدق و مہر و وفا — باعثِ خیر و برکتِ دنیا
اور اِک سو رہے اک کھٹولے پر — ماں کی آنکھوں کا نور، جانِ پدر
اک ننھی سی جان، ہاتھ جلائے* — ٹھنڈ سی پڑ گیا تھا جس کا گلا
بے خبر رکھے ہاتھ اک سر پر — سو رہی تھی سفید بستر پر
(سوؤ آرام سے مرے پیارو! — صبح تک شام سے مرے پیارو!)

خیر لکھنے کو جب قلم ڈھونڈا — مفت کا جیسے اک الم ڈھونڈا
نہ سرہانے کتاب میں پایا — نہ وہ تکیوں کے نیچے مجھ کو ملا
سامنے میز پر نظر ڈالی — وہ بھی آئی مجھے نظر خالی
ہاں مگر ایک لابنی سی ڈبیا — کبھی صابن کی جس میں تھی ٹکیا
اس پہ میں نے دھری ہوئی پائی — اور ڈبیا بھری ہوئی پائی
سخت حیرت کہ یہ کہاں آئی — کس طرح اور کب یہاں آئی
کھولی ڈبیا تو تھی عجب حالت — کیا کہوں تم سے اس کی کیفیت
نہ تو پیسے تھے اور نہ تھے دھیلے — مٹی کے چھوٹے چھوٹے دو ڈھیلے

واہ سلمیٰ! تمہارے کیا کہنے
کھیل یہ پیارے پیارے کیا کہنے

جلیل قدوائی

* ہاتھ جل گیا تھا

غزل

جفا کر رہے ہیں جفا کرنے والے ۔۔۔ دُعا کر رہے ہیں دُعا کرنے والے

غضب ہے کہ نا آشنا ہیں وفا سے ۔۔۔ وفا سے مجھے آشنا کرنے والے

نگاہوں کے تیروں سے مارا ہی تو نے ۔۔۔ نگاہوں سے میری حیا کرنے والے

یہ ٹوٹا ہوا دِل مجھے کیا دیا ہے؟ ۔۔۔ عطا کر کوئی شے عطا کرنے والے

غمِ بے نوائی سے واقف نہیں ہیں ۔۔۔ غمِ یار پر اکتفا کرنے والے

کہوں کیا دوا کرنے والوں سے عابدؔ
کئے جائیں کوشش دوا کرنے والے

عابد علی عابدؔ

شہرۂ آفاق ادیب ڈاکٹر جانسن

سے

میری پہلی ملاقات

۱۷۶۳ء میرے لئے ایک قابلِ یادگار سال ہے، کیونکہ اس سال مجھے ایک نہایت اہم ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی۔ اسی ملاقات کی کیفیت میں اب ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں۔ میں بیس سال کی عمر ہی سے امامِ علم جانسن کی علمی تصانیف کا مطالعہ کرتا رہا تھا۔ میں اُس کی علمی سرگرمیوں سے بے حد لطف اندوز ہوتا تھا اور ہمیشہ میری جانب سے دلی عقیدت و احترام کے پھول اس مصنف پر برستے رہتے تھے۔ اُس کی بے بہا تصانیف کو پڑھ کر اس کی ملاقات کا جذبہ میرے دل میں موجزن ہوا۔ اور آخر مجھے مستقل طور پر یہ فکر لاحق ہوگئی کہ کسی طرح اس باکمال شخص سے شرفِ نیاز حاصل کروں چنانچہ بہت جلد ایک موقع میرے ہاتھ آگیا۔

ایک کام کے سلسلہ میں مجھے ایڈنبرا جانا پڑا اور وہاں اپنے عزیز دوست ٹامس شیریڈن سے ملاقات ہوگئی جو زبان انگریزی کے بہت اچھے مقرر تھے۔ مجھ کو اچھی طرح سے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جب میں اُن کے ساتھ تھا وہ ایک عام مجمع کے روبرو اپنی تقریر کے دوران میں ڈاکٹر جانسن کے علمی کارناموں، اُس کی فراست اور غیر معمولی ذہانت کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے تھے اور میں اس سے بے حد متاثر ہوا تھا۔

تقریر کے بعد میں نے اُن سے سوال کیا کہ کیا ڈاکٹر جانسن سے آپ کی ملاقات ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں مجھے یہ شرف حاصل ہے۔ تب میں نے اپنے جذبۂ خوشی کو چھپاتے ہوئے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ڈاکٹر جانسن سے میرا تعارف کرادیں؟

انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ہاں یہ ممکن ہے کیونکہ جانسن ٹامس ڈیوس کے ہاں اکثر رہا کرتے ہیں ڈیوس میرے ملاقاتی ہیں۔ میں اُن سے آپ کا تعارف کرادوں گا۔ وہ یقیناً آپ کی مطلب براری کریں گے"۔ اندھا کیا چاہتا ہے دو آنکھیں۔ میں فوراً ڈیوس سے ملنے کے لئے راضی ہوگیا۔ چنانچہ دوسرے ہی دن میرا اور ڈیوس کا تعارف ہوگیا۔ اب میں شیریڈن کو چھوڑ ڈیوس کے ساتھ ہوگیا۔

مسٹر ٹامس ڈیوس بہت ہی با اخلاق آدمی تھے۔ وہ ایک معمولی مصنف اور تاجر کتب تھے۔ ان کی دکان رسل اسٹریٹ میں واقع تھی۔ انہوں نے دورانِ گفتگو میں مجھ سے کہا کہ جانسن سے میری گہری واقفیت ہے اور وہ مہینے میں کئی مرتبہ مجھ سے ملنے کے لئے آتا ہے۔ میں نے موقع کو پہچانتے ہوئے ڈیوس پر واضح کردیا کہ جانسن کی ملاقات کے لئے میں کس قدر بیقرار ہوں۔

ایک دن صبح میں اور ڈیوس چائے پینے کے بعد اخبار بینی میں مصروف تھے کہ ڈیوس عقب کی کھڑکی کے شیشوں میں سے کسی کو دیکھ کر بے اختیار چلا اٹھا "دیکھئے وہ آیا ہے"۔ بالکل اسی طرح جیسے شیکسپیر کے مشہور ڈرامے ہیملٹ میں ہوریشیو ہیملٹ کے باپ کے بھوت کو دیکھ کر ہیملٹ کو بایں الفاظ مخاطب کرتا ہے کہ "آقا! دیکھئے وہ آتا ہے"! میں نے ڈیوس کی اس بے موقع پکار پر ایک متعجبانہ نظر کھڑکی کے شیشوں پر ڈالی لیکن مجھے سوائے اس کے اور کچھ نہ دکھائی دیا کہ ایک شخص تیز تیز قدم اٹھائے دکان کی جانب چلا آرہا ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لئے حیرت میں پڑ گیا۔ کیونکہ میں نے ڈاکٹر جانسن کی جو خیالی تصویر بنائی تھی۔ آنے والا شخص بالکل اُس کے مشابہ تھا۔ ڈیوس نے کہا بیٹھ جائیے اب آپ کی تمنا پوری ہو گئی! میں نے اپنی جگہ سنبھالی اتنے میں ڈاکٹر جانسن کمرے میں داخل ہوا اور ہم تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں اُس کو تصویرِ حیرت بنا دیکھ رہا تھا۔ اور اُس کی عظیم الشان شخصیت سے پوری طرح مرعوب ہو گیا!!

تھوڑی دیر بعد ڈیوس نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ آپ مشہور ادیب مسٹر جیمس بوسول ہیں اور اسکاٹ . . . ل . . .

ڈیوس یہیں تک کہنے پایا تھا کہ میں نے اُس کو آنکھ سے اشارہ کیا کہ خبردار یہ نہ کہنا کہ میں اسکاٹ لینڈ سے آرہا ہوں کیونکہ اُس زمانے میں جانسن اسکاٹ لینڈ کے باشندوں سے برافروختہ رہتا تھا! لیکن ڈیوس نے میرے اشارے کی پروا نہ کی اور کہہ دیا کہ "آپ اسکاٹ لینڈ کے باشندے ہیں اور وہیں سے آرہے ہیں"۔ میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا کہ مسٹر جانسن! یہ حقیقت ہے کہ میں اسکاٹ لینڈ کا باشندہ ہوں کیونکہ قدرت نے مجھے وہیں پیدا کیا اس لئے میں مجبور ہوں لیکن اس دنیا کے کسی انسان کی میں اتنی قدر نہیں کرتا جتنی کہ آپ کی قدر کرتا ہوں۔ اس بات پر جانسن مسکرا پڑا اور ہم اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ میں آپ کو اُس مسرت کا اندازہ نہیں کرا سکتا جو مجھے اُس گرانقدر ادیب کے ملنے سے ہوئی!!

یہ وہ زمانہ تھا کہ جانسن کی تصانیف پر تنقیدوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی لیکن تعجب اس امر پر تھا کہ جانسن سے ادیب نے ابھی تک ایک تنقید کا بھی جواب نہ لکھا تھا۔ کچھ دیر مختلف عنوانوں پر بحث رہی۔ اس کے بعد میں نے سوال کیا کہ مسٹر جانسن جب آپ کی تصانیف پر اس قدر تنقیدیں ہو رہی ہیں تو آپ ان کے جوابات لکھ کر ان کے قلم کو کیوں نہیں توڑ دیتے؟ آپ کی اس خاموشی پر ملک بھر میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ جانسن نے میرے اس بے موقع سوال پر مسکرا کر جواب دیا کہ "دوست! ابھی تک جتنی تنقیدیں مجھ پر ہوئیں وہ ایسے اشخاص کی جانب سے ہوئی ہیں جنہیں دنیائے علم میں شمہ برابر بھی وقعت نہیں ہے۔ تنقید سے اُن کا مطلب صرف خود کو مشہور کرنا ہے۔ اگر آج میں کسی تنقید کا جواب لکھوں تو بے وقوف نقاد پھول جائیں گے کہ ڈاکٹر جانسن نے ان کا جواب لکھا یہی میری خاموشی کی وجہ ہے"۔ میں اس معقول جواب کو سن کر اور اس کی فراست کو دیکھ کر پھڑک گیا کہ وہ کس قدر حقیقت شناس ہے۔ اس کے بعد جانسن نے مجھے اور ڈیوس کو رات کے کھانے پر مدعو کیا اور چلا گیا۔ بس اسی دن سے میری اور جانسن کی دوستی کی ابتدا ہوئی اور یہی ملاقات تھی جو میری علمی ترقیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

جیمس باسول

(ترجمہ) کاش ہندوستان میں بھی ایسا ہی ہو کہ ایک معمولی ادیب اپنے سے بلند پایہ ادیب کی اسی طرح قدر و منزلت کرے جیسی کہ مذکورۂ بالا واقعہ سے نمایاں ہے۔ اور یہ فی الحقیقت ترقیٔ علم و ادب کا موجب ہے لیکن یہاں تو آپس ہی میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش ہوتی رہتی ہے ترقی ہو تو کیسے!

منیر الدین حیدرآبادی

ارمغانِ فرنگ

ملکۂ خواب!

اے حسینہ! اگر تو عالمِ خواب میں ہے،
تو جاگ اور دروازہ کھول!
پو پھٹ چکی ہے، آ، اب ہم چل دیں!!
سبزہ زار، کہسار، اور ٹھنڈے پانی والے چشمے ہمارے منتظر ہیں!!!

اے ملکۂ خواب! اپنے جوتوں کو ڈھونڈنے میں وقت مت گنوا،
آ، برہنہ پاؤں ہی چل دے!!
ہمیں شبنم سے لتھڑی ہوئی گھاس پر سے گزرنا ہوگا!
اور دلدلے، اور گہرے پانی کو عبور کرنا پڑے گا!

(پرتگالی)

سائے!!

نسیمِ صبح گاہی سرو کے درختوں کو جھکولے دے رہی ہے
اور سبزہ زار پر شاخوں کے سائے گر کر تبدیل ہو رہے ہیں!!
اے محبت! تو بھی اس طرح اپنے لباس تبدیل کر!
مگر آہ، دیکھ، ہمیشہ کے لئے گم مت ہونا!!

اسی طرح، وقت کے ہمراہ میرے دل میں بھی انقلاب آئے،
تیری شکل کے سائے میرے دل کی دنیا کو پلٹ دیں!
مگر آہ، اے محبت، تو دل سے ہمیشہ کے لئے جدا مت ہونا!!

(انگریزی)

خاموش محبّت !!

جو محبّت کا جویا ہے، اُسے ہمیشہ محبّت کی تلاش میں رہنے دو،
لیکن اُسے اِس سنہرے راز سے آگاہ کردو،
کہ محبت کی سلطنت میں فقط، خاموشی، حکومت کرتی ہے !!
اور اگر وہ اس سنہرے راز سے غفلت برتے گا!
تو پھر اُس کے دل کی سلطنت میں غم کی خلش حکومت کرے گی !!! (جرمن)

سنہرے پُل !!

میرے دل کے نغمے ہی وہ سنہرے پُل ہوں گے!
جنہیں میری محبت عبور کرکے !!
اے میری محبوبہ! تیرے پاس پہنچے گی !!

خوشی کا وقت ہو یا غم کا موقع!
خواب کے دیوتا کے پر، ہر رات !!
مجھے تیرے محبوب دل کے پاس اڑا لے جائیں گے !!! (جرمن)

ماہِ گم شدہ ماہِ نو کی آغوش میں

حسین و نازنین ماہِ نو نیلے رنگ کی زرنق برق پوشاکوں میں ملبوس ہو کر زہرہ کے آستانۂ ناز پر پہنچا، اور سیس نواکر التجا کی "اے حُسن کی شہزادی! اے ملکۂ روشنی!! تیرے محبت آفریں سینہ میں محبت ہمیشہ موجزن رہی ہے، ——— تیرا نازک دل محبت کے خونیں تیروں کا ہمیشہ مسکن بنا رہا ہے، ——— تیرا زخم خوردہ دل محبت کی گہری ٹیسوں، کرب ناک تلخیوں سے خوب آشنا ہے، ——— آہ اس لئے میری اک التجا سُن! ——— میرے پُرانے محبوب گم شدہ چاند کو ایک بار، ہاں، فقط ایک بار پھر مجھ سے ہم آغوش کرا!! ———
دُھند کی سنہری لکیروں کے درمیان سے ہو کر ماہِ نو کے عکس ریز چہرہ کی زرد ارشعاعیں دوشیزۂ شب پر چھلکیں ——— اور ماہِ نو نے تمام کائنات کی موجودگی میں اپنی آغوشِ عشرت کھول کر اپنے پُرانے محبوب گم شدہ چاند کی جبینِ ناز کو چوم لیا !!!

عظیم قریشی لدھیانوی

محفلِ ادب

محبّت کا گیت

بہت میں نے گائے محبت کے گیت
کہ یہ شاعروں کی پرانی ہے ریت
کہی میں نے ہر ایک کے دل کی بات
ہر اک کی، بد و نیک کے دل کی بات
نئی سے نئی میں سناتا رہا
مگر راز تیرا چھپاتا رہا

ستاروں کے نغمے ہواؤں کا زور
گلوں کی مہک آبشاروں کا شور
خمارِ خزان و سرودِ بہار
ہیں نظمیں مری سب کی آئینہ دار
زمانے کا ہر راز مذکور ہے
مگر نام تک تیرا مستور ہے

ترا راز گو میں بتاتا نہیں
زباں پر ترا نام لاتا نہیں
مگر کیا نہاں ہے مرا رازِ عشق؟
ابھی تک ہے، کیا، بے صدا سازِ عشق؟
میں گاتا ہوں جب سوزِ الفت کے راگ
لگاتا ہوں اوروں کے سینے میں آگ
سمجھتے ہیں کیا مجھ کو سب دیدہ ور
غمِ قیس و فرہاد میں نوحہ گر؟
نہیں جانتے کیا کہ لیلیٰ ہے تو؟
مرا منتہائے تمنا ہے تو؟

(اکاروان)

پروازِ شاعر

ہم نوا کوئی نہ پایا جب زمین کے فرش پر
میرا نغمہ لے چلا مجھ کو اُڑا کر عرش پر
ظلمتِ ابلیس کی راہوں سے کتراتا ہُوا
بندگی کے گیت اپنے رنگ میں گاتا ہُوا

جادۂ پامال مہر و ماہ طے کرتا ہوا — مہ بہ مہ، انجم بہ انجم، راہ طے کرتا ہوا
کہکشاں تا کہکشاں بڑھتا گیا بڑھتا گیا — آسماں تا آسماں چڑھتا گیا چڑھتا گیا
کارپردازانِ قدرت ہمسفر بنتے گئے — اپنی اپنی منزلوں تک راہبر بنتے گئے
مرحبا کہتے ہوئے ننھی سی مشتِ خاک پر — ہو گئے رخصت ستارے بامِ ہفت افلاک پر
میں کہ تھا سرمستِ صہبائے ازل چلتا گیا
پاؤں تھک کر رہ گئے تو سر کے بل چلتا گیا

(کارواں)

تاریخ کا گم شدہ ورق

(وصل بعد از وصال)

نومبر ۱۸۴۸ء کی آٹھویں تاریخ ہے اور امیر عبدالقادر جزائری مع اپنی بیویوں، لڑکیوں اور اعوان و انصار کے شہر امبواز کے ایک عالی شان قصر کے اندر فروکش ہوئے ہیں جسے حکومتِ فرانس نے ان کے قیام کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔

امیر عبدالقادر جزائری وہی وطن پرست و غیور امیر تھا جس نے اپنے ملک اور اپنے آبا و اجداد کی روایاتِ شجاعت کی حمایت میں ایک زمانہ تک عساکرِ فرانسادی سے جنگ کی اور اگر دس بار خود شکست کھائی تو پانچ مرتبہ دشمن سے بھی اپنی تلوار کا لوہا منوا کر چھوڑا ——— لیکن فرانس کی زبردست حکومت اور منظم فوج سے مقابلہ کرنا آسان نہ تھا، آخر کار اہلِ فرانس بلادِ عربی میں ساحل سے لے کر ریگستانوں تک وسیع حصۂ زمین پر قابض ہو گئے اور ۲۸ اگست ۱۸۴۸ء کی شام کو امیر عبدالقادر اپنی تلوار دشمن کے حوالہ کرنے پر مجبور ہو ہی گیا ——— ہر چند عساکرِ فرانسادی کے جرنل نے امیر موصوف سے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر وہ اپنے آپ کو حوالہ کر دیں گے تو ان کو اجازت دے دی جائے گی کہ وہ شرقی دیارِ عرب میں جہاں چاہے چلے جائیں لیکن حکومت فرانس اس عہد پر قائم نہ رہی اور انہیں فرانس بھیج دیا جہاں وہ قصر امبواز میں ایک قیدی کی حیثیت سے رکھے گئے۔ یہاں یہ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۲ء تک رہے اور ۱۸۵۲ء میں جب انقلابی دور فرانس میں شروع ہوا تو امیر عبدالقادر دمشق چلے آئے اور یہیں وفات پائی۔

ان لوگوں میں سے جنھوں نے امیر عبدالقادر کا ساتھ دیا تھا اور جو اُن کے ساتھ امبواز میں نظر بند تھے ایک شخص عبدالسمیع مغربی بھی تھا۔ اس نے جس طرح امیر کا ساتھ ان کے لیل و نہار کامیابی میں دیا تھا اسی طرح ادبار میں بھی دیا اور امیر کی محبت ترک کرنا کسی طرح گوارا نہ کیا۔ امیر بھی اس سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کو پوری طرح احساس تھا کہ اس نے محض ان کی محبت میں اپنے وطن اور اہل و عیال سب کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ عبدالسمیع امیر سے کہا کرتا تھا کہ "اے میرے آقا میں نے اپنے قلب کے دو ٹکڑے کر لئے ہیں ایک خدا کے لئے وقف ہے اور دوسرا آپ کے لئے" ——— لیکن اُسے خبر نہ تھی کہ ایک وقت ایسا بھی آنے

والا ہے جب اسے اپنے قلب کے تین حصے کرنے پڑیں گے اور ایک حصہ کسی اور ہستی کے لئے وقف کرنا پڑے گا ——
یہ ہستی ایک نوجوان فرانسیسی لڑکی کی تھی جس کا نام الیس فونتان تھا۔ یہ لڑکی ایک خادمہ کی حیثیت سے امیر کے قصر میں کام کرتی تھی اور یہیں دونوں کے درمیان پیمانِ محبت استوار ہو گیا تھا اور اُس نے بھی اپنے محبوب کے ساتھ اسیری کی زندگی اختیار کر لی تھی +

اتفاق سے ایک دن یہ لڑکی اپنے والدین واعزہ سے ملنے گھر گئی تو انہوں نے اس کو قید کر لیا اور پھر نہ جانے دیا کیونکہ ان کو اس کے تعلق خاطر کا حال معلوم ہو گیا تھا اور وہ کسی طرح گوارا نہ کرتے تھے کہ وہ ایک غیر مذہب و غیر ملک کے انسان سے وابستگی پیدا کرے —— انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "ہم کو تیری موت گوارا ہے لیکن غیر کفو میں شادی کرنا کسی طرح منظور نہیں" —— اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی عہد کر لیا کہ وہ امیر اور عبدالسمیع دونوں سے اس کا انتقام لیں گے"۔

ہفتوں گزر گئے اور وہ لڑکی قصر تک واپس نہ آ سکی عبدالسمیع کا تردد بڑھتا جا رہا تھا اور حیران تھا کہ اُس کی غیر حاضری کا سبب کیا قرار دے۔ آخر کار اُس نے دوسری لڑکیوں سے تحقیقِ حال کی اور جب اُسے معلوم ہوا کہ اس کی محبوبہ مقید ہے اور ہر وقت ملول و حزیں رہتی ہے تو اس کی تکلیفیں اور بڑھ گئیں +

نومبر ۱۸۵۱ء کی پانچویں تاریخ کی صبح کو جب اہل قصر کی آنکھ کھلی تو سنا کہ پائیں باغ کی سمت سے فریاد و زاری کی آواز آ رہی ہے۔ سب لوگ دوڑ پڑے اور دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی رات کے لباس میں لوٹتی ہوئی چلی آ رہی ہے اس حال میں کہ اس کے سینہ اور پہلو سے خون جاری ہے۔ لوگ اس کو فوراً قصر کے اندر لے آئے اور علاج میں مصروف ہو گئے۔ یہ لڑکی زخموں کی تکلیف سے بے تاب تھی، درد سے تڑپ رہی تھی، لیکن عبدالسمیع کا نام ہر وقت اُس کی زبان پر تھا۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کیا قصہ ہے ابھی تک عبدالسمیع کو بالکل علم نہ تھا کہ کون لڑکی کس حال میں قصر کے اندر آئی ہے۔ جب عبدالسمیع نے یہ خبر سنی تو وہ بھی محض تماشائی کی حیثیت سے اس کو دیکھنے گیا، مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ تو اس کی محبوبہ تھی جس کے لئے وہ ہر وقت مضطرب رہا کرتا تھا اور جس کے دفعتہً غائب ہو جانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی —— یہ بے اختیار اُس سے لپٹ گیا اور دیوانوں کی طرح اس کا مجروح سینہ اور غم آلود چہرہ چومنے لگا —— لوگ حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ جب جوش کم ہوا تو عبدالسمیع نے بھی محسوس کیا کہ وہ مشرقی تہذیب سے ہٹا جا رہا ہے اور اس لئے اس نے آہستگی سے لڑکی کا سر تکیہ پر رکھ دیا اور خاموش الگ کھڑا ہو گیا +

جب اس کے ساتھیوں نے پوچھا کہ تمہاری شناسائی اس لڑکی سے کیوں کر ہوئی اور اس بے تکلفی و بے حجابی کے کیا معنی ہیں"، تو اُس نے کہا کہ "میں امیر کے روبرو تمام واقعات بیان کروں گا اور اگر مجھ سے کوئی گناہ ہوا ہے تو امیر ہی کے حضور میں سزا کو قبول کروں گا"۔

جب امیر عبدالقادر کو اطلاع ہوئی تو حکم دیا کہ دونوں سامنے لائے جائیں۔ چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی اور ان دونوں نے اپنی داستان محبت کو شروع سے آخر تک دہرایا ــــــ لڑکی نے گھر میں قید کر لئے جانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا "اے امیر آج میں نے گھر سے بھاگ نکلنے کا ارادہ کر ہی لیا۔ خدا معلوم میرے بھائی کو کس طرح خبر ہو گئی اور اُس نے مجھے راستہ میں پکڑ کر اصرار کیا کہ پھر گھر واپس جاؤں۔ لیکن جب میں کسی طرح راضی نہ ہوئی تو اُس نے اپنا خنجر نکال کر میرے پہلو اور سینہ میں پیوست کر دیا۔ میں گر پڑی اور وہ مجھے مردہ سمجھ کر بھاگ گیا"۔

لڑکی نے یہ کہا اور دفعتہً اس کی گردن شانہ کی طرف ڈھلنے لگی، حتیٰ کہ چند لمحوں کے اندر وہ زمین پر گر پڑی، اور اس حال میں کہ اس کی رُوح پرواز کر چکی تھی اور اس کا جسم سرد ہو گیا تھا۔

امیر عبدالقادر نے حکومت سے اس لڑکی کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت حاصل کر کے اُسے قصر کے جوار میں سبز سایہ دار درختوں کے نیچے مدفون کر دیا اور دیر تک اس واقعہ سے متاثر رہا

---

۱۱ دسمبر ۱۸۵۲ء کی صبح کو امیر عبدالقادر مع اپنے ساتھیوں کے امبواز سے کوچ کی طیاریاں کر رہے ہیں۔ کیونکہ حکومت فرانس نے ان کو آزاد کر دیا اور اجازت دے دی ہے کہ جہاں جی چاہے چلے جائیں۔ امیر جب اہتمامِ سفر سے فارغ ہو کر اپنے ساتھیوں کا جائزہ لینے لگا تو معلوم ہوا کہ عبدالسمیع ان میں موجود نہیں ہے۔

امیر نے جستجو کی تو دیکھا کہ عبدالسمیع اپنے کمرے میں مُردہ پڑا ہوا ہے اور ایک تحریر اس کے سینہ پر رکھی ہوئی ہے جس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ

"اے امیر میں الیس فونتان کو تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ اس لئے جائیے تو مجھے اس کے پاس دفن کر کے جائیے"۔

چنانچہ آج بھی فرانس کے شہر امبواز میں اگر کوئی سیّاح جائے اور مسلمانوں کے قبرستان کی سیر کرے تو دیکھ سکتا ہے کہ ایک گوشہ میں چند درختوں کے نیچے ایک قبر زرد پتھر کی پائی جاتی ہے جس کے سرہانے سنگِ مرمر کی تختی نصب ہے یہی ہے الیس فونتان اور عبدالسمیع کی قبر جہاں وہ کبھی نہ جدا ہونے کے واسطے ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے مل گئے ہیں۔

(نگار)

اُردو زبان کا آغاز

اردو زبان کے آغاز کی نسبت یہ نظریہ اب روز روشن کی طرح عیاں ہوتا جاتا ہے کہ شمال مغربی سرحد سے جو

مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئے وہ پہلے پہل پنجاب میں آکر ٹھہرے۔ وہاں کے باشندوں کے میل جول سے جو نئی مشترکہ ہندو مسلم زبان پیدا ہوتی رہی اسی کو لے کر وہ دوابہ میں اترے اور اُسی کو بولتے ہوئے گجرات اور دکن میں بھی داخل ہوئے۔

فتح دہلی سے قبل مسلمان پنجاب میں قریب دو سو سال تک رہے اور یہ عرصہ ایک نئی زبان کے آغاز کے لئے ناکافی نہیں ہے۔ وہاں جو زبان تیار ہوئی تھی اس میں لاہور کے ایک درباری فارسی شاعر مسعود سعد سلمان نے طبع آزمائی بھی کی تھی مگر افسوس ہے کہ اس کا کلام آج ناپید ہے اور اس کے متعلق سوائے عرفی اور خسرو کے بیانات کے کوئی اور معلومات حاصل نہیں۔ اگر قدیم دکنی اور گجراتی کتابوں کی طرح مسعود کا یہ دیوانِ ہندی بھی آج دستیاب ہو جائے تو اردو کی آغاز ہی تشکیل کی نسبت بہت کم گتھیاں باقی رہ جائیں۔

جب مسلمانوں نے ۱۱۹۳ء میں دہلی کی چوہان سلطنت فتح کر لی تو وہ اُسی زبان کو لے کر راجدھانی میں داخل ہوئے اور دہلی اور اُس کے مشرقی علاقہ یعنی سرزمین برج میں آباد ہو گئے جو پنجاب میں بن رہی تھی اور ابھی خام حالت میں تھی۔ فاتحین کے ساتھ ہریانی یا بانگرو (مشرقی پنجاب) علاقہ کے سیکڑوں باشندے بھی غالباً ملازمین اور بہیر و بنگاہ کی حیثیت سے چلے آئے۔ جس کی بنا پر آج اُردو زبان میں مشرقی پنجابی یا ہریانی عنصر جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

(ہندوستانی)

عزلت گزینی کا فلسفہ

عزلت گزینی کا فلسفہ، ممکن ہے، موجودہ زمانے کے لوگوں کو اتنا خوش آئند معلوم نہ ہو لیکن اُس کا بھی کچھ اطلاق، ہر زمانے اور ہر شخص کے لئے ممکن ہے۔ زندگی کی کچھ پرسکون ساعتیں ہر شخص چاہتا ہے، جب دُنیا کے بکھیڑوں سے الگ ہو کر سوچ بچار، یا خدا کے دھیان، یا کسی بڑے یا اچھے کام کے خیال میں گزار سکے+

زندگی کی کشمکش میں، ایسی گھڑیاں مشکل سے ہاتھ آتی ہیں۔ لیکن جب ہاتھ آجاتی ہیں تو اُس کشمکش کی زندگی میں عجب لُطف دیتی ہیں۔

اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ گوشہ نشینی کا فلسفہ، زندگی میں بالکل بیکار ہے+

البتہ وہ صحیح استعمال چاہتا ہے جس میں افراط و تفریط شامل نہ ہوں۔

(ہندوستانی)

مطبُوعات

ہسٹری آف اُردو لٹریچر (A History of Urdu Literature) یہ ڈاکٹر ٹامس گریم بیلی ایم اے بی۔ ڈی۔ ڈی۔ لٹ پروفیسر السنۂ مشرقیہ لنڈن یونیورسٹی کی انگریزی تصنیف ہے۔ یہ کتاب اگرچہ صرف سوا سو صفحات پر مشتمل ہے لیکن اس قدر جامع ہے کہ اس سے قبل اس نوع کی کوئی ایسی کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری راقم الحروف کو ڈاکٹر بیلی کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ مشرقی زبانوں سے ان کی واقفیت اور دلچسپی حیرت انگیز ہے + علاوہ علمی وادبی زبانوں کے وہ ہندوستان کی مقامی بولیوں سے بھی واقف ہیں۔ پنجابی کے متعلق خود مجھے تجربہ ہے کہ اس زبان سے اُن کی واقفیت اکثر پنجابیوں سے بھی بہ مدارج ارفع ہے۔ اگر وہ پسِ پردہ اس زبان میں گفتگو کر رہے ہوں تو ان کے یورپین ہونے کا وہم و گمان تک نہیں ہو سکتا یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پنجابی جاٹ بول رہا ہے +

موجودہ کتاب ڈاکٹر بیلی کی حیرت انگیز ذہانت کا ایک اور ثبوت ہے۔ اردو شاعری کے متعلق یقیناً اس پائے کی صحیح اور جچی تلی تنقید خود کسی ہندوستانی مصنف نے نہیں کی۔ کاش یہ کتاب زیادہ مفصل ہوتی۔ مگر اب بھی یہ اُردو کے نشوو ارتقا کے ابتدائی عہد سے لے کر موجودہ زمانے تک کی تحریکات کے ذکر سے خالی نہیں۔ اور اسی لحاظ سے ہم نے اسے جامع کہا ہے۔ تنقید ادب سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کو اس کتاب کا ایک ایک نسخہ ضرور اپنے پاس رکھنا چاہئے۔ کتاب اگر مجلد ہوتی تو بہتر ہوتا۔ قیمت عمر ہے۔ ایسوسی ایشن پریس نمبر ۵ رسل سٹریٹ کلکتہ سے مل سکتی ہے۔

کارواں۔ یہ ایک لحاظ سے اردو میں اپنی نوع کا پہلا ادبی صحیفہ ہے۔ یوں تو بعض ماہوار رسائل بھی اپنے سالنامے شائع کرتے ہیں لیکن "کارواں" صرف "سالنامہ" ہے۔ اس کی اشاعت پروفیسر محمد دین تاثیر ایم اے کے زیرِ ادارت سال بہ سال ہُوا کرے گی۔ یہ رسالہ ظاہری و باطنی محاسن کے اعتبار سے قابلِ تعریف ہے۔ اور اردو زبان کے ہر بہی خواہ کو اپنی زبان میں ایسی مطبوعات دیکھ کر قدرۃً مسرت ہوتی ہے۔ بیشتر مضامین نظم و نثر عمدہ ہیں۔ اس کے علاوہ سرورق اور اکثر تصاویر قابلِ ستائش ہیں۔ قیمت فی پرچہ عہ علاوہ محصول۔ دفتر "کارواں" لاہور سے منگوائیے۔

زہرِ عشق۔ جنابِ مجنوں گورکھ پوری نے مرزا شوق کی مثنوی نہایت حسنِ اہتمام سے مرتب کی ہے۔ یہ مثنوی بلاشبہ اردو زبان کی بہترین مثنویوں میں سے ہے اور اگرچہ ایک عرصے تک "اہلِ اخلاق" کے نزدیک بدنام رہی ہے۔ لیکن آخر اس کے غیر فانی محاسن ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ جنابِ مجنوں شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے یہ کتاب ایسی اچھی صورت میں پیش کی ہے۔ کتاب کے شروع میں جنابِ مجنوں کے علاوہ جنابِ عبدالماجد دریابادی جناب احسن لکھنوی نبیرۂ مرزا شوق مرحوم اور جناب نیاز فتح پوری کے تنقیدی مضامین ہیں جن سے مثنوی کے متعلق قابلِ قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ دیباچوں سمیت کتاب کا حجم ایک سو ساٹھ صفحات ہے۔ کتاب نفیس کاغذ پر حسن طباعت و کتابت کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور مجلد فروخت ہوتی ہے۔ جلد بھی خوبصورت ہے جس پر سنہرے حروف میں مثنوی کا نام لکھا ہے۔ تین رنگین تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ قیمت درج نہیں ایوانِ اشاعت گورکھ پور سے مل سکتی ہے

جدید اردو شاعری۔ یہ کتاب عبدالقادر صاحب سروری نے لکھی ہے۔ ابتدا میں شعر کی ماہیت وغیرہ پر تفصیلی بحث ہے۔ اس کے بعد موجودہ ادبی انقلاب سے پہلے کی شاعری کا ذکر ہے اور اسی سلسلے میں اصلاحی دور کے شعرا آزاد وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں موجودہ دور کے اکثر چھوٹے بڑے شعرا کے مختصر حالات اور اُن کے کلام پر مجمل تبصرہ دیا گیا ہے پنجاب کے شعرا میں سے حفیظ اور اقبال کے سوا کسی کا ذکر نہیں۔ یہ مصنف کی دلچسپ بے خبری کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

بحیثیتِ مجموعی کتاب میں اردو ادب کے طالب العلم کے لئے دلچسپ معلومات ہیں۔ کتاب تنقید کے جدید اصول کے مطابق لکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور نوجوان مصنف کو اس میں قابلِ اطمینان کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

حجم ۲۷۴ صفحات۔ قیمت مجلد تین روپے

مکتبۂ ابراہیمیہ سٹیشن روڈ حیدر آباد دکن سے منگوائیے

فہرستِ مضامین

جلد ۲۳

نمبر ۵

ہمایوں بابت ماہِ مئی ۱۹۳۳ء

تصویر:- موت کا انتظار

قیمت فی پرچہ ۶/ ـ ڈیلر بک سٹال پر ۸/ ـ چندہ سالانہ للعہ مع محصول

طلسمِ زندگی

روزنامہ "مدینہ" کی رائے

"یہ کتاب جو ہمارے پاس ریویو کے لئے وصول ہوئی ہے جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے آکسن بیرسٹرایٹ لا ایڈیٹر رسالہ "ہمایوں" لاہور کے پاکیزہ مضامین کا مجموعہ ہے جن لوگوں نے رسالہ "ہمایوں" کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے ضرور آگاہ ہوں گے، کہ جناب میاں صاحب موصوف ایک ایسے طرزِ نگارش کے مالک ہیں جو دلفریب شوخی کے ساتھ اچھوتی متانت اور پاکیزہ سنجیدگی کا حامل ہے طلسمِ زندگی کے مضامین اس خصوصیت کے لحاظ سے قابلِ قدر ہیں، فاضل مضمون نگار نے اپنی شوخیِ قلم اور رنگینیِ خامہ سے ایسی فردوس نظر گلکاریاں کی ہیں جن پر بزمِ اردو بجا طور پر ناز کرسکتی ہے اکثر مضامین نفسیات کے اعتبار سے شاہکار کہے جاسکتے ہیں اور ان کے اسلوب و تنوع سے یہ ترشح ہوتا ہے، کہ مضمون نگار کی دقت پسند و حقیقت بیں نظروں نے فطرت کا کس قدر امعان و تعمق سے مطالعہ کیا ہے اور فلسفۂ کائنات کو سمجھ کر اس کی تشریح کس قدر سلیس اور دلچسپ پیرایہ میں کی ہے، بعض مضامین اس نوعیت کے ہیں کہ ان کے مطالعہ کے بعد دل و دماغ پر انبساطی کیفیت طاری ہو جائیگی اور روح ایک غیر فانی کیف اور بالیدگی حاصل کرے گی، اس کے ساتھ بعض مضامین اس قدر گہرے تاثرات سے لبریز ہیں، جن کا مطالعہ سنگدل سے سنگدل انسان کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان مختلف کیفیات تنوع اور تعدد کے بعد کمال یہ ہے کہ نفسیاتی حسن کے پرتو نظر آتے ہیں، اور بہت کم مضامین ایسے ہیں جو نفسیات پر ایک مبسوط مقالہ کی حیثیت نہ رکھتے ہوں۔

افسوس ہے کہ بخوفِ طوالت ہم تفصیل کے ساتھ مضامین پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ "طلسمِ زندگی" پر تفصیلی تبصرہ خود ایک کتاب کی صورت اختیار کریگا کتابت و طباعت کی دیدہ زیبی بے نیازِ ستائش و تحسین ہے۔ سرورق حسنِ مجسم ہے اور جلد کی پائدار رعنائی نظر نواز۔ بعض مضامین مصور (Illustrated) ہیں اور تصاویر اپنی موزونیت اور تاریخی اہمیت کے اعتبار سے خاص طور پر قابلِ قدر ہیں، بیچ بیچ میں مطلا اور رنگین خاکے بھی ہیں، جو بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں، رفعتِ مضامین سے قطعِ نظر کرتے ہوئے بہ حیثیت ظاہری تزئین و آرائش کے بھی کتاب کو یورپ کی حسین ترین کتاب کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے اور ہندوستان میں تو شاید ہی اس قدر اہتمام سے کوئی اردو کتاب اشاعت پذیر ہوئی ہو ہم جناب میاں بشیر احمد صاحب کو اس کامیاب تصنیف پر مبارکباد دیتے ہیں ہم کو امید ہے کہ ملک میں اس نادر مجموعہ کو قبولیتِ عام حاصل ہوگی"

اس کتاب کی قیمت پانچ روپے ہے،

منگوانے کا پتہ:- سید عبداللطیف دفتر رسالہ "ہمایوں" لاہور

جہاں نما

کنگ جارج کا یادگار عہدِ حکومت

کنگ جارج کو سریرآرا ہوتے بائیس سال گزرے ہیں، ان کے عہدِ حکومت میں اس قدر تاریخی واقعات پیش آئے ہیں کہ انگلستان کے فرمانرواؤں کے اس طویل سلسلے میں سے کسی بادشاہ کے عہد میں بھی پیش نہیں آئے جس کا آغاز ولیم فاتح نے ۱۰۶۶ء میں کیا تھا۔

ان کے عہد میں بے تار برقی نامہ و پیام کا آغاز ہوا اور برق اور بھاپ کی قوت اور ان کا استعمال غیر معمولی حد تک ترقی کر گیا۔ اس کے علاوہ فن پرواز نے حیرت انگیز ترقی کی ابتدائی بے ڈھنگے اور سست رو طیاروں کے بجائے ۲۵۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑنے والے ایروپلین ایجاد ہوئے اور تہذیب تمدن نے اس سرعت سے ترقی کی کہ دیکھتے دیکھتے اس منزل میں جا پہنچی جو پہلے صرف جیول ورنر جیسے مصنفوں کی خیالی جولاں گاہ تھی۔

سب سے بڑا واقعہ جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی، بلاشبہ جنگ عظیم ہے یہ چار سال بجائے خود دنیا کی تاریخ کا ایک جداگانہ باب ہیں۔ اس جنگ کے اثرات عالمگیر تھے خود انگلستان کی کایا پلٹ گئی اور وکٹوریا اور ایڈورڈ کے زمانے کی ایرانہ وضع داری کی جگہ موجودہ آزاد اور سبک طرزِ معاشرت نے لے لی۔

ایک اور اہم واقعہ عورتوں کی آزادی کا ہے اب عورتیں مردوں کی بہت کم دست نگر رہ گئی ہیں اور مردوں اور عورتوں کے تعلقات میں بنیادی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے عورتیں کاروبار میں زیادہ حصہ لینے لگی ہیں اور ان کے لباس اور تمدن و معاشرت میں بھی ایک اہم انقلاب رونما ہے۔

اسی عہد میں یورپ کے طول و عرض میں جمہوریت کے جراثیم پھیلنے شروع ہوئے، کئی حکمران خاندانوں کا زوال ہوا، کئی بادشاہ معزول ہوئے اور کئی نظامِ حکومت متبدل ہو گئے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ یورپ کے شاہی خاندانوں کی باہمی شادیوں کا وہ سلسلہ بھی ٹوٹنے لگا جس کی وجہ سے یورپ کے اکثر حکمران خاندانوں اور انگلستان کے شاہی خاندان کے درمیان قریبی تعلقات قائم تھے۔

۱۹۱۰ء میں تخت نشین ہونے کے وقت سے لے کر اب تک کنگ جارج کو اپنی سلطنت کے مختلف حصوں کے خود مختار ہونے کا خطرہ نظر آتا رہا ہے سلطنت پر ان کے آئینی اختیارات میں تخفیف بھی ہوئی اور ان کا خطاب بھی بدل گیا۔ چنانچہ وہ بجائے شاہِ برطانیہ و آئرلینڈ کے شاہِ سلطنتِ متحدہ برطانیہ و آئرلینڈ ہو گئے۔

انہیں کے زمانے میں (۱۹۲۴ء) برطانی حزب العمال کی حکومت پہلے پہل قائم ہوئی اور نتیجۃً کنگ جارج کو مزدوروں اور پولیس والوں سے ملنا پڑا۔ اس کے بعد انہوں نے مختلف جماعتوں کو برسر اقتدار آتے دیکھا اور آخر یہ قومی حکومت قائم ہوئی جس کے صدر بادشاہ کے دلی دوست ریمزے میکڈانلڈ ہیں۔

اس عہد حکومت میں بہ سرعت اور پے در پے واقعات پیش آتے رہے ہیں کئی چھوٹے اور بڑے مصائب ٹوٹتے رہے کئی مہمات سر کی گئیں اور کئی اہلِ فن دوسروں کے مقابلہ میں حیرت انگیز سبقت حاصل کرتے رہے، اس کے علاوہ ان کے عہد میں سلطنت کو کئی قابلِ رشک کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں۔

انہوں نے جمعیتِ اقوام کی صورت میں عالمگیر صلح کی پہلی کوشش دیکھی اور اس کے بعد اب تک صلح کے لئے لاتعداد مجالس منعقد ہوتی رہی ہیں۔

انہوں نے ۱۹۳۰ء میں خود بحری تخفیفِ اسلحہ کی انجمن اور گول میز کانفرنس کا افتتاح کیا جس نے ہندوستان کو ایک حد تک آزادی دینے کی کوشش کی۔

انہیں کے عہد میں تقریباً سو سال کی آزاد تجارت کے بعد برطانیہ نے اپنے لئے تجارتی تحفظ کی ضرورت محسوس کی، اور اس کے لئے وسائل اختیار کئے گئے اسی عہد میں اقتصادی مشکلات کی وجہ سے انگلستان کے لئے معیارِ طلائی کا التوا ناگریز ہوگیا، تاکہ لندن کی شہرت بحیثیت دنیا بھر کے ساہوکار کے قائم رہ سکے۔

انہیں اپنی والدہ ملکہ الگزنڈرا کے انتقال کا غم دیکھنا پڑا، اس کے علاوہ ہر سال وہ اپنی رعایا کے ساتھ مل کر ان بیس لاکھ سپاہیوں کا ماتم کرتے ہیں، جو گزشتہ جنگِ عظیم میں کام آئے، خواہ کنگ جارج انگلستان کے عظیم الشان بادشاہوں میں شمار نہ بھی کئے جائیں اور ان کا نام دوسرے بادشاہوں کی طرح آئندہ یاد نہ بھی رکھا جائے تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ ان کا عہدِ حکومت یقیناً اہم ترین عہد ہے، ان کے زمانے میں سلطنتِ برطانیہ کرۂ ارض کے ایک ربع پر پھیلی ہوئی نظر آتی ہے، اُن کی رعایا آبادی میں چھیالیس کروڑ تیس لاکھ نفوس تک بڑھ گئی ہے۔ اور یہ تعداد دنیا کی آبادی کا ¼ حصہ ہے، ان کے زیرنگیں دو سو بائیس مختلف زبانیں بولنے والی اقوام آباد ہیں، اُن کی رعایا میں دنیا کے ہر مذہب و ملت کے افراد بستے ہیں، اور ان مذاہب میں دنیا کے ابتدائی مذاہب سے لے کر جدید ترین مذاہب تک سب شمار کئے جا سکتے ہیں نیز نوعِ انسان کے یہ کروڑوں نفوس جو جارج پنجم کی رعایا ہیں سینکڑوں مختلف نسلوں اور قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

ابھی معلوم نہیں کنگ جارج کے عہد میں اور کیا کیا واقعات پیش نہ آئیں گے۔

بنگال میں اردو

۱۹۳۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق صوبۂ بنگال میں ۹۲ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ بنگال میں مختلف اقطاعِ عالم سے آکر لوگ آباد ہوگئے ہیں، بنگال کی کل آبادی ۵۱۰۸۷۰۰۰ ہے اس میں سے ۱۸۹۱۳۲۷ ہندوستانی (اردو) بولتے ہیں، اردو کے بعد غیر بنگالی زبانوں میں سب سے زیادہ تعداد اڑیا بولنے والوں کی ہے، اس کا شمار ۱۵۹۰۰۰ کے قریب ہے جو اردو کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے، صرف کلکتے میں پچاس مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں بولنے والوں کی کل تعداد ۱۱۹۶۷۲۴ ہے، ان میں سے بنگالی بولنے والے ۶۴۸۴۵۱ ہیں اور ہندوستانی بولنے والے ۳۶۱۲۲۴۔ اگرچہ انہیں اعداد و شمار سے بنگال میں اردو کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے لیکن اگر دوسرے بڑے بڑے شہروں کے اردو بولنے والوں کا مقابلہ کلکتے سے کیا جائے تو پھر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوتا ہے، اُن بڑے بڑے شہروں کی آبادی حسبِ ذیل ہے جن میں زیادہ تر اردو زبان بولی جاتی ہے :-

دہلی	۴۴۷۴۴۲	کانپور	۲۴۳۷۵۵
لاہور	۴۲۹۷۴۷	آگرہ	۲۲۹۷۶۴
لکھنو	۲۷۴۶۵۹	بنارس	۲۰۵۳۱۵
امرتسر	۲۶۴۸۴۰	الہ آباد	۱۸۳۹۱۴
پٹنہ	۱۵۹۶۹۰		

ان شہروں میں صرف دہلی کی آبادی کلکتے کے اردو بولنے والوں کی تعداد سے بقدر ۱۱۳۱۹ کے زیادہ ہے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ دہلی میں ان لوگوں کی تعداد ۱۱۳۱۹ سے کافی زیادہ ہے جو اردو نہیں بولتے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کلکتہ اردو بولنے والوں کا سب سے بڑا مرکز ہے، بنگال میں اردو زبان کی اہمیت تسلیم کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

تصویر

موت کا انتظار ۔ یہ تصویر بوہیمیا کے مصور گبرائیل میکس کے کمالِ فن کی مظہر ہے، فنونِ لطیفہ کی واقفیت اور قدرشناسی میں اہلِ بوہیمیا ضرب المثل ہیں اور یہ مصور اپنے ملک کے بہترین مصوروں میں شمار کیا گیا ہے، اس کا تخیل نہایت روشن اور واضح تھا اس لئے اس کی تصاویر میں ایک مقناطیسی جذب پایا جاتا ہے، موجودہ تصویر میں عیسائی لڑکیاں اپنی موت کے لئے ان درندوں کے جاگنے کی منتظر ہیں، جن کے رحم پر ملحد حکومت کے جبر نے انہیں چھوڑ رکھا ہے۔

محبّت اور شادی

موجودہ زمانے کی روشِ خیال کو دیکھ کر کچھ یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ عہدِ ماضی کے حالات و مسائل سے ہمیں کوئی تعلق نہیں رہا اور ہم صرف حال اور مستقبل کے لئے زندہ ہیں۔ گزشتہ زمانے میں مذہب کو ہمارے معاشرتی معاملات میں اتنا دخل تھا کہ معاشرہ کے تقریباً تمام رسوم و رواجات اس کے دائرۂ عمل میں آجاتے تھے لیکن مذہبی خیالات میں جو انقلاب پیدا ہو چکا ہے اس کا اندازہ ہمارے اس مضمون سے کیا جا سکتا ہے "جو مستقبل کا مذہب کیا ہوگا؟" کے عنوان سے "ہمایوں" کے کسی گزشتہ پرچے میں شائع ہوا تھا۔

شادی کے عہد کی پابندی کرنا اور بچے پیدا کرنا بھی ایک زمانے تک خالص مذہبی فرائض شمار کئے جاتے تھے لیکن اب مذہب سے آزاد ہو کر ان مسائل پر غور کیا جا رہا ہے۔ انہیں اہلِ فکر حضرات نے جن کے خیالات "آئندہ مذہب" کے متعلق ہم پیش کر چکے ہیں ان دو مسائل پر بھی اپنی آرا کا اظہار کیا ہے کہ آیا محبت کے خاتمے پر شادی کا تعلق قطع کر دینا چاہیئے یا نہیں اور آیا بچوں کا وجود شادی کی کامیابی کے لئے ضروری ہے یا نہیں۔ پہلا سوال اس لئے پیدا ہوا کہ جب ایک مسیحی شادی ہوتی ہے تو میاں بیوی دونوں عہد کرتے ہیں کہ ہم اس وقت تک جدا نہ ہوں گے جب تک کہ موت ہم کو جدا نہ کرے۔ اور یہ ایک ایسا عہد ہے کہ انسان اس کی پابندی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس حیثیت سے یہ ایک خالص مذہبی سوال معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا ایک معاشرتی پہلو بھی ہے۔ اس مضمون میں ہمارا مدِنظر یہی پہلو ہے اور ہم نے صرف ایسی آرا کا انتخاب کیا ہے جو معاشرت سے تعلق رکھتی ہیں۔ دوسرا سوال اس لئے پیدا ہوا کہ کہتے ہیں دنیا کی آبادی ضرورت سے بہت بڑھ چکی ہے۔ اور اقتصادی حالات بچے پیدا کرنے کی اجازت نہیں دیتے، اس کے علاوہ جسمانی حالات بھی بعض اوقات ناسامد ہوتے ہیں۔

یہ آرا یا اقوال در اصل ایک ہی موضوع کے متعلق بہت سے چھوٹے چھوٹے اور دلکش مضامین ہیں۔ لیکن اگر ہم ان سب مضامین کو ایک مضمون اور جتنے دماغوں سے یہ پیدا ہوئے اُن کو ایک دماغ تصور کریں تو ان کی حیثیت اس ہیجانِ خیال اور تذبذب کی سی نظر آئے گی جو ایسے معاملات کو طے کرتے وقت ہمارے دماغ میں پیدا ہوتا ہے۔ ہم محسوس کرنے لگیں گے کہ محبت شادی کے لئے ضروری بھی ہے اور کچھ اتنی ضروری بھی نہیں۔ محبت ختم ہو جائے تو قطعِ تعلق ضروری بھی ہے اور کچھ اتنا ضروری بھی نہیں

شادی کی کامیابی کے لئے بچے ضروری بھی ہیں اور کچھ اتنے ضروری بھی نہیں۔ آخر کون کہہ سکتا ہے کہ شادیاں سب محبت کی وجہ سے ہوتی ہیں اور اسی لئے وہ برقرار ہیں؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اب محبت مردہ ہوگئی اور اس لئے شادی فسخ ہو جانی چاہیئے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ بچے شادی کے تعلق کو مضبوط نہیں کر دیتے یا ان کی وجہ سے ازدواجی زندگی بعض اوقات عذابِ جان نہیں بن جاتی؟ معلوم یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کے قیام کے لئے خیر و شر کا ایک زبردست توازن کارفرما ہے جو ہماری جلد بازانہ بلند پروازیوں کو بروئے کار نہیں آنے دیتا لیکن جو وقت پر وہی کچھ ظہور میں لاتا ہے جو بہتر ہوتا ہے۔

اگر محبت ختم ہو جائے تو کیا شادی کا تعلق قطع کر دینا چاہیئے؟

مسٹر بیورلے نکولس

شادی اور محبت کے درمیان کبھی مجھے ادنیٰ سا تعلق بھی نظر نہیں آیا۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کامیاب شادی کا اصل الاصول ہی یہ ہے کہ طرفین میں سے کسی کو ایک دوسرے کے ساتھ محبت نہ ہو۔ آخر شادی کے معنی تو یہی ہیں نا کہ ہم اکھٹے رہیں لیکن ہم صرف اپنی بیویوں کے ساتھ نہیں رہتے۔ مجھے اپنے سیکرٹری کے ساتھ، اپنی خادمہ کے ساتھ اور کم و بیش بہت سے اور لوگوں کے ساتھ بھی رہنا پڑتا ہے اور اگر ان سب کے عشق میں میرا دل ہر وقت دھڑکتا رہے تو زندگی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو جائے

زندگی سے ہم بہت زیادہ توقع رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ شادی اور محبت کے متعلق ہم اس قسم کی بیہودہ سرائی کرتے رہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے کیک کو کھا بھی جائیں اور پھر بھی وہ ہمارے پاس باقی رہے، ایک خیالی دیوی کی پرستش بھی کریں اور اُس سے ہم آغوش بھی ہوں یہ سب باتیں نہایت افسوسناک ہیں۔

مسٹر ایتھل مینین

یہ حالات پر منحصر ہے، سب سے پہلے بچوں کی فلاح و بہبود کا خیال کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر بچے موجود نہ ہوں اور شوہر اور بیوی دونوں قطعِ تعلق کرنا چاہیں۔ تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ شادی کیوں نہ فسخ کی جائے۔

مسٹر سٹارم جیمیس

اگر محبت نہ ہو تو قطعِ تعلق میں کیا مضائقہ ہے؟ لیکن اگر اس تعلق سے بچے بھی ہوں تو سب سے پہلے اُن کی فلاح و بہبود کا خیال کرنا چاہیئے اگر میاں بیوی دونوں اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے کوئی جذبہ محبت نہیں پاتے تو قانونی عہد و پیمان کی زنجیروں میں جکڑ کر اُن کو اس پر آمادہ کرنا ناممکن ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں اس عامیانہ نظریہ کی قائل نہیں ہوں کہ شادی کے لئے صرف محبت ایک ضروری شے ہے۔ اس کے سوا اور بھی کئی باتیں اسی قدر ضروری ہیں، مثلاً احترام خواہش۔ شادی ایک عادت

ہے، ایک مشین نہیں جس میں اکتی ڈالی اور مسرت نکال لی +

مسٹر آلیو بالڈون رکن پارلیمان

شادی کو محبت سے اتنا کم لیکن رفاقت سے اتنا زیادہ تعلق ہے کہ زیر بحث سوال کو کوئی روحانی اہمیت حاصل نہیں۔ معاشرتی حیثیت سے اِسے کوئی اہمیت حاصل ہو تو ہو +

مارکوئس آف ڈونیگل

بچے موجود بھی ہوں تو باہمی رضامندی سے طلاق ہو جانی چاہیئے۔ موجودہ زندگی میں قبیلہ داری کی اہمیت یا عملیت روز بروز کم ہورہی ہے اور آئندہ بچے خود بخود پرورش پایا کریں گے۔ دوسری صورت جس میں بچے ایک بدمزگی اور نفرت کی فضا میں پرورش پائیں، میرے خیال میں والدین میں سے ایک کی جدائی سے بدتر ہے +

مسٹر سیسل بیٹن

اگر میاں بیوی دونوں کی محبت مردہ ہو جائے تو دوستو اسے حسنِ اتفاق سمجھو اور جُدا ہو جاؤ۔ کیونکہ مشکل یہ ہے کہ عام طور پر محبت صرف ایک دل سے رخصت ہوتی ہے، اور اگر اس حالت میں شادی کا تعلق قطع کیا جائے تو محبت رکھنے والے فریق کے واسطے زندگی کچھ عرصے کے لئے ایک عذابِ الیم ہو جاتی ہے۔ اگرچہ محبت کا جواب محبت نہ ملنے پر تعلقات کو بھول جانے کا بھی بہت امکان ہوتا ہے۔ لیکن یہ بدمزگی بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ ایک فریق کی تمام زندگی کسی ایسے شخص کی بے جا وارفتگی کی وجہ سے ایک ناقابلِ برداشت عذاب ہو جائے جس کی محبت کا معاوضہ اُس سے نہ بن پڑتا ہو +

مس دافنے دموریئے

طبعی جذبہ عقل و فہم سے ایک بالاتر وصف ہے ازدواجی زندگی کے چند ابتدائی سالوں کی بنیاد یہی جذبہ ہے اور مستقبل کی کامیابی کا انحصار اسی کے دانشمندانہ ضبط و اختیار پر ہے لیکن پھر بھی لوگوں کو اُس وقت تک شادی نہیں کرنی چاہیئے جب تک باہمی اعتماد، محبت اور رفاقت بھی اُن میں بدرجہ اتم موجود نہ ہو۔ شادی بالکل بیکار ہے جب تک کہ دو انسان ایک دوسرے کے لئے ہر حیثیت سے لازم و ملزوم کا درجہ نہ رکھتے ہوں۔ اگر یہ نہیں تو پھر بہتر ہے کہ دونوں الگ الگ رہیں تاکہ بدمزگی اور مصیبت کا موقع ہی پیدا نہ ہو +

مسٹر انتھونی ایم لوڈوویسی

شادی کا تعلق یقیناً نہیں ٹوٹنا چاہیئے۔ نوعِ انسان لاکھوں برس سے دیکھ رہی ہے کہ محبت مٹ جاتی ہے لیکن شادی کی رسم پھر بھی قائم ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ شادی ایک تمدنی اور معاشرتی مقصد کی تکمیل کرتی ہے، اس کے مدنظر کوئی جذباتی مقصد نہیں تھا

شادی کا کچھ قصور نہیں غلطی اُن جذبات پرستوں کی ہے جو شادی کو محبت کا واحد منبع اور ذریعہ قرار دیتے ہیں اور اس کی ابتدا کو محبت سے متعلق سمجھتے ہیں۔ یہ ایک غلط اور بیہودہ خیال ہے شادی ایک ضروری معاشرتی حالت ہے جس میں محبت کی موجودگی کو کوئی دخل نہیں اور اگر شاذ و نادر کبھی ہوتا بھی ہے تو اُس وقت جب ابھی معاہدۂ نکاح کا احساس بحیثیتِ معاہدہ نہ ہوا ہو ٭

مسٹر ڈبلیو ڈبلیو وکفیلڈ:۔

میرا جواب نفی میں ہے۔ اگر بچے ہوں تو سب سے پہلے اُن کے متعلق غور کرنا چاہیئے۔ شوہر اور بیوی محبت کے بغیر بھی باہم خوش رہ سکتے ہیں ممکن ہے کہ اُن کے ایک جگہ رہنے سے محبت دوبارہ پیدا ہو جائے پھر شادی کو کیوں منسوخ کیا جائے ؟

مسٹر کالن کلائیو:۔

ہاں میرا خیال ہے کہ اگر محبت نہ رہے تو قطعِ تعلق کر لینا چاہیئے۔ میں اسے خلافِ اخلاق قابلِ نفرت اور خلافِ فطرت سمجھتا ہوں کہ دو ایسے آدمی یکجا رہیں جن کو ایک دوسرے سے محبت نہ ہو۔ میرے دل میں اُن بیاہے ہوؤں کی بہ نسبت جو فریب اور منافقت میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہوں اُن محبت کرنے والوں کی زیادہ عزت ہے جو گناہ کی زندگی گزار رہے ہوں ٭

مسٹر ڈی جی لے لو:۔

محبت، سچی اور کامل محبت کبھی مٹ نہیں سکتی۔ ایک ناقص دنیا کے ناقص انسانوں کی محبت ہی ایسی ناپائدار ہو سکتی ہے کہ اس میں کمی بھی واقع ہو سکے اور وہ مٹ بھی سکے۔ اگر یہ بات غلط ہے، اگر عمر بھر کے اُس عہدِ رفاقت کے لئے جسے محبت کی شادی کہتے ہیں کوئی بنائے قیام باقی نہ رہے، اگر خیال اور احساس میں ایسی تبدیلی واقع ہو جائے کہ کسی مشترک مسرت سے لطف اندوز ہو سکنے کا امکان نہ ہو تو غالباً رشتۂ ازدواج منقطع ہو جانا چاہیئے ٭

مسٹر چارلس گریوز:۔

شادی کا انقطاع میاں بیوی کی حمیت و غیرت پر منحصر ہے جس کے ساتھ یہ سوال بھی شامل ہو جاتا کہ آیا اس شادی سے کچھ بچے بھی ہیں ؟

مسٹر آئرس بیری:۔

شادی ایک معاشرتی معاہدہ ہے، جذباتی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ شادیاں جو باہمی آسانی و آسودگی اور مشترک خواہشات اور دوستی پر مبنی ہوں معاشقہ کی شادیوں سے بہت زیادہ کامیاب ثابت ہوتی ہیں۔ اگر دونوں فریق آسانی سے یکجا زندگی نہ گزار سکیں۔ اگر وہ آئندہ ایک دوسرے کے دوست نہ رہے ہوں تو ظاہر ہے کہ اُن کو قطعِ تعلق کر لینا چاہیئے اور تین مہینے کے بعد دوبارہ شادی کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے ٭

لیڈی ڈاروتھی ملز:-

شادی ایک حلفِ محبت ہے یا کم ازکم مروت اور احترام رفاقت کا ایک معاہدہ۔ اگر یہ نہیں تو ایک بے حقیقت اور ذلت آمیز حالت ہے جو ایک مستقل اور فضول رنج و مصیبت کا باعث ہوتی ہے اور دونوں فریقوں کی قدر و منزلت اُن کے ہم چشموں کی نظروں سے گرا دیتی ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ اسے فسخ کر دیا جائے ؂

مسٹر ریمنڈ میسے:-

ہر معاہدے کی طرح شادی کے معاہدے میں بھی زیادہ سے زیادہ مسرت مدِنظر ہونی چاہیئے۔ اس منظر سے زیادہ مکروہ اور کوئی شے نہیں کہ ایک مرد اور ایک عورت ایسی حالت میں اکٹھے رہنے پر مجبور رہوں جبکہ رشتۂ محبت ہی اُن کے اتحاد کو قائم رکھنے سے عاجز آ گیا ہو ؂

مسٹر گاڈفرے ون:-

یقیناً شادی منسوخ نہیں ہونی چاہیئے۔ کامیاب شادیوں میں سے بہت سی ایسی ہیں جن میں شوہر اور بیوی صرف دوست دوست ہیں۔ آخر شہوانی محبت کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اُسے پژمردہ و افسردہ ہو جانا چاہیئے۔ پھر اگر ایسے موقع پر رشتۂ ازدواج منقطع ہو جایا کرے تو معاہدۂ نکاح کے کیا معنی اور کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے۔ دوسری طرف ایک ایسی شادی جس کا انحصار اتنا محبت پر نہ ہو جتنا مروت، باہمی احترام اور اشتراکِ مزاج پر ہو تمام اُن مشکلات اور خطرات کا مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتی ہے جو اُس کی راہ میں پیدا ہوں معلوم ہوتا ہے کہ لوگ بھول گئے ہیں کہ شادی ایک معاشرتی ضابطہ ہے محض جذبات کے لئے ایک پردہ نہیں ہے ؂

مسٹر شیلا کے سمتھ:-

آپ کے سوال سے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے ——— کیا شادی منسوخ ہو سکتی ہے؟ پھر محبت کی تعریف کرنے کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ محبت کی بعض اقسام ایسی ہیں کہ وہ شادی کا مقصد پورا ہونے سے پہلے ہی مردہ ہو جاتی ہیں اس کے برعکس ایک محبت لازوال بھی ہوتی ہے ؂

مس کیتھلین نسبٹ:-

اس کا انحصار اُن معنوں پر ہے جو آپ لفظِ محبت سے منسوب کرتے ہیں۔ ابتدائی دنوں کا جوش اور ولولہ تو ایک ختم ہو جانے والی شے ہے اور شادی اس کے بغیر بھی ایک عمدہ رشتے کی صورت میں باقی رہ سکتی ہے۔ لیکن اگر محبت کا لفظ وہی مفہوم ادا کرتا ہے جو دوستوں کی محبت، بچوں کی محبت اور ملک کی محبت کا ذکر کرتے وقت ہمارے ذہن میں ہوتا ہے، اور اگر اس کے معنی

مروت، توجہ، وفاداری اور احترام کے احساس کے ہیں تو پھر میرا خیال ہے کہ اس کی غیر موجودگی میں شادی ایک بد اخلاقی پیدا کرنے والا رشتہ ہے اور جب اس قسم کی محبت جاتی رہے تو جس قدر بھی جلد ہو سکے اس رشتے کو توڑ دینا چاہیئے ؛

مسٹر گلبرٹ فرینکاؤ :-

تمام شادیاں باہمی رضامندی سے فوراً منسوخ ہو جانی چاہیئے ؛

مس ننیسی ہیٹن :-

اگر محبت کی پہلی سی وارفتگی گزر بھی چکی ہے تو کیوں دو شریف متنفس ایک ہی چھت کے نیچے ایک مطمئن اور کامیاب زندگی بسر نہیں کر سکتے ؟ اور اگر انہیں یہ ناممکن نظر آتا ہے اور اُن میں سے ایک کو کسی تیسرے مرد یا عورت سے محبت ہے تو پھر ہر وقت کی گھبراہٹ اور آنکھیں چرانے سے کیا فائدہ ہے ؟ اگر اُن میں سے ایک فریق دوبارہ شادی کرنا چاہتا ہے تو اسے تڑپانے کے بغیر ایسا کرنے دو' عدالتوں میں مُنجوں کے مناظر اور محبت کے خطوط پیش کرنے سے کیا حاصل ہے ؟

مس ایڈنا بیسٹ :-

ہاں۔ اگر محبت حقیقت میں مرجائے تو صرف قطعِ تعلق ہی ایک دانشمندانہ فعل ہے۔ محبت دنیا کی حسین ترین چیز ہے لیکن محبت نہ ہو تو صرف قانونی پابندی میں کوئی حسن نہیں ہے ؟ یہ نہایت کریہ المنظر ہے ؛

مسٹر کاپٹن میکنزی :-

محبت کیا شے ہے ؟ اور یہ فیصلہ کون کرے کہ محبت ختم ہوئی یا نہیں ؟

مسٹر کینتھ ونٹر :-

محبت رخصت ہو جاتی ہے تو دوستی اور اتفاقِ رائے پھر بھی اکثر باقی رہتے ہیں۔ ان میں محبت سے بڑھ کر استقلالِ تعلق کا مادّہ موجود ہوتا ہے جب یہ بھی رخصت ہو جاتے ہیں تو اُس وقت جس قدر جلد بھی قطع تعلق کیا جائے بہتر ہے ؛

مسٹر جے جیفرسن فارجیون :-

یہ ایک غضب کا مشکل سوال ہے محبت ہے کیا چیز ؟ شہوت تقریباً ہمیشہ مرجاتی ہے یا مٹ جاتی ہے لیکن ایک اور بے بہا چیز کے باقی رہنے کا امکان ہوتا ہے اگر یہ باقی رہ جائے تو ایک ایسے تعلق کے قطع کرنے سے کیا حاصل ہے جو شہوت کے مقابلے میں حیرت انگیز طور پر فائدہ مند ہو لیکن شہوت کو تسکین دینے کی مجبوری ہو تب البتہ بڑے امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ محبت کی تشریح اس لفظ کے چار حروف نہیں کر سکتے ؛

مس روزیٹا فوربس :-

اگر میرا یہ خیال ہوتا کہ محبت کے اختتام پر شادی فسخ کر دینی چاہیئے تو میں کہتی کہ محبت کرنے والے کبھی شادی نہ کریں

مسٹر آئیور نویلو :-

اگر محبت مردہ ہو جائے اور بچے بھی موجود نہ ہوں تو یقیناً قطعِ تعلق کر لینا چاہیئے - لیکن موت اور نیند میں فرق کون کرے ؟

کیا ایک کامیاب شادی کے لئے بچوں کا وجود ضروری ہے ؟

مسٹر بیورلے نکولس :-

ہاں ، ایک کامیاب شادی کے لئے بچوں کا ہونا ضروری ہے وہ ایک رحمت ثابت ہونے کے بجائے ایک لعنت ثابت ہو سکتے ہیں ، لیکن اُن کی موجودگی کم از کم شادی کے رشتے کی کمزوری کو زائل کر دیتی ہے ؛

مسٹر آلڈس ہکسلے :-

بچوں کے بغیر شادی کامیاب ہو سکتی ہے یا نہیں ؟ اس سوال کا تعلق اُن لوگوں سے ہے جن کی شادی ہوئی ہے - اکثر شادیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سوال کا جواب صریحاً اثبات میں دینا پڑتا ہے ؛

مسٹر ایولن واہ :-

ہاں ، ایک کامیاب شادی کے لئے درجنوں بچے درکار ہیں ؛

مس ایتھل مینن :-

اس سوال کے متعلق عمومیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا - یہ ایک شخصی معاملہ ہے ؛

مس سٹارم جیمیس :-

مجھے معلوم نہیں کہ ایک کامیاب شادی کے لئے بچے ضروری ہیں یا نہیں یقیناً اس کا انحصار شادی پر ہے - اگر میاں اور بیوی دونوں کو بچوں کی خواہش نہ ہو تو یہ خلافِ قیاس ہے کہ ایک بچہ اُن کی شادی کو کامیاب بنا سکے - بلاشبہ ایک حیثیت سے یہ کہنا درست ہے کہ کوئی شادی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ میاں بیوی کو ماں باپ بننے کا تجربہ حاصل نہ ہو - لیکن ہر شادی کے متعلق یہ بات بھی صحیح نہیں - بہت سی شادیاں ہونگی جو بچوں کی مسرت اور زحمت کے بغیر ہی کامیاب ہوں گی

مارکوئیس آف ڈونیگل :-

یقیناً کامیاب شادی کا انحصار بچوں کی موجودگی پر نہیں خصوصاً تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان - اس مغالطے کا آغاز شاید اُس

زمانے میں ہوا تھا جب دنیا کی آبادی بہت کم تھی' اور بڑے بڑے گھرانے آباد کرنے کی ضرورت تھی ابھی یہ منظریہ تسلیم کیا جا رہا ہے کہ جو والدین بچے پیدا نہیں کرتے وہ اپنے ملک کا فرض بجا نہیں لاتے اس بُت کا توڑنا علمی' اختیاری اور منظم طریقِ تولید کی طرف جسے آخرکار موجودہ ابتری کی جگہ لینی ہے پہلا قدم ہوگا۔ ایک ایسا طریق جس سے جاہل دہاتی کے ہاں تو دس بچے پیدا ہو جائیں اور علامہ صاحب کے ہاں ایک بھی نہ ہو۔ بڑھتے ہوئے علم کی روشنی میں برقرار نہیں رہ سکتا ؛

مسٹر سیسل بیٹن :-

نہیں' بچے شادی کی کامیابی کے لئے قطعاً ضروری نہیں ہیں۔ اور رہوں کیوں —— ہر وقت چیں ہیں کرتے رہنے والے بچو بگڑے ؟ ایک پالتو کتّے یا بلّی سے زیادہ اُن کی ضرورت نہیں ہے اور غالباً وہ اُن سے زیادہ معقول اور شریف بھی نہیں ہوتے۔ بہت سے ماں باپوں کی زندگیاں نسبتہً آسان ہو جائیں اگر نہیں اپنی اُس اولاد سے چھٹکارا نصیب ہو جو اتنا پریشان کرتی ہے کہ اُس کے مقابلے میں ان کا وجود عبث ہے ؛

مس دافنے دموریئے :-

ان میاں بیوی کے دماغوں میں کچھ خلل ہوتا ہے جو ایک دوسرے کو چاہتے ہوں اور پھر بھی بچوں کی خواہش نہ رکھتے ہوں۔ غربت اور ایک اچھے گھر کا مہیا نہ کرسکنا ہی ان کا ایک معقول عذر ہوسکتا ہے۔ شوہر اور بیوی کے تعلق کو استوار کرنے کا اس سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ اُس وجود کو پروان چڑھائیں جسے ان دونوں نے مل کر پیدا کیا ہو۔ بچوں کی وجہ سے اُن کی زندگی قدرتی طور پر کم خود غرضانہ اور کم نفس پرستانہ لیکن زیادہ دلچسپ ہو جائے گی۔ شاید بچوں کے بغیر بہت سی شادیاں کامیاب ہیں لیکن اگر ان لوگوں کے ہاں بچے ہوتے تو ان کی مسرت کے مواقع آپ سے دگنے ہو جاتے۔ عورت کا نقطۂ نظر بہرکیف یہی ہے

آنریبل ایولن مارگن :-

اس سوال کے موافق اور مخالف دونوں صورتوں میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے بلاشبہ شادیوں کی ایک بڑی تعداد والدین کی اپنے بچوں کے لئے مشترک محبت پر قائم ہے لیکن دوسری طرف تقریباً اتنی ہی بڑی تعداد رشک وحسد اور خانگی سازشوں کا شکار بھی ہوگئی ہے۔ خصوصاً ایسی سازشوں کا جن کا تعلق جائداد کی وراثت' لڑکیوں کی شادیوں اور جہیز وغیرہ کے معاملات سے ہے۔ شادیاں اسی قدر کامیاب ہوں۔ اگر میاں بیوی کے علمی اور تفریحی اشغال مشترک ہوں ؛

مسٹر ڈبلیو ڈبلیو ویکفیلڈ :-

ایک کامیاب شادی کے لئے بچوں کا ہونا ضروری نہیں۔ میں نے بعض ایسی نہایت کامیاب شادیاں دیکھی ہیں۔ جن میں بچوں کی موجودگی کو دخل نہ تھا۔ اگرچہ بچے ایک کامیاب شادی کے لئے ضروری نہیں تاہم وہ ہمارے لئے ایک امداد ہیں بہت

سی شادیاں ایسی ہیں کہ ان کی کامیابی کا باعث بچوں کا وجود ہے ؂

مسٹر کولن کلائیو :-

محبت، رفاقت اور مفاہمت، صرف یہ چیزیں ایک شادی کی کامیابی کے لئے ضروری ہیں۔ جب ان کا وجود باقی نہیں رہتا تو خواہ کتنے ہی بچے کیوں نہ ہوں والدین کی زندگی کو خوشگوار نہیں بنا سکتے۔ عام طور پر لوگ بچوں کے خواہشمند نہیں ہوتے اور ہر سال ہزاروں بچے ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کی درحقیقت ضرورت نہیں ہوتی۔ یقیناً ایک کامیاب شادی کے لئے بچوں کی کچھ ضرورت نہیں لیکن میں صرف آپ کے سوال کا جواب دے رہا ہوں۔ یاد رکھیئے کہ متاہل زندگی کی مسرت کا سوال ہو تو جواب کچھ اور ہوگا ؂

مسٹر ڈی جی اے لو :-

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک کامیاب شادی کے لئے بچوں کا وجود ضروری نہیں ہے لیکن بچے اس کی تکمیل ضرور کرتے ہیں۔ لاتعداد بے اولاد لیکن مسرور مثالیں اس امر کی شاہد ہیں کہ ایسی شادیاں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ لیکن گہرے احساسات مثلاً کامل بے نفسی جو اولاد کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اولاد کے بغیر اس کا تجربہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کامل ازدواجی زندگی ایک با اہل وعیال زندگی ہی کو کہہ سکتے ہیں جس میں رنج و راحت کے حقیقی تجربات اور ایثار نفس کے ہزاروں موقع موجود ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بچے ہماری ذہنی ترقی میں بھی مدد دیتے ہیں۔ وہ والدین کے درمیان ایک مضبوط رشتہ ہوتے ہیں، وہ رحمت و برکت کا باعث ہیں ؂

مسٹر جان سٹریچی رکن پارلیمان :-

شادی کی کامیابی کے لئے بچوں کی یقیناً ضرورت نہیں ہے لیکن وہ شادی کے لئے کچھ مہلک بھی نہیں ہیں ؂

مسٹر مارس لین نارکاٹ :-

میرا خیال ہے کہ بچوں کا وجود ایک کامیاب شادی کے لئے ضروری ہے، کم از کم والدین اپنے بچوں کی تصویریں دکھاتے وقت مجھ سے یہی ظاہر کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ جھوٹ بولتے ہوں ؂

لیڈی ڈاروتھی ملز :-

اس مسئلہ کا انحصار زیادہ تر ہر شخص کی ذاتی طبیعت پر ہے۔ ایک ایسی شادی جس کی بنا دنیا کے رواج اور شہوانی کشش پر ہو بچوں کے ذریعہ سے شاید کچھ وقعت اور تقویت حاصل کر سکتی ہے لیکن ایک ایسی شادی جس کی بنا اتحادِ خیال حقیقی ہمدردی مفاہمت اور اشتراکِ مفاد پر ہو میرے خیال میں بغیر بچوں کے مکمل ہے ؂

پروفیسر اے ایم لو، ڈی ایس سی :-

میرا یہ عقیدہ نہیں کہ بچے ایک شادی کو کامیاب بنا سکتے ہیں۔ جب تک اتحادِ ازدواج پورے طور سے کامیاب ہو اس وقت تک بچے بالکل پیدا نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر ہمارے نگڑدادا کی طرح ہماری ناک پر بھی ایک تِل ہو تو ہم اس میں فخر محسوس کرتے ہیں لیکن ایک ایسے اتحاد کو کیوں جاری رکھا جائے جو دو زندہ انسانوں کے درمیان بدمزگی کا موجب ہو؟

ریورنڈ ایچ جی جی ہرکلاٹس :-

چونکہ اس کتاب کے مرتب نے تعمیم سے کام لیا ہے اس لئے ایک ایسے سوال کا کوئی قطعی جواب دینا ناممکن ہے لیکن میرا خیال ہے کہ کامیاب شادیوں میں اکثریت اُن شادیوں کی ہے جو اولاد سے بہرہ ور ہوئیں، اور ناکام شادیوں میں اکثریت اُن کی ہے جو اولاد سے محروم رہیں۔ دیدہ دانستہ ایک بے اولاد شادی کی طرح ڈالنا مشکلات کو دعوت دینا ہے ؛

جے اے بانڈ، صدر آکسفرڈ یونین :-

میں کتابِ مقدس کی تقلید کروں گا یعنی سوالات کا جواب سوالات سے دوں گا۔ کامیاب شادی کیا ہوتی ہے؟ کامیابی کیا ہے؟ شادی کیا ہے؟

مس وایولٹ کارڈری :-

میرا خیال ہے کہ بچے شادی کو زیادہ خوشگوار بنا دیتے ہیں۔ لیکن ایک کامیاب شادی کے لئے ان کا وجود ضروری نہیں ہے ؛

مسٹر ریمنڈ میسے :-

اگر کامل مسرت حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اکثر شادیوں کے لئے بچوں کا ہونا ضروری ہے۔ شادی کا مقصد ہی بچے ہیں، اور ایک بے اولاد شادی اُس موٹر کی طرح ہے جس کا انجن نہ ہو ؛

مسٹر سیوئل سٹوکس :-

بچوں کا وجود اکثر شادیوں کی کامیابی کے لئے ضروری ہے جب عشق کا جوش سرد پڑنے لگتا ہے تو ایک مرد اور ایک عورت کو باہم متحد رکھنے کے لئے کسی مشترک دلچسپی کی ضرورت ہوتی ہے، بچے ان کی اس ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ بچے اپنے والدین کو جوان رکھنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ ادھیڑ عمر کی کنواریاں اور کنوارے شاذونادر ہی اتنے ترقی یافتہ ہوتے ہیں جتنے کہ ادھیڑ عمر کے والدین ہوا کرتے ہیں ؛

مسٹر گاڈفرے ون :-

ذاتی طور پر میرا یہ خیال نہیں ہے کہ ایک کامیاب شادی کے لئے بچوں کی ضرورت ہے ہم ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں جس کا ضبط و نظام عقل اور رفتار سے قائم ہے جس میں جذبات کو علم سے مغلوب ہونا پڑتا ہے، بہت سے لوگ چاہتے ہوں گے کہ اُن کے ہاں بچے ہوں لیکن بہت کم ہوں گے جو اس کی مقدرت رکھتے ہوں، کیونکہ بچے، نہ صرف مالی نقطۂ نظر سے بلکہ وقت اور قوت کو ضائع کرنے کے لئے بھی ایک عیب و مستقل خطرہ ہیں۔ یہ ایک مغالطہ ہے کہ جس بیوی کے ہاں اولاد نہ ہو وہ خوشی اور خوش اخلاقی سے محروم ہوتی ہے اس کے برخلاف آج اُسی بیوی کو ہوشمند سمجھا جاتا ہے جو بے اولاد رہنے کی کوشش میں مصروف رہے ؛

مس کیتھلین نسبٹ :-

میں نہیں سمجھتی کہ بچے ایک شادی کی کامیابی میں کچھ مدد دیتے ہوں گے۔ بچوں کی موجودگی کبھی کبھی اُن لوگوں کو یکجا رہنے پر مجبور کرتی ہوگی جو بصورتِ دیگر جدا جدا ہو جاتے لیکن وہ اپنے والدین کے تعلقات پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ ایک کامیاب شادی کا انحصار کسی بیرونی اثر کے بجائے میاں بیوی کی طبیعتوں کے ملاپ اور ایک دوسرے کے احترام پر ہے ؛

مسٹر گلبرٹ فرینکاؤ :-

کیا کہیں کامیاب شادیوں کا وجود بھی ہے ؟

مس ژان دکازانی :-

غالباً بچے ہمیشہ شادی کی کامیابی کے لئے ضروری نہیں ہوتے لیکن یقیناً کوئی شادی اُن کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اور یقیناً جس عورت کے ہاں بچہ نہیں ہوا آدھی عورت ہے ؛

مس نینسی پیٹن :-

بچوں کی موجودگی سے شادی کی کامیابی کو کچھ تعلق نہیں۔ فرض کیجئے کہ ایک لڑکی نے اپنی پسند سے شوہر انتخاب کیا ہے وہ کیوں اُسی کے ساتھ مطمئن نہیں ہو جاتی اور بشیار چیخنے چلانے والے اور غالباً کریہ المنظر بچوں کا غم اور پریشانی اٹھاتی ہے۔ ہاں۔ اگر جائداد کے لئے وارثوں وغیرہ کی ضرورت ہو تو بسم اللہ، پھر ہر عورت کو یہ کام فرض سمجھ کر انجام دینا چاہیئے، اور بہ تکلف چہرے پر شگفتہ ترین تبسم لا کر بچے کا خیر مقدم کرنا چاہیئے ؛

مس سونیا ہیمبرگ :-

پچھلے زمانے میں جب عورتیں ناتعلیم یافتہ ہوتی تھیں خاوند اور بیوی کی مشترک دلچسپیاں صرف بچوں تک محدود تھیں۔

معاشرہ آج سے زیادہ قبیلہ پرست تھی اور بچوں کے بغیر شادی کے ناکام ہو جانے کا امکان تھا۔ آج کل عورتیں اپنے شوہروں کے ہر معاملے میں حقیقی دلچسپی لینے کے قابل ہو چکی ہیں اور جب سے حکومت نے والدین کو اپنے بچوں کے متعلق بہت سے حقوق سے محروم کر دیا ہے اولاد کی خواہش پہلے کی طرح شدید نہیں رہی جب شادی کی بنیاد رفاقت کے احساس اور اعتماد پر ہو تو بچوں کی غیر موجودگی میاں بیوی کی مسرت میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں کر سکتی ؛

مسٹر کامپٹن میکنزی :-

ننانوے فیصدی شادیوں کی کامیابی کے لئے بچوں کا ہونا ضروری ہے ؛

مس آرنٹ رابرٹسن :-

اگر میاں بیوی سمجھدار دوست ہیں تو بچوں کی کچھ ضرورت نہیں۔ اگر عورت کو بچوں کے افکار سے نجات دلانے کے لئے جیب میں پیسے ہوں تو بچوں سے بڑھ کر اور کوئی چیز شوہر اور بیوی کے رشتے میں خلل ڈالنے والی نہیں ہے جذبات پرستوں سے قطع نظر بچوں کا مسئلہ اقتصادی حالات سے تعلق رکھتا ہے ایک اچھی شادی بغیر بچوں کے بھی کامیاب بنتی ہے' ایک بُری شادی ان کی وجہ سے برقرار رہ سکتی ہے لیکن اگر یہ ایک ایسا بودا رشتہ ہے کہ اس سہارے کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا تو دس میں سے نو صورتوں میں اسے توڑ دینا بہتر ہے ؛

لیڈی ڈرمنڈ ہے :-

ایک کامیاب شادی لازماً ایک پُرمسرت شادی نہیں ہوتی ایک کامیاب شادی کے صرف یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ دو آدمی یکجا زندگی گزار رہے ہیں ایسی شادیوں کے رشتے میں بچے اکثر ایک مضبوط گرہ کا کام دیتے ہیں ؛

مشرقی ممالک میں جہاں میں ایک عرصے تک رہی ہوں' بچے' بہت سے بچے تقریباً شادی کا حقیقی مقصد سمجھے جاتے ہیں لیکن اس پر بھی مشرق ہی میں شہر آگرہ کے اندر ایک مرد اور عورت کی محبت کی یادگار "تاج محل" موجود ہے جس کی نظیر تمام دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔

دنیا میں ایک اولاد معنوی بھی ہوتی ہے یہ بڑے بڑے صاحب دماغ لوگوں' موجدوں' مصنفوں' مصوروں' شاعروں وغیرہ کی تخلیق ہوتی ہے' ایسے لوگوں کو بچوں کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی ؛

مس روزیٹا فوربس :-

ایک کامیاب شادی کے لئے بچوں کی ضرورت نہیں ہے' میں نے بچوں کے بغیر بہت سی کامیاب شادیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ بچوں کی موجودگی کی حالت میں اُن کی غیر موجودگی کی حالت کی بہ نسبت طلاق کا امکان کم ہو جاتا ہے اور ہو جانا چاہیئے اور اگر کسی شادی کے کامیاب ہونے کا بڑا ثبوت اُس کا قیام ہے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ بچے اس کامیابی کے حصول میں بڑی مدد دیتے ہیں ؛

منصور احمد

لوری

چمگادڑ نے دھوم مچائی   گھمسا چھایا رام دہائی[1]
آئی رات اندھیری چھائی   ہریالی[2] نے لوری گائی

اگلا جھولے بگلا جھولے
ساون ماس[3] کریلا پھولے[4]

لوٹ آئے گھر موچھ مچھندر[5]   ہاتھ میں رسی پیچھے بندر
دنیا بھر کے شاہ قلندر[6]   سوئے اپنے گھر کے اندر

اگلا جھولے بگلا جھولے
ساون ماس کریلا پھولے

پیاری نیند کا پیارا آنا   بھاری پلکوں سے پہچانا
لو ہم گائیں پریم کا گانا   اللہ آمیں تم سو جانا

اگلا جھولے بگلا جھولے
ساون ماس کریلا پھولے

---

۱ ۔ گھمسا چھایا رام دہائی " ـــ ایک دیہاتی نغمہ ہے مطلب یہ ہے کہ تاریکی شب چلی خدا کی پناہ ÷

۲ ۔ ہریالی ایک دیہاتی نام ہے اس قسم کے نام ـــ بچے کھلانے والی سہیلیوں کے ہوا کرتے ہیں ÷ ۳ ۔ ماس معنی مہینہ

۴ ۔ یہ ایک دیہاتی نغمہ ہے جو بطور لوری کے گایا جاتا ہے اس میں ایک خاص دیہاتی کیفیت ہے۔ کریلے کے پھولوں کی خوشبو بڑی مست ہوتی ہے

۵ ۔ "موچھ مچھندر" یعنی بندر والا جو اپنے لمبے بالوں اور خاص قسم کی مونچھوں کی وجہ سے بچوں میں بہت مشہور ہے۔ اس کو مداری بھی کہتے ہیں کبھی کبھی وہ تماشے بھی کرتا ہے۔ شام کے وقت گھر جاتے ہوئے وہ سڑک پر خاص انداز سے نکلتا ہے ÷

۶ ۔ یعنی امیر و غریب (۷) المخمور ÷

بالےؔ میاں کا بجا ربانا ۔۔۔ اٹھ کے سویرے میلے جانا
برفی اور بتاشے کھانا ۔۔۔ بچے کھچے تو گھر کو لانا

اگلا جھولے بگلا جھولے
ساون ماس کریلا پھولے

روتے روتے سونا کیسا؟ ۔۔۔ سوتے سوتے رونا کیسا؟
آئی نیند کو کھونا کیسا؟ ۔۔۔ آنسو سے مُنھ دھونا کیسا؟

اگلا جھولے بگلا جھولے
ساون ماس کریلا پھولے

حامدؔ، سرورؔ، نسیمؔ سویا ۔۔۔ موہنؔ اپنے گھر پر سویا
جو تھا باہر بھیتر سویا ۔۔۔ سوجا سوجا سب گھر سویا

اگلا جھولے بگلا جھولے
ساون ماس کریلا پھولے

ٹامیؔ سویا ٹیگر سویا ۔۔۔ طوطا، مینا، کبوتر سویا
مرغا اور کبوتر سویا ۔۔۔ لال، بیا اور تیتر سویا

اگلا جھولے بگلا جھولے
ساون ماس کریلا پھولے

گیت سہانا نیند یا گائے ۔۔۔ چندا ماموں آئے آئے
کنول کٹورا لائے لائے ۔۔۔ آنکھیں موند کو لی سو جائے

اگلا جھولے، بگلا جھولے
ساون ماس کریلا پھولے

سید مقبول حسین احمد پوری

---

۸ بالے میاں" سید سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ۔ آپکا مزار بھرائچ (ملک اودھ) میں ہے سال میں وہاں ایک بڑا میلہ ہوتا ہے بڑے بڑے جھنڈے جن کو "نشان" کہتے ہیں میلے کی خاص دلچسپی ہیں جیسے محرم میں علم - ربانا ایک خاص قسم کا باجا ہوتا ہے جس کے بجانے والے "ڈفالی" کہلاتے ہیں۔ جب بھرائچ کا میلہ قریب ہوتا ہے تو ڈھلی ہوئی شام یعنی تقریباً آٹھ بجے شب کو میلے جانیوالے یہ باجہ بجاتے ہوئے گاؤں کے قریب سے گذرتے ہیں اسوقت اس کو سنکر ایک عجیب لطف حاصل ہوتا ہے۔

۹ یہ سب ساتھ کھیلنے والے لڑکوں کے نام ہیں ۱۰ پالتو جانوروں یعنی کتوں اور پرندوں کے نام ؛

تشکیلِ بیان

یعنی

مصحفی کی شاعری پر ایک نظر

تشکیل کا احساس عموماً دو طرح ہوتا ہے۔ دیکھ کر اور سُن کر۔ نگاہ کی کارفرمائی بلا واسطہ ہے البتہ سماعت کے ذریعہ سے "احساسِ تشکیل" کا ہونا بغیر کسی واسطے کے ممکن نہیں۔ سامع کو ہمیشہ تمثیل و بیان کی ضرورت ہے۔ مثلاً ایک نابینا شخص صرف آواز ہی کے ذریعہ سے کسی چیز کا احساس اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کا نمونہ پیش نہ کیا جائے یعنی یہ کہ جب تک اس کو طول و عرض اور رنگ و خاصیت سے آگاہ نہ کیا جائے گا محض سن کر اسے کوئی احساس نہیں ہو سکتا۔ بالفاظِ دیگر جب تک کہ آواز ایک نوائے مجسم نہ ہو۔ سماعت کے ذریعہ سے کسی تشکیل کا احساس ہونا امرِ محال ہے۔

فنونِ لطیفہ میں مصوری تشکیلِ نظر ہے اور شاعری تشکیلِ بیان۔ جس طرح کہ مصوری کو "تشکیلِ احساس" اور "جذبۂ مجسم" وغیرہ کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح علاوہ تشکیلِ بیان ہونے کے شاعری اور بھی بہت کچھ ہے۔ مثلاً یہ کہ کبھی تو شاعری نوائے کیف ہے کبھی کیفِ مجسم کبھی موسیقی ہے کبھی تصور کبھی احساسِ لطافت ہے کبھی خود لطافت۔ اس اعتبار سے شاعری کو ہم دو بڑی خصوصیتوں کا حامل پاتے ہیں۔ وہ یہ کہ (۱) شاعری آرٹ کی تفسیر ہے اور (۲) خود آرٹ شاعری کی تفسیر ہے۔ پہلی خصوصیت کی مثال مغربی شاعری ہے اور دوسری مثال مشرقی شاعری۔ مشرقی شاعری ایک مشترکہ حیثیت بھی رکھتی ہے۔ مثلاً اہلِ چین کی شاعری۔ شاید مغرب نے یہ باتیں چینی لوگوں ہی سے سیکھی ہیں۔ اہلِ چین کی شاعری اور مصوری کا انحصار باہم ایک دوسرے پر ہے۔ چینی لوگ ازل ہی سے مصور پیدا ہوئے ہیں۔ ان کی معاشرت، ان کی زبان حتیٰ کہ رسم الخط اور طرزِ تحریر سب مصوری کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ انگلستان میں چینی نظموں کے ترجمہ کرنے والے بہت سے ادیب ہیں۔ چنانچہ H. A Giles اور Arthur Waley کی حیثیت چینی زبان کی واقفیت کے اعتبار سے انگریزی میں وہی ہونی چاہیئے، جو میکس میولر کی سنسکرت زبان کے اعتبار سے ہے۔ کیونکہ ان کی ترجمہ کی ہوئی چینی نظموں سے پتا چلتا ہے کہ چینی نظم ایک قسم کا آرٹ ہے۔ انگریزی زبان میں اور بھی مختلف ترجمے ہیں یہاں ایک نظم کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

رات کیسے بڑھ رہی ہے؟ ؞ آدھی رات ابھی نہیں آئی

نیچے میدان میں مشعل جل رہی ہے ❊ دور سے میں ڈھول بجنے کی آواز سن رہا ہوں
رات کیسے بڑھ رہی ہے؟ ❊ رات ابھی ختم نہیں ہوئی
میں بلندی پر بگل کی آواز سنتا ہوں ❊ آنے والی روشنی میں مشعل دھیمی پڑ رہی ہے
رات کیسے بڑھ رہی ہے؟ ❊ رات ختم ہو گئی
صبح کی روشنی میں مشعل سے دھواں اٹھ رہا ہے ❊ دھوپ میں اژدر پھریرا Dragonbanner اڑ رہا ہے"

(ترجمہ از انگریزی - ماخوذ از چینی تصنیف "شی کنگ" مترجمہ Hellen Waddell)

انگریزی شاعروں میں ورڈسورتھ ٹینیسن اور شیلی نے شاعری کو آرٹ کی تفسیر ثابت کیا ہے۔ آج کل اردو زبان میں عموماً انہیں کی تقلید کی جاتی ہے۔ چنانچہ "شبان زادوں کے نعرے"، "مطربہ و مغنیہ کے نغمے" "سب شعرائے مغرب کی آواز بازگشت ہیں۔ قدیم اردو شعرا میں یہ باتیں نہ تھیں، اگر قدیم اردو شاعری کے ذریعے سے صورت گری کی بھی گئی ہے تو عام ہندوستانی مناظر کو مدنظر رکھ کر مثلاً

ساقیا ساغر مے لاکہ منائیں ساون ❊ بوندیاں پڑتی ہیں چلتی ہیں ہوائیں سن سن
بادل امڈے چلے آتے ہیں گھماگھم ہر سو ❊ بجلیاں کوندتی ہیں شور ہے اتر دکھن

تشکیل بیان کی یہ خالص ہندوستانی مثالیں ہیں۔ اب مغربی رنگ ملاحظہ ہو۔ شاعر قازوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے اڑنے کی تصویر کھینچتا ہے۔ عام طور پر قازیں پرے باندھ کر اڑا کرتی ہیں۔ ایک قاز آگے ہوتی ہے۔ باقی قطار در قطار پیچھے۔ اگلی قاز کو مخاطب کر کے شاعر کہتا ہے ؎

آگے آگے تو ہے پیچھے ہمنوا ہیں بے شمار ❊ اڑتی جاتی ہے بصد تزئیں قطار اندر قطار
تیرے منہ سے اس طرف آواز نکلی ایک بار ❊ اور ادھر چیخوں سے اکدم گونج اٹھا ابر بہار
سچ بتا اے قاز اندھیرے میں کہاں جاتی ہے تو؟

یہ تو اردو زبان میں مغرب کی تقلید ہوئی۔ اس اعتبار سے شاعری آرٹ کی تفسیر ہے۔ جب کبھی یہ انداز بیان مشرقی سوسائٹی سے ہم آہنگ ہو کر ظاہر ہوتا ہے بہت پیارا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً حقہ اور چلم سے متعلق یہ شعر ؎

سوزاں ہے چلم آتش رخسار کی صورت ❊ اور اس پہ دھواں گیسوئے خمدار کی صورت

غزل میں کم و بیش ہر شاعر نے یہ رنگ اختیار کیا ہے۔ مگر عمومیت صرف عہد جدید کے شعرا کو حاصل ہوئی۔ مثلاً داغ ؎

جنبش میں یوں ہیں وہ لب نازک نفس کے ساتھ ❊ جیسے ہلے نسیم سے پتی گلاب کی

لیکن آرٹ کے ذریعہ سے بجائے داغ کو عام کرنے کے غالب کو عام کرنے کی کوشش زیادہ کی جاتی ہے۔ شاید علوئے تخیل

کو مدنظر رکھ کر یہ بات پسند کی گئی۔ اقبال اس کے زیادہ مستحق تھے۔

آرٹ شاعری کی تفسیر کس طرح ہے؟ اس کی تمثیل آج کل اردو رسائل میں بہت کچھ پیش کی جاتی ہے۔ عمر خیام پر مغرب میں اور غالب وغیرہ پر ہندوستان میں جو آرٹ بلاکس تیار کئے گئے ہیں، مثال کے لئے کافی ہیں۔ لیکن غالب کے خیالات کو آرٹ بخوبی نمایاں نہ کرسکا۔ نمایاں کرنے کی سعی قابل تعریف ضرور ہے مگر لاحاصل۔ اقبال اور جوش اس سعی کے زیادہ اہل ہیں۔ اگرچہ علامہ اقبال کی سعی حقیقت جوش میں نہیں تاہم باوجود غلبۂ رنگِ مجاز کے جوش کا کلام تشکیلِ بیان کا نہایت زود فہم نمونہ ہے۔ مثلاً یہ شعر ؎

نظمِ عبودیت پڑھی میں نے کچھ ایسے لحن سے ✲ ہنس کے رباب اٹھا لیا نغمہ زنِ الست نے

نغمہ زنِ الست کی تصویر تو صرف تصور میں کھنچ سکتی ہے۔ مصور سے ممکن نہیں۔ یہی شاعری کا کمال ہے خیر یہ حضرات تو عہدِ حال سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان پر تو ابھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے۔ آیئے اردو شاعری کے قدیم اسکول پر ایک نظر ڈال لیں۔ قدیم اسکول کے شعرا میں تشکیلِ بیان کی اہلیت کم رہی۔ بظاہر انشا اللہ خان پر نظر پڑتی ہے۔ مثلاً ذیل کی "تصویر":-

بلبل ادا اس بیٹھی ہے اک سوکھے ڈنڈے پر

لیکن انشا کا یہ عام انداز نہیں۔ اس قسم کی عمومیت تو اُن کے ہم چشم مصحفی کے کلام میں بہت ہے۔ بعض لوگوں نے مصحفی کے کلام کو بالکل خشک قرار دیا ہے۔ یہ بات واقعیت سے بہت دور ہے۔ مصحفی میں درد بھی ہے کیف بھی، ندرت بھی ہے واقعیت بھی۔ کہیں وہ میر ہیں کہیں میر درد، کہیں غالب اور کہیں داغ غرض میرے خیال میں وہ "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کے مصداق ہیں۔ مثلاً ذیل کے اشعار ؎

شاہد رہیو تو اے شبِ ہجر ✲ جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی (رنگِ میر)

وہ کبھو گل ہے اور کبھو بلبل ✲ مصحفی اس کا ایک حال نہیں (رنگِ درد)

اے مصحفی میرے دلِ ناشاد کی خاطر ✲ ایجاد کیا اُس نے بد شنام تبسم (رنگِ غالب)

نامے کے میرے ٹکڑے لا ڈالے میرے آگے ✲ نامے کا میرے قاصد اچھا جواب لایا (رنگِ داغ)

علیٰ ہذا القیاس مصحفی سب کچھ ہیں۔ پھر بھی اُن کے کلام میں ایک قسم کا ضعف ضرور ہے اس ضعف کی وجہ انشاءاللہ خان کے جوش وخروش کے ساتھ تقابل ہے۔ انشا کا کلام مصحفی سے ہم آہنگ نہیں نہ وہ معیار ہے[1] انشا سے مصحفی کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش ہی اس ضعف کے احساس کا باعث ہے۔ جو بات فطری نہ ہو اکتسابی طور پر ظاہر نہیں ہوسکتی ✲

مصحفی ہمہ گیر ہیں۔ ان کا اندازِ بیان دوسرے شعرا کے بیان میں مشترک ہے لیکن باوجود اس اشتراک باہمی کے وہ ایک ذاتی خصوصیت بھی رکھتے ہیں۔ وہ خصوصیت تشکیلِ بیان ہے تشکیلِ بیان کو مصحفی کے کلام پر ایک نئی "ریسرچ" یا تحقیق سمجھنا چاہیئے

---

[1] ایڈیٹر کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا لازم نہیں

اس کے دو پہلو اوپر بیان کئے گئے۔ مصحفی کی ہر غزل کے متعدد اشعار ان میں سے کوئی نہ کوئی پہلو ضرور لئے ہوتے ہیں۔ ان دو کے علاوہ ایک تیسرا پہلو بھی ہے جس کو ہم بزبانِ حالی مرحوم "ان نیچرل تشکیلِ بیان" کہیں گے۔ دیوانِ مصحفی سے اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

زلف جھک کر سلام کرتی ہے ⁂ رُخ کو اور رُخ کہے ہے عمر دراز

نالہ کرتی ہے جس گھڑی بلبل ⁂ شعلہ آک آشیاں سے اٹھتا ہے

رات پردے سے فرامنہ جو کسو کا نکلا ⁂ شعلہ سمجھا تھا اُسے میں یہ بھبھوکا نکلا

یہ تمام باتیں غیر فطری ہیں۔ اسی طرح یہ شعر ؎

مری حالت سے جا کر یوں کرے اس کو خبر کوئی ⁂ کہ روتا ہے کھڑا تیرے لئے بیرون در کوئی

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں بچپن کی خوبو ہے۔ کیونکہ اس طرح لڑکے باپ سے رو کر مٹھائی مانگا کرتے ہیں۔ عاشق کے رونے کے لئے صحرا و بیابان کی تخصیص ہونا چاہیئے۔ اسی غزل میں یہ شعر البتہ تشکیلِ بیان کی اعلیٰ مثال ہے ؎

خدایا صبر دے دل کو کہاں تک راہ میں اُس کی ⁂ دھرے زانو پہ سر بیٹھا رہے ڈوڈو پہر کوئی

تمثیلِ بیان سے جو تشکیل پیدا ہوتی ہے بعض وقت نہایت ہی دلچسپ ہوتی ہے۔ مثلاً ؎

حیران ہے کس کا جو سمندر ⁂ مدت سے رُکا ہوا کھڑا ہے

اس سے کہیں زیادہ دلچسپ کامیاب مثال مصحفی نے اس شعر کے ذریعہ سے بہم پہنچائی ہے۔ شعر ؎

نوکِ مژگاں پر کرے ہے یوں دلِ صد پارہ رقص ⁂ پھول گیندے کا کرے جوں برسرِ فوارہ رقص

شعر کا دوسرا مصرعہ تمثیلِ بیان کی نہایت دلچسپ تشکیل ہے ⁂

اہلِ چین اپنے آرٹ میں نہایت استادی اور حُسن و خوبی کے ساتھ شاعرانہ تخئیل کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہندی شاعری میں کہیں کہیں چینی رنگ ہے۔ مگر بہت کم۔ مثلاً ملک محمد جائسیؒ کا یہ شعر ؎

بھئی ادر یہ بھپ نامان، ⁂ جن بات بکھر رہے گھن سامان

شاعر فرقِ محبوب پر پھولوں کو دیکھ کر کہتا ہے کہ سیاہ بادلوں میں بگلوں کی قطار اُڑی چلی جا رہی ہے۔ اسی طرح ایک یہ مشہور شعر ؎

ندی کنارے دھواں اٹھت ہے میں جانوں کچھ ہوئے ⁂ جہ کارن جوگن بھئی کہوں وہی نہ جرتا ہوئے

اردو زبان میں واقعات کو اس انداز سے ظاہر کرنے کی طرف پہلے کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔ اب البتہ اس طرف طبائع مائل ہوئی ہیں۔ مصحفی کے کلام میں چونکہ یہ رنگ غالب ہے۔ اس لئے یہ خوبی اُن کے کلام میں خصوصیت کا درجہ رکھتی ہے۔ البتہ یہ خصوصیت بھی

اسی قدیم مشرقی رنگِ تغزل یعنی وصال و فراق وغیرہ کے دائرے تک محدود ہے۔ مثلاً مصحفی کے یہ اشعار ؎

دیکھ اُس کو اک آہ ہم نے کرلی ❊ حسرت سے نگاہ ہم نے کرلی
جب اُس نے چلائی تیغ ہم پر ❊ ہاتھوں کی پناہ ہم نے کرلی
نخوت سے جو کوئی پیش آیا ❊ کج اپنی کلاہ ہم نے کرلی

"متحرک آرٹ" کی مثالیں بھی ملاحظہ ہوں۔ لکھتے ہیں ؎

ساقی شراب لایا مطرب رباب لایا ❊ تجھ پر تو اک قیامت عہدِ شباب لایا
شمع پر پروانہ شب جس وقت جل کر رہ گیا ❊ دیکھ کر میں اس کو اپنے ہاتھ مل کر رہ گیا
ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا ❊ کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا
کبھو تک کے در کو کھڑے رہے کبھو آہ کرکے چلے گئے ❊ ترے کوچے میں جو ہم آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے
ترسا نہ مجھ کو کھینچ کے تلوار مار ڈال ❊ گر مار ڈالنا ہے تو اک بار مار ڈال

شاعری حُسن و کیف اور آہنگ و نغمہ کا مجموعہ ہے۔ حسن کیا ہے کسی حسین احساس کی مرئی شکل۔ کیف کیا ہے ایک روحانی شادمانی جس کی صدائے بازگشت آہنگ و نغمہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے شاعری کو ایک فنِ لطیف کہا جاتا ہے۔ اگر کان سے سُن کر دل اس سے لطف حاصل کرسکتا ہے تو آنکھ مطالعہ کے ذریعہ سے اس کو دل تک پہنچا سکتی ہے۔ موسیقی اس کو سنا سکتی ہے۔ مصوری دکھا سکتی ہے، دیکھنا، سننا ہی دو ایسے احساس ہیں جن پر فنونِ لطیفہ کا دارومدار ہے۔ شاعری ایسی چیز ہے جس کو دیکھا بھی جائے اور سنا بھی جائے اور ہر طرح اس سے لطف حاصل کیا جائے۔ مصور اس کو دیکھنے کے قابل بنا رہے ہیں۔ مگر اردو اشعار کی طرف ابھی انہوں نے زیادہ توجہ نہیں کی ہے حالانکہ اردو میں اُن کے مطلب کی چیزیں بہت ہیں وہ زمانہ زیادہ دور نہیں جب اس طرف لوگ متوجہ ہوں گے، آیئے آخر میں مصحفی کے چند اشعار بہ طورِ انتخاب اور لکھ دیں جو ان کی مصورانہ شاعری کا ثبوت بھی ہوں اور مصوروں کے لئے "Muse of art" بھی ثابت ہوں:۔

صاف چولی سے عیاں ہے بدن سُرخ ترا ❊ نہیں چھپتا تہِ شبنم چمن سُرخ ترا
پہنی جو قبا جامۂ گل دوز کی تم نے ❊ طاؤس صفت اور بھی طناز ہوئے تم
پوچھیں گے تمہیں تازہ نہالانِ چمن کیا ❊ اب نام خدا سروِ سرافراز ہوئے تم
تھا سرخ پوش وہ گل شاید چمن کے اندر ❊ شعلہ سا شب پھرے تھا سروِ چمن کے اندر
جو ہاتھ دلبروں کے دامن کو کھینچتے تھے، ❊ اب کھنچ کے رہ گئے ہیں کیسے کفن کے اندر

گورے بدن کا عالم اس کا میں رات دیکھا ❊ اک نور کا جھمکڑا تھا پیرہن کے اندر

خوشوں کے مانند سر سے پاؤں تک ہیں آبلے ❊ آدمی ہے تیرا دیوانہ کہ نخل انگور کا

ہے طرفہ ماجرا مرے قاتل کے سامنے، ❊ بسمل پڑا تڑپتا ہے بسمل کے سامنے

جا رہیے اس جگہ کہ جہاں اچھی صورتیں ❊ بے پردہ ہو کے آتی ہیں سائل کے سامنے

حسرت پر اُس مسافرِ بیکس کی رویئے ❊ جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

اپنے رونے کو کوئی سمجھے تو آئینہ مثال ❊ دیدۂ خشک سے آنسو کی تری نکلے ہے

کھول دیتا ہے تو جب جا کے چمن میں زلفیں ❊ پابہ زنجیر نسیمِ سحری نکلے ہے

مصحفی کس کے کھلے بال تو دیکھ آیا ہے ❊ کہ تری وضع سے شوریدہ سری نکلے ہے

سید مقبول حسین احمد پوری

قطعات

محرومی

جن کو ہے عشقِ دل میسر، وہ
ہائے کیا کیا کھلکھلا کے ہنستے ہیں
اور ہم بے نصیب اے اختر
مسکرانے کو بھی ترستے ہیں

بانسری سے نغمہ

بجلی کی طرح کوندر ہی ہے صدائے نے
سینے میں نشتر سے چبھوتی ہے کوئی نے
نغمے سے کہہ رہا ہے مری داستان ہو
دل اپنے سوز و ساز کو پہنچا تا ہو جیسے

اختر انصاری دہلوی بی اے آنرز

غزل

صحرائے جنونِ اُلفت میں دیوانۂ کامل کوئی نہیں
واماندۂ منزل لاکھوں ہیں آوارۂ منزل کوئی نہیں

انجامِ محبّت سوچتے کیا آغاز ہی کا جب ہوش نہ تھا
اِس عشق کی اندھی نگری میں سب مست ہیں عاقل کوئی نہیں

طوفانِ بلا کی موجوں میں اوڈوبنے والے ہوش میں آ
کس چیز کو نظریں ڈھونڈتی ہیں۔ اس بحر کا ساحل کوئی نہیں

یا کشمکشِ امیدِ طرب یا حسرتِ یاس و محرومی
دُنیا کے پُجاری دنیا میں غمگین ہیں خوشدل کوئی نہیں

یا خوُئے الم کی راحت میں مَیں کاہشِ غم کو بھول گیا
یا کاہشِ غم ہی دنیا میں احساس کے قابل کوئی نہیں

ہے شرطِ نظر اندازِ جنوں سب غیب کے جلوے ظاہر ہیں،
یوں نام کو پردے ہوں تو ہوں نظارہ میں حائل کوئی نہیں

ریاض عباسی امروہی

پنا سے اجیگڑھ تک

چاند کا منہ فق ہوگیا، ڈوبتے اُچھلتے تاروں کی محفل پھیکی پڑ چکی، صبح کاذب کے دھندلکے میں نسیم سحری کی سرسراہٹ سے جو میری آنکھ کھلی، میں نے ایک چھوٹی سی پوٹلی بغل میں مار، ڈور لوٹا سنبھال، میاں عبدالغفور صاحب سوداگر کو بلایا - وہ بھی شاید گوش برآواز ہی تھے، چارپائی سے تڑپ کر زمین پر کھڑے ہوگئے، اور لگے آنکھیں مل مل کر کہنے :-

سلام علیکم . . . . اچھا . . . . ہاں تو آپ چلے . . . . اب جاتے ہیں؟ . . . . ہاں . . . میں نے کہا ذرا دو چار روز اور ٹھہر جاتے تو ساتھ ہو جاتا . . . . خیر!

۱۹۱۵ء میں مجھے سوداگر عبدالغفور صاحب بریلوی کے ہمراہ ریاست اجیگڑھ[1] سے پنا جانے کا اتفاق ہوا تھا جب وہاں بہت دن پڑے پڑے جی اُکتا گیا، بے طرح وحشت اُٹھنے لگی اور کوئی دل بہلاؤ مشغلہ نظر نہ آیا، تو میں نے سوداگر صاحب کو سمجھایا کہ بھائی مجھ سے تو اب یہاں خواہ مخواہ ٹھہرا نہیں جاتا، آپ کو دو چار روز کا کام اور ہے جس میں میری کوئی خاص ضرورت نہیں لہذا ادھر آپ اِن لوگوں سے نمٹیں، اُدھر میں اجیگڑھ جا کر سامان وامان درست کرتا ہوں جب آپ یہاں سے فارغ ہوکر آئیں گے تو میں چرکھاری چلا جاؤں گا ؀

بعض اوقات انسان کو ایسی صحبتیں میسر آجایا کرتی ہیں جن کی دلچسپیوں میں محو ہوکر وہ چاہتا ہے کہ خدا کرے یہ محفل اسی طرح برقرار رہے، پھر ہوتا یہ ہے کہ انقلابِ زمانہ کے ہاتھوں یار دوست کھیلوں کی طرح بکھر جاتے ہیں۔ اور پھر وہ موقعہ عمر بھر نہیں آتا ؀

جیسا کہ اوروں کو ارمان رہا ہے، میاں عبدالغفور صاحب کی بھی آرزو تھی کہ میں اُن سے کبھی جدا نہ ہوں، سوائے قسمت کہ بہت جلد چند مجبوریوں نے ہمیں تین تیرہ کر دیا - اس بیچارہ کی دعا قبول نہ ہوئی ؀

تین چار روز کی رد و کد کے بعد بچھڑنا قرار تو پا ہی چکا تھا، میں اُن سے رخصت ہونے لگا کہ ذرا ٹھنڈے ٹھنڈے میں پہنچ جاؤں تو اچھا ہے ؀

اس وقت ہم ایک سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے، جو آبادی سے باہر اِسی سڑک پر تھی، میں سوداگر صاحب سے مصافحہ معانقہ کرکے

---

[1] اجیگڑھ، پنا اور چرکھاری بندیلکھنڈ کی مشہور ریاستیں ہیں ؀

سرائے سے اس طرح باہر آیا گویا پھر کبھی یہاں نہیں آنا +

سڑک پر قدم رکھتے ہی طبیعت بشاش ہوگئی، برکھا رُت، نور کا تڑکا، کنکر کی ڈھلی ڈھلائی سڑک کے دونوں طرف سبز سبز قالین سے بچھے ہوتے ہرے بھرے درختوں پر چڑیوں کی چہکار، بوٹے بوٹے پر نکھار گویا آسمان سے رحمت برس رہی تھی، بس بے اختیار خدا کی حمد کرنے کو جی چاہتا تھا +

دوست سے بچھڑنے کا صدمہ تھا، تتّے گھاؤ میں تھوڑی دور تو میں ذرا یوں ہی آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتا چلا، جوں ہی موڑ پر پہنچا ہوں، یکایک خیال آیا کہ بھئی اس چال سے تو کام چل چکا، کہیں نکلی جو چمک کر دھوپ تو یاد رکھیو ایک ایک پاؤں سو سو من کا ہو جائے گا، بس جناب پھر میں نے قدم اٹھایا اور لمبی ڈگیں بھرنی شروع کر دیں +

رنگ برنگ پھولوں کی خود رو بیلوں سے سجے سجائے درختوں کی سوبھا زبانِ حال سے پکارتی رہ گئی، کہ اے میاں جانیوالے ذرا ادھر بھی! لیکن میں نے پلٹ کر نہ دیکھا، انہیں اُسی حالت میں کھڑا چھوڑ کر دھن باندھے چلا گیا +

کوئی میل ڈیڑھ میل نکلا ہونگا کہ ایک دقّت پیش آئی، وہ یہ کہ جُوتا جو پہلے کہیں کہیں سے ذرا دباتا تھا، لگاتار کرنے چند فرلانگ تو میں نے اس کی کچھ پروا نہ کی، پھر سوچا کہ واہ یہ بھی کیا حماقت ہے، اس طرح تو اچنگڑھ پہنچتے پہنچتے پیروں کا کچومر نکل جائیگا ایسے میں کہیں کیچ نہ کھاند، سڑک صاف پڑی ہے۔ کچھ شہر بازار بھی نہیں کہ صاحب کوئی نام دھرے گا، یہاں کون دیکھتا ہے، اس موذی کو بغل میں مار ہلکے پھلکے ہو کر اپنی راہ لو +

سلیم شاہی نکالتے ہی لگی جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، واللہ آنکھیں سی کھل گئیں، اوہ ان ڈھائی چھٹانک کی جوتیوں نے تو جان بھاری کر رکھی تھی، پھر دو قدم چل کر آیا جو مزے میں سر کا صافہ بھی اتار ادھر اُدھر کندھے پر ڈال لیا تاکہ ذرا سر کو بھی جنگل کی ہوا لگتی چلے +

اس وقت بھی شان قابلِ ملاحظہ، جیسے کوئی ہوش سر پہ ٹوپی نہ پاؤں میں جوتا۔ سویرے سویرے ہی ننگے پاؤں نہار منہ بغل میں پٹلیا دبائے ہاتھ میں ڈور لوٹا لٹکائے چلے جا رہے ہیں جنگل بیابان میں +

پنا کی سڑک کا یہ وہ حصہ تھا جہاں سے ہیرے نکلتے ہیں، کسی وقت کی لگی ہوئی کانوں کے دو طرفہ گڑھے نظر آتے تھے۔ جس زمانہ میں یہاں کان کنی ہو رہی ہوگی، تو کچھ عجیب لطف ہوگا، آج کل کہیں کام نہ تھا، پھر بھلا کون ملتا، طرّہ یہ کہ اس سڑک کے آس پاس کوئی گاؤں داؤں بھی نہیں، کوہ وندھیاچل کے سلسلہ میں یوں ہی ایک مرتفع ہموار زمین حدِ نظر تک پھیلی ہوئی ہے،

پھر وہ جگہ آئی جہاں اُس رات آتے وقت سنا تھا، کہ یہاں سے چند میل کے فاصلہ پر راناپانِ ماسبق نے پہاڑوں میں ایک رمنا بنایا تھا جس میں خانہ زاد ہاتھیوں کی نسل لی جاتی تھی۔ مگر اب وہ یوں ہی پڑا ہے +

اسی طرح میلوں راستہ طے ہوگیا۔ مگر کوئی خدا کا بندہ آتا جاتا نہ ملا بس یا تو سڑک کے ادھر اُدھر کبھی کبھی درخت آجاتے تھے یا چٹیل میدان پڑا تھا۔

ویسے قاعدہ کے مطابق تو سات ساڑھے سات کا عمل ہونے کے سبب سے اس وقت خوب دھوپ ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن خوش قسمتی میری کہ آج ایسا نہ ہوا۔ کچھ فاختئی فاختئی بھورا بھورا سا بادل سارے آسمان پر چھایا ہوا تھا۔ گویا دن رات اور اندھیرے اُجالے کی درمیانی فضا میں لطیف ہوا کے چور ُخے جھونکوں نے زمین پر بہشت بریں کی سی کیفیت طاری کر رکھی تھی وہ رُوح پرور سماں تھا کہ کچھ نہ پوچھو۔ اتنا تیز چلا تھوڑی ہی دیر میں کہیں کا کہیں نکل آیا، پھر دیکھو تو تکان کا نام نہیں، بلکہ یہ ولولہ کہ یوں ہی اڑے چلو، خود بخود قدم اُٹھتے تھے اور ایک موج آرہی تھی۔

چلتے چلتے ایک چھوٹی سی پُلیا دکھائی دی۔ پل مارنے میں وہاں جا پہنچا۔ یہاں آکر جیسے کسی نے پاؤں جکڑ دیئے اور میں تھا کہ چوکڑی بھولے ہوئے وحشی ہرن کی طرح کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

سڑک کے بائیں ہاتھ ایک چھوٹی سی سبز پوش پہاڑی تھی جس نے کچھ عجب انداز سے پلیا کی طرف بازو پھیلا دیئے تھے درمیان میں اس سرے پر جہاں یہ بازو جُڑ گئے تھے موتی کی سی آب والا ایک چشمہ دو ڈیڑھ گز بلندی سے پندرہ سولہ فیٹ ہموار سنگی فرش پر گرتا تھا، کہ تین تین چار چار انچ دل کی ایک اُجلی اُجلی آبی چاندنی سی بچھی معلوم ہوتی تھی جس سطح پر پانی پھرا ہوا تھا وہ اُس پتھر کی تھی جس کی موٹی سل سے پتلے پتلے پاٹ چھانٹ چھانٹ کر عالیشان عمارتوں کی چھتوں اور فرشوں میں لگائے جاتے ہیں

پانی کے بہاؤ سے اس چٹانی سطح کے پرت جھڑ جھڑ کر ایک بے ترتیب زینہ سا بن گیا تھا جس وقت چشمہ کا پانی پندرہ سولہ فیٹ کی سطح پر پھیل کر زینہ اُترتا اور چادریں ٹوٹتیں تو یہ مزا آتا گویا انوار و تجلیات کے طبق بہتے چلے آتے ہیں۔ پہاڑی کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے جن پر ہری ہری جھاڑیاں کھڑی جھوم رہی تھیں، ان ٹیلوں کے دباؤ سے تنگ ہو کر چشمہ نے نالے کی سی صورت اختیار کرلی تھی کنارے کنارے کسی خاص قسم کی گھاس کے لمبے لمبے ڈنٹھل پانی پر جھکے پڑتے تھے، اس جگہ کچھ تو تنگی کے سبب سے اور کچھ اونچے نیچے پتھروں میں پڑ کر نالے میں ایک پر کیف ترنم سا پیدا ہوگیا تھا گویا جب یہ چیزیں اسے روکتی ہیں تو وہ اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے جھنجھلا کر بڑبڑاتا چلا جاتا ہے۔

اس مقام پر فیاض قدرت نے دلنوازی کا کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا، ہاں اگر کچھ کسر تھی تو یہ کہ اکیلا ہنستا بھلا نہ روتا۔ سوائے محاسنِ فطرت کے وہاں کوئی ہم جنس بولتی تصویر نظر نہ آتی تھی جو اس پر لطف نظارہ کی تکمیل ہوتی، پُلیا سے کوئی آٹھ دس قدم کے فاصلہ پر ایک چھوٹی سی چٹان اُس نالے پر جھک پڑی تھی، اور اس چٹان پر ایک پتلے پتلے تنے والا قد آدم چھتنارہ درخت اس انداز سے کھڑا تھا، جیسے کوئی چھتری لگائے مناظرِ فطرت کے شوقِ دید میں محو ہو میں سڑک سے اُتر کر اسی چٹان پر جا

بیٹھا جہاں وہ مسافر نواز درخت آتے جاتوں کو متوجہ کیا کرتا تھا کہ آؤ ذرا میرے سایہ تلے دم لو۔
سبحان اللہ کیا نظارہ تھا' یہاں آکر جو اطمینان سے ایک نگاہ ڈالی' واللہ جان سی پڑگئی' اور دل تھا کہ باغ باغ ہو گیا۔ دنیا کے ہنگاموں سے دور پُر سکوت فضا میں چشمہ کی چھال سے آبی چاندنی میں متواتر سلوٹیں پڑنا اور طرح طرح کے سُر پیدا کر کرکے ادھر اُدھر بکھرتے رہنا' پھر بے ترتیب چٹانی زینہ سے ٹیڑھی سیدھی چادریں ٹوٹ ٹوٹ کر ٹیلوں کی جڑمیں جمع ہونا اور نالا سا بن کر اس چھوٹی سی چٹان سے ٹکرانا جس پر میں بیٹھا تھا' چٹان کی ٹکر سے حبابوں کا آنکھیں کھول کھول کر اُبھرنا اور پھولوں کے ہاروں کی طرح چکر کھاتے ہوئے تیزی سے پلیا کی طرف بہ جانا۔
بھلا اب وہ بات کہاں نصیب ہوگی' چڑھتا خون' اعلیٰ صحت' ہر طرح کی بے فکری لاپروائی کا زمانہ' چند ہی منٹ میں یہ مزا آیا جیسے ہر رگ ریشے میں ایک نورانی اور خوشبو دار رو جا رہی ہے' بار بار پھریریاں سی اُٹھتی تھیں اور خواہ مخواہ جھومنے کو جی چاہتا تھا' میں تو جانوں وہ کوئی ایسا عالم تھا جو شاید اس دنیا میں نہیں۔
واللہ اعلم کتنی دیر یہی کیفیت طاری رہی' حتےٰ کہ بیٹھے بیٹھے بھوک لگ آئی اور بڑے زور سے (اب ویسی کبھی نہیں لگتی) معلوم ہوا جیسے کوئی کلیجہ کھرچ رہا ہے' یا پیٹ میں چوہے قلابازیاں کھا رہے ہیں' خدا کے فضل سے اپنے پاس توشہ بھر وسہ تو موجود ہی تھا' کھولی جو بسم اللہ کر کے پٹلیا تو جناب پورا پورا ہی انتظام نکلا' میاں عبدالغفور صاحب نے جن کی مہمان نوازی اور فیاضی اس مراق تک پہنچی ہوئی تھی کہ ناخواندہ راہ چلتوں کو قسمیں دلا دلا کر کھانا کھلاتے پھرا کرتے تھے' بڑی چترائی سے گھی میں تر بتر تین موٹے موٹے پراٹھے' کچھ بھنا ہوا قیمہ اور کوئی بیس بائیس بڑے بڑے رسیلے آم رات کو میری پوٹلی میں باندھ رکھے تھے' پراٹھوں اور قیمہ کا تو ابھی تک کچھ نہ بگڑا تھا' البتہ اُن کی چادر میں بندھے بندھے آم ضرور گرم ہو گئے تھے اور ذرا اُن میں چیپ ویپ بھی لگا ہوا تھا' میں جو جھک کر نالے میں ایک آم دھونے لگا' معاً سوجھی کہ واہ بھئی یوں کب تک مل مل کر چیپ چھڑایا جائیگا' چشمہ کے رُخ ہی نہ پھینک دیں' اس طرف کا ڈھال ہے آخر آئیگا تو ادھر ہی کو' وہاں سے آتے آتے خود بخود ٹھیک بھی ہو جائیگا۔
گو تھی تو یہ لڑکپن کی سی حرکت' مگر تھی کیا مزے دار' میں نے جھٹ پٹ ڈھیلی ڈھالی موری کا پائجامہ رانوں تک چڑھا لیا سر سے گھٹنوں گھٹنوں پانی والے نالے میں سرک پڑا اور پینترا بدل کر کھڑا ہو گیا' اُفوہ کس قدر ٹھنڈا پانی تھا' ایکدم آنکھوں تک تری دوڑ گئی' پھر جناب پھینکتا ہوں جو ایک آم پھسلواں تو آبی چاندنی پر لکیر کھینچتا ہوا چشمہ کے آبشار میں غائب' اسی طرح باری باری سارے آم بھتا دیئے پھر دیکھا جو سامنے تو چاندنی پر لوٹتے' چادروں میں لپٹتے' سیڑھیاں اُترتے آم چلے آ رہے ہیں میری طرف' جوں ہی اُن میں کا ایک میرے قریب آیا اور نالے میں غٹ پٹ ہو کر نکلنے لگا' میں نے پھرتی سے پکڑ لیا' اب کیسا چیپ بالکل صاف ہو چکا تھا' مگر میں نے اُسے چٹان پر نہ رکھا' اسی چشمہ کی طرف دوبارہ کھینچ مارا' بس جناب پانچ چھ پھیروں میں سارے آم ادلا ہو گئے

وہ رنگ نکھرا کہ صورت دیکھے سے منہ میں پانی بھر آئے ۔

میں نے آم نکال نکال کر چٹان پر چن دیئے اور اُچھل کر درخت کے نیچے بیٹھ گیا' آم پلپلا کر اتارا جو ایک گھونٹ' آہا سینہ مہک گیا' ان ہی آموں میں کل رات کو ایسا کوئی نہ نکلا تھا' اُسے ختم کرتے کرتے خیال آیا کہ یہ چیز کورے کلیجہ نقصان کرتی ہے' پہلے تھوڑا بہت ناشتہ ضرور کرلینا چاہیئے' باقی آم تو میں نے گڑھا کرکے پانی کے قریب دبا دیئے تاکہ ٹھنڈے رہیں' اور پراٹھے قیمہ سے لو لگائی' دو پراٹھے اور سارا قیمہ چٹ کرگیا' اس کے بعد آموں کی باری آئی تو ایک ایک کرکے وہ بھی ہضم' اوپر سے پیا جو پانی سُر در گٹھ گیا' خیر سے دھوپ ابھی تک نہ نکلی تھی' وہی ابر چھایا ہوا تھا' جی چاہا تھوڑی دیر اور بیٹھیں ہیں' سگریٹ سلگا کر لگایا جو ایک کش' آہا تاری سی کھل گئی' ہر چیز ہزار چند حسین نظر آنے لگی۔

مثل مشہور ہے' بھوکے کو تنور کی سوجھے پیٹ بھرے کو دور کی سوجھے۔" گوالیار کے لیل و نہار آنکھوں میں پھرنے لگے' محلّے محلّے ایک سے بڑھ کر ایک من چلا سردار پڑا ہوا ہے' جب دیکھو جلسے ہو رہے ہیں' رقص و سرود کی محفل گرم ہے کسی نہ کسی بہانہ ایک آدھ جگہ ہُوحق ہوتی ہی رہتی تھی' مجھے اکثر ایسی صحبتوں میں جانے کا اتفاق ہوا کرتا تھا' جن میں استاد سعادت خان جل ترنگئے' امیر خان استاد ستاریئے' گُدئی سنگھ پکھاوجیئے اور رشام راؤ کھڑتالیئے اپنے اپنے ساز ملا کر موسیقی کے کرتب دکھایا کرتے تھے' ان یگانہ روزگار استادانِ موسیقی کا بدل اب کہاں ہوگا' جنہوں نے قدر شناس امرا کی سرپرستی میں فکرِ معیشت سے بے نیاز ہوکر اس فنِ لطیف پر زندگیاں وقف کر دی تھیں ۔

جس وقت ان کی بحث چھڑ جاتی' کڑاکے کی سردیوں میں پسینہ پسینہ ہو ہو جاتے' آپ ہی آپ راگنیاں اتر آتی تھیں' اہل محفل کی محویت کا یہ عالم ہوتا کہ دو ایک جگہ کی بوٹیاں بھی کاٹ لو تو انہیں خبر نہ ہو ۔

وہ محفلیں تو روپیہ پانی کرکے امیر امرا کے سجے سجائے عالیشان محلوں میں ہوتی تھیں' جہاں ہر کس و ناکس کی رسائی نہ تھی کیا مجال جو بلا مرضی' بغیر اجازت پرندہ پر مار جائے' اور یہاں کھُلے خزانہ جنگل میں منگل ہو رہا تھا' سناتی ہوا میں نتھرے ہوئے چشمہ کی چھالیں چھن چھنا رہی تھیں' پانی کی چادریں ایک مسلسل جل ترنگ بجا رہی تھیں' نالے کی بڑبڑاہٹ ستار کی گت کا مزہ دے رہی تھی' اور سنسان فضا میں ایک مستقل سم چھایا ہوا تھا' اس پر لطف یہ کہ پہرہ نہ چوکی' راستے کھلے ہوئے ہیں' جس کا جی چاہے بے دھڑک چلا آئے اور زندگی کا پھل پائے ۔

اتنی سی دیر میں جی تو کیا بھرتا' لیکن سر پر سفر سوار تھا' میں نے سوچا منزل کھوٹی ہوتی ہے' اب چلنا ہی چاہیئے' با دلِ ناخواستہ چھاتی پر پتھر رکھ کر اٹھا' بار بار اُس دل دلفریب نظارے پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالیں اور اُٹلیا پٹلیا سنبھال چل کھڑا ہوا۔ سڑک کا وہ حصّہ تو پیچھے رہ ہی چکا تھا' جس میں کہ نور کا خاندان دفن ہے' جہاں نہ معلوم کتنے ہیرے میرے پیروں تلے

نکل گئے ہونگے کہ اگر وہ عالمِ شہود میں آئیں تو ایک عالم کی نگاہیں خیرہ کر دیں۔ آگے اور کوئی میل ڈیڑھ میل ہی ہموار سڑک ملی، اس کے بعد کسی قدر بادل چھٹ کر دُور دُور کچھ دھوپ جھلکی اور سامنے جنگل سے ڈھکے ہوئے پہاڑ پر ایک لہریا سا چڑھتا نظر آیا، اس پہاڑ کے دامن سے ہی درختوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا، لیکن کچھ ایسا گھنا نہیں، درخت آئے اور پہاڑ کی چڑھائی نے ساگون کے تناور درختوں میں پہنچا دیا، یہ چڑھائی کچھ زیادہ لمبی نہ تھی، دو ایک ہی ہیر پھیر میں اترائی سی جالی پھر وہ ہی صورت اختیار کرلی، جو عام طور پر پہاڑی علاقوں کی ہوا کرتی ہے۔

شادابی کے لحاظ سے اس نواح میں دُور دُور ایسا کوئی قطعہ نہیں، جس نے ہر قسم کے پرندوں کی کثرت سے بڑے بڑے چڑیا گھروں کو مات کر رکھا ہو کتنی ہی بار قازوں کی ڈاریں میرے سر کے اوپر سے نکل چلی گئیں، جا بجا طوطوں کے جھنڈ اُڑتے پھرتے تھے، تیتروں کی آوازوں سے جھاڑیاں معمور تھیں، جنگلی کبوتروں کی ٹکڑیوں کا تو گویا کوئی شمار ہی نہ تھا، اکثر جگہ اونچے اونچے درختوں پر بگلے بیٹھے نظر آتے تھے، ٹیٹریاں "ہٹ ٹی ٹی" "ہٹ ٹی ٹی ٹی" کرتی اڑتی پھرتی تھیں کبھی کبھی طاؤس شور مچاتے تو سارا جنگل گونج جاتا، فاختہ کی حق سرہٗ حق سرہٗ اس پاک پروردگار کی یاد دلاتی تھی، پودنے تو ہی تو ہی تو ہی تو ہی کرتے پھرتے تھے، ان کے علاوہ کتنے ہی پرندا ایسے بھی دیکھنے میں آئے جنہیں نہ تو میں اس وقت جانتا تھا نہ اب پہچان سکتا ہوں۔

کبھی کبھی آفتابِ عالم تاب کسی شوخ مزاج دہرطاعت کی طرح بادلوں کی آڑ سے جھانکتا اور دور دور تک ایک جھلاپور زرفتی چادر سی پھینک کر سمیٹ لیتا، پھر برشگالی ہواؤں کے ہوش رُبا جھونکوں سے جنگل کے درخت سائیں سائیں کرکے دہرے ہونے لگتے، معلوم ہوتا جنت کی کھڑکیاں کھل گئی ہیں۔

یہ سڑک پہاڑ کے گھیر میں کروٹیں سی بدلتی ہوئی بتدریج علاقہ زیر گھاٹی کی طرف اتر رہی تھی، ایک طرف اونچا پہاڑ تھا دوسری جانب نشیب کھڈ اور غار وغیرہ، کہیں کہیں پہاڑ بھی آجاتے تھے بعض جگہ جہاں مویشیوں اور گاڑیوں کے لئے ذرا زیادہ گھماؤ تھا، وہاں پیدلوں کی آسانی کے واسطے زینے کاٹ دیئے گئے تھے تاکہ ناحق کے چکر میں نہ پڑیں، کھٹ سے نچلی سڑک پر اُتر جائیں۔

کئی ایک جگہ یہ قدرت بھی دیکھنے میں آئی کہ ایک درخت پہاڑ کی دراڑ میں جڑوں کا اڑنگا ڈالے سڑک پر جھکا ہوا ہے اور اس درخت کی کھوال میں کسی دوسری ہی قسم کے درخت کی ہری ہری شاخیں لہلہا رہی ہیں، اوپر سے کوئی پھولوں والی بیل چھائی ہوئی ہے اور بڑے درخت کی ڈالیوں میں بیلوں کی جونجیں جھول رہی ہیں۔

اترائی پر سوائے خود کو سنبھالے رہنے کے چلنے میں کچھ ایسا زیادہ زور تو لگانا ہی نہیں پڑتا میں نے بدن سادہ کر

ٹانگیں چھوڑ دیں اور جلد جلد نظارے بدلنے شروع ہوئے، لیکن اس مارا مار سے کسے فرصت تھی کہ جگہ جگہ اٹکتا کتنی ہی دلفریب چیزیں عمداً نظر انداز کرنی پڑیں، کہ کبھی ہوگا چلے بھی چلو ٹھہرنے کا موقعہ نہیں۔

اس دوڑ دھوپ میں ایک زینہ آیا، جسے اترتے ہی دیکھتا کیا ہوں کہ سڑک کے اس پار دُور تک کمر کمر منڈیر چلی گئی ہے اور اس پختہ منڈیر میں ایک جگہ نکلنے کا راستہ ہے جس سے دوچار سیڑھیاں اُتر کر کچھ اونچی نیچی زمین کے بعد دو ایک سیڑھیاں چڑھ کر ایک ہموار چٹان پر چھوٹا سا مندر، ایک دالان، اور پتھر کی چند پختہ کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں، جنکے درمیان اچھا خاصہ لمبا چوڑا پختہ حوض ہے، ادھر اُدھر باغ کی طرح قسم قسم کے درخت لگے ہوئے ہیں، جن میں آم کے اونچے اونچے چھوٹے چھوٹے پھلوں والے پیڑ تو خاص کر گواہی دے رہے تھے کہ یہ جگہ ضرور کسی نیک دل بندے نے مسافروں کی راحت کے واسطے آراستہ کی ہوگی۔

اس سنسان بیابان میں ایسا خوشنما باغ دیکھ کر بے اختیار سیر کرنے کو جی چاہا، اور بڑا اشتیاق ہوا کہ دیکھنا چاہیئے یہ مکانات اندر سے کیسے ہیں، بھئی یہ تو کچھ ایسی مزیدار جگہ ہے کہ اگر انسان یہاں رہے تو خدا نے چاہا چند ہی روز میں دل دماغ روشن ہو جائیں۔

مگر جناب وہاں تک پہنچنا کوئی ہنسی کھیل نہ تھا، کیونکہ اس باغ اور اُن مکانات پر لنگور قابض تھے آدمی زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی، یا پھل پھلاری کے سبب سے طرح طرح کے پرند بھی جمع ہو گئے تھے آسمان پر چیلیں منڈلا رہی تھیں، پپیہے کی "پی کہاں پی کہاں" کا شور تھا آموں کی ڈالیوں پر کوئلیں کوکتی پھرتی تھیں، ابلقوں، پوتوں، میناؤں، شاماؤں اور بھٹیاریوں کا شور وشغب، طوطوں کی ٹیں ٹیں کوّوں کی کائیں کائیں اور لنگوروں کی چیخ پکار سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی، اس سہانے سمے اور آزاد فضا میں سب ہی امنگ پر تھے۔

خاص کر لنگوروں سے نچلا بیٹھا ہی نہ جاتا تھا، ذرا دم لیا کہ دس فیٹ اُڑ کر دوسرے درخت پر نظر آئے، دو لنگور جو آپس میں گتھم گتھا ہوتے ہوئے گرے تو ایک نے لپک کر بڑگد کی ڈاڑھی پکڑلی، دوسرا کسی گدے سے جا چمٹا، کتنے ہی لنگور خواہ مخواہ بھی ڈالیوں میں جھول رہے تھے، بعض لنگورنیاں ٹہنگوں پر بیٹھی بچوں کو دودھ پلا رہی تھیں، بہت سے بچے ادھر ادھر پھدکتے پھرتے تھے بیسیوں لنگور آم کھاتے اور نیچے ٹپ ٹپ گٹھلیاں گراتے۔

میرا دل بے قابو ہوا جاتا تھا، کہ جس صورت بھی ہو ان مکانوں کی اندر سے ضرور سیر کرنی چاہیئے، مگر سوچا کہ نادان عقل تو نہیں ماری گئی ہے، اس ویرانے میں کہ آدمی نہ آدم زاد بجز ذات خدا کوئی یار یاور نہیں کبھی بھول کر بھی ایسا نہ کیجیو، خیر چاہتا ہے تو کان دبا کر کھسک جا ورنہ کہیں یہ وحشی خوخیا خوخیا کر لپٹ پڑے، تو ڈھونڈے بوٹی نہ ملے گی۔

مگر واہ رے لنگورو! آفرین ہے تم کو نہ جانے کتنوں نے مجھے دیکھا ہوگا لیکن سوائے اچھلنے کودنے یا آپس میں خوش فعلیاں کرنے کے کسی نے نہ پوچھا تیرے منہ میں کے دانت ہیں۔

میں نے سُست چال تیز کی اور لگا فراٹے بھرنے، آگے جا کر جبکہ اُترائی کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ رہ گیا ہو گا، کہیں کہیں چھدرے درختوں میں سے ریاست اجیگڑھ کا علاقہ زیر گھاٹی جھلکنے لگا، اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی قدرتی سین کا مرقع دیکھ رہا ہوں جس میں کہیں جنگل ہے، کہیں پہاڑ کہیں لہلہاتے کھیت ہیں تو کہیں چراگاہیں، کسی جھیل پر مُرغابیاں اترتی دکھائی دیتی ہیں کسی تالاب کے کنارے سارس کی جوڑی پھر رہی ہے، کہیں کتے بلی کی برابر چھوٹی چھوٹی سی گائیں بھینسیں چر رہی ہیں، کسی سبزہ زار میں ننھے ننھے سے ہرنوں کا ٹھنا چوکڑیاں بھرتا پھرتا ہے کسی پگڈنڈی پر اونٹوں کی قطاریں جا رہی ہیں، کسی جھونپڑی سے دھواں اُٹھ رہا ہے، اور یہ نہیں جو میرے سر پر ہے کسی دوسرے ہی آسمان کی بوقلمونیوں نے اُس مرقع کی دیدہ زیبی کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

آخر دو تین موڑ بعد اس سڑک کا خاتمہ ہو گیا، دفعتہً ایک دھوبن چڑیا میرے سامنے سے اُڑتی ہوئی کھیتوں کی طرف جاتی دکھائی دی، میری رفتار بھی اب ویسی تیز نہ رہی تھی، نگاہوں نے چڑیا کا تعاقب کیا، اور وہ تھی کہ ایک پرانی عمارت کے اوپر سے گذرتی ہوئی غائب ہو گئی، یہ عمارت ساخت کے لحاظ سے مجھے باولی سی معلوم ہوئی، کچھ تو پیاس بھی لگ آئی تھی کچھ میں نے خیال کیا یار بار یہاں کون آتا ہے، آؤ ذرا بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے چلیں۔

اندر جا کر معلوم ہوا کہ گو عمارت پرانی ہے لیکن اس کے پانی کی صفائی میں کلام نہیں جیسے بلور کا ٹکڑا کاٹ کر رکھ دیا ہو، تہ کا ذرّہ ذرّہ صاف نظر آ رہا ہے، جوں ہی پوٹلی رکھ کر میں نے پانی میں ہاتھ ڈالا، اور پانی کے بلوروں کی لہریں دور تک پھیلیں، کچھ عجیب سیر ہوئی، اک دم بالشت بالشت سوا سوا بالشت کی کتنی ہی ننھی مچھلیاں دوڑ دوڑ کر کنارے کے قریب آ گئیں، ایک پراٹھا میرے پاس ابھی باقی تھا، میں نے وہ نکالا اور چورا مل مل کر پانی پر بکھیرا، پھر کیا تھا یہاں سے وہاں تک مچھلیوں کی ایک تہ سی بچھ گئی، نری مچھلیاں ہی مچھلیاں نظر آنے لگیں، شاید انہیں کبھی کسی سفاک آدمی سے پالا نہ پڑا ہو گا، جب ہی تو بے دھڑک مجھ پر چڑھی آتی تھیں، اس وقت میرے دل میں کھوٹ تو آ ہی گئی تھی، مگر میں جانتا تھا کہ یہ مچھلی بُری طرح کانٹا مارتی ہے، ورنہ ایک آدھ ضرور پکڑتا پھر چاہے فوراً ہی چھوڑ بھی دیتا۔

میں نے پراٹھے کا چورا کر کے سیڑھی پر رکھ لیا تھا، کبھی پیتل کا لوٹا مانجھنے لگتا کبھی ایک چٹکی چورا پانی میں ڈال دیتا، پھر لوٹا مانجھنے لگتا، لوٹا مانجھ کر آہستہ آہستہ صافہ باندھا، پاؤں دھو کر جوتا پہنا، اور احتیاطاً لوٹا بھر کر آدمیوں کی سی صورت بنا کر باولی سے نکل کر راہ پر آیا۔

اب میں اجیگڑھ کے پہاڑی قلعہ کی پشت اور دھندر رود کی درمیانی وادی میں تھا، یہاں سڑک وڑک کوئی نہ تھی، یونہی ایک کنکریلی پتھریلی گرداٹ سے سب آتے جاتے تھے، کچھ فاصلہ پر ایک اُجڑ سا گاؤں نظر آیا جس کے باہر باہر وہ گرداٹ جا رہی تھی، تضیعِ اوقات سمجھ کر میں اس طرف نظر ڈالے بغیر سُدھ باندھے چلا گیا۔

گاؤں سے دو ایک فرلانگ نکل کر ننھے ننھے رنگ برنگے سنگریزوں سے گرڈواٹ چمک رہی تھی، جیسے کسی نے جواہرات بکھیر دیئے ہوں، نزدیک پہنچا تو ان سنگریزوں میں ایک خوبصورت ناگن جاتی ہوئی دکھائی دی، اس درجہ نازک اور ایسی حسین کہ صورت دیکھا کرو، مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے نرم نرم زمین کے کھیت میں چلی گئی، پہلے تو اس پر رحم آیا کہ جانے بھی دو اپنا کیا لیتی ہے، پھر سوچا کہ نہیں سانپ کا بچہ سپنولیا، اس کی ظاہری صورت پر نہ جانا، بس کی گانٹھ ہے، اس کا مارا پانی نہیں مانگتا، کہیں موقعہ پاکر کسی کو چٹک لیا تو بچارا وہاں کا وہیں رہ جائیگا لہذا ایذا پہنچانے سے پہلے ہی موذی کو ٹھکانے لگا دینا چاہیئے۔

فوراً جھپٹا ابھی وہ ڈھائی تین قدم بھی نہ نکلنے پائی تھی کہ میں نے تاک کر ساڑھے تین سیر کچے کا پانی بھرا لوٹا اس پر پھینک دیا، اب وہ یا تو دوہری زبان لپکا لپکا کر پھن ٹیکتی تھی، یا تیزی سے دم ہلا رہی تھی، لوٹا ہٹا کر جو دیکھا تو ہڈی پسلی ایک ہوئی زمین میں چپکی رہ گئی ہے، تاہم لوٹا ہٹ کر گئی جو تازہ ہوا سکت آگئی تھی آہستہ آہستہ رینگنے، یقیناً وہ اس ضرب سے زندہ تو نہ رہتی، گھڑی دو گھڑی میں ضرور مرجاتی، لیکن عذاب دے دے کر نہیں مارنا تھا، اس لئے کہ جلد مشکل آسان ہو، میں نے دو ایک بار اور لوٹا دے پٹکا دیا جس سے وہ فیتہ بن کر رہ گئی، اس کی پیٹھ پر ایک رنگین زنجیر کھنچا ہوا تھا، اور دونوں طرف رنگ برنگی افشاں چنی ہوئی تھی، کم بخت آنکھوں میں کھب گئی، میں نے جو اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو کس قدر ملائم اور چکنی چکنی کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔

آخر ناگن تو اٹھا کر جھاڑیوں میں پھینکی اور گرڈواٹ پر ہولیا، کھیت در کھیت چل کر قلعہ کی چٹانیں آئیں، سڑک نہ ہونے کے سبب سے یہاں گرڈواٹ بہت گڈھب ہوگئی تھی جس میں قدم قدم پر پیچ و خم تھے مگر اونچے اونچے بکثرت درخت اس قدر گھن دار کہ کہیں کہیں کچھ کرنیں چھن چھن کر آجاتی تھیں، باقی زمین نے شاید کبھی دھوپ دیکھی ہی نہ ہوگی، اس مقام پر وہ مفرح لپٹیں آئیں، میری روح تازہ ہوگئی، ہر سانس پر پردے سے اُٹھتے جاتے تھے، سینہ میں ایک گدگدی سی ہوتی تھی اور میرا دل گرڈواٹ سے ملی ہوئی اس مینو سواد گھاٹی کی طرف کھنچا جاتا تھا، جو رنگا رنگ خودرو پھولوں کی مہک سے طبلۂ عطار بنی ہوئی تھی، آخر مجھ سے ضبط نہ ہوسکا، اور جھاڑیاں پکڑتا ہوا اس قدرتی چمن میں اُتر گیا جہاں زمین نے نباتاتی خزانہ اگل دیا تھا۔

بڑے بڑے باغوں میں اعلیٰ اعلیٰ درجہ کے انجینیر مصنوعی پہاڑ اور کھنگروں کے ٹیلے بناتے تھے، پھر تجربہ کار مالی کھاد اور پانی دے دے کر موقع موقع سے ہری ہری دوب لگاتے ہیں، طرح طرح کے گل بوٹوں اور خوبصورت خوبصورت گملوں سے سجاتے ہیں، مگر یہ بہشت زار گھاٹی قدرتی طور پر چھوٹی چھوٹی زمردی چٹانوں سے معمور تھی، اس میں ایسی ایسی نرم و نازک بوٹیاں جو ہزار صاحب سنبھال پر بھی گلشنوں میں کملا جاتی ہیں، کچھ اس شان سے لہلہا رہی تھیں گویا انہیں خزاں سے کبھی واسطہ پڑا ہی نہیں۔

جدھر نظر ڈالتا نگاہیں مست ہوجاتیں، مجھے عجیب و غریب بیل بوٹے، چھلکے، ڈنٹھل، پھول، پتیاں، پھلیاں، گھنڈیاں، زیرے اور تخم وغیرہ نظر آتے اور میری حیرت میں اضافہ کرتے، خدا جانے ان میں کون کون سے اکسیر الخواص جوہر پنہاں ہوں گے افسوس

مجھے جڑی بوٹی کی شناخت نہیں سوائے اس کے کچھ نہ کر سکا کہ انہیں دیکھوں اور رہ جاؤں۔

ایسے میں کوئی یوگی سنیاسی یا کوئی ماہر فن ہوتا تو نہ جانے کیا کیا فوائد حاصل کرتا، اس فن سے کورا ہونے کے باوجود مجھ پر وہاں کے ظاہری نظارے اور اُن جڑی بوٹیوں کی عجیب وغریب ساختوں نے وہ سحر کیا کہ میں دیوانوں کی طرح اُس بھول بھلیاں میں ادھر اُدھر بھٹکنے لگا اور اندر ہی اندر کہیں کا کہیں جا نکلا۔

ایک جگہ کسی کے بولنے کی کچھ بھنک سی پڑی میرے کان کھڑے ہوئے سامنے جو دیکھتا ہوں تو اونچی چٹان پر جھاڑیوں کی آڑ میں چند آدمی باتیں کرتے جا رہے ہیں، میں نے اس سمت قدم بڑھایا کہ دیکھوں یہ کیا مقام ہے اور جانیوالے کون ہیں، وہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ تو جھاڑیوں میں غائب ہو گئے، البتہ دوسری جانب مجھے اجیگڑھ کی آبادی کے سے آثار نظر آئے میں نے وہی راستہ اختیار کیا اور کٹھنے جوتے سے مجبور پیر گھسیٹ گھسیٹ کر پتھریلی گرد واٹ پر چلنے لگا۔

پنا سے لیکر یہاں تک ایک جگہ چشمہ سے نکل کر کسی دیہات کے میاں بیوی اپنا ننھا سا بچہ لئے ہوئے ملے تھے، اُترائی میں اجیگڑھ کے ایک شناسا سے ملاقات ہوئی تھی، یا جب میں علاقہ زیر گھاٹی کے گاؤں سے گذر رہا تھا تو کچھ پنہاریاں کنوئیں پر جاتی دکھائی دی تھیں، مگر جوں ہی اجیگڑھ کا قلعہ قریب آیا کیونکہ یہاں چھ سات مہینہ سے مقیم تھا، راستہ ہی سے سلام دعا کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

تالاب لہریں مارتے دکھائی دیئے، بستی آئی اور میں خیر سے اپنے میزبان قاضی محمد رسول خان کے گھر پہنچ گیا، یہاں آکر معلوم ہوا کہ اب دن کے گیارہ بجنے والے ہیں۔

کپڑے وپڑے اتار کر جو اطمینان سے بیٹھا تو تازہ خون کی تیز گردش سے کانوں میں شائیں شائیں ہو رہی تھی، راستہ کے مناظر آنکھوں میں پھرتے تو معلوم ہوتا، کوئی سینما دیکھ کر آیا ہوں جس میں عجیب وغریب سینریاں تھیں۔

پنا سے اجیگڑھ تک کا فاصلہ لوگ سات ساڑھے سات میل بتاتے تھے، شاید ایک آدھ میل زیادہ ہو، اگر میں جا بجا ٹھہر نہ جاتا تو یہ مسافت اس رفتار کے لحاظ سے ڈھائی تین گھنٹہ میں ختم ہو گئی ہوتی، اتنا مختصر سفر کس قدر دلچسپ تھا کہ اب بھی کبھی کبھی تصور میں ان راستوں پر اُسی طرح چل چل کر مزا لیا کرتا ہوں۔

یا سفر کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پشاور سے فرانٹیر میل کے فرسٹ کلاس کی سیٹ ریزرو کرا کے ڈٹ گئے، اب ٹس سے مس ہونے کی ضرورت نہیں خدا نے چاہا بیٹھے بیٹھے یہیں سب کچھ حاضر ہو جائیگا، یا کوئی بڑا جنکشن آگیا تو ذرا اُتر کر رسٹورنٹ میں چائے پانی سے جی بہلانے لگے، پھر گارڈ کی سیٹی ہوتے ہی وہاں کے وہیں موجود ہیں۔ تیسرے دن صبح ساڑھے آٹھ بجے جو آنکھ کھلی تو آواز آئی "بمبے سینٹرل" یعنی اتنا بڑا اُلٹ پھیر ہو گیا، اس قدر ملک طے کر لیا مگر مطلق خبر نہ ہوئی کہ کیسے کیسے قابل دید عجائبات نکل گئے۔

فہیم بیگ چغتائی

دو خط

میری پیاری فرحت خط لکھنے کو جی بہت چاہتا ہے۔ مگر الفاظ کاغذ پر نہیں اُترتے خیالات امڈے چلے آتے ہیں بے اختیار ہوا جاتا ہوں، جی چاہتا ہے تم سامنے ہو اور تمہیں دیکھتا رہوں، مگر یہ کہاں نصیب! پھر بھی تم نظروں کے سامنے ہو، دیکھتا ہوں کہ چارپائی پر بیٹھی ہو، دوپٹہ زمین پر لٹک رہا ہے، دھوپ میں گال سُرخ ہو رہے ہیں، بال بکھر بکھر کے کان پر اور گالوں پر آ رہے ہیں، کبھی کبھی انہیں ہٹا دیتی ہو، مگر وہ استغراق ہے کہ میں بیٹھا ہوں میری بھی پروا نہیں، کسی کی پروا نہیں، گھر بھی یاد نہیں، کتاب ہے اور تم ہو، کتنے خوش قسمت کہانی کے لوگ ہونگے جو تم سے بھی بہ خراج لے رہے ہیں، تم سے بھی! انہیں کیا معلوم تم کون ہو کسی کو نہیں معلوم، شاید تم خود بھی نہیں جانتیں، جب تم ایسے چپ بیٹھی ہوتی ہو تو میں تم میں بہار کی شبنمیں راتوں کا سکوت دیکھتا ہوں، تم نہیں جانتیں! جب تم ہنستی ہو تو مجھے شفق کی گلنار بشاشت یاد آ جاتی ہے، جب میں تمہاری آواز سنتا ہوں تو میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے خدا تعالیٰ کے قرب میں فرشتے محبت کے گیت گا رہے ہیں، یا کسی گرجے کے مقدس ترین حصے میں طلائی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔

میری آرزوئیں کیا ہیں! کاش تم کبھی پوچھو میں کیا چاہتا ہوں، جی چاہتا ہے کسی بھرے ہوئے دریا میں ایک کشتی بہاؤ پر چلی جا رہی ہو، میں اور تم اس میں بیٹھے ہوں، تم مجھ سے لگی آرام کر رہی ہو، دنیا ایک منتظرانہ خاموشی میں ڈوبی ہوئی ہو، دور افق پر سورج دمک رہا ہو، اس کی آخری شعاعوں نے ہماری کشتی تک ایک سنہرا راستہ بنایا ہو، ہماری کشتی اسی راستہ پر چلتی جائے اور میں تمہیں دیکھتا رہوں، یا سرسبز درختوں کے ایک گھنے جنگل میں کوئی چشمہ ہو جس کے گرد اونچے تناور درخت دائرہ بنائے ہوئے ہوں، چشمہ زمین سے پھوٹ کر گول گول خوشنما چمکیلے پتھروں پر بہ رہا ہو، ہری ہری گھاس پر تم لیٹی ہوئی ہو، ادھر اُدھر پھول کھلے ہوئے ہوں زرد گلاب کی خمار آفریں مہک سے وہ خطہ لبریز ہو رہا ہو، میں تمہاری آنکھوں کی عمیق تاریکیوں میں جگنو ڈھونڈتا رہوں، یا پہاڑوں کی کسی جنت نشان وادی میں صبح کے زعفرانی سمے میں میں اور تم اوس سے بھیگے ہوئے نیلے اور گلابی اور بسنتی پھول توڑتے پھریں، تم دن بھر اس وادی میں کرنوں سے کھیلتی رہو اور میں تمہیں دیکھتا رہوں فرحت پیاری میں کیا کچھ نہیں چاہتا! میں چاہتا ہوں اس ملک میں بھی حسن کی پرستش ہو، زہرہ کے معبد جا بجا موجود ہوں، میں اپنی آرزوؤں کا ایک رنگین جگمگ جگمگ کرتا ہوا مندر بناؤں اور تم دیوی بن کر اس میں بیٹھو۔ یا برسات کا موسم ہو، کسی اونچے سے درخت سے ایک ریشمیں پینگ لٹک رہی ہو، میں تمہیں اس میں بٹھا کر جھولا جھلاؤں، آسمان پر بادل چھٹ رہے ہوں، سورج کی شعاعیں بادلوں میں سے چھل چھل کر نکل رہی ہوں، تمہاری

پتنگ اتنی بڑھے کہ آسمانی پتنگوں سے جا ٹکرائے۔

یا پھر تم میز پر کھانا کھا رہی ہو میں ایک ننھا سا لال بن کر کھڑکی کے راستے آ کر تمہاری پلیٹ پر آ بیٹھوں، تم اس ڈر سے کہ کہیں میں اڑ نہ جاؤں چپ چاپ بیٹھی رہو، پھر اپنا نرم سا ہاتھ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھاؤ، میں اسی چیز کا منتظر، تمہاری کلائی پر جا بیٹھوں، مجھے چمکارنے کے لئے تمہارے ہونٹ سکڑ کر غنچہ کی صورت ہو جائیں، تمہارے رس بھرے لبوں کے کُنج میں روٹی کا ایک ننھا سا ذرہ ہو، میں جلدی سے اڑ کے اپنی چونچ سے اسے اڑا لوں، تم گھبراہٹ میں پہلے میری جسارت سے شرما جاؤ، پھر میری بیباکی پر ہنس دو اور تمہارے ہونٹ پھول کی طرح کھل جائیں۔

مگر کاش کبھی تم سنو، تو میں سناؤں تخیل کی مدد سے میں نے تمہارے ساتھ بہت سی دنیائیں دیکھی ہیں، میں نے تمہیں اپنی محبت کی کہانی تشبیہوں سے، استعاروں سے، گیتوں کی مدد سے سنائی ہے، میرے اور تمہارے درمیان کوئی حجاب، کوئی جھجک کوئی بات حائل نہیں ہوئی، مگر میں تمہارے ہاں جاتا ہوں اور ناکام واپس چلا آتا ہوں، بیٹھتا بھی ہوں، تمہاری طرف دیکھتا بھی رہتا ہوں، کبھی کبھی تمہاری والدہ اٹھ بھی جاتی ہیں، کبھی میں اور تم اکیلے بھی رہ جاتے ہیں، دنیا کا شور گم بھی ہو جاتا ہے، مگر میں سوال ہی نہیں کر سکتا، میں ڈرتا ہوں، تم سے، تمہاری والدہ سے، تمہاری مجبوریوں سے، تمہاری والدہ کی سخت گیر طبیعت سے، کیا میرا جی نہیں چاہتا کہ تمہیں پیار کر دوں، کیا تمہاری نگاہ میں گرمی نہیں، تمہارے ہونٹوں میں ٹھنڈک نہیں؟ تمہارے نتھنوں کی نازک سی حرکت میرے لئے جنوں انگیز نہیں؟ میرے پہلو میں بھی دل ہے، دل میں خون بھی ہے، مگر، جاتا ہوں، مزاج پرسی کرتا ہوں، میری والدہ، میری بہنوں، ان کے خاوندوں، ان کے بچوں کے متعلق گفتگو ہوتی رہتی ہے، پھر خاموشی طاری ہو جاتی ہے، تمہاری والدہ سبزی بناتی ہیں یا ننھے کو نہلاتی رہتی ہیں، یا کوئی کپڑا سیتی رہتی ہیں اور تم بیٹھی ہوئی اپنی گھنی پلکوں والی بڑی بڑی مستفسر آنکھوں سے کبھی کبھی مجھے دیکھ لیتی ہو۔ تمہارے بھائی آ جاتے ہیں، مجھے باتوں میں الجھا لیتے ہیں، کبھی کبھی تم اپنے مست پیازی ہونٹ کھول کر انگڑائی لے لیتی ہو تو میں سب گفتگو بھول جاتا ہوں، دنیا ایک لمحہ کے لئے مرتعش ہو جاتی ہے، در و دیوار زندہ ہو جاتے ہیں، پھر کچھ دیر بعد ہر چیز بدستور اپنی اپنی جگہ سو جاتی ہے اور میں تمہارے بھائی کے الفاظ سننے لگتا ہوں، شام ہو جاتی ہے اور میں سلام کر کے چلا آتا ہوں۔

یہ میری دنیا ہے! میرا کمرہ ہوتا ہے، باہر ہوسٹل میں لڑکے کھیلتے ہیں، باتیں ہوتی ہیں بحثیں ہوتی ہیں ہنسی مذاق ہوتا ہے۔ آمد و رفت سے ہر آن اک شور مچا رہتا ہے مگر میرا کمرہ سنسان ہے جیسے کسی وسیع صحرا میں ہو، میرے دل میں تاریک راتوں کی طرح خاموشی ہوتی ہے، بیٹھا ہوتا ہوں اور تمہارے بیٹھنے کے انداز کو یاد کرتا رہتا ہوں، تمہارا دوپٹہ تمہارے چہرہ کو آدھا چھپائے ہوئے ہوتا ہے، کسی اپنے ہی کام میں مشغول ہوتی ہو، کبھی اٹھ کے باورچی خانہ جو جاتی ہو تو میرے دل کی حرکت تمہارے قدموں کے تابع

ہوجاتی ہے میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے چپ چاپ رات میں کہیں سارنگی بجنے کی آواز آرہی ہے جب انہیں خیالات سے بیتاب ہوجاتا ہوں تو باہر سیر کو نکل جاتا ہوں، تمہاری یاد ساتھ ہوتی ہے اور میں دور دور پھرآتا ہوں۔

اب یہ خط لکھ رہا ہوں اس لئے نہیں کہ تمہیں بھیج دوں، بلکہ اس لئے کہ شاید کچھ دل کو تسلی ہوجائے، اکثر تمہیں خط لکھ کے اپنے پاس رکھ لیتا ہوں، تسکین ہوجاتی ہے پھر دو ایک دن بعد پھاڑ دیتا ہوں، اس خط کا بھی شاید یہی انجام ہوگا، مگر کاش میں تمہیں یہ خط بھیج سکوں کاش تم میرے خطوں کو پڑھ لیا کرو۔ مگر یہ کیسے ہو؟ یہ ناممکن باتیں ہیں یہی کیا کم ہے کہ تمہیں دوسرے تیسرے دیکھ لیتا ہوں، جی بھر کے دیکھ لیتا ہوں، مجھے اور کیا چاہیئے!!

دوسرا خط

پیاری مجیدہ۔ تمہیں تو شاید آج کل خط پڑھنے کی بھی فرصت نہ ہو۔ نئی نئی بھابی میکے سے آئی ہوں گی، نئے نئے چاؤ ہونگے نئے نئے پیار، بھائی جان، ہی بھابی جان گھر میں سارا دن ہوتا ہوگا، نئے نئے خوشرنگ کپڑے پہنے، قوس قزح بنی صحن میں پھرتی ہوگی، طلسی بنارسی، کامدانی! کیا کیا بھڑک ہوگی۔ مہندی، ڈھولک، گانا بجانا، ہنسی کھیل اور پھر تمہاری ہنسی جس سے مرجھائے ہوئے پھول بھی تروتازہ ہو جائیں! میں کون ہوں جو ان دنوں تمہیں یاد آؤں، پھر تین مہینے ملے ہوئے بھی ہوگئے، تمہارے بھائی جان کی شادی بھی اب ہمارے لئے تو پرانی ہوگئی، مگر تمہارے گھر تو مکلاوہ ہی اب آیا ہے، تمہاری خوشیوں کا کیا ٹھکانا ہوگا، معلوم نہیں تمہارے دل کی مسرت نے اچھل اچھل کر میری یاد کہاں کی کہاں گم کردی ہوگی، اب سات دن ہوتے ہیں خط بھی نہیں بھیجا۔ ہر روز منتظر رہتی ہوں کہ خط آئے۔ دن میں کئی بار ڈاکی کو لیٹر بکس کی طرف بھیجتی ہوں، مگر تم کیوں خط لکھو!

آج کل یہاں بہار شروع ہے۔ ہماری چار دیواری تک بھی ہوا، باغوں کی پھولوں کی خبریں لے آتی ہے، صبح ہوتی ہے لوگ جاگ اٹھتے ہیں، دن گذر جاتا ہے، پھر رات میرے لئے اپنی دلنواز تاریکی لئے آجاتی ہے، مجھے رات بہت بھاتی ہے، سب سوجاتے ہیں مجھے تسکین ہوتی ہے کہ اب میں بستر پر لیٹی خواہ جاگتی رہوں، خواہ سوچتی رہوں، خواہ فضا کی لاانتہا بلندیوں میں اپنے تئیں کھو دوں، کسی کو کیا خبر ہوگی؟ تم ہو کہ سب کچھ جانتی ہو، پھر بھی لکھنا بھول جاتی ہو، تمہاری بلا سے کوئی مرے یا جئے! تم ہوگی اور تمہاری وہ لاڈلی رقیہ! سارا دن ڈھولک ہوگی اور وہ ناچے گی اور تم اور باقی سب بہنیں گا رہی ہونگی، جب مجھے خیال آتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ اس چھچھوندر کو دیس نکالا دیدوں مجھے نہیں معلوم تم اس سے بات کیسے کرسکتی ہو، مان لیتی ہوں کہ وہ گاتی اچھا ہے، اگرچہ جتنا بنتی ہے اتنا اچھا نہیں گاتی۔ ہاں البتہ ناچتی اچھا ہے، پاؤں خوب مارتی ہے اور بازو اور ہاتھ اچھے انداز سے پھراتی ہے مگر اتنا بھی نہیں کہ تم اسے سر آنکھوں پر بٹھا لو، مجھے تمہاری یہ عادتیں پسند نہیں، مجھے تو جب میں شادی پر گئی تھی، تبھی اس کا تمہارے کندھوں پر چڑھنا زہر معلوم ہوتا تھا، اتنی بھی کیا کہ جیسے تمہارے

بغیر اس کی زندگی ہی ممکن نہیں۔ مرنش کہیں کی! میرا تو کلیجہ الٹ جاتا ہے جب اُس کا خیال آتا ہے اور پھر ہر وقت تمہارے ساتھ، نہ اپنے گھر دفع ہوتی ہے، نہ تمہیں چھوڑتی ہے، مجھے تو وہ جب بات کرنے کا ہی مشکل سے موقع دیتی تھی، کٹنی کہیں کی! میں تو حیران ہوتی ہوں کہ میں اس کا نام ہی کیسے لے سکتی ہوں چھچھوندر کی سی اس کی شکل ہے۔ توبہ ایسی ناک بھی کسی کی نہ ہو!

غصہ مجھے اس بات پر آتا ہے کہ میں کتنی ہی دل شکستہ ہوں جب مجھے یہ یاد آتی ہے تو مجھے اپنی تکلیف بھول جاتی ہے! دبی جاتا ہے مار مار کر کچھ مز نکال دوں مگر میں کیوں اپنا دل دکھاؤں پہلے ہی کیا کم بجھ چکا ہے، معلوم نہیں انسان پیدا کیوں ہوتا ہے، اگر دنیا میں آ کے اسے یہی کچھ دیکھنا ہوتا ہے، مجبوریاں ہوں، پابندیاں ہوں تو آدمی سہہ لے، نہ یہ کہ جیسے گھر میں کوئی بال کھایا ہوا مٹکا پڑا ہے نہ باہر ہی پھینکا جائے نہ استعمال ہی کیا جائے، جب کبھی سکول کے دن یاد آتے ہیں تو بے اختیار رونا آجاتا ہے، مجھے جانتی ہو رونا آیا ہی نہیں کرتا تھا تمہیں مجھے سنگدل اور جانے کیا کچھ کہا کرتی تھیں، میرا تو نام ہی تم نے برف رکھ دیا تھا، اب وہ سخت دلی کہاں! وہ دل کا انجماد کہاں! کاش میرا دل پتھر کا ہوتا ہوتا۔ نہ کسی چیز کا اس پر اثر ہوتا نہ مجھے کسی چیز کی لگن ہو سکتی، میں جب افسردہ ہوتی ہوں تو مجھے اپنی بیچارگی اور مایوسی کی وجہ سے اور بھی رونا آتا ہے، اس لئے اور بھی کہ میں جس کی آنکھ میں کسی نے آنسو نہ دیکھا تھا اسے اس آسانی سے رونا آجائے۔

میرے ساتھ چھ سال پڑھی ہو تم، دس برس میں تو ہم بہت ہی اکٹھے رہے ہیں، سکول میں کیسی کیسی حسین لڑکیاں ہوتی تھیں کبھی مجھے بھی کسی کی طرف آنکھ اٹھاتے دیکھا تھا لڑکیاں ایک دوسرے کی خاطر مر جاتی تھیں مجھے ایسی لڑکیوں سے کتنی نفرت ہوتی تھی، یاد ہے صغرا بورڈنگ والی! توبہ!! اس نے روپ پال کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا تھا، غش کھا کھا جایا کرتی تھی، اس نے روپ سے ملنے کے لئے کس کس کی منتیں نہیں کی تھیں، تمہارے ہی آگے اس نے ہاتھ نہیں جوڑے، خدا اور رسول کے واسطے نہیں دیئے اور مجھے کتنی بری لگا کرتی تھی جب بیچاری یاد آتی ہے، تو مجھے اپنی سختی پر بہت افسوس آتا ہے معلوم نہیں اس کے دل کو کیسی لگی ہوگی، بہتیرا گھر کے کام میں جی لگاتی ہوں مگر وہ اتنا ہو بھی۔ اگر زیب کے کچھ نیچے بھی رہے، تو امی کو جانتی ہو، ان سے بن کچھ کئے بیٹھا ہی نہیں جاتا، آپ ہی سبزی کاٹنے بیٹھ جائیں گی، میرے لئے کچھ کرنے کو نہیں ہوتا، کتابوں میں جی لگاتی ہوں، بھائی جان کی بیشمار کتابیں ہیں، انگریزی کے بہت عمدہ عمدہ ناول بھی ہیں، پڑھتی ہوں مگر دن ڈھلنے کو ہوتا ہے پر نہیں ہوتا۔

عصر کے وقت سے میرا دل تڑپنے لگتا ہے کہ وہ اب آئے کہ اب آئے۔ روز تو تم جانتی ہو وہ آتے نہیں، معلوم نہیں کیا وجہ ہے اور پھر سوچتی ہوں کہ آئیں بھی کیوں، ان کے لئے یہاں کون سی دلچسپی ہے۔ اس سال ان کا یونیورسٹی کا امتحان بھی نہیں ہے پھر بھی دوسرے دن ہی آئیں گے بعض دفعہ دو دو دن گذر جاتے ہیں، اور وہ نہیں آتے، انتظار کرتے کرتے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے میرے دل کی حرکت بند ہو گئی ہے، اپنے بدن کے کپڑوں سے بھی نفرت ہو جاتی ہے گھر ایسا روکھا روکھا سا دکھائی دیتا ہے جیسے اس میں کوئی بستا ہی نہیں، ننھے سے کھیلتی ہوں، امی کا ہاتھ بٹا دیتی ہوں، مگر امی تو خود مجھے کرنے نہیں دیتیں، کتاب لے کر پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں، کچھ پڑھ بھی لیتی ہوں، مگر ناول کے افراد ایسے بے جان سے معلوم ہوتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیوں ایک دوسرے کی خاطر یوں پریشان ہوتے پھرتے ہیں، کہانی بہت

بے مزہ ہو جاتی ہے' کتاب دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔

پھر جب وہ آتے ہیں تو ابھی ڈیوڑھی ہی میں ہوتے ہیں کہ میں پہچان لیتی ہوں' میرے تو بدن میں جان ہی نہیں رہتی' ہونٹ اتنے خشک ہو جاتے ہیں کہ مجھے خطرہ ہونے لگتا ہے کہ امی ہی نہ کبھی دیکھ لیں اور کہیں تجھے کیا ہو گیا ہے اور دل جو سارا دن کہیں گم رہتا ہے' ایسے زور سے دھڑکنے لگتا ہے کہ جیسے پھوٹ پڑے گا' جانتی ہو نا رشیدہ کو' کتنے اچھے نقش ہیں اس کے' اور آنکھیں ایسی چمکتی ہیں جیسے ان کی سیاہی میں جان پڑ گئی ہو' بس وہی آنکھیں ہیں' رشیدہ سے چار سال بڑے ہیں' مگر بہت بڑے تو نہیں معلوم ہوتے' ایسے بے پروا انداز میں آ کے بیٹھ جاتے ہیں جیسے میں وہاں ہوتی ہی نہیں' امی ہی سے سلام اور انہیں سے باتیں کبھی کبھی مجھ سے بھی سلام ہو جاتا ہے۔ مگر جب تک بیٹھے رہیں گے' ایسے' گویا خیالات کہیں اور ہیں' آنکھیں کہیں اور ہیں۔ آہستہ آہستہ بات کریں گے اور کس کی؟ رشیدہ کی' حمیدہ کی اپنی والدہ کی اور جانے کن کن کی اور سب امی سے۔

کبھی کبھی میری طرف جو دیکھ لیتے ہیں تو میری جان ہی نکل جاتی ہے' ایسے دیکھیں گے' جیسے نقطہ میں ہی میں دنیا میں ہوتی ہوں' ایک نظر ڈالتے ہی میرا دل کھینچ کے لے جاتے ہیں مگر کون جانے اس وقت کیا سوچ رہے ہوتے ہیں' خواہ اپنے کسی شاعر کے شعر ہی دماغ میں سلجھا رہے ہوں' اس وقت میری حالت ایسی ہوتی ہے کہ میں حرکت ہی نہیں کر سکتی۔ پھر اور طرف منہمک ہو جاتے ہیں یا چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں' پھر جو میری طرف دیکھیں گے تو اس طرح جیسے مجھ میں اور دیوار میں کوئی فرق نہیں' مگر ان کی آنکھیں ہیں جیسے کالی رات میں کبھی دور چراغ ٹمٹما رہے ہوں' کبھی کبھی امی اٹھ کے باورچی خانے چلی جائیں تو چپ بیٹھے رہیں گے یا مجھے ٹکٹکی باندھ کے اتنا دیکھیں گے کہ میں شرما جاتی ہوں مجھ سے کہاں اُن کی آنکھوں میں دیکھا جاتا ہے! شام ہونے کو ہو گی تو بھائی جان آ جائیں گے' بس پھر اُن سے باتیں ہوں گی اور کسی سے نہیں' میں تو گویا ہوتی ہی نہیں' میرا دل گھٹنا شروع ہو جاتا ہے' کہ اب اُٹھے اور اب اُٹھے' ادھر مغرب کی اذان ہوئی اور ادھر وہ گئے' جاتی دفعہ میری طرف بھی دیکھ لیں گے' مگر ایک نظر سے کیا ہوتا ہے!

اس وقت بتاؤ میرے لئے کیا رہ جاتا ہے! دنیا یک لخت اتنی خالی ہو جاتی ہے کہ میں سن سن ہوتا اپنے کانوں سے سُن لیتی ہوں' یوں شام پڑ جاتی ہے . . . .

فیاض محمود

اے دوست!

ہائے کیا شب تھی فضائے دہر پر پھیلی ہوئی
آنسوؤں سے ابرِ ماتم دار کے بھیگی ہوئی

رات جو پہلی محبت کی طرح خونخوار تھی
فطرتِ بیدرد کی ڈھالی ہوئی تلوار تھی

پرسکوں گہرائیوں میں دل کی طوفاں خیز رات
وہ بھری برسات کی جذبات سے لبریز رات

گہرے گہرے رنگ کے بادل ہواؤں میں بھرے
پھر رہے تھے ہر طرف اک درد پھیلاتے ہوئے

ننھی ننھی بوندیاں گرتی تھیں فرشِ خاک پر
یا تمنائیں برستی تھیں دلِ صدچاک پر

تر بتر جھونکے ہواؤں کے امنگوں سے بھرے
ایک پیغامِ عمل تھے سرد آہوں کے لئے

منظرِ تاریک میں وہ دفعتہً اک روشنی
چونک اٹھتی تھیں امیدیں دل کی سوئی ہوئی

سرنگوں تھا خوابِ راحت لذتِ غم دیکھ کر
دل بدل جاتے تھے سینوں میں یہ عالم دیکھ کر

کروٹوں پر کروٹیں تھیں نیند ہی آتی نہ تھی
خواب کی ننھی پری تکلیف فرماتی نہ تھی

دل نے اک کروٹ ادھر بدلی زمانے کی طرح
یاد آیا تو اُدھر بھولے فسانے کی طرح

دل کی سب سنسان گلیاں جاگ اٹھیں اس یاد سے
شورشوں کا سلسلہ پیدا ہوا فریاد سے

تھے جو فرشِ ضبط پر خوابیدہ نالے چونک اُٹھے
جو ربابِ دل میں تھے بیہوش نغمے چونک اُٹھے

صبر کی مضبوط بنیادیں یکایک ہل گئیں
سرد آہوں کو گذر جانے کی راہیں مل گئیں

لاکھ روکا، درد لیکن دل کو تڑپا ہی گیا
لب پہ تیرا نام آنسو آنکھ میں آہی گیا

زیبا رودولوی

"زِ رنگ زاہد افتادم بہ کافر ماجرائی ہا"

(غالبؔ)

(سانیٹ)

(عزیز دوست ارشد وحیدی کے نام)

وفا و عشق کے گیتوں کو بھول جا، اے دوست!
کہ تھک گیا ہوں محبّت کی نغمہ خوانی سے،
نشاطِ وصل سے، فرقت کی خوں فشانی سے!
کوئی "فسانۂ آوارگی" سُنا، اے دوست!
مری حیات کی افسردگی مٹا، اے دوست!
سنا وہ گیت جو بھرپور ہو جوانی سے،
کسی جوانِ ہوس کار کی کہانی سے!
مرے شباب کو تقدیس سے بچا، اے دوست!
یہ زہدِ خشک تو ہے موت زندگی کے لئے!
کہ اس سے زیست کو افسردہ دیکھتا ہوں میں!
گلِ شباب کو پژمردہ دیکھتا ہوں میں!
یہ اِک خزاں ہے امنگوں کی تازگی کے لئے!
ندیم آ کہ تقدس سے دور ہو جائیں!
گنہ اور اُس کی محبت میں چور ہو جائیں!

عطاء اللہ سجاد

شرط

چیخوف کا ایک افسانہ

چیخوف (۱۸۶۰ ـــ ۱۹۰۴) دنیا کے بہترین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتا ہے، اگرچہ اس نے ایم ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی مگر عمر بھر طب کا پیشہ اختیار نہ کیا بلکہ اپنی زندگی ادبیات کے لئے وقف کر دی، لیکن اس کی علمی تحصیل نے اس باب میں بھی اسے بہت مدد دی، انسانی زندگی کا اس نے نہایت گہرا مطالعہ کیا تھا، اور اس سلسلے میں اس کی واقفیت بے انتہا متنوع اور وسیع تھی، وہ اپنے موضوع کا استعمال نہایت ہوشیاری سے کرتا تھا، اور الفاظ کے خرچ میں انتہائی کفایت ملحوظ رکھتا تھا، "شرط" میں اس نے یہ دکھایا ہے کہ ایک سادہ سا مذاق کس قدر لغوی، قنوطیت، دنیا سے بیزاری، بے تعلقی، دنائت، بد باطنی اور غداری پر منتج ہو سکتا ہے ؛

خزاں کی ایک تاریک رات تھی، بڈھا مہاجن اپنے مطالعے کے کمرے میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا، پندرہ سال گزرے یہی پت جھڑ کے دن تھے، اور ایسی ہی اندھیری رات جب اُس نے اپنے چند احباب کو ایک پُر تکلف دعوت دے رکھی تھی، بہت سے ذہین اور طبّاع دوست جمع تھے اور کئی دلچسپ مسائل گفتگو کا موضوع بنے رہے، بات میں سے بات نکلتی آئی، اور آخر گفتگو کا رُخ سزائے موت کے مسئلے کی طرف پھرا، اکثر مہمانوں نے جن میں سے بیشتر متبحر عالم اور ادیب تھے، سزائے موت کی مذمت کی، اور بہ طور تعزیر اس کا استعمال خلاف انسانیت اور قابلِ ترک ٹھہرایا، بعض کا خیال تھا کہ موت کی سزا کے بجائے اقصائے عالم میں حبسِ دوام کی سزا رائج ہو جانی چاہیے۔

میزبان نے اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ ذاتی طور پر مجھے نہ سزائے موت کا اور نہ حبسِ دوام کا تجربہ حاصل ہے، لیکن انسانی عقل میں اگر قیاس کا کوئی دخل تسلیم کیا جائے تو پھر میری رائے یہ ہے کہ حبسِ دوام کے مقابلے میں موت کی سزا زیادہ نرم اور زیادہ قرینِ انسانیت ہے، پھانسی پر لٹکتے ہی جان نکل جاتی ہے لیکن قید میں انسان گھل گھل کر مرتا ہے، وہ جلاد جو چند ثانیوں میں موت کے گھاٹ اتار دے یقیناً اُس جلاد سے زیادہ مہربان ہوتا ہے جو کئی سال تک لگاتار کرید کرید کر جان نکالتا رہے۔

ایک مہمان نے کہا "اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ دونوں یکساں مجرم سمجھے جانے چاہئیں، کیونکہ ان کا مقصد ایک ہی ہے دونوں انسان کو اُس کی زندگی سے محروم کر دیتے ہیں، حکومت آخر خدا تو نہیں ہے، اسے یہ حق کہاں پہنچتا ہے کہ کسی شخص کو

کسی ایسی چیز سے محروم کردے جسے اگر وہ پھر چاہے بھی تو واپس نہ کرسکے"۔

مہمانوں میں پچیس سال کا ایک نوجوان وکیل بھی تھا' اس کی رائے دریافت کی گئی تو اس نے کہا کہ "سزائے موت اور حبسِ دوام دونوں خلافِ انسانیت اور خلافِ اخلاق ہیں لیکن اگر مجھے ان دونوں میں سے انتخاب کرنے کا موقع دیا جائے تو میں یقیناً حبسِ دوام کو ترجیح دونگا۔ زندگی سے بالکل ہاتھ دھو لینے کے مقابلے میں زندہ رہنے کی ہر صورت بلاشبہ غنیمت سمجھنی چاہیئے"۔

اس پر ایک پُرلطف بحث چھڑ گئی' میزبان جو اُن دنوں مقابلتہً جوان اور تیز مزاج تھا' بھڑک گیا' اُس نے میز پر زور سے اپنا ہاتھ مارا اور نوجوان وکیل سے مخاطب ہوکر کہا "تم غلط کہتے ہو۔ میں شرط باندھتا ہوں کہ اگر تم پانچ سال کے لئے بھی ایک کوٹھڑی میں بند رہنا گوارا کرسکو تو میں تمہیں بیس لاکھ روپیہ ہار دوں گا۔

وکیل نے کہا: "اگر تم یہ صدقِ دل سے کہہ رہے ہو تو میں شرط باندھتا ہوں کہ میں پانچ نہیں پندرہ سال کے لئے بند رہوں گا"۔

میزبان نے چلاکر کہا "پندرہ سال! چلو' یہ اور بھی اچھا ہے' صاحبو! میں بیس لاکھ روپے کی بازی لگاتا ہوں"

وکیل نے کہا "مجھے منظور ہے اور سنو تم بیس لاکھ روپے کی بازی لگاتے' تو میں اپنی آزادی کی بازی لگاتا ہوں۔"

اس طرح یہ لغو اور بیہودہ شرط بندھ گئی' مہاجن کے ہاں اُن دنوں روپے کی خوب ریل پیل ہورہی تھی' کروڑوں روپے کا کاروبار تھا اور کروڑوں روپے کی ہمیانیاں اس کے خزانوں میں محفوظ تھیں' دولت کے نشے نے اسے خود پرست اور انجام سے غافل بنا رکھا تھا' اس کا دل پُرجوش جذبات کا ایک بوجھیں مارتا ہوا دریا بن رہا تھا اور وہ تقریباً آپے سے باہر ہورہا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اس نے وکیل کی طرف تمسخر سے دیکھ کر کہا "میاں صاحبزادے! وقت گزرنے سے پہلے ہوش کی دوا کرو' بیس لاکھ روپے میرے لئے بے حقیقت ہیں' لیکن تم اپنی زندگی کے بہترین تین یا چار سال ضائع کردوگے' تین یا چار سال میں نے اس لئے کہے کہ اس سے زیادہ بند رہنے کی تمہیں تاب نہ ہوگی' آہ بدقسمت دوست دل کے کان کھول کر سُن لو کہ اختیاری قید جبری قید سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے' یہی خیال کہ اپنی آزادی تمہارے اختیار میں ہے' قید کی کوٹھڑی میں تمہاری رگ رگ کے اندر زہر بن کر پھیل جائیگا' اور تمہاری تمام زندگی کو مسموم کردے گا' مجھے تمہاری حالت پر رحم آتا ہے"۔

آج بڈھا مہاجن اپنے مطالعے کے کمرے میں ادھر اُدھر ٹہل رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا کہ میں نے ناحق یہ شرط باندھی' فائدہ کیا ہے؟ وکیل نے اپنی زندگی کے پندرہ سال گنوا دیئے اور میں اپنے بیس لاکھ روپے اندھے کنوئیں میں جھونک رہا ہوں' اس بنا پر لوگ سزائے موت کے سزائے قید سے بہتر یا بدتر ہونے کا فیصلہ کرنے سے تو رہے' لاحول ولاقوۃ! بیہودگی کی انتہا ہوگئی' جب پیٹ بھرا ہو تو جو سوجھتی ہے الٹی سوجھتی ہے' خیر میں نے تو حماقت کی ہی تھی' یہ وکیل جو لنگوٹی میں پھاگ کھیل رہا تھا' اس کی مت بھی ٹھکانے نہ رہی۔

توبہ! روپے کی حرص بھی بُری بلا ہے۔

پھر وہ دعوت کے بعد کے واقعات یاد کرنے لگا، فیصلہ یہ ہوا تھا کہ وکیل مہاجن کے خانہ باغ کے ایک حجرے میں شدید نگرانی کے ماتحت اپنی قید کی مدت کاٹے، یہ بھی طے ہوا تھا کہ زمانۂ اسیری میں وہ نہ صرف کسی انسان کی صورت دیکھنے یا کسی انسان کی آواز سننے کے حق سے محروم رہے گا، بلکہ دہلیز سے باہر قدم رکھنے، یا اخبارات اور خطوط وصول کرنے کا بھی مجاز نہ ہوگا۔ اُسے موسیقی کا ایک ساز رکھنے کے علاوہ کتابیں پڑھنے اور خط لکھنے کی اجازت دی گئی تھی اور تمباکو اور شراب کے استعمال کا بھی اختیار حاصل تھا سمجھوتے کے مطابق وہ بیرونی دنیا سے خاموش نامہ و پیام کرسکتا تھا اور اس مقصد کے لئے خاص طور پر دیوار میں ایک چھوٹا سا غرفہ بنا دیا گیا تھا، کاغذ کے پرزے پر مطلوبہ اشیا کا نام لکھ کر کھڑکی کی راہ سے باہر پہنچانے کی دیر ہوتی کہ شراب کتابیں گانے، غرض جس چیز کی بھی اسے ضرورت پڑتی کھلے دل سے مہیا کردی جاتی، معاہدے میں جزوی سے جزوی تفصیلات کے لئے شرائط درج تھیں جن کے رو سے وکیل شدید ترین قید تنہائی میں رکھا گیا تھا، اور وہ پورے پندرہ سال یعنی ۱۴ نومبر ۱۸۷۰ء کے ۱۲ بجے سے لے کر ۱۴ نومبر ۱۸۸۵ء کے بارہ بجے تک محبوس رہنے کا پابند تھا، شرائط نامے کی خفیف سے خفیف خلاف ورزی، یہاں تک کہ مقرر وقت سے صرف دو منٹ پہلے باہر نکل آنے پر بھی مہاجن بیس لاکھ روپے کی رقم ادا کرنے کا پابند نہ رہتا تھا۔

جہاں تک وکیل کے مختصر رقعوں سے اندازہ ہوسکتا تھا، اس نے قید کے پہلے سال میں اپنی تنہائی اور بیکاری کے عذاب کو نہایت شدت سے محسوس کیا، اس کے کمرے سے دن رات پیانو کی آواز آتی رہتی تھی، شراب اور تمباکو کے استعمال سے اس نے انکار کردیا تھا، اس نے لکھا کہ شراب خواہشات کو برانگیختہ کرتی ہے، جو ایک قیدی کی سب سے بڑی دشمن ہیں اور تمباکو سے کمرے کی ہوا بگڑ جاتی ہے، پہلے سال کے دوران میں وکیل کو ہلکی قسم کی کتابیں دی گئیں، مثلاً محبت کے افسانے، فریب کاری کے قصے اور لطیف نظمیں وغیرہ۔

دوسرے سال پیانو کی آواز مطلق بند رہی اور وکیل صرف متین اور مستند تصنیفات منگواتا رہا، پانچویں سال پیانو کی گتیں پھر سنی گئیں، اور قیدی نے شراب بھی طلب کی، اپنے نگرانوں کے بیان کے مطابق اس سال بھر کے دوران میں وہ محض کھاتا پیتا یا اپنے بستر پر لیٹ کر وقت کاٹتا رہا، وہ اکثر جماہیاں لیتا اور کبھی کبھی آپ ہی آپ غضب آلود باتیں کرنے لگتا، اب اُسے مطالعے سے کوئی سروکار نہ تھا، کبھی رات کے وقت بیٹھ کر وہ کچھ لکھنے لگ جاتا اور گھنٹوں ہی بیٹھ کر لکھتا رہتا، لیکن صبح اُٹھ کر سب کچھ پھاڑ ڈالتا دو تین دفعہ اس کے رونے کی آواز بھی سنی گئی۔

چھٹے سال کے وسط میں قیدی نے نہایت انہماک کے ساتھ تاریخ، فلسفے اور زبانوں کا مطالعہ شروع کردیا، وہ ان مضامین کے مطالعے میں اس حریصانہ والہیت سے مشغول ہوا کہ مہاجن کے لئے نت نئی کتابوں کی تلاش کا کام خاصہ اہم مسئلہ بن گیا، چار سال

کی مدت میں تقریباً چھ سو جلدیں اس کی درخواست پر خریدی گئیں' اسی زمانے میں اس نے مہاجن کے نام یہ خط لکھا! عزیز دوست۔ میں یہ چند سطور چھ زبانوں میں لکھ رہا ہوں' یہ ان زبانوں کے ماہرین کو دکھاؤ اور اگر پڑھنے کے بعد انہیں ان میں ایک غلطی بھی نظر نہ آئے تو براہِ کرم باغ میں بندوق کا ایک فائر کرادو۔ اس کی آواز سن کر مجھے معلوم ہو جائیگا کہ میری کوششیں ناکام نہیں رہیں' ہر عہد اور ہر ملک کے غیر معمولی انسان اگرچہ مختلف زبانیں بولتے رہے مگر ان سب کی باتوں کی روح مشترک ہے' کاش تمہیں میری اُس بے لوث مسرت کا اندازہ ہو سکے جو مجھے اپنے اس علم سے حاصل ہوئی ہے"۔

قیدی کی خواہش پوری کی گئی' مہاجن کے حکم سے باغ میں دو فائر کئے گئے۔

اس کے بعد جب قید کے دس سال گذر گئے تو وکیل کے نگرانوں نے دیکھا کہ وہ اپنی میز کے سامنے بے حس و حرکت بیٹھ کر ہر وقت انجیل کا مطالعہ کرتا رہتا ہے' مہاجن کو یہ بات بہت عجیب معلوم ہوئی کہ وہ شخص جس نے چار سال میں چھ سو علمی کتابوں پر عبور حاصل کر لیا تھا' اس نے اب پورا سال بھر صرف ایک ایسی کتاب پڑھنے میں گزار دیا ہے جو نہ ضخیم ہے اور نہ مشکل انجیل کے بعد تاریخ مذاہب اور الٰہیات کا مطالعہ شروع ہوا' قید کے آخری دو برسوں میں اس کے شوقِ مطالعہ نے غیر معمولی بوقلمونی حاصل کی کبھی وہ علومِ طبیعیہ کے مطالعے میں وقت گزارتا اور کبھی بائرن اور شیکسپیر کی تصانیف پڑھتا اور کبھی وہ ایک ہی رقعے میں طب' کیمیا' فلسفے' الٰہیات اور افسانوں کی کتابیں طلب کرتا۔ اس کے مطالعہ کی یہ کیفیت تھی' گویا وہ سمندر میں کسی طوفان زدہ جہاز کے شکستہ تختوں کے درمیان تیر رہا ہے اور اپنی زندگی بچانے کی کوشش میں کبھی لکڑی کے اس ٹکڑے پر ہاتھ ڈالتا ہے اور کبھی اُس پر۔

مہاجن نے یہ سب واقعات دل ہی دہرائے اور سوچا کہ "کل بارہ بجے وہ آزادی حاصل کرے گا حسب قرارداد مجھ کو اسے بیس لاکھ روپے کی رقم ادا کرنی ہوگی جو اگر میں ادا کردوں تو میرا کام تمام ہوا جاتا ہے' میں کوڑی کوڑی کو تنگ آجاؤں گا"۔

پندرہ سال قبل وہ کروڑوں روپے کا مالک تھا لیکن آج اس کا رواں رواں قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا' خدا جانے اب اس کے پاس روپیہ زیادہ تھا یا قرض؟ تجارت قمار بازی کی سگی بہن ہے' اُس کی تقدیر کسی ایسے پیچ میں آئی کہ پھر وہ کسی طرح نہ سنبھل سکا اور آج وہ ایک معمولی مہاجن تھا جس کا دل منڈی کے بھاؤ کے ذرا ذرا سے اتار چڑھاؤ پر دھڑکنے لگتا تھا۔

بحالتِ یاس اُس نے اپنا سر پیٹ کر کہا:۔ "آہ اس منحوس شرط نے مجھے کہیں کا نہ رکھا یہ کمبخت آدمی مر کیوں نہ گیا' ابھی اس کی عمر بھی صرف چالیس سال کی ہے' یہ میری بچی کھچی پونجی پر ہاتھ صاف کرے گا اور شادی کر کے گلچھرے اڑائے گا' ادھر مجھے ایک حاسد گداگر کی طرح ٹکٹکی کے لئے اس کا منہ دیکھنا پڑے گا' مجھے بار بار یہی لفظ سننے پڑیں گے:۔

"میں اپنی زندگی کی مسرتوں کے لئے عمر بھر تمہارا ممنون رہونگا' اور میں ہر طرح تمہاری مدد کے لئے تیار ہوں"۔

"نہیں نہیں! مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکے گا' اس ذلت سے نجات کی یہی ایک صورت ہے کہ یہ شخص مر جائے"' گھڑی نے

ابھی ابھی تین بجائے تھے گھر میں سب لوگ سو رہے تھے، باہر درختوں پر پالا گر رہا تھا اور اُن کی خشک ٹہنیاں برف بار ہوا سے جھونکے کھا کر دھیمے دھیمے نالے کر رہی تھیں' اس نے آہستہ سے اپنی آہنیں الماری کھول کر اُس دروازے کی کنجی نکالی جو پندرہ سال سے مقفل تھا' اس کے بعد اپنا اوورکوٹ پہن کر باہر نکل گیا' باغ میں کڑاکے کی سردی تھی اور گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا رہا تھا۔ یخ بستہ ہوا کے شدید جھونکوں میں باغ کے درخت وحشیانہ چیخیں بلند کر رہے تھے۔ تاریکی اس غضب کی تھی کہ پاؤں تلے کی زمین بھی نظر نہ آتی تھی' مہاجن بہ دشواری باغ کے اُس حصے میں پہنچا جہاں وکیل کا حجرہ واقع تھا' یہاں اس نے پہریدار کو دو آوازیں دیں لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا' غالباً پہرے والا اس طوفانی موسم کی تاب نہ لاکر کسی کوٹھڑی میں سو گیا تھا۔

بڈھے مہاجن نے دل میں کہا" اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو لوگوں کو سب سے پہلے پہرے دار پر شک ہوگا" پھر وہ اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا اُس تنگ و تاریک ڈیوڑھی میں پہنچا جس کے پیچھے وکیل کا حجرہ تھا' یہاں اس نے دیا سلائی جلائی تو ایک طرف ایک خالی پلنگ اور ایک گوشے میں ایک لوہے کی انگیٹھی دکھائی دی' اس وقت وہاں ایک بھی فرد بشر نہ تھا۔ وکیل کے حجرے کے دروازے کی مہر بالکل سلامت تھی' جب دیا سلائی بجھ گئی تو بڈھے نے جس کا جسم شدتِ جذبات سے کانپ رہا تھا' دریچے میں سے اندر جھانکا' کمرے میں شمع کی مدھم سی روشنی ہو رہی تھی' قیدی میز کی طرف رخ کئے بیٹھا تھا' صرف اس کی پیٹھ' اس کے سر کے بال اور اس کے ہاتھ نظر آرہے تھے۔ میز پر' دونوں کرسیوں پر' اور میز کے قریب غالیچے پر' ہر طرف کھلی ہوئی کتابیں بکھری پڑی تھیں' پانچ منٹ گزر گئے لیکن قیدی نے خفیف سی حرکت بھی نہ کی' شاید پندرہ سال کی عزلت میں اسے اس طرح ساکت و صامت بیٹھنے کی عادت ہو گئی تھی' مہاجن نے انگلیوں سے کھڑکی پر ہلکی سی تھپکی لگائی لیکن قیدی نے جواب میں کوئی حرکت نہ کی' پھر اُس نے بہ احتیاط قفل کی مہر توڑی اور اس میں کنجی گھمائی' زنگ خوردہ قفل میں سے دھیمی سی دردناک آواز نکلی اور دروازہ کھلنے پر ایک ہلکی سی چیخ پیدا ہوئی' مہاجن کو امید تھی کہ دروازہ کھلتے ہی قیدی چونک کر اُٹھے گا' اور حیران ہو کر آگے بڑھے گا' لیکن تین منٹ گذر گئے اور پھر بھی کمرے میں پہلے ہی کی سی خاموشی طاری رہی' اب اس نے اندر داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے دیکھا کہ میز کے سامنے عام انسانوں سے مختلف ایک شخص بیٹھا ہے' یہ محض ہڈیوں کا ایک پنجر تھا جس پر کھنچا ہوا خشک سا چمڑا نظر آتا تھا' سر کے بال عورتوں کی طرح لمبے لمبے اور گھونگر والے تھے اور ڈاڑھی بہت گھنی اور الجھی ہوئی تھی' اس کے چہرے کا رنگ خاکستری مائل زرد تھا اور گال اندر کو پچکے ہوئے تھے' وہ سر سے پاؤں تک بالکل تاق ہو رہا تھا' اس کی سکڑی ہوئی پیٹھ لمبوتری سی معلوم ہوتی تھی اور وہ ہاتھ جس سے اس نے اپنے گھنے بالوں والے سر کو سہارا دے رکھا تھا' اس قدر دبلا اور سوکھا ہوا تھا کہ اس کی طرف دیکھنا بھی دردناک تھا' اس کے بال سفید ہو رہے تھے اور چہرے کی پیرانہ لاغری کو دیکھ کر کوئی شخص اعتبار نہ کر سکتا تھا کہ اس کی عمر صرف چالیس سال کی ہے۔

مہاجن نے دل میں کہا "یہ بیچارا سو رہا ہے اور شاید لاکھوں روپے کے خواب دیکھ رہا ہے بس اب مجھے یہ نیم مردہ چیز اٹھا کر بستر پر ڈالنی ہے اور اس کے بعد اسے کچھ دیر تک تکیے کے نیچے دبائے رکھنا ہے، اس کے بعد وثیق سے وثیق طبی معائنے پر بھی کسی کو اس کی غیر طبعی موت کا گمان تک نہ گزرے گا، لیکن پہلے دیکھیں تو اس نے لکھا کیا ہے۔" مہاجن کاغذ اٹھا کر پڑھنے لگا:

"کل شب بارہ بجے میں آزاد ہو جاؤں گا اور مجھے لوگوں سے میل جول کا حق حاصل ہوگا لیکن اس سے قبل کہ میں اس کمرے کو چھوڑوں اور سورج کی روشنی سے دوچار ہوں میں تم سے چند باتیں کہنا ضروری سمجھتا ہوں، میں اپنے ضمیر کو اور خدا کو گواہ رکھ کر کہتا ہوں کہ آزادی، زندگی، صحت اور تمام ان چیزوں کو جنہیں تمہاری کتابیں دنیا کی نعمت سمجھتی ہیں نفرت کی نظر سے دیکھتا ہوں، پندرہ سال تک میں نے نہایت غور سے اس دنیا کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے، یہ سچ ہے کہ اس اثنا میں میں نے نہ دنیا کو دیکھا اور نہ دنیا کے لوگوں کی زندگی کو، لیکن میں نے تمہاری کتابوں ہی میں مے احمر کے بلوریں جام لنڈھائے ہیں، رقص و سرود کی داد دی ہے، جنگلوں میں ہرنوں اور وحشی درندوں کا شکار کیا ہے اور عورتوں سے محبت کی ہے ـــ عورتیں خوبصورت، فسوں ساز، پُراسرار جنہیں تمہارے شعرا کے تخیل کے سحر نے پیدا کیا ہے راتوں کو میرے پاس آتیں اور میرے کانوں میں عجیب و غریب باتیں کہتیں جن سے میرے دل و دماغ پر ایک کیف سا چھا جاتا۔ میں البرز اور ہمالہ کی چوٹیوں پر چڑھا، جہاں سے میں نے صبح کے وقت سورج کو طلوع ہوتے اور شام کے وقت اسے آسمان، سمندر اور کوہسار کو سنہرے قرمزی رنگ میں نہلاتے پایا، وہیں میں نے اپنے سر پر بادلوں کے دامن میں جھلملاتی ہوئی بجلیاں دیکھیں، مجھے دور و نزدیک ہرے بھرے جنگل، مرغزار، دریا، جھیلیں، شہر اور بستیاں دکھائی دیں، میں نے پریوں کے گیت سنے اور خوبصورت جنتنوں کے پروں کو ہاتھ لگایا . . . . تمہاری کتابوں میں میں نے اپنے آپ کو اتھاہ گہرائیوں میں گرا دیا، میں نے معجزے دکھائے، شہر جلا کر خاک سیاہ کئے، نئے نئے مذاہب کی تلقین کی اور ملکوں کے ملک فتح کر ڈالے . . . . .

"تمہاری کتابوں نے مجھے دانش عطا کی ہے، انسان کے ان تھک سوچ بچار نے صدیوں میں جو کچھ پیدا کیا وہ سب کچھ دب سکڑ کر میرے دماغ میں سما گیا ہے، مجھے خوب معلوم ہے کہ میں تم سب سے زیادہ ہوشیار ہوں اور سنو مجھے تمہاری کتابوں سے بھی نفرت ہے تمام دنیاوی کامیابیوں سے نفرت ہے اور دانش وری سے نفرت ہے، یہاں کی ہر چیز بے اصل، ناپائدار اور سراب آسا کیسر فریب ہے۔ تم لاکھ مغرور، عقلمند اور خوبصورت ہو موت تمہیں دنیا کے تختے سے اسی طرح نیست و نابود کر دے گی جس طرح بلوں کے اندر رہنے والے چوہوں کو، اور تمہاری آئندہ نسلیں، تمہاری تاریخ اور تمہارے قابل ترین افراد اس کرۂ خاکی کے ساتھ ہی اس کے میل کی طرح جل بجھیں گے۔

"تم لوگ دیوانے ہو تم نے غلط راہ اختیار کر رکھی ہے، تم باطل کو حق اور بدنمائی کو حسن سمجھتے ہو۔ اگر نارنگی اور سیب کے درختوں کو مینڈک اور چھپکلیاں لگنے لگیں اور گلاب کے پھولوں سے ہانپتے ہوئے گھوڑوں کے پسینے کی بو آنے لگے تو تمہیں اچنبھا ہوگا، اسی طرح مجھے تمہاری حالت پر تعجب ہوتا ہے کہ تم عقبیٰ کو چھوڑ کر دنیا کے ہو رہے ہو، میں تو تمہارے حالات کو سمجھنا تک نہیں چاہتا، جن چیزوں پر تم جان

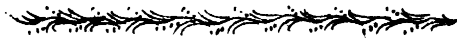
دیتے ہوئے اُن سے اپنی سچی نفرت کا عملی ثبوت دینے کے لئے میں اُس دو لاکھ روپے کی رقم پر لات مارتا ہوں، جسے میں کبھی جنت کی مسرت کا خزانہ سمجھتا تھا۔ یہ رقم حاصل کرنے کے حق سے اپنے آپ کو محروم کرنے کے لئے میں معیّن وقت سے پانچ منٹ پہلے باہر نکل کر اس معاہدے کو فسخ کر دونگا"۔

پڑھنے کے بعد مہاجن نے کاغذ پھر میز پر رکھ دیا اور اس عجیب وغریب آدمی کے سر کو بوسہ دے کر رونے لگا۔ پھر وہ حجرے سے باہر نکل گیا، اس کو کبھی شدید سے شدید تباہی کے غار میں گرتے وقت بھی اپنی ہستی اتنی حقیر اور فرومایہ نظر نہ آئی تھی جتنی آج نظر آئی وہ واپس آکر اپنے بستر پر لیٹ گیا، لیکن ہیجانِ جذبات اور گریۂ افسوس نے اُسے دیر تک سونے نہ دیا۔

علی الصباح بے چارہ پہرہ دار بھاگتا ہوا اپنے آقا کے پاس آیا، اور بولا "حضور وہ آدمی جو حجرے میں بند تھا کھڑکی توڑ کر باہر نکل گیا ہے۔ اس نے نکلتے ہی بیرونی دروازے کا رخ کیا اور نظروں سے غائب ہوگیا"۔

مہاجن نے فوراً اپنے ملازموں کے ساتھ وہاں پہنچ کر قیدی کے فرار کے واقعے کی تصدیق کی، وہاں پہنچتے ہی اس نے میز پر سے وکیل کی دست برداری کا قبالہ اٹھایا اور واپس آکر بہ احتیاط اُسے اپنی تجوری میں مقفل کر دیا تاکہ شہر کے بفکروں کو پہلے اُٹھانے کا موقع نہ ملے۔

حامد علی خاں



باغ بھی کتنی پیاری جگہ ہے، خدا جانتا ہے۔
یہاں گلاب کی کیاری۔
وہاں ندی کنارے اک جھالری۔
کہیں پتیوں کا جھرمٹ۔
گویا امن دامان کا اک مکتب۔
اور اس پر بھی احمق جھگڑتا ہے۔
کہ خدا موجود نہیں۔
خدا نہیں؟ باغوں میں؟ جب شام سایہ ڈالے؟
ہاں میرے پاس اک نشانی ہے:
یہ امر یقینی ہے کہ خدا میرے باغ میں ٹہلتا ہے!

گلچیں (علیگ)

غزل

قفس میں عمر گزری نالہ و آہ و فغاں کرتے / ہم آخر کس توقع پر خیالِ آشیاں کرتے

ہماری دور بینی تھی ہمارے اُن کی دشمن، / نہ ہوتی فکرِ مستقبل تو عیشِ جاوداں کرتے

پتا ملتا نہیں جنسِ وفا کا اب زمانے میں / کہیں سے ہاتھ اگر لگتی تو نذرِ دوستاں کرتے

حرم میں بھی جب اپنے ساتھ تھی قسمت کی محرومی / تو ہم کس منہ سے آخر شکوۂ جورِ بتاں کرتے

کسی کے نازِ خود بیں نے نہ اس کی بھی اجازت دی / کہ اپنے سر کو ہم وقفِ سجودِ آستاں کرتے

نہ تھی منظور ہمکو شمع کی تقلیدِ رسوائی / کہ محفل میں بیانِ لذتِ سوزِ نہاں کرتے

ابھی ہیں قوتیں ناآزمودہ حسن و اُلفت کی / جو تم کھنچتے تو ہم بھی جذبِ دل کا امتحاں کرتے

مزا آتا اگر گزری ہوئی باتوں کا افسانہ / کہیں سے ہم بیاں کرتے کہیں سے تم بیاں کرتے

دلِ افسردہ کو اپنے جو احساسِ طرب ہوتا / تو ہم بھی دو گھڑی سیرِ بہارِ بوستاں کرتے

ہم اپنے دیدۂ مشتاق ہی سے کام لیتے ہیں / حجاب آتا ہے اُن سے آرزوؤں کا بیاں کرتے

ہمیں بیفائدہ تجدیدِ غم کی کیا ضرورت تھی / پس از بربادیٔ گلشن جو یادِ آشیاں کرتے

حرم کیا دَیر کیا یکساں کشش تھی سارے عالم میں / خدائی جمع ہوتی خودنمائی تم جہاں کرتے

کیا موقوف ہم نے قصۂ دردِ نہاں وحشت
کہاں تک خامۂ حسرت رقم کو خونچکاں کرتے

رضا علی وحشت

نغمۂ حیات

(۱)

آہ! مجھے اپنا وہ عالمِ بے خبری اور وہ زمانۂ آشنائی یاد آتا ہے جب تو اور میں سرسبز باغیچوں کے درمیان پھولوں کی تلاش میں آوارہ پھرا کرتے تھے اور وہ رنگیں ساعتیں دلکش اور مہکتے ہوئے پھولوں کے ہار پرونے اور گلدستہ بنانے میں صرف ہوا کرتی تھیں میں تیرے لئے نوشگفتہ پھولوں میں سے حسین ترین پھول انتخاب کر کے لاتا اور میرے بےچین دل کو اس وقت تک سکون نصیب نہ ہوتا جب تک کہ اس ہدیۂ رنگ و بو کو تیرے معصوم حسن کی نذر کر دیتا۔

آہ! بچپن کی وہ مسرور ساعتیں جنگلی گلاب کا وہ دلکش موسم جو فضا کو معطر کئے دیتا تھا اور بچپن کی بےفکری کا وہ زمانہ — کیا جلد گزر گیا!

(۲)

پھر ہوش آنے پر ہمارے دل نشۂ محبت سے سرشار ہو گئے، ہمارا وقت راز و نیاز اور موسیقی کے عالمِ محویت میں بسر ہونے لگا، یہاں تک کہ شب بھر کے لئے جدا ہوتے وقت اپنے تھرتھراتے لبوں کو ایک دوسرے سے پیوست کرنے سے پہلے ہمارا قلبی ہیجان ہرگز سکون نہ پاتا تھا اور ملاقات کے وقت دل کی عزیز ترین دولت یعنی وہ گلے اور شکوے جو تمام تیری ذات سے متعلق ہوتے تیری محبوب ہستی پر نثار کر دینا میرے لئے تسکین و راحت کی کلید تھا، بیشک وہ عیش و نشاط کی دلفریب دنیا تیری ہی شرمندۂ احسان تھی، آہ! اب بھی جب کبھی ماہتاب کی تمام ساکنانِ فلک سے جگمگا اٹھتی ہے تو میرے بدن میں بجلیاں تڑپنے لگتی ہیں، میری آنکھیں گرم گرم آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں اور میری طبیعت کو آہ! میری بےقرار طبیعت کو اس شام کی یاد گدگداتی ہے جب تو اور میں جوان تھے۔

(۳)

عقد ہو جانے پر ہم اکٹھے رہنے لگے، ہمارا دامنِ امید زندگی کی خوشیوں سے بھر گیا تیری محبت بہت زیادہ گہری ہو گئی اور ہم دنیا کی بے ثبات لذتوں میں کھو گئے، مگر آہ! ہمیں فلکِ ناسپاس نہ دیکھ سکا اور موت کے بے رحم ہاتھوں نے تجھے مجھ سے جلد ہی چھین لیا، اور اب بھی اگرچہ تیرا شیریں نغموں اور سوزِ محبت سے معمور سینہ خوشنما پھولوں کی نرم نرم جڑوں اور پھدکتے ہوئے پرندوں کے نازک پنجوں تلے دب کر سرد ہو چکا ہے لیکن میں تیری خاموش در اداس آرامگاہ کے پہلو میں بیٹھ کر تیری وفاشعاری اور روح فرسا جدائی اور اپنی بربادی کے میٹھے میٹھے غم کو جس کی یاس و افسردگی کی ظلمت میرے خانۂ دل کو تاریک بنائے ہوئے ہے کم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

انہیں شیریں خوابوں کی بدولت میں تیرے حسرتناک مدفن کے دہشتناک ماحول کی اداسی اور اس خوفناک خاموشی میں تیری جدائی کے جانگداز صدمے کو برداشت کئے بیٹھا ہوں اور حقیقت میں جب ظلمت مجھے بچپن کی سادگی اور معصومیت اور جوانی کی امنگوں اور ولولوں کی یاد دلاتی اور بڑھاپے کی مایوسی اور موت کی بےرحمی کا مرقع دکھاتی ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میں بچہ بھی ہوں، جوان بھی اور بوڑھا بھی!!!۔

بابر بٹالوی

(ٹامس لوول بیڈوز)

مسلمان اور سنسکرت ادب

ذیل کا مضمون مسٹر ایم زیڈ صدیقی کے انگریزی مضمون "مسلمان اور سنسکرت ادب" کا ترجمہ ہے جو ماہِ مارچ کے ماڈرن ریویو میں طبع ہوا ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے یہ حقیقت بڑی حد تک واضح ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے گزشتہ صدیوں میں سنسکرت ادب کی کیا قیمتی خدمات انجام دیں اور کس طرح ہندوؤں کے علوم اور خیالات کو عربی اور فارسی زبانوں میں منتقل کر کے سب سے پہلے مغرب کو ان سے روشناس کرایا۔

"اکبر نے اپنے ذاتی رجحان اور سیاسی مصالح کی بنا پر سنسکرت کی ایسی اہم کتابوں کا جو مسلمانوں کے لئے مفید ثابت ہوں، فارسی میں ترجمہ کرانے کا عزم کیا، اس مقصد کے لئے فتح پوری کے دیوان خانے میں محکمۂ دار الترجمہ قائم کیا گیا اور مہابھارت جیسی مشہور کتاب سب سے پہلے ترجمہ کے لئے منتخب کی گئی، نقیب خان ترجمہ کرنے، اور متعدد پنڈت اس کی توضیح و تشریح کے لئے مقرر کئے گئے، اس کام کو شروع کئے تین ہی دن گزرے تھے کہ مورخ بدایونی کو بحیثیت مترجم کے نقیب خان کے شریک کار ہونے کا حکم دیا گیا اور اس ضخیم کتاب کے آٹھویں حصے کا چار ماہ میں ترجمہ ہوا، پھر اس کام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، ایک حصے کے ترجمہ کے لئے نقیب خاں اور حاجی محمد سلطان اور دوسرے حصے کے لئے ملا شیری مقرر کئے گئے، اور ملا فیضی کو نگرانکار کی خدمت سپرد ہوئی، کتاب کا ⅓ حصہ ترجمہ ہونے کے بعد حاجی محمد سلطان کو نظر ثانی کا حکم دیا گیا، غرض کہ ہندوستان کی اس عظیم الشان رزمیہ تصنیف کا فارسی ترجمہ کچھ دنوں بعد مکمل ہو گیا اور رزم نامہ کے نام سے شائع کیا گیا۔"

"پھر شہنشاہِ اعظم کی فراست اور عمدہ مشورہ کی بدولت دربار کے مشہور علما مثلاً ابوالفضل، فیضی، نقیب خان، حاجی محمد سلطان، ملا ابراہیم، ملا عبدالقادر بدایونی کے زیر نگرانی قابل پنڈتوں کی مدد سے مہابھارت، رامائن، بھگوت گیتا، اتھروید، یوگ وششٹ، مہیشمہانند، ہربنس اور دوسری کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا بعد ازاں ان ہندوؤں نے جو فارسی اور سنسکرت دونوں زبانوں پر دسترس رکھتے تھے سابقہ ترجموں کی نظر ثانی کی اور کچھ نئے تراجم بھی کئے، ۱۶۲۶ء میں گھرداس نے رامائن کا ایک جدید ترجمہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ سولھویں صدی کے آخر میں دیبی داس کایستھ نے اس کا آزاد ترجمہ کیا، دارا شکوہ کے ایک ہندو دوست نے جوگ واشِشٹا کا ترجمہ کیا۔"

"ویدوں کا فارسی ترجمہ سترھویں صدی کے وسط تک عام طور پر دستیاب نہ ہوتا تھا اتھروید کا فارسی ترجمہ جو اکبر کے

عہد میں کیا گیا تھا اس قدر خراب تھا کہ بہت جلد نظر انداز کر دیا گیا، شہزادہ دارا شکوہ نے جس نے بہت سی سنسکرت کتابوں کا ترجمہ کرایا تھا اس اہم کام کو بھی اپنے ذمہ لیا اور بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے ویدوں کا فارسی ترجمہ کیا گیا جو ۱۶۷۵ء میں مکمل ہوا۔ لیکن سنسکرت کی دوسری کتابوں کے ترجمہ کا کام انیسویں صدی تک جاری رہا، سنسکرت کے فارسی ترجمہ کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے خیالات بھی اسلامی علوم میں منتقل ہوتے رہے فیضی کی نل دمن مسیح بیگ کی رام اور سیتا کی کہانی، عبدالرحمٰن چشتی کی مراۃ المخلوقات اور مرزا فخرالدین کی تحفتہ الہند اس کا ثبوت ہیں، ان میں سے تحفتہ الہند عالمگیر کے عہد میں اس کے پوتے جہاندار شاہ کے لئے اس کے اتالیق کوکل تاش خان کی ایما سے ترجمہ کی گئی۔ یہ کتاب سات ابواب میں منقسم ہے جن میں ہندو تہذیب اور خیالات کو نہایت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، پہلے تمہید ہے جس میں اصل کتاب کا ذکر ہے پھر بابِ اول ہندوؤں کا علم عروض، باب دوم ہندوؤں کی شاعری، بابِ سوم ہندوؤں کے حروفِ ہجا، بابِ چہارم ہندوؤں کا فلسفۂ محبت، باب پنجم ہندوؤں کا علم موسیقی، بابِ ششم لذت مباشرت کا نظریہ، بابِ ہفتم ہندوؤں کا علم قیافہ، سنسکرت کے ان عربی اور فارسی ترجموں نے جو مسلمانوں کے لئے ہندوستانی علوم سے واقفیت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تھے، مغرب کے مستشرقین میں بھی مطالعہ کا ذوق پیدا کیا اور ان ہی ترجموں نے یا ان کے لاطینی ترجموں نے ان مستشرقین کو سنسکرت ادب کی خوبیوں سے روشناس کرایا اور اس کی تعریف کا ذریعہ بنے، کلیلہ دمنہ کا ادیبس ترجمہ ابن مقفع کے عربی ترجمہ سے عبرانی، یونانی، لاطینی، ہسپانی، اطالوی، ترکی، جرمنی، انگریزی، ولندیزی اور فرانسیسی زبانوں میں کیا گیا اور اٹھارھویں صدی کے ختم سے قبل تک مغرب کے علماً نے سنسکرت کی اصلی کتاب کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔"

"ہندوستانی فلسفہ کی سب سے پہلے ستائش کرنے والا مغربی فلسفی دراصل اس لاطینی ترجمہ کے مطالعہ کا مرہون منت ہے جو ان عربی، فارسی ترجموں سے کیا گیا تھا، شوپن ہار نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "دنیا کی تمام کتابوں میں کسی کا مطالعہ اپنشدوں سے زیادہ مفید اور بلند خیالات پیدا کرنے والا نہیں ہے"۔ لیکن اس فلسفی نے بھی نہ اصل سنسکرت کتاب دیکھی تھی اور نہ اس کا کوئی راست ترجمہ بلکہ اس کا ذریعہ معلومات پیران (Perron) کا وہ لاطینی ترجمہ تھا، جو دارا شکوہ کے عہد کے فارسی ترجمہ سے کیا گیا تھا"۔

محمد نسیم

مئے دو آتشہ

حکیم عمر خیام نیشاپوری

ما [illegible] گفتن نو
وانگاہ فروشندہ جنت بہ دو جو
گوئی کہ پس از مرگ کجا خواہیم رفت
مے پیش من آر و ہر کجا خواہی رو

ترجمہ

اک رند کو فیلسوف کہہ کر نہ بناؤ
اک مست کو غیب داں سمجھ کر نہ ستاؤ
کیا پوچھتے ہو مر کے کہاں جائینگے
مجھکو پلاؤ اور جہاں چاہے جاؤ

حکیم عمر خیام نیشاپوری

مے خور کہ ز دل کثرت و قلت ببرد
واندیشۂ ہفتاد و دو ملت ببرد
پرہیز مکن ز کیمیائی کہ ازو
یک جرعہ خوری ہزار علت ببرد

ترجمہ

مے پی کہ غم کثرت و قلت نہ رہے
اور خطرۂ ہفتاد و دو ملت نہ رہے
[illegible] ساغر مے کو [illegible]
گر [illegible] کوئی علت نہ رہے

حکیم آزاد انصاری

زمرّد کی پیدائش

شہزادہ مہر چاند کی کرن پر فریفتہ ہوگیا، دن بھر چاند کی کرن کے پیچھے پیچھے پھرتا تھا مگر وہ ہاتھ نہ آتی تھی ——— ہاں، چاند کی کرن ہمیشہ شہزادے سے شرما کر چھپ جاتی اور شہزادہ مہر نشیب و فراز میں سرگرداں پھرتا تھا لیکن کرن ہاتھ نہ آتی تھی ——— آہ آفتاب کی پُرجمال محبوبہ ایک طویل خنک کرن!

چاند کی کرن کا چہرہ زرِ خالص کی طرح چمکدار اور پیلا تھا، شہزادہ مہر ایک سچا عاشق محبّت کی تپش سے شعلہ گوں رہتا تھا ——— محبت کی آگ سے تابندہ اور لرزیدہ!

شہزادہ مہر کے سامنے سے چاند کی ننھی کرن خواب کی طرح سے گزر جاتی تھی بس شہزادہ ایک "خواب" سا دیکھتا رہ جاتا تھا، کرن بھاگ جاتی تھی اور دُور کھڑی ہوکر اپنے برق وش حبیب کو دیکھتی رہتی تھی پھر چھپ جاتی تھی!

حبیب و محبوب کے درمیان قدرت نے ایک حجاب پیدا کردیا تھا، شہزادۂ مہر کے حُسن کی برقِ تپاں اور شعاعِ ماہتاب کا خنک جمال کبھی متصل نہ ہو سکے ایک دن کا ذکر سنو، شہزادہ مہر اپنی محبوبہ کی جستجو میں پھر نکلا، سنہری رتھ میں بیٹھا ہوا، تھکا ہُوا دن شفق کی آغوش میں گرا جارہا تھا، کہ شہزادۂ مہر نے چاند کی کرن کو پکڑ لیا اس طرح آخر ایک دن حبیب و محبوب مل گئے!

شہزادہ مہر کی محبت کی گرم آغوش نے چاند کی کرن کو پکڑ لیا ——— دوشیزہ کرن گھبرا کر بھاگی اور پہاڑی کے پیچھے جا چھپی، حجاب سے اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی ——— شبنم رات بھر پڑتی رہی!

شہزادہ مہر برابر جستجو میں رہا اور صبح کو اپنی محبوبہ سے جا ملا اور محبت کے ہیکل پر لے جاکر ختم ہونیوالے دن کے سامنے شادی کرلی! ———

ایک حیرت انگیز حسین شعلہ رُو بچہ ان کے ہاں پیدا ہُوا!

آسمانی محبت کی درخشاں اولاد ——— ! **زمرّد!**

آفتاب کے نور کی جلوہ پاشیاں ماہتاب کی دمک کی جھلکیاں ——— آہ نور و جمال کا ایک کوہِ رنگیں ——— جان سے پیارا زمرّد!

ظفر قریشی بی اے دہلوی

محفلِ ادب

مصطفٰے ندیم

(اردو زبان کا ایک ترک شاعر)

مصطفٰے ندیم جس کا انتقال پچھلے سال بمقامِ انگورہ ہوا ہے، جدید ترکی کے مشہور شعرا میں تھا، حکومتِ ترکی نے حال میں اُس کا کلام لاطینی حروف میں شائع کیا ہے۔

ہمارے اہلِ وطن کو یہ سُن کر تعجب ہوگا۔ کہ ندیم ترکی کے علاوہ فارسی اور اردو میں بھی شعر کہتا تھا' فارسی میں تو اُس نے ایک ضخیم دیوان یادگار چھوڑا ہے' اردو میں بھی غزلوں اور نظموں کا اچھا خاصا مجموعہ ہے' جو ۱۹۰۹ء میں بمقامِ کلکتہ شائع ہوا۔

ندیم کی زندگی کے اکثر حالات پر گمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہے، مثلاً ہم پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہندوستان کیوں آیا؟ اور پورے دس سال یہاں کیوں مقیم رہا؟ اسی طرح اس کی سیاسی سرگرمیوں کے متعلق ہمارے معلومات بہت تشنہ ہیں' ہمیں ڈاکٹر سر عبداللہ المامون سہروردی کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا ہے' اُس کا ملخص یہ ہے کہ ندیم کا باپ سلیمان بک ترکی کی فوج میں کپتان تھا' وہ پلونا کے مشہور معرکے میں شریک تھا' اور روسیوں کے مقابلے میں نہایت شجاعت سے لڑا تھا۔

سلیمان بک کا ارادہ تھا کہ اپنے بیٹے کو بھی فوجی تعلیم دلائے' چنانچہ اُس نے مصطفٰی ندیم کو استنبول کے مکتبِ حربیہ میں داخل کرا دیا۔ ندیم نہایت وارستہ مزاج نوجوان تھا' شعر و شاعری کے ذوق نے اُسے بالکل بیکار بنا دیا تھا' چنانچہ وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکا' پھر جب انجمنِ اتحاد و ترقی نے قومیّت و وطنیّت کا غلغلہ بلند کیا تو ندیم نے اس مجلس کی حمایت میں کئی مضامین لکھے، جو وقت اور ترجمان وغیرہ میں شائع ہوئے' اُن دنوں ترجمان میں اُس کی بعض نظمیں بھی شائع ہوئیں' جو وطنیّت کے جذبات سے لبریز ہیں۔

ندیم ۱۹۰۳ء میں ہندوستان آیا۔ اور ۱۹۱۳ء میں ترکی واپس گیا' سر عبداللہ سہروردی کا بیان ہے کہ ندیم کو محبت میں سخت ناکامی ہوئی تھی' جس نے اُسے ترکِ وطن پر مجبور کر دیا۔ بدقسمتی سے ہمیں اس واقعہ کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔

ندیم نہایت پابندِ مذہب نوجوان تھا۔ ہندوستان کے متعلق اس نے بچپن سے سن رکھا تھا۔ کہ وہاں کے لوگ مذہب کے معاملے میں نہایت پختہ ہیں' اس کے علاوہ ہندوستان کی دولت کے افسانوں سے بھی اُس کے کان آشنا ہو چکے تھے'

چنانچہ اُس نے جب وطن چھوڑا تو سیدھا ہندوستان کا رُخ کیا، کچھ دن بمبئی رہا، پھر حیدرآباد چلا گیا۔ ۱۹۰۵ء میں کلکتہ آیا اور پورے آٹھ سال وہیں مقیم رہا۔

ندیم کی اردو غزلوں اور نظموں میں جو صفائی اور گھلاوٹ ہے اسے دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ اس نے استنبول میں ہی اردو سیکھ لی ہوگی۔ سر عبداللہ سہروردی کا بیان ہے کہ ندیم کے پڑوس میں ایک ہندوستانی تاجر رہتا تھا۔ جس نے کسی ترک خاتون سے شادی کر لی تھی اور مستقل طور سے استنبول میں اقامت گزیں ہو گیا تھا۔ ندیم اکثر اس سے ملتا رہتا تھا، چنانچہ اس کی صحبت میں ندیم کو اردو کا ذوق پیدا ہو گیا، ذہین آدمی تھا، تھوڑے عرصے میں بے تکلف اردو میں بات چیت کرنے لگا۔ سر عبداللہ سہروردی سے ندیم کے نہایت دوستانہ تعلقات تھے، انہیں کی تحریک پر اُس نے "عہدِ نو" کے نام سے ایک نظم لکھی، جو عظیم آباد کے رسالہ ادیب میں شایع ہوئی، لیکن اس وقت کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ نظم ایک ترک نوجوان کی طباعی کا نتیجہ ہے۔

۱۹۱۱ء میں علامہ سہروردی کے ہاں ایک مختصر بزمِ مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں شفق عماد پوری، عیش لکھنوی، وحشت کلکتوی وغیرہ شریک تھے، ندیم نے اس محفل میں ایک غزل پڑھی۔ جس کے تین شعر ہمیں یاد رہ گئے ہیں ؎

تھا حجاب کا اُٹھنا دشمنِ شکیبائی ∴ طور پر ہوا کیا تھا پوچھ چشمِ موسیٰ سے

دو مریضِ اُلفت نے آج پھیر لیں آنکھیں ∴ تھک گئی نظر آخر انتظارِ فردا سے

عشق وہ ہے رگ رگ سے جس کا جوش ظاہر ∴ بادہ ہو اگر بادہ پھوٹ نکلے مینا سے

علامہ سہروردی پر ندیم کی صحبت کا بہت اثر پڑا۔ چنانچہ انہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا، جو کچھ کہتے تھے، ندیم کے سوا کسی کو نہیں دکھاتے تھے، ندیم نے اُن کے کلام پر بعض نہایت برجستہ اصلاحیں دی ہیں مثلاً علامہ سہروردی نے ایک غزل کہی جس کا مطلع یہ تھا ؎

ہماری آہ نے جب برجِ عرشِ معظم میں پکڑی ∴ سرشکِ دیدہ نے بھی کوئے قاتل کی زمیں پکڑی

ندیم نے کہا پہلا مصرع اچھا ہے، دوسرا مصرع بدلئے اور پہلے مصرع میں "ہماری آہ" کے بجائے "غبارِ آہ" کر دیجئے۔

ندیم کی اردو نظموں کا مجموعہ "سبدِ گل" کے نام سے ڈاکٹر سہروردی نے ۱۹۱۱ء میں شایع کیا تھا۔ جب ندیم کو معلوم ہوا تو بہت جز بز ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے پاسِ خاطر سے "سبدِ گل" کی فروخت کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور جتنی کاپیاں چھپی تھیں، اب تک ڈاکٹر صاحب کے ہاں جوں کی توں پڑی ہیں۔

ندیم ۱۹۱۳ء میں اپنے وطن گیا۔ اور ۱۹۳۱ء میں جبکہ اُس کی عمر تقریباً پچپن سال کی ہوگی، انتقال کر گیا۔"

ندیم کے مفصل حالات کے لئے تو اُس کے سوانح حیات کا انتظار کیجئے جنہیں عبداللہ سہروردی عنقریب شایع

کر رہے ہیں' ہم یہاں اس کے چند اشعار نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں' جو ہمیں علامہ سہروردی کی عنایت سے دستیاب ہوئے ہیں

جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی ❊ راہ میں اُن سے ملاقات ہوئی

کہ ہر شیشہ نظر میں قطرۂ اشک ندامت ہے ❊ خجل ہے میکدہ اتنا ہماری روسیاہی سے

جو چیز موخر تھی مقدم نظر آئی ❊ آغاز میں ہستی کے اجل آگئی اے دل

گل بھی ہوا تو میں نہ ہوا آشنائے رنگ ❊ اے عندلیب باغ جہاں میں بتنگ شمع

ہماری چشم گریاں کشتی سوغات بنتی ہے ❊ وطن کی یاد بھر دیتی ہے اس کو لعل و گوہر سے

سادہ پڑا ہے اک ورقِ آفتاب اور ❊ ہر شے میں تیرے نور کی تصویر کھنچ گئی

اردو غزل میں ندیم کا کوئی خاص انداز نہیں بعض غزلیں داغ کے انداز میں ہیں بعض میں لکھنو کی شاعری کا تتبع ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے خوب لکھا ہے' افسوس ہے کہ ہمیں اس کی کوئی نظم دستیاب نہیں ہوسکی' ورنہ آپ دیکھتے ہیں کہ اس نے کیسے کیسے اچھوتے موضوعوں پر نظمیں لکھی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے' کہ ندیم کے فارسی کلام کا بھی تھوڑا سا نمونہ دیدیا جائے' اس نے رباعیاں خوب لکھی ہیں' ایک رباعی سنئے

از سینۂ زار داد خواہے بودہ است ❊ ایں باد وزندہ بد آہے بودہ است

ایں غنچۂ باغ کج کلاہے بودہ است ❊ ایں خار کہ ہست در چمن لبود رقیب

باشد دہنت کوثر و رخسار بہشت ❊ اے ساقیِ ماہ منظر و حور سرشت

زاں پیش کہ خاک من و تو گردد خشت ❊ برخیز دمی از سبوئے در جام بریز

ندیم فارسی اشعار میں اکثر مقامات پر جدید فارسی شعرا کی طرح حروفِ صحیح بھی گرا دیتا ہے' فکِ اضافت کی مثالیں بھی کثرت سے ملتی ہیں' لیکن اس کے اردو اشعار میں اس قسم کی کوئی مثال نہیں ملتی فارسی میں اس کی ایک طویل غزل ہے جس کا مطلع ملاحظہ ہو سے

کاش می مردم ہماں لحظہ کہ بیدار شدم ❊ دوش در خواب دمے ہمدم دلدار شدم

دوسرے مصرع میں ملئے ہوز گرا دی ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ آج تک ندیم پر اردو زبان میں ایک مضمون بھی نہیں لکھا گیا' اردو کے جو تذکرے گذشتہ دس سالوں میں شائع ہوئے ہیں' ان میں بھی ندیم کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ حالانکہ ندیم اپنی شاعرانہ عظمت کے اعتبار سے بہت توجہ کا مستحق ہے۔

ندیم کا فارسی اور اردو کلام ڈاکٹر سہروردی کے پاس موجود ہے' اردو کلام کا ایک مجموعہ چھپا ہوا موجود ہے' امید ہے کہ ندیم کی موت کے بعد ڈاکٹر صاحب کو "سبد گل" کی جلدیں فروخت کرنے میں کوئی عذر نہیں ہوگا۔

نیرنگ خیال

ایوانِ عدل

آسکر وائیلڈ کی ایک منثور نظم

ایوانِ عدل میں خاموشی طاری تھی اور ایک ننگا دھڑنگا انسان خدا کے حضور میں پیش ہوا۔

اور خدا نے انسان کے اعمال کی کتاب کھولی۔

اور خدا نے انسان سے کہا "تیری زندگی بُری تھی، تو نے اُن پر ظلم کیا جو بے کس تھے، اور جن کو مدد کی ضرورت تھی اُن سے تو نے تلخ مزاجی اور سخت دلی کا برتاؤ کیا غریبوں نے تجھ کو بلایا اور تو نہ بولا اور تیرے کان میرے دکھی بندوں کی پکار پر بند ہو گئے، بے باپوں کے ورثے پر تو قابض ہو گیا اور ہمسایہ کے تاکستانوں کی طرف تو نے لومڑیوں کو بھیجا، تو نے بچوں کی روٹی اٹھائی اور کتوں کے آگے ڈال دی اور میرے کوڑھی بندے دلدلوں میں امن سے رہتے تھے اور میری حمد کرتے تھے تو نے انہیں پہاڑوں کی طرف نکال دیا، اور میری زمین پر جس سے میں نے تجھے بنایا تھا تو نے بیگناہوں کا خون بہایا"۔

اور انسان نے جواب دیا اور کہا "ہاں میں نے ایسا ہی کیا"۔

اور خدا نے پھر انسان کے اعمال کی کتاب کھولی۔

اور خدا نے انسان سے کہا "۔ تیری زندگی بُری تھی، تو حُسن کے جنون میں رہا جس کو میں نے ظاہر کیا اور نیکی کی تلاش نہ کی جس کو میں نے چھپایا۔ تیرے مکان کی دیواریں بتوں کی تصویروں سے سجی ہوئی تھیں اور تیرے ناپاک بستر میں سے ارغنوں کی آواز تجھے جگاتی تھی، جن گناہوں کو میں نے معاف کیا اُن کے لئے تو نے سات قتل گاہیں تعمیر کیں اور جن چیزوں کو میں نے حرام کیا اُن کو تو نے کھایا، اور تیری قبا کے ارغوانی رنگ پر تیرے گناہ کے تین نشان نمایاں تھے، تیرے بُت نہ سونے کے تھے نہ چاندی کے جو پائدار ہوتے بلکہ گوشت کے تھے جو مرجھا جاتا ہے، تو ان کے بالوں میں خوشبوئیں لگاتا تھا اور انار اُن کے ہاتھوں میں دیتا تھا، تو اُن کے پاؤں میں زعفران لگاتا تھا اور قالین اُن کے آگے پھیلاتا تھا۔ تو سرمہ اُن کی آنکھوں میں لگاتا تھا اور مُر ان کے جسم پر بساتا تھا تو اپنا سر اُن کے آگے زمین پر جھکاتا تھا اور ان کا رتبہ آفتاب سے بڑھاتا تھا، تو اپنی رسوائی آفتاب کو دکھاتا تھا اور اپنا جنون چاند کے سامنے پیش کرتا تھا

اور انسان نے جواب دیا اور کہا "ہاں" "میں نے ایسا ہی کیا"۔

اور خدا نے تیسری دفعہ انسان کے اعمال کی کتاب کھولی۔

اور خدا نے کہا تیری زندگی بُری تھی کہ بھلائی کے عوض تو نے بُرائی کی اور نیکی کے عوض بدی، جن ہاتھوں نے تجھے پالا تو نے ان کو زخمی کیا اور جن چھاتیوں کا تو نے دودھ پیا ان کی تو نے تحقیر کی، جو پانی لے کر تیرے پاس آیا وہ پیاسا ہو کر گیا، اور باغی لوگ جنہوں نے اپنے خیمے میں تجھے پناہ دی صبح ہونے سے پہلے پہلے تو نے انہیں پکڑوا دیا، اور تیرا دشمن جس نے تجھے چھوڑ دیا تھا

تو نے گھات میں بیٹھ کر اُس کو زخم لگایا اور تیرا دوست جو تیرے ساتھ چلا تو نے اُسے روپے کے عوض فروخت کر دیا، اور جنھوں نے تجھے محبت کا تحفہ دیا تو نے نفس پرستی اُن کے سامنے پیش کی"۔

اور انسان نے جواب دیا اور کہا "ہاں میں نے ایسا ہی کیا"۔

اور خدا نے انسان کے اعمال کی کتاب بند کر دی۔ اور کہا "یقیناً میں تجھے جہنم میں بھیجوں گا، ہاں میں تجھے جہنم میں بھیجوں گا"۔

اور انسان نے چلّا کر کہا، "تو ایسا نہیں کر سکتا"۔

اور خدا نے انسان سے کہا "میں کیوں ایسا نہیں کر سکتا اور اس کی کیا وجہ ہے؟"

انسان نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ میں ہمیشہ جہنم ہی میں رہا"۔

اور ایوانِ عدل میں خاموشی چھا گئی۔

اور تھوڑی دیر بعد خدا بولا، اور اس نے انسان سے کہا۔ "یہ دیکھ کر کہ میں تجھے جہنم میں نہیں بھیج سکتا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں تجھے جنت میں بھیجوں، ہاں میں تجھے جنت ہی میں بھیجوں گا"۔

اور انسان چلّا کر بولا۔ "تو ایسا نہیں کر سکتا"۔

اور خدا نے انسان سے کہا "میں کیوں تجھے جنت میں نہیں بھیج سکتا اور اس کی کیا وجہ ہے؟"

انسان نے جواب دیا "اس لئے کہ کبھی اور کسی جگہ بھی میں اس کا تصور نہیں کر سکا"۔

اور ایوانِ عدل میں پھر خاموشی چھا گئی۔

(افسانہ)

کہیں جاتے ہوئے

(سید شبیر حسن صاحب جوشؔ ملیح آبادی)

پھر اس طرف رواں ہوں فسانہ لئے ہوئے ماضی کا ہر نفس میں ترانہ لئے ہوئے
پھر گامزن ہوں میکدۂ دوش کی طرف رفتار میں خمارِ شبانہ لئے ہوئے
پھر بزمِ رنگ و بُو کی طرف مڑ رہا ہے دل بے رنگ زندگی کا فسانہ لئے ہوئے
پھر جا رہا ہوں دورِ خرد آرمیدہ میں بُھولا ہُوا جنوں کا زمانہ لئے ہوئے
کیا نارِ عشق ہے کہ اُدھر جا رہا ہوں جوشؔ
باوصفِ فقر طبعِ شہانہ لئے ہوئے

مطبوعات

تجدید عمل۔ اس کتاب میں مذہب کی سائیکالوجی پر ایک مختصر مگر جامع بحث کی گئی ہے اور یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ہر مذہب اپنے زمانے اور قوم کے ضروریات کی پیداوار ہوتا ہے اور اس کی اصلیت ان ضروریات کے بدلنے پر بجز نام کے اور کچھ نہیں رہ جاتی' اس بحث سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسی وجہ سے کوئی مذہب قومیت کو نہیں بدل سکتا' بلکہ قومیت خود مذہب کو اپنے رنگ میں ڈبو لیتی ہے' اس سلسلے میں بعض مثالیں بھی دی گئی ہیں' کتاب کی زبان اچھی ہے مصنف مرزا عسکری علی خان مجازی ہیں قیمت آٹھ آنے ہے' اور **گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو** لاہور سے مل سکتی ہے۔

ادبی دنیا — اپریل کا پرچہ ہمارے پیش نظر ہے' یہ رسالہ پہلے مولانا تاجور کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ مولانا اس کی ادارت سے عملاً دستکش ہو گئے ہیں اور اب اس کا انتظام و ادارت کلیتہً جناب منصور احمد صاحب سابق جائنٹ ایڈیٹر ہمایوں کے ہاتھ میں ہے' صاحب موصوف نے جس خوبی اور تن دہی سے "ہمایوں" کی خدمات انجام دیں اس کا ایک زمانہ شاہد ہے۔ ان کے ادبی ذوق کو روشناس کرنے کی ضرورت نہیں "ہمایوں" میں ان کے گرانقدر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں' اس کے علاوہ ان کی کتاب "دنیا کے بہترین افسانے" نقادانِ فن سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے عزم و ہمت اور انتظامی قابلیت سے ادبی دنیا کو ہر طرح نہایت باقاعدہ رسالہ بنا دیں گے' موجودہ پرچے کو دیکھ کر آئندہ کے متعلق بہت سی امیدیں ہو جاتی ہیں' سالانہ چندہ پانچ روپے چھ آنے دفتر **ادبی دنیا** لاہور سے منگوائیے۔

افسانہ — اس رسالے کا ابھی پہلا نمبر ہی شائع ہوا ہے اور ہم اس کے قابل مدیر جناب ملک محمد اسلم خان صاحب ایم اے (کینٹب) بیرسٹرایٹ لا کو مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کی ادبی کوششوں کا یہ نقش اول ہی نہایت کامیاب رہا ہے رسالے کا مقصد ادب و افسانہ کا فروغ اور اس کے متعلق صحیح ذوق پیدا کرنا ہے چنانچہ اس مقصد کے لئے نہ صرف اعلیٰ درجے کے افسانوں کا ترجمہ کرایا جائیگا' بلکہ ملکی افسانہ نگاری کی حوصلہ افزائی بھی کی جائیگی' اس کے علاوہ افسانے کے موضوع پر تنقیدی مضامین شائع ہوا کریں گے۔ یہ مقاصد بہت بلند ہیں اور جیسا کہ پہلے نمبر ہی سے ظاہر ہوتا ہے ہمیں امید ہے کہ ملک صاحب اپنے فرائض سے بوجہ احسن عہدہ برا ہوں گے۔ چندہ سالانہ اعلیٰ کاغذ تین روپے معمولی کاغذ دو روپے ہے' دفتر **افسانہ انارکلی لاہور** سے طلب فرمائیے۔



فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ جون ۱۹۳۳ء

جلد ۲۳ — نمبر ۶

تصویر:- جنابِ اثر صہبائی

قیمت فی پرچہ ۶ر — ڈیلر بک سٹال پر ۸ر — چندہ سالانہ للعہ ۶ر مع محصول

"طلسمِ زندگی"

یعنی

جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) مدیر ہمایوں کی تازہ تصنیف

کے متعلق

جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی بی اے ایل ایل بی کی رائے

"یقین فرمائیے گا تصنع قطعی نہیں۔ لاہور میں شرفِ قدمبوسی حاصل ہوا لیکن وہ بیکار تھا۔ آج طلسم زندگی کے ذریعہ سے گویا از سرِ نو نیاز حاصل ہوا۔ بعد میں نے آپ کے مضامین میں رڈ نرد رتھ کے فلسفہ کے ساتھ پہلی مرتبہ عمر میں کیٹس کی جوشیلی حسیات دیکھیں کس قدر گرمی کے ساتھ کوئی فقرہ آتا ہے کہ ایک دم سے عبارت جگمگا اٹھتی ہے ایک دم سے دل اچھل پڑتا ہے ایک چٹکی سی دل میں کوئی لیتا ہے دوسری سطر میں گدگدی ہونے لگتی ہے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ عمر میں پہلی مرتبہ میں نے اردو میں ادبِ لطیف دیکھا۔ آج میں نے اردو میں کامیاب ترین چیز دیکھی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اتنے دنوں سے کیوں ان مضامین کو چھپائے رکھا گیا؟

میں نے آج تک اس قدر غیر دلچسپ عنوانات کے تحت میں اس قدر دلچسپ مضمون نہیں دیکھے مضمون دیکھتے جاؤ وہ حالت ہوتی ہے کہ جیسے دریا کنارے خوبصورت سنگریزے ہیں ایک سے ایک اچھا ملتا ہی چلا جاتا ہے اور آگے بڑھتا جاتا ہے اور بوجھ سے تنگ آ کر اس سے اچھا سنگریزہ پاتا ہے اسے چھوڑ دیتا ہے مگر افسوس کے ساتھ اور دوسرا اٹھاتا ہے۔ دیکھئے مضمون یہاں ہے کتنے مشکل اور معمولی عنوانات آپ نے لئے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کیونکر ان پر کچھ لکھنا ممکن ہے پھر انجمن زندہ دلانِ ہند ضرورت ہے چند پند وغیرہ ایسے مضمون ہیں کہ لطافت نگاری اور مزاحیہ رنگ میں جان ڈال دی ہے خاص طور پر لڈو کس قدر دلچسپ مضمون ہے آپ کا کوئی مضمون حقائق سے خالی نہیں ہے اور خاص لطف یہ ہے کہ اردو ایسی کم مایہ زبان میں آپ نے چند لفظوں کے ہیر پھیر سے غضب کر دیا ہے۔ مثلاً چند پند کی پہلی سطر کہ اس میں فلسفہ ظرافت اور حقیقت بھی کچھ ہے۔

یقین کیجئے میں نے طلسم زندگی کو اتنی اچھی طرح دیکھا کہ گویا گھول کر پی گیا ہوں اور دیکھے جا رہا ہوں کیا تعجب کہ پھر لکھوں۔ کتاب کی ظاہری شان ہے میں بھولا ہی جاتا تھا اس کے معنی یہ تھے کہ آپ نے جو کچھ اس طرف توجہ کی اس کو قومی خسارے میں ڈالے دیتا تھا ایک لفظ میں کتاب کی ظاہری خوبیاں کچھ بھی نہیں محض ایک مضمون دوست کی اصلی خوبیوں پر سے تمام عمدہ جلد اور رنگین پلیٹ تصدق کئے جا سکتے ہیں۔

ہماری پہلی کتاب اور کتاب کا آخری مضمون یہ دونوں جواہر پارے اس قدر دلچسپ اور پھڑکتے ہوئے ہیں کہ بے ساختہ واہ! کہنے کو جی چاہتا ہے۔"

قیمت فی جلد پانچ روپے | ملنے کا پتہ:۔ سید عبد اللطیف دفتر رسالہ ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور

جہاں نما

چین کی دیوارِ عظیم

چین کی دیوارِ عظیم کا ذکر آج کل اخبارات میں پھر تازہ ہو گیا ہے۔ جاپان کے وزیرِ خارجہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ دو ہزار سالہ دیوار پہلے منچوریا اور چین کے درمیان حدِ فاصل کے طور پر قائم تھی اور اس لئے جیہول مانچوکو کی نئی صوبہ داری کا ایک جزوِ لاینفک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مانچوکوؤ کو منگولیا کے قلب تک توسیع حاصل ہو جائے گی۔

دیوارِ عظیم شہنشاہ زن شی نے تعمیر کرائی تھی اسی لئے بعض لوگ اسے دنیا کا معمارِ اعظم کہتے ہیں۔ یہ دیوار بحیرۂ اصفر سے شروع ہو کر وسطِ ایشیا تک پہنچتی ہے اور یہ فاصلہ اُن دنوں سال بھر کے عرصے میں طے ہو سکتا تھا۔ دیوارِ چین انسان کی تعمیری یادگاروں میں سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ ایک عظیم الہیئت اجگر کی طرح پہاڑوں پر چڑھتی اور وادیوں میں اترتی ہوئی یہ دیوار پندرہ سو میل تک چلی گئی ہے۔

دیوارِ چین بیس ہزار سپاہی معماروں نے تعمیر کی جن کی حفاظت کے لئے چار لاکھ فوجی جوان مقرر تھے بعض بعض اینٹیں تیس تیس سیر وزن کی تھیں۔ تیس ہزار دوسرے آدمی قلی مزدور کے کام اور سامانِ ضروریات کی بہم رسانی پر مقرر تھے مختصر یہ کہ تقریباً پانچ لاکھ آدمیوں نے دس سال کی محنت ضائع کی اور ارد گرد کا علاقہ آباد کر کے اس خطرہ کو اور بڑھا دیا جس سے محفوظ رہنے کے لئے یہ دیوار تعمیر ہو رہی تھی۔ ایک ضمنی نتیجہ یہ بھی نکلا کہ روسی خون میں ان لاکھوں محنت کش نفوس کے ایشیائی خون کی آمیزش ہو گئی۔

دیوار کا زیریں حصہ کہیں کہیں پچیس فٹ یا اس سے زیادہ عریض ہے اور بالائی حصے کا عرض پندرہ فٹ ہے جب یہ دیوار تعمیر ہو گئی تو اس میں اتنا مسالا موجود تھا کہ اس سے دنیا کے گرد ایک نو فٹ بلند دیوار بن سکتی تھی۔

زن شی کو یہ ہوس تھی کہ تاریخ کی ابتدا اس کے عہد سے ہو چنانچہ اس نے نہایت کاوش سے قدیم کتابیں اور نوشتے تباہ کئے اور پانسو کے قریب مذہبی پیشواؤں کو زندہ جلا دیا جو ان کتابوں کے حافظ تھے۔

یہ عظیم الشان یادگار دیوار اُس عہد میں تعمیر ہوئی تھی جب چین کو شمال کی طرف سے حملوں کا خطرہ تھا۔ آج کل پھر یہی حالت ہے۔ اس زمانے میں یہ دیوار واقعی ایک پناہ کا کام دے سکتی تھی لیکن موجودہ زمانے میں اس قسم کی فصیل کی کوئی حقیقت نہیں آج کل کی توپیں آنکھوں آنکھوں میں اس کی خاک اڑا سکتی ہیں۔

انسان دیوارِ عظیم پر بیٹھ جائے تو خاموش اور تنہا پہاڑیوں پر ڈھلتے پھرتے اس کے وہ برج نظر آتے ہیں جن پر خطرے کے وقت روشنی کر کے دفاعی افواج ہوشیار کی جاتی تھیں۔ اب تو طرفۃ العین میں برق ملک کے طول و عرض میں پیغامات پھیلا دیتی ہے اور ان

شکستہ و ریختہ میناروں کی ویرانی پر ہوائی جہاز بھائیں بھائیں کرتے پھرتے ہیں۔

اُن دنوں چینیوں کو منگولوں اور مانچوؤں سے خطرہ تھا اور "ٹھنگنوں" (جاپانیوں) کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے آج کل جاپانی منچوریا اور اندرونِ منگولیا میں اپنی حیثیت استوار کر رہے ہیں لیکن چینی بھی بڑھ رہے ہیں اور اپنی حیثیت قائم رکھنے پر مُصر ہیں اور مُصر رہیں گے۔ اس لئے ابھی معلوم نہیں یہ داستان کب انجام کو پہنچتی ہے۔

عہدِ حاضر کا رابنسن کروسو

ایک پورے جزیرے کا تنہا باشندہ

لنڈن سے اٹھارہ گھنٹے کی مسافت پر ایک جزیرہ واقع ہے جہاں ایک ایسا آدمی رہتا ہے جسے سچی مسرت حاصل ہے ـــ

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد ــــ کسے را با کسے کارے نہ باشد

اس شخص نے زندگی کا ہر مسئلہ حل کر لیا ہے۔ وہ روپے کا استعمال نہیں کرتا کسی دوسری انسانی صورت سے دوچار نہیں ہوتا اور اس کے نزدیک لوزان اور اٹاوہ کی کانفرنسوں کی حقیقت ایک پرِ کاہ کے برابر بھی نہیں۔ جنگ و جدال برپا ہوتے ہیں، وبائی امراض پھیلتے ہیں، نمائندگانِ جمہور کے انتخابات کا شور اٹھتا ہے اور بادشاہوں کی اموات واقع ہوتی ہیں لیکن اسے ان کی اطلاع تک نہیں ہوتی۔

جزیرہ منگولے جس میں وہ اپنی عزلتِ کامل کی زندگی گزارتا ہے سکاٹ لینڈ سے سو میل کے فاصلے پر واقع ہے اور اسے ایک ایسا ودٹ حاصل ہے جو آج تک کسی نے طلب نہیں کیا۔

اس کی تمام ضروریات اسی جزیرے میں پوری ہو جاتی ہیں، وہ اپنی خوراک کے لئے خود غلہ بوتا ہے، خود اپنے لئے کپڑا مہیا کرتا ہے اور ایک وحشی جانور کی طرح فکر و تشویش سے آزاد اور خوش و خرم ہے۔ بحری پرندے، مچھلیاں اور بھیڑ بکریاں جو اس کے اردگرد ادھر اُدھر پھیلی ہوئی ہیں اس کی تنہائی کی رفیق ہیں، دن کا کام ختم کرنے کے بعد سونے سے پہلے وہ اپنی جھونپڑی میں بیٹھ کر انجیل کا مطالعہ کرتا ہے۔ اور دنیا کی سیاسیات سے اُسے کوئی سروکار نہیں۔

جھوٹ کی عالمگیری

۹۷ فیصدی اشخاص دروغ گو ہیں

کالگیٹ یونیورسٹی کے معلمِ نفسیات پروفیسر لیرڈ نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ سو میں بہ مشکل تین آدمی ایسے نکلتے ہیں جنہیں ہم حقیقی مفہوم میں سچا کہہ سکتے ہیں۔ اکثر لوگ جھوٹ سے اپنے ناتکمیل یافتہ عزائم کی پردہ پوشی کا کام لیتے ہیں اس لئے دنیا کے جھوٹوں میں ڈینگ مارنے والوں کی کثرت ہے معلمِ مذکور نے جھوٹ کے متعلق بہت تحقیق و تدقیق کی ہے چنانچہ عام قابلیت کے ایک امتحان میں اس نے یہ سوال کیا کہ شکسپیئر نے اپنے ڈرامے Gone but Not Forgotten (رفتہ و از یاد نرفتہ) کا موضوع کہاں سے

حاصل کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ شیکسپیئر نے ایسا کوئی ڈراما نہیں لکھا لیکن کالج کی بیسیوں لڑکیوں اور لڑکوں میں سے ایک بھی اس ڈرامے کے متعلق اپنے علم کا ثبوت دینے سے نہ چوکا۔ چنانچہ ہر متعلم نے ایک گھڑا گھڑایا جواب پیش کر دیا۔ بعض قابل پروفیسروں نے تحقیق کی ہے کہ ایسے لوگ جو نہ اپنے متعلق نہ اپنی قابلیت کے متعلق اور نہ کسی اور چیز کے متعلق جھوٹ بولیں صرف تین فیصدی ہیں جھوٹ بولنے کی طرف رغبت کے مختلف مدارج ہیں۔ سب سے پست درجہ وہ ہے جس میں انسان کسی چیز کے متعلق بھی سچ نہیں بول سکتا۔ ایسے لوگوں کی ذہنیت علیل ہوتی ہے۔ سب سے بلند درجہ وہ ہے جس میں انسان کسی حالت میں بھی اور کسی چیز کے متعلق بھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اگر ابتدا ہی میں سچ بولنے کی تعلیم نہ دی جائے تو اکثر بچے گہوارۂ طفلی ہی میں دروغ گوئی کی طرف راغب ہونے لگتے ہیں۔ دو پروفیسروں نے تحقیق کے دوران میں معلوم کیا کہ چار سالہ امریکن بچوں کے ایک عام گروہ میں سے اکثر جھوٹ کی طرف نمایاں طور پر مائل تھے۔ اُن سے مختلف سوال کئے گئے۔ مثلاً ان سے پوچھا گیا کہ تم اپنا نام لکھ سکتے ہو؟ سر کے بل کھڑے ہو سکتے ہو؟ دس تک گن سکتے ہو؟ وغیرہ اوسط درجے کے سب بچوں نے ۵۱ فیصدی باتوں کے متعلق اثبات میں جواب دیا، حالانکہ امتحان لینے پر وہ صرف تیس فیصدی باتوں میں پورے اترے۔

مشرقی بچوں کی دیانت

ڈاکٹر کیتھرین ایم مرڈک کو تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ مشرقی نسلوں کے ۹۹ فیصدی بچے اوسط درجے کے اینگلوسیکسن بچوں سے صداقت شعاری اور دیانت میں بڑھے ہوئے ہیں، اور مقابلۃً بہت کم مبالغے سے کام لیتے ہیں۔

لیکن ڈاکٹر لیرڈ نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہم میں سے اکثر شریف و غیر شریف یکساں جھوٹے ہیں۔ ہمارے بعض عزائم پورے نہیں ہوتے اور ہم اپنے آپ کو ناکام سمجھ کر ڈرتے ہیں کہ کہیں دوسرے بھی ہمیں ایسا ہی نہ سمجھنے لگیں۔ چنانچہ پردہ داری کے لئے ہم جھوٹ سے کام لیتے ہیں۔ بعض دفعہ کوئی ایسا آدمی جس نے سالہا سال سے جھوٹ نہ بولا ہو اجنبیوں میں آکر جہاں اسے احتساب کا اندیشہ نہ رہے دفعۃً جھوٹ بولنے لگتا ہے۔ اس قسم کے جھوٹ کی کئی مثالیں ہیں۔ مثلاً بعض گریجویٹ کالج سے نکل کر ڈینگ مارتے ہیں کہ ہم اپنی ٹیم کے بہت بڑے کھلاڑی تھے حالانکہ انہیں ٹیم میں شامل ہونے کا موقع بھی نہیں ملا ہوتا۔ بعض لوگ قماربازی میں ہار جیت کے متعلق دروغ بانیاں کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ گزرا ایک ڈاکو نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ لوگ اپنے اُس روپے کے متعلق جو میرے ہاتھ آتا رہا بہت مبالغے سے کام لیتے تھے۔ شاید انہیں یہ اعتراف کرتے ہوئے شرم آتی تھی کہ ہمارے گھر میں چند روپوں سے زیادہ کچھ نہ تھا۔

بعض شوہر اپنی بیویوں کو زیور اور موتی پیش کرتے وقت قیمت بہت بڑھا کر بتلاتے ہیں۔ آخر فروخت کرتے وقت جوہری کے ہاں اُن کا پول کھلتا ہے۔

انجیل کہتی ہے "سب لوگ جھوٹے ہیں" لیکن اس کا علاج یہ ہے کہ ہم جو کچھ ہیں وہی رہیں۔ اُس سے زیادہ ظاہر ہونے کی کوشش نہ کریں۔

گائیں گے ہم گائیں گے

دُور کسی اک گاؤں میں ہم ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں ہم
گانا اپنا گائیں گے
گائیں گے ہم گائیں گے
ننھے ننھے پھولوں میں ہلکے پھلکے جھولوں میں
کیا کیا لطف اُٹھائیں گے
جھولیں گے اور گائیں گے
پھر اک پیاری صُورت کو پھر اک موہنی مورت کو
من کا گیت سنائیں گے
ناچیں گے اور گائیں گے
دنیا آنی جانی ہے ہم نے بھی پر ٹھانی ہے
جو کھویا ہے پائیں گے
پائیں گے اور گائیں گے
اوروں کا ہم دیکھ کے رنگ آج یہ رنگ اُور کل یہ ڈھنگ
غصّے میں جب آئیں گے
ہنس دیں گے اور گائیں گے
جنت کو ہم کیا جانیں دوزخ کو ہم کیا مانیں
دکھ میں بھی ہم گائیں گے
جی کر یوں دکھلائیں گے

بشیر احمد

مشرقی خواتین کی بیداری

ٹرکی، مصر، شام، چین، جاپان اور ہندوستان کی خواتین میں حیرت انگیز طور پر بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں اور انہوں نے ترقی و آزادی کے لئے پیہم جدوجہد کر کے زمانہ موجودہ کے معیار کے لحاظ سے بھی حیرت انگیز ترقی کر لی ہے۔

ٹرکی کی عورتوں نے ایشیائی ممالک میں نسوانی حقوق و اصلاحات کے حصول میں بے حد مفید و اہم خدمات انجام دی ہیں۔ صدیوں سے ٹرکی کی عورتیں مکانوں کی چار دیواریوں میں مقید، ترقی کی راہوں سے بے خبر، زندگی کو لطف سے ناآشنا جذبات و احساسِ ذمہ داری سے ناواقف اور نام نہاد اسلامی پردہ میں روپوش تھیں۔ وہ بغیر نقاب کے نہ تو شاہراہوں پر نکل سکتی تھیں اور نہ علاوہ قریبی عزیزوں کے، کسی نامحرم مرد کے روبرو آسکتی تھیں۔ البتہ اس عالمگیر جنگ کے زمانے میں انہیں خیراتی کھیتوں اور شفاخانوں میں کام کرنے کی اجازت ہو گئی تھی اور یہی اُن کی آئندہ تمدنی و معاشری ترقی کا باعث ہوئی۔ ترکوں کی "نوجوان جماعت" اس امر کا تہیہ کر چکی تھی کہ ٹرکی میں مغربی اثر و تہذیب کی ترویج اور رسم و رواج اختیار کرنے کی ہر ممکن طریقے سے تلقین کی جائے۔ اسی سلسلے میں عورتوں کی ترقی و اصلاح کا خیال بھی شامل تھا۔ آخر وہ دن آیا کہ مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنے ایک حکم کے ذریعہ سے پردے اور کثرتِ ازدواج کے رواج کو متروک قرار دے دیا، اور یہ اعلان کیا کہ قانون کے رو سے عورتوں کو بھی مردوں کے مساوی حقوق و مراعات حاصل ہونے چاہئیں۔

ٹرکی کی خواتین کو نسوانی اصلاحات کے کامیاب بنانے میں مردوں سے بھی بہت مدد ملتی رہتی ہے! ایک مشہور ترک افسر نے اپنے ملک کی تباہی و زوال کے اسباب بیان کرتے ہوئے اس امر پر بھی زور دیا کہ اس کا بڑا سبب ترک خواتین کا ملک کی معاشرت و سیاست سے علیحدہ کیا جانا، اور ان فطری حقوقِ آزادی سے محروم رہنا بھی ہے، جو قدرت کی جانب سے عورتوں کو عطا کئے گئے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "ہماری عورتوں کو ملک کی معاشرتی زندگی میں شامل کرنا آئندہ نسلوں کی اصلاح و ترقی کے لئے پہلا مبارک قدم ہوگا۔ اس کے ساتھ یہ امر بھی ملحوظ رکھنا چاہئیے کہ تہذیب، جذبۂ معاشرت کی اس شکل کا نام ہے جس میں کیرکٹر کی خوبی اور پاکیزگی خیال و عمل نمایاں ہو۔

لطیفہ خانم، سلیمہ خاتون اور خالدہ خانم عورتوں کے حقوق کی جدوجہد میں سب سے پیش پیش رہیں۔ ۱۹۱۶ء سے عورتیں ٹرکی کی یونیورسٹیوں میں داخل ہونے لگیں۔ اس طرح انہوں نے ان مواقع اور اختیارات کا اتنی اچھی طرح استعمال کیا کہ آج

ترک خواتین سرکاری دفاتر میں، عدالتوں میں، ریلوے میں، اسٹیج پر، غرض مختلف شعبوں میں مشغول و سرگرم نظر آتی ہیں۔ وہ بال کٹوا کر، فراک زیبِ تن کئے، کلب میں جلوہ فرما ہوتی ہیں۔ ترک خواتین کا اپنے قدیم سیاہ برقع کے بجائے نفیس، شوخ رنگ اور نیم عریاں پیرہن میں ملبوس ہو کر قسطنطنیہ کی شاہراہوں پر تنہا بے نقاب پھرنا اب چنداں باعثِ حیرت نہیں رہا۔ اگر یورپ اور امریکا سے مقابلہ کیا جائے تو ٹرکی کی خواتین کے لئے ابھی اور بہت کچھ کرنا باقی ہے لیکن اس قلیل عرصے میں اس مشرقی ملک نے، باوجود قدامت پرستی اور سخت رواجی قیود کے جو کچھ ترقی کی ہے وہ بلاشبہ بیحد حیرت انگیز ہے

~~~

مصر کا مشرقی خواتین کی منازلِ ترقی میں دوسرا درجہ ہے۔ جہاں تک ترقی و روشن خیالی کا تعلق ہے، قاہرہ کی عورتیں بہت زیادہ آزاد اور زندہ دل ہیں۔ وہ اصابتِ رائے، وسعتِ نظر اور حبِ وطن کے جذبات سے بہرہ مند ہیں۔ مصر کی عورتوں کی رہنما ہدیٰ خانم ہیں جو ایک نہایت مقتدر اور اعلیٰ خاندان کی فرد، صد درجہ دلفریب شخصیت کی مالک، اعلیٰ خصوصیات کی حامل اور فنِ تجارت سے اچھی واقفیت رکھتی ہیں۔ وہ مصر کی پہلی خاتون ہیں جنہوں نے نہایت فراخ حوصلگی اور دلیری سے پردہ اُٹھا دیا، یہ ایک ایسے ملک میں جہاں نقاب اور ترکی ٹوپی دونوں قدیم اسلامی خصوصیات موجود ہوں، یقیناً بڑی جرأت کا کام ہے۔ علاوہ بریں وہ لوگوں کو اپنے مکان پر، جو ایک عظیم الشان قدیم قلعہ ہے، ملاقات کی دعوت دیتی ہیں اور یہ ایک ایسا طرزِ عمل ہے جس سے قدیم مشرقی روایات اور ان کی عظمت کو بڑی ٹھیس لگتی ہے۔ نسوانی تحریکِ آزادی کی سیکرٹری شاکر خاتون ہیں جو ایک زبردست کیرکٹر کی مالک اور بلند حوصلہ ہونے کے علاوہ مطالعہ کی شائق اور مصنفہ بھی ہیں۔ چند سال ہوتے شاکر نے اعلان کر دیا کہ میں امریکا کی یونیورسٹی میں، جو بیروت میں قائم ہوئی ہے جا رہی ہوں، اس وقت تک کسی مسلمان عورت نے بیروت کی یونیورسٹی میں داخل ہونے کی جرأت نہ کی تھی — وہ سالِ اول میں تنہا عورت تھیں لیکن وہ مردوں کے دوش بدوش تعلیم حاصل کرتی رہیں اور چار سال وہاں صرف کئے۔ انہوں نے مزید تعلیم کے لئے کولمبیا یونیورسٹی میں داخلہ کا تہیہ کر لیا لیکن وہاں کے تعلیمی شعبے نے داخلہ کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

مصر کی آزاد خیال عورتوں کے پیشِ نظر بہت سی ملکی اصلاحیں بھی ہیں۔ وہ مزید اسکولوں کے قیام کے لئے کوشاں ہیں اور جدوجہد کر رہی ہیں کہ میزانیۂ حکومت میں تعلیم کے لئے کچھ اضافہ کر دیا جائے جو اس وقت تک کل رقم کا صرف ڈیڑھ فیصدی ہے۔ وہ لڑکیوں کے لئے درسگاہوں اور جبری تعلیم کا مطالبہ کر رہی ہیں اور اس پر بھی زور دے رہی ہیں کہ مشہور و معروف دار العلوم جامعۂ ازہر میں جدید متمدن اصول پر اصلاحات ہونی چاہئیں، انہوں نے
~~~

اپنے لئے شفاخانے اور تعلیم گاہیں قائم کی ہیں اور مردوں کی طرح مکمل اور مساوی حقوق کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اسی تحریک کے زمانے میں انہوں نے ایک مسودۂ قانون پیش کرایا جس میں کثرتِ ازواج کو خلافِ قانون قرار دیا گیا تھا حالانکہ قرآن چار شادیوں کی اجازت دیتا ہے۔ یہ محسوس کر کے کہ قرآن کے خلاف کسی قانون کا نافذ ہو جانا ایک مشکل امر تھا، انہوں نے باہم تصفیہ کر لیا کہ جب تک یہ قانون منظور نہ ہو لڑکیوں کو خود ایسا خاوند ہرگز قبول نہ کرنا چاہیئے جس کی اور بھی بیویاں موجود ہوں۔ نسوانی حقوق کی علمبردار خواتین اُسی معاشرتی و اخلاقی معیار کے لئے عورتوں کی طرف سے دعوے دار ہیں جو مردوں کو حاصل ہے۔

شام میں بھی تحریکِ آزادیٔ نسواں نے عام مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کر لی ہے۔ شام عہدِ گزشتہ کے قدیم ترین دَور کا خطہ تصور کیا جاتا ہے اور وہاں اس تحریک کی حامی خواتین بیحد پُر جوش اور پُر خلوص ہیں۔ اُن کی قائد دمشق کی مس عابد ہیں جو بڑی شخصیت کی مالک، بے حد دلیر اور خیال و عمل میں بہت آزاد ہیں۔ مس عابد نے عرب کی اس خانہ جنگی میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جس میں شہزادہ فیصل کا، جو اب شاہ فیصل والیٔ عراق ہیں، نہایت اہم حصہ تھا۔ پولیس کی سختی اور قانونی سخت گیری غالباً شام میں انتہا کو پہنچ چکی ہے لیکن مس عابد اپنے طریقۂ عمل پر تمام قیود سے آزاد ہو کر نہایت بے باکی سے عمل پیرا ہیں اور عورتوں کے حقوق مردوں کے مساوی کرنے کے لئے نہایت سرگرمی سے کوشاں ہیں۔ شام میں تحریکِ آزادی کی حامی عورتوں نے ابھی تک پوری طرح اپنے کام کی ذمہ داری کا احساس نہیں کیا، تاہم موجودہ رفتارِ ترقی اُن کو اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ اگر یہی کوششیں جاری رہیں تو مستقبلِ قریب میں کامیابی یقینی ہے۔

تحریکِ خواتین کی بیحد سرگرم حامی و کارکن جولیا دمشق ہیں جو عربی بولنے والے ممالک میں مشہور شخصیت کی مالک ہیں۔ اُن کا رسالہ "خاتونِ جدید" عربی دنیا کا ہر دلعزیز اور کثیر الاشاعت پرچہ ہے جو مصر، شام، عراقِ عرب، ترکی، فارس، عرب، فلسطین اور دوسرے مشرقی ممالک میں بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ جولیا دمشق ایک ہفتہ وار پرچہ کی اڈیٹر بھی ہیں جس میں بیروت سے ہر ہفتہ اُن معاملات و مسائل پر بحث و مباحثہ کیا جاتا ہے جن سے بالخصوص مشرقی دنیا کا تعلق ہے۔ قوم پرستی، برطانوی و فرانسیسی معاملات، بین الاقوامی انجمن، عربی مشکلات، موصل کا مسئلہ، کردی، ترکستانی و فارسی معاملات، بغداد کے تیل کا مسئلہ، بالشویک خیالات، ہندوستان کا مستقبل، چین کی تباہی، جاپان کی ترقی اور اسی قسم کے دیگر مضامین پر مشہور اہلِ قلم عورتیں اور مرد نہایت آزاد خیالی سے بحث و تمحیص

کرتے ہیں ۔

مشرقِ بعید کی عورتوں کے حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی راہِ ترقی پر کامیابی و مستقل مزاجی سے گامزن ہیں۔ چین میں شہر کینٹن نسوانی تحریک کا مرکزی مقام ہے' جس کی رہنما' چین کی جمہوری سلطنت کے بانی اور مشہور ترین لیڈر ڈاکٹر سن یٹ سن کی بیوہ ہیں - وہ چین کی خواتین میں تعلیم عام کرنے کی سعی و کاوش میں مصروف ہیں تاکہ وہ اُن جدید سیاسی خیالات کی تقلید کرسکیں جن کی داغ بیل اُن کے آنجہانی شوہر نے ڈالی تھی۔ سن یٹ سن کے احکام کے مطابق' جن کی ایک نقل ہر اسکول میں موجود ہے اور روزانہ پڑھی جاتی ہے' کینٹن کی خواتین مردوں کے مساوی حقوق رکھتی ہیں' ان قابلِ قدر اصلاحی خدمات کے باعث سن کو شمالی چینیوں کے قلوب میں وہی عظمت و عزت حاصل ہے جو سوویٹ روسیوں کے دلوں میں لینن کو حاصل ہے ۔ لیکن چونکہ عام لوگ تقریباً ناخواندہ ہیں اس لئے نسوانی تعلیم و ترقی دشوار رہے - عورتیں اس سلسلہ میں نہایت قابلِ قدر خدمات انجام دے رہی ہیں' اور یقیناً انہوں نے محیر العقول ترقی کر لی ہوتی اگر چین کے عام امن و امان کو بدامنی اور خانہ جنگی کی خوفناک آگ بھڑک کر خاکستر نہ کر دیتی -

کینٹن میں عورتوں کے لئے صرف وہی قیود اور پابندیاں ہیں جو یکساں مردوں کے لئے بھی روا رکھی جاتی ہیں - بہت سی خواتین مردانہ لباس زیبِ تن کرتی ہیں - پیکنگ میں نہ صرف فوج اور پولس میں عورتیں کام کرتی ہیں ، بلکہ کاروبار کے تمام شعبوں میں موجود ہیں - چین میں عورتوں کے جذبۂ آزادی و ترقی نے ابھی سے جوش و خروش پیدا کر دیا ہے' اور جب عام عورتوں میں معمولی نوشت و خواند کی قابلیت پیدا ہوجائے گی اور زبان کے سہل حروف عام طور پر سمجھے جانے لگیں گے اس وقت نسوانی تحریک کی تبلیغ و ترویج آسانی سے ہو سکے گی' جس کے نام سے ابھی اس ملک کی بیشتر عورتوں کے کان تک آشنا نہیں - وسائلِ آمد و رفت کے فقدان کے باعث جمہوری و اجتماعی ہمدردی حاصل کرنا ناممکن ہے - فی الحال وہاں کوئی بھی مشترکہ زبان ایسی نہیں جو عام لوگ بولتے ہوں ، اگرچہ تحریری زبان ایک ہے -

---

جاپان میں تحریکِ آزادی کے لئے وہ راہیں مسدود نہیں جن کے باعث چین کی تحریک کامیاب نہیں ہو سکی - جاپان کی خواتین نہایت جوش اور ولولے سے کام کر رہی ہیں لیکن قدامت پسندی کے ساتھ - ان کی جدید

سوسائٹی کے نصب العین میں، جو ۱۹۲۰ء میں عالمِ وجود میں آئی ہے، عورتوں مردوں کے مساویانہ حقوق بھی شامل ہیں، اس سے قبل ایک قانون نافذ تھا جس کے رُو سے عورتوں کے لئے سیاسی مجالس کا قیام اور ان کی شرکت ممنوع قرار دی گئی تھی لیکن عورتوں نے جلسوں میں جانے اور تقریریں سننے کے حقوق حاصل کرنے کے لئے اس قدر پیہم کوششیں کیں کہ آخر ۱۹۲۱ء میں اس قانون کو تبدیل کر دیا گیا۔

ہم مشرقی ممالک کی رفتارِ ترقی کو مایوسانہ نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں لیکن ان گزشتہ پچیس سالوں میں مشرقی ممالک نے جو محیر العقول ترقی کی ہے اتنی یورپ نے شاید پانچ صدیوں میں کی ہوگی۔ بیوی کے لئے جاپانی لفظ **اسکوسا ما** کے معنی "پردہ نشین خاتون" کے ہیں اور حقیقتہً وہ ۱۹۱۰ء تک ایسی ہی تھی جس کے بعد ایک مکمل تغیر و انقلاب رونما ہو چکا ہے، اب وہ اچھی طرح دنیا کے معاملات سے باخبر اور ہر پیشہ و فن اور میدانِ عمل میں مردوں کے دوش بدوش کام کرتی نظر آتی ہے وہاں طبی پیشہ بہت ہر دلعزیز ہے جو در اصل جاپانی عورتوں کو اُن کے محنت و ایثار کے باعث ہر طرح زیب دیتا ہے۔ جاپان میں بارہ سو عورتیں طبیب، پینتیس ہزار نرس پانسو دندان ساز اور ایک بڑی تعداد دوا فروشوں کی ہے مشکل سے کوئی حرفہ و صنعت یا پیشہ جاپانی عورتوں کے لئے بند ہوگا۔ یہاں تک کہ جاپانی عورتیں کرایہ کی موٹر چلاتی ہیں اور ایک عورت جہاز بھی چلاتی ہے جس کی وہ خود ہی مالک اور کپتان ہے وہاں کی مشہور عورتوں میں نہایت اہم شخصیت کی مالک مسز سزوکی ہیں جو چاول کی کروڑپتی تاجر اور بنک کی مالک ہیں اور جن کے کارخانوں کی تباہی سخت اقتصادی تباہی کا سبب ہوئی تھی۔ یہ زبردست تباہی مسز سزوکی بدانتظامی کے باعث واقع نہ ہوئی تھی بلکہ چین کی بدامنی اور خانہ جنگی کی وجہ سے دفعتہً پیدا ہوگئی تھی۔ کیونکہ وہ ان کا بہت بڑا گاہک تھا۔

ٹوکیو میں عورتوں کے لئے بیس سے زیادہ ماہوار رسائل جاری ہیں جن کو جاپانی خواتین بیحد دلچسپی سے پڑھتی ہیں چونکہ وہاں کی اٹھانوے فیصدی آبادی خواندہ ہے اس لئے متمدن و جدید خیالات کو بڑی آسانی سے قابلِ قبول بنایا جا سکتا ہے، اپنے معیار کے لحاظ سے یہ رسائل نہایت قابلِ قدر ہیں اور اُن کے مضامین سے ظاہر ہے کہ جاپانی خواتین کتنی سنجیدگی سے دنیا کے مسائل اور انسانی معاملات پر بحث کر سکتی ہیں سیاست مذہب، جنگ، معاشرتی مسائل، جدید خیالات، اقتصادیات، صحت و تندرستی، عشق و محبت، شادی، نسوانی حقوق اور دیگر مضامین پر جدید خیالات کی روشنی میں نہایت آزادی سے تبصرہ کیا جاتا ہے۔

بین الاقوامی خیالات کا وہ احساس و جذبہ جو تمام عالم کی خواتین کے قلوب میں پیدا ہوتا ہے بلاشبہ تمام نسوانی تحریکوں سے زیادہ مفید اور موثر ہے ہر بڑے اور چھوٹے متمدن ملک کی عورتوں میں ملکی و قومی بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ زمانۂ موجودہ میں خواتین پہلے سے زیادہ تعلیم حاصل کرتی ہیں پہلے سے زیادہ غور و خوض کرتی ہیں اور عالمگیر تحریکوں سے اتنی واقف ہیں کہ اس سے قبل کبھی نہ ہوئی تھیں ہر سال اقصائے عالم کی عورتیں ایک بڑی تعداد میں مختلف کانفرنسیں منعقد کرتی ہیں اور مشرقی خواتین بین الاقوامی انجمنوں میں شرکت کر کے بڑی سرگرمی اور بیدار مغزی کا ثبوت دیتی ہیں اب ان کو اس امر کا احساس ہوگیا ہے کہ دنیا کی دوسری عورتیں بھی انہیں کی طرح ذی روح، جذبات و احساسات کی مالک اور حقوق و مراعات کی خواہشمند ہیں اور ان انجمنوں کے انعقاد کے بعد وہ تمام دنیا کی خواتین کو ایک صنف، ایک خاندان کے افراد اور ایک رشتہ و تعلق میں منسلک سمجھتی اور ان کے معاملات و مسائل کو اپنے معاملات و مسائل تصور کرتی ہیں۔ آخر کار مشرق و مغرب کے بُعد کے باوجود مشرق و مغرب آپس میں متحد اور ہمخیال بن رہے ہیں!

مقبول الرحمن بچھرانی

دو غزلیں

(۱)

دشمن تو بہت درپئے آزار تھے اب تک
ہم ہی تری رحمت کے سزاوار تھے اب تک

سب جرم و خطا اپنی ہوا اِس نے اُڑائی
ہم اِس دلِ بے دیں کے ہوادار تھے اب تک

کیا ہم کو سکھاتے ہو دل و دیں کی حفاظت
اے بے خبر! ہم بھی خبردار تھے اب تک

رونا کبھی زخموں کا، کبھی فکر رفو کی
سو کام میں ہم لگ گئے بیکار تھے اب تک

اک جام بھی ہونٹوں سے لگایا نہیں جاتا
حالانکہ ہمیں مستِ قدح خوار تھے اب تک

چرچے ہیں اِسی لب پہ اب اُس رازِ خفی کے
ہم بے خبرِ لذتِ اظہار تھے اب تک

(حامد علی خاں)

(۲)

ملتا نہیں ڈھونڈے سے عجب کیا ہے یہیں ہو
تھا نورِ نظر آنکھ میں پنہاں نہ کہیں ہو

ہم خوش ہیں تو کیا اِس میں اجارہ ہے کسی کا
یہ پیرِ فلک کس لئے یوں چیں بہ جبیں ہو

گر کر ترے قدموں میں جو میں جی سے گزر جاؤں
تا را مری قسمت کا سرِ عرشِ بریں ہو

کرتے ہیں جُدا مجھ سے تجھے، کاش سمجھتے!
کیا ظلم ہے گر جسم کہیں، رُوح کہیں ہو

اک نسخۂ اکسیرِ محبّت میں ملا ہے،
مٹّی ترے قدموں کی ہو اور میری جبیں ہو

جنّت نظر آئے گی ہر اک منزلِ دشوار
ہمراہ ہو تو اور سفرِ روئے زمیں ہو

حامد علی خاں



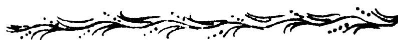
رنگ میں بھنگ

(کارخانے کے ایک کاریگر کی زبانی)

ذیل کی عبارت پڑھتے وقت زیر و زبر اور الفاظ کی عجیب و غریب تبدیلیوں کو ضرور ملحوظ خاطر رکھیئے،

رات کا وخت تھا میں گھر میں اکیلا بیٹھا وا تھا کہ اِتّے میں برّبر وارے مکان میں سے عورتوں کے گانے کی اَواز آنی شروع ہوئی۔ پہلم پار تو میں نے وِس کا کچھ زادہ خیال نہیں کیا مگر جد کو ہی تین گھنٹے گذر گئے اور گانے کی اواز نہ تھمی تو میں نے دل میں سوچا کہ آج تو بڑی حریانی اٹھانی پڑے گی یوں کہ ایسی حالت میں نیند کس طریوں آئیگی اور اوپر سے مصیبت یہ کہ وِن عورتوں کے گانے میں کچھ لُفظ بھی نہیں تھا بس یہ سمجھو کہ گانا کیا تھا رونا تھا میرے تو کان پھٹے جا رئے تھے۔ خیر میں ہانکھیں بند کیئے پڑا رہا اور میری آنکھ لگنے کو ہی تھی کہ اس اثنا کے بیچ میں کسی نے میرے دروزّہ کے کواڑ پیٹنے شروع کئے۔ میں نے ژلدی سے اُٹھ کر کنڈی کھولی کیا دیکھتا ہوں کہ ایک لمڈا دِسپنا ہاتھ میں لئے کھڑا ہے مجھے دیکھ کے بولا کہ خلیفہ ہمارے ابّا سُلفے کا دم لگائیں گے وِنھوں نے ذرا سا کڑوا تمّاخو اور آگ منگائی ہے میں نے وِس سے کیا کہ اپنے ابّا سے کہیو کہ خلیفہ کی جوزہ تو اپنی امّاں کے گھر گئی وی ہیں اس لئے گھر میں آگ ہی نہیں جلتی اور تمّاخو کے بارے میں یہ کہنا کہ خلیفہ جی نے جد سے یہ سنا ہے کہ حُقّہ پینا شرعین ناجائز ہے وِنھوں نے اپنا حُقّہ توڑ دیا ہے اور تمّاخو وہ رکھتے ہی نہیں۔ وہ لمڈا میری بات سُن کر لگا چلنے میں نے وِسے روک کر دریافت کیا کہ بے یہ تو بتلا کہ یہ رونا پٹینا کِس کے گھر میں ہو رِیا ہے وہ بولا واہ خلیفہ یہ تو عورتیں گا رئی ہیں مَولی صاب کی لڑکی کی کل شادی ہے خیر وہ تو چل دِیا اور میں پھر چرپائی پہ آن لیٹا اور بڑی مُشکل سے نیند آئی صبو نیفری کی آواز نے میرے کان کے پردے پھاڑ دیئے اور میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہاتھ منہ دھو کر خند آرے دھیانگی لینے باہر نکلا۔ رستہ میں برلبِ سڑک کے کنارے بابو عیوض بیگ مل گئے۔ وہ بولے خلیفہ آج تو تمہاری پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہوگا میں نے کِیا کیوں۔ وہ بولے آج تو تمہارے پڑوس میں شادی ہے سُنا ہے مولی صاب کی لڑکی کی بِداع ہے۔ میں نے کیا ہماری تو وِنھوں نے دعوتِ کی نہیں خیر کیا ہے ہم بھی اپنے لمڈے کے خَتنوں میں وِن کو نہیں بلائیں گے۔ بابو جی ہنس کے بولے ہمیں تو اس رشتہ کا انجام کار اچھا نظر نہیں آتا۔ یوں کہ سنا ہے کہ مولی صاب

نے اپنی لڑکی کی مرضی کے برخلاف یہ رشتہ کیا ہے لڑکی تعلیم یافتہ اور سمجھدار ہے دِس نے جو سُنا کہ دِس کی شادی ایک جاہل اور بڈھے آدمی سے ہورئی ہے تو دِس نے صفا اپنی ماں سے کہ دیا کہ میں اس جنگہ شادی کرنے کے لئے رضاوند نہیں ہوں۔ مگر سُنا ہے مولی صاب نے دِس غریب کو بہت بُرا بھلا کہا میں نے کیا بابوجی مگر وہ لڑکی بھی بڑی بے حائی تھی کہ منہ سے بول اٹھی یہ تو کوہی اشرافت کی بات نئیں۔ وہ بولے خلیفہ تم کیا جانو تم کو مذہب کا حُکم کیا معلوم۔ تم کو تو جیسے مُلّانوں نے بتا دیا تم نے دِس کو ٹھیک سمجھ لیا۔ شادتم کو معلوم نئیں لڑکی کی رضاوندی کے بغیر از نکاح جائز ہی نہیں ہو سکتا۔ اور یہ تو موٹی سی بات ہے کہ دولھا سے نبھاؤ مولی صاب کو کرنا ہوگا یا دِن کی لڑکی کو میں نے کیا مگر آخر مولی صاب اس شخش سے کیوں رشتہ کر رہے ہیں۔ وہ بولے کہ بات دراصل میں یہ ہے کہ وہ بڑا رئیس ہے۔ بس دِس کی دَولت پر مِٹے وے ہیں خیر بابوجی کے پاس سے میں کر خندار کے گھر پہنچا باز واں سیدھا اپنے گھر آیا۔ مولی صاب کا مکان سُرق و سبز جھنڈیوں سے سجا وا تھا اور خُوب گانا بجانا ہو رہا تھا۔ مہمان پہ مہمان چلے آرئے تھے میں نے دِل میں کیا کہ یہ مولی صاب بھی عجب بے وحدت ہیں کہ مسجد میں جد ہمارے آگُو وعظ دیتے تھے تو کتے تھے کہ فضول خرچیاں کرنی گناہ ہیں اور اپنے آپ جو بے ناحق روپیہ لٹائے ہیں تو دِس کا پُرسان حال کوہی نہیں۔ یہ سوچتا وا میں کمرے کے اندر گیا اور رواں سے کار چوب نکال کام شروع کر دیا۔ کوہی دو گھنٹے ہوئے ہوں گے کہ چان چک کیا سنتا ہوں کہ مولی صاب کے گھر سے رونے پیٹنے کی آواز چلی آرئی ہے۔ گانا بجانا سب بند ہو گیا اور عورتیں ہائے ہائے کر رئی ہیں۔ میں کُرتہ گلے میں ڈال باہر نکلا بابو عیوض بیگ پان چار آدمیوں سے کھڑے وے باتیں کر رئے تھے میں نے دِن سے دریافت کیا کہ دئی بابوجی یہ رنگ میں بھنگ کیسے؟ وہ بولے میں نئیں کہتا تھا دیکھ لو وہی ہوا۔ مولی صاب کی لڑکی نے زہر کھا لیا۔ اور اب دِس کی حالت بڑی خراب ہو گئی ہے۔ ڈانگڈر صاب آئے تھے دِنہوں نے لڑکی کی نوض دیکھ کر دانتوں میں انگلی دے لی۔ میرا خیال ہے بچاری گھڑی دو گھڑی کی مہمان ہے۔ میں نے کیا لعنت ہے ایسے رشتہ پر کہ دِس ناشاد نامراد لڑکی کی جان پر بن گئی۔ بابوجی بولے خلیفہ تم کو کیا پتا۔ خدا جانے ہماری جاہلیت کی بدولت اسی طریوں کتی لڑکیاں تو جان پہ کھیل گئی ہوں گی اور کتی زندہ درگور اپنی مصیبت کے دن کاٹ رئی ہوں گی اور اگر ابھی کچھ دنوں اور یہی حالیت رئی تو بس پھر ہمارا خدا ہی حافظ ہے ؞



ایم اے مغنی دہلوی بی اے

شاعر کی زندگی اور موت

تو مجھے موت کی وادی سے گذر جانے دے،
تو مری رُوحِ غم آلود کو مرجانے دے،
کہ ترے جسم میں اس رُوح کو پھر جینا ہے،
بادۂ خمخانۂ اُلفت سے مجھے پینا ہے۔

اک ترا جسم ہے دنیا میں بقا ہے جس کو،
نہ غمِ مرگ نہ اندوہِ فنا ہے جس کو۔

اب مرے سر پہ جو آتی ہو وہ سہنے دے مجھے،
موت کے سیلِ بلاخیز میں بہنے دے مجھے۔

رات دن دیکھتا ہوں سینکڑوں انسانوں کو،
موت کے سرد بیابانوں میں مرجھاتے ہوئے،
اور انسانوں کی مانند ہوں انساں میں بھی!

فرق یہ ہے مجھے حاصل ہے محبت تیری،
اور اسی میں ہے نہاں رازِ بقا میرے لئے؛
میں غمِ مرگ میں دن رات پریشان نہیں،
بند ہے، جانتا ہوں، راہِ فنا میرے لئے؛

شاید انسانوں کی مانند میں انسان نہیں!
جب کبھی آتی ہے تاریکی و تنہائی میں،
موت کے پاؤں کی خاموش سی آواز مجھے،
بند کر لیتا ہوں میں اپنی نگاہیں لیکن
نظر آتا ہے نزار روئے فسوں ساز مجھے،
اور ہر شے ابدی بن کے نظر آتی ہے،
موت دُزدانہ مرے پاس سے ہٹ جاتی ہے!
میرے اطراف میں چھا جاتے ہیں انوارِ حسیں،
تاب لا سکتی نہیں جن کی، نگاہیں میری؛
پڑنے لگتے ہیں مرے کانوں میں نغمے شیریں
جن کے طوفان میں بہ جاتی ہیں آہیں میری؛
پھر بھی ہو جاتی ہے بیتاب مری رُوحِ حزیں،
کہ بہت دُور ہیں اس راہ سے راہیں میری!
تو مجھے موت کے ویرانوں میں کھو جانے دے،
تو مری رُوحِ غم آلود کو سو جانے دے!
کہ نئے جسم میں اس رُوح کو پھر جینا ہے،
بادہ خمخانۂ الفت سے تجھے پینا ہے!

ن۔م۔ راشد

اثر صہبائی کی نظموں پر ایک اجمالی نظر

سیالکوٹ زمانۂ قدیم ہی سے علما و فضلا کا منبع و مرجع رہا ہے۔ علی الخصوص عہدِ مغلیہ میں اس کو ممتاز درجہ حاصل تھا۔ علامہ عبدالحکیم کے ٹھیک دو سو برس بعد ڈاکٹر اقبال نے اس کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کیا۔ گویا ڈاکٹر اقبال کی شخصیت سے سیالکوٹ کی ادبی نشاۃ الثانیہ شروع ہوتی ہے۔ خواجہ عبدالسمیع پال آثر صہبائی ایم۔ اے (فلسفہ) ایل ایل بی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں۔ آپ کو مغربی علومِ متداولہ میں منتہی ہونے کے ساتھ ہی مشرقی علوم میں بھی کافی دستگاہ حاصل ہے۔ علی الخصوص شاعری کے ساتھ آپ کو اُس وقت سے گہری دلچسپی ہے جبکہ آپ اسکول کی چار دیواری میں "رفت و بود" کا سبق یاد کیا کرتے تھے اور غمِ دل کی تفسیریں اس وقت سے لکھی جا رہی ہیں جبکہ آپ نے کالج کی زندگی کا جامہ پہنا ہے۔ غالباً ۱۹۲۲ء کا زمانہ ہوگا جب پہلے پہل میں نے آپ کو لاہور میں دیکھا تھا۔ اس سے قبل سیالکوٹ میں آپ سے کبھی نیاز حاصل کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ میں نے اکثر سید عابد علی عابد کو اور آپ کو ایک ساتھ دیکھا۔ میں ان دنوں انجمنِ اربابِ علم پنجاب کا جائنٹ سیکرٹری تھا اور سب سے پہلی نظم میں نے آپ کی اسی انجمن کے جلسہ میں سُنی۔ اُس جلسہ میں سر عبدالقادر صدر انجمن مولانا تاجور جنرل سکریٹری مولانا عبدالمجید سالک۔ مولانا تہما۔ راجہ نرندر ناتھ۔ ڈاکٹر گوکل چند نارنگ وغیرہ جیسے سخن فہم اصحاب تشریف رکھتے تھے اور میں نہایت غور سے دیکھ رہا تھا کہ آپ کے اس آخری بند کا کیا اثر ہوا :-

انجام کی کیا کہیئے آغاز نہیں معلوم | ہستی کے معمے کا کچھ راز نہیں معلوم
کب ٹوٹ کے رہ جائے یہ ساز نہیں معلوم | پی اور پلا ساقی پی اور پلا ساقی

اسی طرح اسی انجمن کے ایک جلسہ میں آپ کی نظم صبح و شام کے اس مصرعہ کا اس قدر اثر ہوا کہ ہر طرف سے تحسین و آفریں کی صدا آتی تھی۔ ع

قدرت کی صراحی مئے وحدت سے بھری ہے

اس کے بعد مجھے ایک دم یو۔ پی جانا پڑا۔ لاہور کے دورانِ قیام میں اثر صاحب سے کبھی میرے دوستانہ مراسم نہیں ہوئے۔ پانچ سال کی مسلسل علیحدگی کے بعد ۱۹۲۹ء میں سیالکوٹ آیا اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً آتا رہا اور آپ سے ملاقات کا موقعہ ملتا رہا۔



اب اثر وہ اثر نہیں تھے جنھیں میں نے لاہور میں دیکھا تھا۔ اب میں نے سمجھا کہ آپ حقیقی معنوں میں شاعر ہیں۔ آپ کی گفتگو سے میں نے اندازہ کیا کہ وارفتگی آپ کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

اِس مرتبہ مجھے مسلسل چار ماہ تک سیالکوٹ میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ اکثر آپ سے صحبتیں رہیں اور میں نے وہ کچھ حاصل کیا جس سے میں پہلے ناواقف تھا۔ اور سب سے بڑی بات جو مجھے حاصل ہوئی وہ ایک شاعر کی فطرت کا مطالعہ تھا۔

اس قحط الرجال کے زمانے میں جبکہ بے ادبی ناقدردانی مضاعف ہے اثرصہبائی کا وجود مغتنمات میں سے ہے۔ اگر ابنائے روزگار کی توجہات مساعدت کریں تو ممکن تھا کہ ان کا مجموعۂ کلام "خمستان" (زیرِ اشاعت) کبھی کا چھپ گیا ہوتا۔ یہ مجموعہ اثرصاحب کے گزشتہ گیارہ بارہ سال کے کلام پر مشتمل ہے اور مروجہ اصنافِ سخن پر حاوی ہے۔ اکثر غزلیات اور نظمیں اور رباعیات ہندوستان کے برگزیدہ جرائد میں شایع ہو کر مقبولِ عام ہو چکی ہیں۔ حصۂ رباعیات جامِ صہبائی کے نام سے علیحدہ چھپ چکا ہے جس کو اس مجموعہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بیشتر جدید نظمیں اور غزلیات جو ابھی تک شایع نہیں ہوئیں بالخصوص "راحت کدہ" جو آپ کی زندگی کے انتہائی تغیر کا نتیجہ ہے ایک معرکۃ الآرا چیز ہے۔ حصۂ "سمن زار" جو مختلف العنوان نظموں کا مجموعہ ہے۔ اور جس کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے صنفِ نظم نویسی میں مخصوص حیثیت رکھتا ہے۔

تاریخ نظمِ اردو میں سب سے پہلے قدما میں میر تقی میر نے اس صنفِ شاعری کو دیگر اصناف کے ساتھ عام رواج دیا۔ "میر کے گھر کا احوال" وغیرہ نظمیں اس زمانے کی بہترین یادگاریں ہیں۔ چونکہ بخلاف دوسرے شاعروں کے میر کے دل میں سوز و گداز فطرۃً ودیعت تھا۔ اس لئے اُس کی جولانیِ طبع نے غزل کی محدود فضا سے نکل کر نظم کو اختیار کیا۔ پڑھنے والے اب بھی اُس کے کلام سے متاثر ہوتے ہیں۔ میر مرحوم کے بعد سودا، مصحفی اور انشاء اللہ خاں نے اگرچہ نظمیں کہیں لیکن وہ ہجو یا باہمی شکوہ و شکایت کے دائرہ ہی میں محدود ہو کر رہ گئیں۔ میر حسن مرحوم اور دیا شنکر نسیم نے اپنی مثنویات لکھ کر اردو علم ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔ اور آئندہ نسلوں کے لئے ایک نئی شاہراہ کھول دی۔ انیس و دبیر کو اس کے بعد مذہبی مقتضیات نے پیدا کیا۔ اور انھوں نے سلام و مراثی لکھ کر رزمیہ اور بزمیہ نظموں کی بنا ڈالی۔ اس سے کسی خاص طبقہ کو جو کچھ فائدہ ہوا سو ہوا لیکن اردو پر ان دونوں اصحاب نے ایسا احسان کیا ہے جو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جذبات نگاری کے جدید اسالیب۔ انتہائی سوز و گداز کی کیفیتیں، رقت انگیزی کے جو شیلے انداز شاعری کے جزوِ لاینجزیٰ ہو کر رہ گئے ہیں۔ میرزا غالب نسل میں ترک تھے۔ شاعری کا جذبہ ازل سے لے کر آئے تھے۔ اُن کی طبیعت پر زیادہ اثر عجمی ادبیات کا تھا اور وہ بذات خود بھی بے عدیل جدت آفریں تھے۔ انھوں نے اردو زبان کے طاقوں کو عجمی گلدستوں سے آراستہ کیا اور بزمِ خیال کو بوقلموں فانوسوں سے منور کیا۔ اردو زبان میں دور از قیاس عسیر الفہم پیچیدہ فلسفیانہ "صوفیانہ" اور عاشقانہ مضامین کو غیر مانوس فارسی تراکیب میں

ادا کرنا غالب کے حصے میں آیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غالب کے کلام میں بحیثیتِ مجموعی سلاست و روانی مفقود ہوتی چلی گئی۔ غالب نے نظمیں قصائد اور قطعات لکھے جو بلاشبہ مستند ادبی کارنامے ہیں لیکن جذباتی اعتبار سے نظمیں مدح سرائی اور مضمون آفرینی تک محدود رہیں[1]۔

حالی اور آزاد نے غالب کے بعد مجددانہ قلم اٹھایا۔ ایک کو غالب کا شاگرد ہونے کا فخر حاصل تھا۔ اور دوسرے کو ذوق کا تلمیذ ہونے کا شرف۔ اپنے استادوں کی طرح ہر دو نے دنیائے شاعری میں اپنی شخصیتوں کو نمایاں کیا۔ اور "ارشد تلامذہ" ہونے کا بین ثبوت دیا قومی اور نیچرل شاعری جس سے شاعری عاری تھی ہر دو کے ہاتھوں سے اُن کی تخم ریزی ہوئی۔ یہاں سے ہماری اردو شاعری موضوعہ حدود کی پابندیوں سے بالاتر ہوکر کسی خاص مقصد سے گامزن ہوتی ہے۔ اس سے قبل ہماری شاعری کا مطمحِ نظر آناو قیع نہ تھا کیونکہ ہر زمانے میں جس جہد و جہد کا مقصد بنی نوع انسان کو عام سطحی حالت سے اٹھا کر کسی بلندی کی طرف لے جانا ہو وہ ہمیشہ زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے اور قدر دانی کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ حالی اور آزاد دونوں میں اپنے استادوں کی کوئی جھلک نہیں پائی جاتی۔ حالی میں سرسید کے فیضانِ صحبت نے اثر کیا اور ویسے وہ خود ہی محتاط اور صحیح الاحساس مسلمان تھے۔ آزاد نے ایران کی سرزمین میں سیاحت کر کے فائدہ اٹھایا اور ذہن کے موقلم سے صفحۂ قرطاس پر مناظرِ قدرت کی تصویر کھینچی۔ وہ ایک بڑی حد تک مقبول ہوئے جس طرف انہوں نے اپنا اشہبِ قلم دوڑایا پاکیزہ خیالات نے قدم چومے اور زبان کی روانی اور سلاست کنیزِ بے دام ہوکر اُن کے ہمرکاب رہی لیکن آزاد کبھی بھی کسی پھول کے پاس بیٹھ کر شریکِ دلسوزی نہیں ہوئے اگرچہ انہوں نے پھول کے اوپر شبنم کے قطرہ کی من وعن تصویر کھینچ دی لیکن اس سے وہ کبھی متاثر نہیں ہوئے کہ شبنم پھول سے یا پھول شبنم سے کیا کہہ رہا ہے اور ایک دوسرے سے کیوں پیوست ہیں۔ یہ وصال اُن کے لئے فنا کی تعلیم ہے یا بقا کی بہرکیف اس میں کچھ شک نہیں کہ حالی اور آزاد نے شاعری کے لئے ایک جدید سنگِ اساس رکھ دیا جس پر اقبال جوش ملیح آبادی اور اثر صہبائی وغیرہ نے محل تیار کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے اس کہنہ خاکستر سے ایک نیا آدم بنایا اور اس کی تگ و دو کے لئے ایک نیا جہان تعمیر کیا۔ اردو زبان کی خوش قسمتی سے مغربی تعلیم یافتہ فلسفی شاعر نے ابتدا میں اسی زبان کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا۔ اور خیالات کے ترفع کے ساتھ اُس غرابت کو رفع کیا جو غالب کے کلام میں جا بجا پائی جاتی ہے۔ بانگِ درا جو حضرتِ اقبال کے دلآویز کلام کا مجموعہ ہے بیشتر صنفِ نظم پر حاوی ہے شخصی، معاشری، تمدنی، تشریحی، جذباتی، اور فلسفیانہ عنوانات پر سوز و گداز سے بھری ہوئی نظمیں اس مجموعہ کا طرۂ امتیاز ہیں اثر اور تاثیر کا یہ عالم ہے کہ جو سمجھتا ہے وہ بھی متاثر ہوتا ہے اور جو نہیں سمجھتا وہ بھی۔ حضرتِ اثر کے شاعرانہ محرکات میں زیادہ حصہ اقبال کی شاعری کا ہے۔ اگرچہ بعد میں حافظ اور عمر خیام کے اثر نے بھی آپ کی طبیعت کو رندی

---

[1] غالب کے متعلق فاضل مضمون نگار سے مجھے بہت کچھ اختلاف ہے جس کی تفصیل یہاں ضروری نہیں۔ (حامد)

اور مستی کے رنگ میں غرق کر دیا +

حضرتِ اثر کی نظموں کو دیکھ کر مجھے سب سے زیادہ خوشی اس لئے ہوئی کہ زمانۂ حال کے بعض دیگر شعرا کی طرح آپ نے ڈاکٹر اقبال کی کورانہ تقلید نہیں کی بلکہ اس میں سے اُس چیز کو حاصل کیا ہے جو آپ کے طرزِ سخن کے لئے مفید ہو سکتی ہے اور خواہ مخواہ فلسفہ کو جزوِ شاعری نہیں بنایا۔ میرے خیال میں شاعری اور فلسفہ دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ یہ شاعر کا کمال فن ہے کہ وہ ان دونوں کی آمیزش سے خوش آئند نتائج پیدا کرے اور اسلوب بیان میں کسی قسم کی غرابت تنافر اور دیگر فنی عیوب نہ پیدا ہونے دے۔ ورنہ فلسفہ شاعری کا جزو لاینفک نہیں ہے شاعر کا کمال اسی میں ہے کہ اس کے شعوری مدرکات جس اثر کو قبول کریں، اسے بہترین انداز میں نظم کر دے ٭

ارسطو کے نزدیک شاعری کی جانب ہمارا رجحان محض اس لئے ہے کہ ہم فطرۃً اُس چیز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ہمارے جذبۂ لطف اندوزی کو تحریک دے اور کسی مخصوص طبقہ سے متعلق نہ ہو، بلکہ ہر شخص اس سے متاثر ہو سکے۔ شلر جرمنی کا مشہور فلاسفر کہتا ہے "تمام علوم و فنون کی قدر دانی کا معیار یہ ہے کہ وہ دوسروں کو کس قدر لطف اندوز کرتے ہیں اور اس سے زیادہ اہم کوئی مسئلہ نہیں ہے کہ انسان کس طرح خوش کیا جائے۔ اس لئے صحیح علم یا فن وہی ہے جو انسانی جذبات کے اندر لطیف ہیجان برپا کر دے"۔ اثر صاحب نے عموماً اپنے اشعار میں اسی مفہوم کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور ایسے ایسے عنوانات پر اشعار کہے ہیں جو بذاتِ خود انسان کے لئے جاذبِ توجہ ہو سکتے ہیں۔ غیر متبدل ہیں اور ابتدائے آفرینش سے اب تک انسان ان سے متاثر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ مثال کے طور پر "خمستانِ بہار"، "آرزو"، "صبح و شام"، "پلائے جا"، "تاروں بھری رات"، "چاند اور سمندر"، "پھول اور ستارہ"، "حُسن"، "برسات" وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ عنوانات ہیں جن پر قدما اور متوسطین اپنے اپنے زمانہ میں جداگانہ انداز و اسلوب میں خامہ فرسائی کرتے رہے ہیں، چنانچہ آرنلڈ لکھتا ہے "شاعر کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ کسی پیش پا افتادہ موضوع پر خیالاتِ عالیہ پیدا کر سکے۔ اس لئے شاعر کو سب سے اول عمدہ موضوع تجویز کرنا چاہیئے۔ یعنی وہ موضوع جو انسانی رجحانات کو خود بخود اپنی طرف کھینچ لے۔ انسان کے بیشتر ایسے احساسات ہیں جو زمانے کے ساتھ ساتھ نہیں بدلتے۔ موضوع کی قدامت یا جدت پر بہترین شاعری کا انحصار نہیں ہے بلکہ اُن موضوعات پر ہے جو قدامت اور جدت کی قید سے آزاد ہیں اور انسانی احساس اُن کو ہر زمانہ میں محسوس کر چکا ہو۔ اور کر سکتا ہو۔ اگر شاعر اس قسم کے موضوع پر شعر کہے تو اشعار کا دلچسپ ہونا ناگزیر ہے۔ کیونکہ اُن کو ہمارے اندرونی احساسات

سے فطری نسبت ہوگی۔ اثر صاحب کے جملہ موضوعات آرنلڈ کی اس انتخابِ موضوع کی تشریح سے عین مطابقت رکھتے ہیں۔

آج کل ہمارے آزاد و روشعرا میں یہ مرض بہت ترقی پذیر ہے کہ وہ اپنے اشعار کو غزل نظم وغیرہ موضوعہ اصطلاحات سے موسوم کرنا خلافِ شان سمجھتے ہیں اور ایسے ایسے عنوانات قائم کرتے ہیں جن کو ان کے اشعار سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اکثر شعرا تو اپنے اشعار ہی میں سے کوئی ترکیب لے کر بطورِ عنوان لکھ دیتے ہیں۔ ورنہ حسّیات' 'تاثرات' زمزمۂ تغزل وغیرہ وغیرہ ایسے مستقل عنوانات ہیں جنہیں نو آموز شاعر بلکہ بعض کہنہ مشق شعرا بھی بڑے شوق سے لکھ دیتے ہیں۔ اشعار کو دیکھا جائے تو وہ ایسی متضاد کیفیات پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کا دماغ کسی ایک کیفیت سے بھی لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ایک قسم کی پریشانی مول لے لیتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عام طور پر موضوع منتخب کرنے کے بعد شعرا اُس کی روح کو قائم نہیں رکھتے۔ تشریح کرتے وقت عوارض کو موضوع پر ترجیح دے دیتے ہیں اور اکثر ایسے بے تکے دلائل' استعارات اور تشبیہات شہادت میں لاتے ہیں کہ اصل موضوع ان عوارض کا محتاج ہو جاتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ روحِ موضوع کی تشریح اس انداز میں کی جائے کہ شروع سے لے کر اخیر تک یک رنگی قائم رہے' نہ کہ اسلوبِ بیان کی شرکت میں مطالب و موضوع کو گم کر دیا جائے۔ اثر صہبائی روحِ موضوع کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایک بڑی حد تک وہ اس میں کامیاب ہیں وُہ ایک ہی مضمون کو مسلسل پوری نظم میں ادا کر دیتے ہیں۔ آپ کی نظم **"تری وحدت کے گیت گاتا ہوں"** ملاحظہ ہو:-

نغمۂ صبح

صبحِ خنداں ہے موسمِ گل ہے ﴿ نغمہ زن اپنی لَے میں بلبل ہے
موجزن چار سو تبسم ہے ﴿ یہ سماں پیکرِ ترنم ہے
نغمۂ سرمدی کی تانیں ہیں ﴿ بزمِ بالا کی داستانیں ہیں
روح مضطر نہیں ہے رقصاں ہے ﴿ فرطِ نغمہ سے تارِ لرزاں ہے

عالمِ بے خودی میں جاتا ہوں
تری وحدت کے گیت گاتا ہوں

دامنِ آسمان ہے پُرخوں ﴿ ہے رواں بحرِ بادۂ گلگوں
میکدہ ہے کہ بزمِ مستی ہے ﴿ ذرّے ذرّے پہ جوشِ مستی ہے
میں بھی جامِ طہور پیتا ہوں ﴿ بادۂ پُر سرور پیتا ہوں

عالمِ بے خودی میں جاتا ہوں
تری وحدت کے گیت گاتا ہوں

جامِ سرور

شام کا دلفریب منظر ہے ﴿ روح پرور ہے کیف آور ہے

پیکرِ نغمہ

چاندنی شب کنارِ دریا ہے ﴿ ہلکا ہلکا سا ابر چھایا ہے
ساغرِ ماہ میں شرابِ سرور ﴿ کہکشاں میں رواں ہے آبِ سرور

فلک نیلگوں میں موسیقی　　عالم پرسکوں میں موسیقی　　عالم بے خودی میں جاتا ہوں
نغمہ پیرا ربابِ ہستی ہے　　پیکرِ نغمہ ساری ہستی ہے　　تری وحدت کے گیت گاتا ہوں

مغربی تعلیمیافتہ ہونے کے اعتبار سے حضرتِ اثر نے لارڈ ٹینی سن اور ورڈز ورتھ کے کلام سے بھی استفادہ کیا ہے بلکہ میں یہ کہوں گا کہ حصۂ نظم "سمن زار" انگریزی زبان کی (sonnets) ہیں یعنی وجدانی اور قلبی واردات کی روح کو ایسے ملبوساتِ شاعری سے مزین کیا ہے کہ موسیقی، مصوری اور ساحری اس کا جزوِ لاینجزیٰ بن گئے ہیں۔ جذباتی ومحاکاتی رنگ میں احمد علی شوق مرحوم اور منشی درگا سہائے، سرور جہان آبادی متوفی نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ شوق مرحوم نے برج بھاشا کے اسلوب میں بزمِ خیال اور دیگر مثنویات کو نسوانی جذبات کے اظہار کا آلہ کار بنایا ہے، اور مناظرِ قدرت کی تصویر ٹھیٹھ اردو بھاشا کے الفاظ میں کھینچی ہے۔ سرور کا کلام ایک نوع کی تجدیدِ شاعری تھی۔ سرور کے انتقال کو دس پندرہ سال ہوئے ہونگے۔ اتفاق سے مجھے دو تین سال تک اس کے وطنِ مالوف قصبۂ جہان آباد کے قرب وجوار میں رہنے کا موقعہ ملا ہے اور جہان آباد جاکر اس کے اعزہ واقربا سے بھی ملاقی ہوا ہوں۔ سرور بے حد سادہ مزاج تھا۔ شراب کے نشہ میں شبانہ روز سرشار رہتا تھا۔ جون کیٹس کی طرح انتہا پسند واقع ہوا تھا۔ ذراسی خوشی اور معمولی سا رنج اس کے شیرازۂ ہستی کو پریشاں کرنے کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ اس کی تمامتر شاعری ایک طوفانِ جذبات ہے جو دریائے تخیّل کے کناروں سے اچھلا جاتا ہے۔ "یادِ ایام" کی خلشِ مسلسل ہے جو سینے کو جراحتکدہ بنارہی ہے۔ پھول کو دیکھ کر وہ وقفِ رقص ومستی ہوجاتا ہے کیونکہ اس کا رنگ وبو سرور کے نازک حسیات کو اپنی طرف مائل کرلیتا ہے۔ وہ اس لئے روتا ہے کہ عنقریب پھول کی ہستی فنا ہونے والی ہے۔ غرضکہ وہ ایک پیکرِ بیقراری ہے۔ اس کے شاعرانہ جذبات فطری تھے اور وہ اس میں کسی کے تاثر کا مرہونِ منت نہیں ہوا۔

اثر صہبائی کے جملہ محرکات کا ماخذ جذبات ہیں مگر وہ جو کچھ کہتے ہیں قوتِ شعوری کے ماتحت کہتے ہیں، آپ نے جذبات کو کبھی اتنی آزادی نہیں دی کہ وہ بے ربطیٔ مضمون اور پریشانیٔ خیال کا باعث ہوں۔

قدرت کے وہ عطیات جن کا تعلق فنونِ لطیفہ کی صحیح قدردانی سے ہے انکی تربیت آپ کے مذاقِ سخن پر حاوی ہے۔ آنکھ، کان اور ذوقِ صحیح جملہ خوبصورتیوں سے لطف اندوز ہونے کا ذریعہ ہیں۔ آپ نے ان سب کو حسن کی قدردانی کے لئے صرف کیا ہے یہاں تک کہ مزاولت سے وہ خود بھی فرداً فرداً اور مجموعۃً حسین ہوگئے ہیں، اور اب آپ کو ہر چیز حسین نظر آتی ہے۔ چنانچہ **ذوقِ نظارہ** کے عنوان سے آپ کے اشعار ملاحظہ ہوں:-

ماہ میں حسن ترا مہر میں تنویر تری　　سنگ میں نور ترا خاک میں اکسیر تری

کاکُلِ سنبلِ پیچاں میں ہے زنجیر تری | اور ہر ذرّے پہ منقوش ہے تصویر تری

اس قدر وادیٔ نظارہ میں کھو جاتا ہوں

خود بھی اک چشمۂ مئے حسن کا ہو جاتا ہوں

جون کیٹس اپنے ایک خط میں لکھتا ہے "میں دنیا کی تمام چیزوں سے اس لئے محبت کرتا ہوں کہ ان میں مجھے "حُسن" نظر آتا ہے"۔ نیز اس کا عقیدہ تھا "صداقت حسُن ہے اور حُسن صداقت ہے" اثر صاحب فرماتے ہیں "کائنات خمخانۂ حُسن وجمال ہے۔ حسُن شراب سے زیادہ لطیف اور کیف انگیز ہے اور ہر حسین شے ساقی سے زیادہ دلفریب اور نظرافروز ہے۔ اربابِ بصیرت اسی حسُن سے کیف اندوز ہوتے ہیں اور یہی کیف وسرور وجدانِ حقائقِ عالیہ کا باعث ہے۔ زندگی، رُوح اور خدا کے اسرار وغوامض انہیں کیفیاتِ مستی وبیخودی میں بے نقاب ہوتے ہیں"۔ اثر صہبائی دراصل اسی میخانۂ حسُن کا ایک رندِ سرمست ہے۔ اور اس نے بھی مناظر فطرت ہی کی پرستش کرنا زندگی کا مقصدِ اوّلیں قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس خمخانے کے حسُن وجمال کو جس والہانہ انداز اور وارفتگی کے عالم میں بیان کیا ہے اس کا اندازہ ذیل کی نظم "پلائے جا" سے ہو سکتا ہے:۔

بہار ہے نگار ہے، | کنارِ جوئبار ہے
فضائے کوہسار ہے | ربابِ آبشار ہے
نسیم خوشگوار ہے | جہانِ زرنگار ہے
پلائے جا، پلائے جا
غمِ جہاں مٹائے جا

ستارے ہیں یہ سُو بہ سُو | جھلک رہے ہیں یا سبُو
رواں ہے چاندنی کی جو | ہر ایک شے ہے مُشکبو
یہ بزمِ حسُن ہو بہ ہو | ہے اک طلسمِ رنگ و بُو
پلائے جا، پلائے جا
غمِ جہاں مٹائے جا

باوجودیکہ اثر صاحب پلائے جا، پلائے جا کے پیہم تقاضے کر رہے ہیں اور اس بے خودی اور سرمستی کو چاہتے ہیں جس سے غم غلط ہو مگر قوتِ شعوری کی گرفت آپ کو اس عالم میں بھی انجام کی یاد دلا رہی ہے۔ چنانچہ اخیر کے دو بند ملاحظہ ہوں

کبھی بہار کا سماں | کبھی ہے منظرِ خزاں
یہ زندگی کی داستاں | عجیب سی ہے چیستاں
رواں ہے ایک کارواں | خبر نہیں مگر کہاں
پلائے جا، پلائے جا
غمِ جہاں مٹائے جا

کرم ہو ساقیٔ کرم | نگاہِ مست کی قسم
چلے وہ دورِ جامِ جم | کہ بھول جائیں کیف و کم
یہ محفلیں ہیں مغتنم | کہ زندگی ہے کوئی دم
پلائے جا، پلائے جا
غمِ جہاں مٹائے جا

ایک دوسری جگہ "خمستانِ بہار" کے عنوان سے بہار کی رنگینیوں اور رعنائیوں کی کیسی دلربا تصویر کھینچی ہے :-

رنگ بن کر چھا گیا دنیا پہ دامانِ بہار | حسن برساتا ہے دامانِ گل افشانِ بہار
دشت و صحرا گلکدے ہیں گلکدے رشکِ ارم | رُوکشِ صد کہکشاں ہے انجمستانِ بہار
چاند عصمت کا کنول، سورج جوانی کا گلاب | خوشنما دو پھول ہیں زیبِ گریبانِ بہار
کس قدر وجد آفریں ہیں جلوہ ہائے رنگ رنگ | جوئے نغمہ بن گئے ہیں نغمہ سنجانِ بہار
حسن کی رنگینیاں موجِ شرابِ ارغواں | شوق کی پُرکیف نظریں میگسارانِ بہار
گلعذارانِ جہاں گُل پیرہن گل پوش ہیں | آگیا ہے حسن کے دریا میں طوفانِ بہار
تیرے گلہائے تبسم رشکِ گلہائے چمن | میرا دامانِ تمنا رشکِ دامانِ بہار

"تاروں بھری رات" میں کیسی شگفتہ اور نادر تشبیہات کو جمع فرما دیا ہے :-

جلوہ فشاں ہے وادیٔ اخضر میں بوستاں | پیشِ نظر ہے منظرِ فردوس کا سماں
دامانِ گلفروش ہے، دامانِ کہکشاں | کیا دلفریب چرخ کی ہیں زرنگاریاں

افشاں جبینِ شب پہ نمودار ہو گئی
سطحِ فلک تمام سمن زار ہو گئی

تارے فضائے عرش میں ہیں جگمگا رہے | آویزے یا ہیں ماہ جبینانِ خلد کے
روشن ہوئے ہیں محفلِ بالا کے قمقمے | یا ڈل میں پھول ہیں یہ کنول کے کھلے ہوئے

حُورانِ خُلد شب کے لئے بے نقاب ہیں
یا بحرِ نیلگوں کے طلائی حباب ہیں

اس کے بعد عالمگیر خاموشی کا نقشہ کھینچا ہے. ہر شے محوِ خواب ہے ؎

شاعر کا ساز زمزمہ پرداز ہے مگر
اس کا خیال مائلِ پرواز ہے مگر

اثر صاحب زندگی کی بے ثباتی، امیدوں کی ناکامی اور آغاز و انجام کے پریشان کن مسائل پر غور کر کے مغموم ہو جاتے ہیں لیکن پھر کائناتِ حُسن سے مخمور و مسحور ہو کر بے اختیار پکار اٹھتے ہیں ؎

عالم تمام جلوہ از رنگِ حُسن ہے | لیکن یہ بزم گلکدہ رنگِ حُسن ہے

اور ایک مرتبہ پھر آخری بندمیں تاروں بھری رات کے جلووں سے کیف اندوز ہوتے ہیں اور دنیا کو "جامِ مےٴ خوشگوارِ حسن" کہ کر اپنے کو مخاطب کرتے ہیں ؎

پی اور بے ثباتی عالم کو بھول جا
ناکامیوں کی سوزشِ پیہم کو بھول جا

اسی طرح ستارہٴ صبح کو دیکھ کر اس کے اور صبح کے حسن سے بیخود ہو کر عجیب اسرار بے نقاب کرتے ہیں۔

عجیب کیف سے لبریز ہے طلوعِ سحر
غریقِ نورِ ازل کائنات کا منظر
فضائے ارض وسما میں عجیب مستی ہے
شرابِ میکدہٴ خلد سے برستی ہے
تو ایک کاسہٴ زریں ہے اے ستارہٴ صبح
فروغِ بادہٴ تسکیں ہے اے ستارہٴ صبح
یہیں سے صبحِ تجلّی ظہور کرتی ہے
شبِ گناہ کو فردوسِ نور کرتی ہے
یہیں سے لذتِ ایماں نصیب ہوتی ہے
یہیں سے مستیٴ عرفاں نصیب ہوتی ہے
یہ حسن روح کو ایسا گداز کرتا ہے
خدا سے بندے کو سرگرمِ راز کرتا ہے

اس کے بعد شباب کے طغیان وعصیاں کا ذکر کرتے ہوئے حضرتِ اثر ستارہٴ صبح کے معصوم جلووں سے تزکیہٴ روح کرتے ہیں :۔

شہیدِ خواب کو بیدار کر دیا تو نے
فروغِ مطلعِ انوار کر دیا تو نے
تو ایک جامِ مسرت ہے اے ستارہٴ صبح
پیامِ روحِ محبت ہے اے ستارہٴ صبح
ترے پیام کی تائید کر رہا ہوں میں
وفا کے عہد کی تجدید کر رہا ہوں میں
غریقِ قعرِ مذلّت تھا سربلند ہوں میں
کہ بارگاہِ ازل میں نیازمند ہوں میں
خوشا نصیب سحر خیز ہو گیا میں بھی
تجلّیات سے لبریز ہو گیا میں بھی

جذبات نگاری یوں تو تمام کلام کی روح ہے لیکن **شبابِ کیف آفریں** صحیح معنوں میں اس کی آئینہ دار ہے ؎

(۱)

عجیب دورِ مست تھا
ہر ایک مے پرست تھا
جوانیوں کی مستیاں
وہ شب کی مے پرستیاں
وہ بادہ ہائے جانفزا
وہ ساقیانِ خوش ادا

وہ نعرہ ہائے ہاؤ ہو   وہ وردِ یا سبُوا سبُوا!
عجیب دورِ مست تھا
ہر ایک مے پرست تھا

(۲)

ہر ایک شے پہ حسن تھا
ہر ایک شے تھی کیف زا

وہ زینتیں بہار کی، | بہارِ زرنگار کی
کچھ اس قدر نکھار تھا | حسین خار خار تھا
وہ مہوشوں کے جمگھٹے | وہ گلرخوں کے قہقہے
سرورخیز تھا سماں | جہاں تھا رشکِ جناں

ہر ایک شے پہ حسن تھا
ہر ایک شے تھی کیف زا

(۳)

مگر ہے کھو گیا کہیں
شبابِ کیف آفریں

بہارِ گلستاں وہی، | ریاضِ کہکشاں وہی
زمین و آسماں وہی | ہے رونقِ جہاں وہی
اسی طرح عیاں ہے حسن | شرابِ جاوداں ہے حسن
مگر وہ بے خودی نہیں | وہ لطفِ زندگی نہیں

اثر ہے کھو گیا کہیں
شبابِ کیف آفریں

جذبۂ الوہیت پرستی ہر نظم کی خصوصیت ہے۔ تلاشِ حسن جو بیشتر نغموں میں پائی جاتی ہے۔ ان میں حسن سے مراد وہی حسنِ ازلی ہے، وہی "ہمہ اوست" اور "ہمہ از وست" ہے۔ اثر صاحب ذوقِ نظارہ میں بھی اسی کو دیکھتے ہیں۔ بہار، برسات شام و سحر غرضکہ ہر نقش میں اُسی کی ذات کو جلوہ گر پاتے ہیں۔ یہ تمام رنگ ڈھنگ، طور طریقے، یہ جملہ اصطلاحات اسلوب و انداز اسی خدائے مطلق کی جستجو کے لئے اختیار کئے گئے ہیں۔

ہر چند اثر صاحب نے فلسفہ میں ایم اے کیا ہے اور آپ کو الٰہیات سے غیر معمولی شغف ہے لیکن پھر بھی آپ نے اپنی شاعری کو فلسفیانہ مضامین سے گرانبار نہیں کیا۔ بلکہ اپنے فلسفہ کو ارتقائے شاعری کا ایک ذریعہ سمجھا ہے۔ جہاں کہیں فلسفیانہ مضامین آ گئے ہیں اُن کو شعریت میں ڈبو دیا ہے۔ چنانچہ **کائنات** اور **انسان** میں اسی نوعیت کی قادر الکلامی کا پتا چلتا ہے۔

کائنات زندگی سے معمور ہے اور زندگی ایک طوفانِ اضطراب ہے جو اپنی رو میں رواں دواں ہے اور جس کا منتہا کچھ نظر نہیں آتا ہے

ہے ازل سے موجزن بحرِ روانِ زندگی | بحرِ بے پایاں ہے بحرِ بیکرانِ زندگی
پیکرِ ہستی کی ہر رگ میں ہیجانِ حیات | قطرے قطرے میں ہے پنہاں ایک طوفانِ حیات
بادپا رہوار ہے جس کو غمِ منزل نہیں | سیل بے پرّا ہے جو شرمندۂ ساحل نہیں

ابتدا ہے زندگی اور انتہا ہے زندگی
کاش کھل جائے کبھی یہ بھی کہ کیا ہے زندگی

زندگی کے اس طوفان و ہیجان میں انسان نمودار ہوتا ہے جس کی ہستی خود بھی منظم ہے اور کائنات میں بھی تنظیم کا باعث ہوتی ہے ؎

اس تماشا گاہ میں اک ہستیٔ انساں بھی ہے
جو دلِ آگاہ بھی ہے دیدۂ حیراں بھی ہے

زندگی کا سوز سازِ آگہی سے مل گیا
ہوش بھی ایک گونہ جوشِ بیخودی سے مل گیا

نغمۂ پرشوق اٹھا شورِ بے ہنگام سے
ہو گئی معمور دنیا درد کے پیغام سے

منتشر جلووں سے پیدا ہو گئی تصویرِ حسن
جاگ اٹھی روحِ محبت جاگ اٹھی تصویرِ حسن

صبح کی رنگینیاں معصوم تر ہونے لگیں
شام کی تاریکیاں مغموم تر ہونے لگیں

انسان کی اس تخلیق پر عناصر برافروختہ ہو جاتے ہیں اور اپنی جملہ قوتیں اس کو ہلاک کرنے میں صرف کر دیتے ہیں گویا عناصر اور انسان میں ایک خوفناک جنگ چھڑ جاتی ہے فطرت کی تمام جبری اور قہرمانی قوتیں ایک طرف ہیں اور انسان کی کمزور و ناتواں ہستی دوسری طرف۔

ہیں پہاڑ آتش فشاں اور بحرِ طوفاں خیز ہیں
یورشیں صد ہا دباؤں کی بھی حشر انگیز ہیں

بر سرِ جنگ اس کے آگے ہیں عناصر صف بہ صف
ہے تن تنہا مگر بے چارہ انساں اک طرف

ٹوٹ کر خاموش ہو جاتا ہے سازِ آرزو
غرقِ بحرِ یاس ہوتا ہے جہازِ آرزو

ٹھوکریں کھاتا ہے رہوارِ عمل بے اختیار
راہ گم کردہ ہے تاریکی میں عقلِ ہرزہ کار

"گردشِ تقدیر" اس کی بے بسی کا نام ہے
اور "خدا" انسان کی کم آگہی کا نام ہے

میں نے بخوفِ طوالت صرف چند ہی نظموں کو پیش کیا ہے ورنہ ہمن زار میں تقریباً پینتیس نظمیں ہیں جن میں سے "نذرِ بہار" "صبح و شام" "پی" اور "پلا ساقی" "چاند" اور "سمندر" "پھول" اور "ستارہ" "دلِ نامراد" "ناکامِ محبت" "یادِ ایام" "برسات" "حسن" "افسردگی" "محبت" اور "موت" خاص طور پر مقبول ہو چکی ہیں۔

"جامِ صہبائی" یعنی مجموعۂ رباعیات جب شائع ہوا تھا تو علامہ کیفی دہلوی نے ارشاد فرمایا تھا:-

"جامِ صہبائی حقیقت میں مناظرِ فطرت کی رنگکاریوں حسن و عشق کی نغمہ سرائیوں بادۂ عرفاں کی سرمستیوں اور فلسفہ و حکمت کی حقائق آرائیوں کا مجموعہ ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح چاند سورج ستاروں اور پھولوں میں ایک ہی حسن درخشاں ہے حقیقی شاعر کا رنگ بھی ہر صنفِ سخن پر حاوی ہوتا ہے خواہ غزل ہو یا رباعی یا نظم اس لئے علامۂ موصوف کی رائے صہبائی صاحب کے تمام کلام پر حاوی ہے: **غلام سرور فگار**

خوابِ زندگانی

یہ رنگیں بدلیاں جو تیرتی ہیں آسمانوں پر
یہ دلکش گیت جو لہرا رہے ہیں بوستانوں پر

غروبِ مہر سے یہ زرفشاں جلووں کی ارزانی
یہ گہری ندیوں میں ٹھوکریں کھاتا ہوا پانی

یہ رنگینی جو پھولوں کی رگوں میں مسکراتی ہے
یہ ہریاول جو کمسن کھیتیوں میں لہلہاتی ہے

یہ سازِ شام پر دھیمے ترنم جوئباروں کے
یہ خواب افروز آڑے ترچھے سائے دیوداروں کے

درختوں میں یہ ہلکی تیرگی یہ ہانپتے جنگل
یہ سرخی اور سیاہی کا تصادم کانپتے جنگل

یہ رعنائی جو منڈلاتی ہے جہاں پرور بہاروں پر
یہ مدہوشی جو ہے چھائی ہوئی رنگیں نظاروں پر

یہ بوچھاڑیں ہواؤں کی یہ چھینٹے آبشاروں کے
یہ خم کھاتے ہوئے ڈھلوان رستے کوہساروں کے

یہ چرواہوں کی دردانگیز تانیں بزمِ فطرت میں
یہ ہلکے ہلکے سائے کے مناظر نور و نکہت میں

یہ عنّابی فضاؤں میں ابابیلوں کی پروازیں
نشاط آمیز خاموشی میں یہ جھینگر کی آوازیں

جدھر دیکھوں نظر آتا ہے اک طوفانِ شادابی
مگر مجھ کو تو اس سے اور بھی ہوتی ہے بیتابی

کہ یہ جوشِ بہاریں جاودانی ہو نہیں سکتا
یہ خوابِ زندگانی، زندگانی ہو نہیں سکتا

احسان ابنِ دانش

دروغ برگردنِ راوی

(۱۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ برس کی تاریخ ٹاکی شکل میں)

"...... میرا نام شیطان ہے بعض مجھے ابلیس کہتے ہیں اور فرشتوں کا استاد تسلیم کرتے ہوئے دنیا جہان کی برائیوں اور ایک عالم کے گناہوں کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ میرا کام صرف انسانی ناکامیوں کو بے پردہ دکھانا ہے اور میں حقیقت کو حقیقت کہتا ہوں۔ یہی میرا قصور ہے۔

میں استعاروں میں گفتگو کرنے پر مجبور ہوں تشبیہوں اور تمثیلوں میں —— تاکہ آپ میرا مفہوم سمجھ سکیں۔ مجھے آپ کی زبان، آپ کے تخیل، آپ ہی کے طرزِ ادا پر اتر آنا ہے اور ایک فہم و ادراک سے بالاتر ہستی کے تجربے کو ننھے بچوں کے الفاظ میں بیان کرنا ہے یعنی فرض کیجئے آپ کو جبر و مقابلہ کا کوئی اہم مسئلہ صرف جمع تفریق جاننے والوں کو سمجھانا ہو، یا بلند ترین فلسفے کا کوئی نظریہ جن پریوں کی کہانی کی شکل میں خود وہ الفاظ جاننے والے پہلی دوسری جماعت کے طالب علموں کے سامنے پیش کرنا ہو، تو کس قدر مشکل کا سامنا ہوگا۔ یہی حالت میری ہے۔ آپ یوں سمجھ لیجئے کہ ایک آدمی اس آپ کی دنیا پر جس وقت ابھی کسی قسم کی زندگی کا نام و نشان تک نہ تھا ایک سیاہ کپڑا اور تصویر اتارنے کا کیمرا لے کر آیا تھا۔ وہ میں ہوں ——

سیاہ کپڑا اور فوٹو کا کیمرا۔ لیکن معمولی کیمرا نہیں بلکہ وہ جس میں چلتی پھرتی تصاویر اتاری جاتی ہیں اور آواز بھی۔ جسے آپ ٹاکی کیمرا کہتے ہیں۔ آپ کا سوال ہوگا کہ یہ کیوں؟ یہ اس لئے کہ ——

مجھے یہاں ایک عظیم الشان طاقت نے بھیجا تھا جو دیکھتی اور سنتی ہے، اسے میں آپ کی خشک مزاج سے عاری اور ہیبتناک "معبودیت" کے نازک احساسات کو صدمے سے بچانے کی غرض سے سادہ الفاظ میں قادرِ مطلق کہونگا۔ اب یہ خیال بھی انسان کی خودی کا تقاضا ہے کہ اس تمام زمانہ دراز میں جب سے نظامِ عالم کا ظہور ہوا ہے وہ اعلیٰ و ارفع ہستی امید و بیم کے جذبات لئے ہوئے انسان کے ہر فعل کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کر رہی ہے کہ کس طرح یہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے مطابق ہونے کی مجنونانہ کوشش میں مبتلا ہے۔ گویا نظامِ عالم میں حضرتِ انسان کے سوا اور کسی مخلوق کی کوئی اہمیت ہی نہیں حالانکہ اصلیت اس کے بالکل خلاف ہے، مجھے پھر استعارۃً کہنا پڑتا ہے کہ اصل واقعہ یوں تھا۔ قادرِ مطلق نے کہا شیطان میاں!

مجھے ابھی فرصت نہیں ہے اور میری توجہ کی ابھی خاص ضرورت بھی کیا ہے۔ تم ذرا اس نئی دنیا میں جاکر ایک فلم تو تیار کرو۔ پھر جب ضرورت ہوئی مجھے بلا کر دکھا دینا۔"

اب آپ شاید یہ گفتگو قادرِ مطلق کے شایانِ شان نہ سمجھیں گے لیکن اُسے الفاظ کی ضرورت نہ تھی۔ میرے لئے مشکل یہ ہے کہ الفاظ کا استعمال لازمی ہے۔

آپ حیران ہوں گے کہ اس مدتِ مدید اور عرصۂ بعید کی کچھ حقیقت ہی نہ تھی۔ لیکن یہ آپ غور فرما سکتے ہیں کہ جس طرح آپ کے یہاں لاسلکی۔ ریڈیو۔ متحرک تصاویر اور ایسی بہت سی محیر العقول اشیا ہیں۔ کیا تمام جہان کے مالک کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں تھا جس سے وہ آپ کی دنیا کے کل حرکات و سکنات آوازوں اور تغیر و تبدل کا ایک مستقل ریکارڈ رکھ سکتا؟ اس آپ کی دنیا یا اور ایسی بےشمار مخلوق میں کوئی واقعہ یا ہلکی سے ہلکی آواز ایسی نہیں ہوتی جس کو دوبارہ دیکھا یا سنا نہ جا سکتا ہو۔ اب کوئی دن کی بات ہے کہ آپ کے یہاں بھی ایسے آلے ایجاد ہو جائیں گے جن سے اگر آپ چاہیں تو حضرت سلیمان کی آواز سن سکیں۔ قادرِ مطلق کے پاس ابدالآباد سے ہر کسی کے ایک سانس لینے تک کا مکمل ریکارڈ موجود ہے اور اس کا مرتب کرنیوالا میں ہوں۔ میں وہ کیمرا ہوں جس نے ان تمام ڈراموں کا جو شروع سے لے کر آج تک آپ کے دنیا کے اسٹیج پر کھیلے ہیں متحرک ٹاکی فلم تیار کیا ہے —— گو قادرِ مطلق نے خود اس فلم کو ابھی نہ دیکھا تھا، اور اس کے منظور کردہ وقت پر مجھے اس کے سامنے پیش کرنا تھا۔

یہ فلم بہت طویل ہے۔ یہاں تک کہ اگر میں بتا بھی سکوں تو آپ اس کی طوالت کا اندازہ نہ کر سکیں گے۔ شاید کبھی میں ان دشواریوں کا حال آپ کو سناؤں جو اس کے بنانے میں پیش آئیں۔ فی الحال مجھے اُس دن کی کیفیت بیان کرنا ہے جب یہ فلم میں نے قادرِ مطلق کو دکھایا۔

جنگِ عظیم سے کچھ عرصہ قبل میں لندن کے نواح میں ایک متوسط درجے کا مکان لے کر کچھ عرصے تک ایک فارغ البال جنٹلمین کی زندگی بسر کرنے کے خیال سے مقیم ہو گیا تھا۔ وہاں نہایت چین اور بےفکری سے گذر ہوتی تھی۔ دن میں کبھی کبھی برٹش میوزیم میں پرانے واقعات کی یاد تازہ کرنے چلا جاتا۔ شام کو ادھر اُدھر کسی باغ میں ٹہلتا اور پھر اپنے کمرے میں تنہا آتش دان کے سامنے بیٹھ کر تخیل کا خواب آور لطف اٹھایا کرتا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ لندن کی اس قسم کی شام ایک ایسے دماغ کے لئے جو کروڑوں برس تک بہت تیزی سے کام کرتا رہا ہو کس قدر سکون انگیز ہو سکتی ہے۔

لیکن جنگ عظیم کے اختتام نے غور کرنے کے لئے بہت سا مادہ فراہم کر دیا۔ ہر امر میں اعتدال میرا ہمیشہ اصول رہا ہے یہاں تک کہ پست ہمتی اور جسے آپ شیطنت کہتے ہیں ان میں بھی اس اصول کی پابندی لازم سمجھتا ہوں۔ زمانۂ قدیم سے ہمیشہ

انسان خطا کرنے کا حقدار ہونے کا دعوے کرتا رہا اور حاکم اعلیٰ نے بھی اس حق کو کم و بیش تسلیم کر لیا لیکن میری رائے میں اب وہ حدِ اعتدال سے تجاوز کر گیا تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ قادرِ مطلق کے دنیا میں آ کر میرے فلم کو ملاحظہ کرنے کا یہی وقت ہے۔ تاکہ وہ اپنے کئے پر آپ ہی حیران ہونے کی ستم ظریفی سے لطف اندوز ہو سکے۔

چنانچہ میں نے ایک طویل عرضداشت لکھی جس کے جواب میں جبرئیل اور میرے درمیان بہت سی خط و کتابت کے بعد دن جگہ اور وقت مقرر ہو گئے۔ اس امر میں بے حد احتیاط سے کام لیا گیا اور تمام باتیں کامل طور پر صیغۂ راز میں رکھی گئیں ورنہ حضرت انسان کا حماقت پیدا ہونے کا حق نہ جانے کیا آفت برپا کرتا۔

~~~~~~~~

میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس روز مجھ پر گھبراہٹ سی طاری تھی خصوصاً اس فکر سے کہ ایسا نہ ہو قادرِ مطلق فلم کی اہمیت کافی نہ سمجھے اور میرے بیکار تکلیف دینے پر ناراض ہو۔ میں بہت سویرے اٹھا اور بڑی احتیاط سے کپڑے پہنے۔ بوٹ کو رگڑ رگڑ کر اس قدر چمکایا کہ منہ دکھائی دینے لگا۔ اسٹیشن پر وقت سے بہت پہلے پہنچ کر گاڑی میں بیٹھ گیا ——

سالزبری پہنچ کر میں نے اخبار خریدا اور ویٹنگ روم میں بیٹھ کر ریل کا انتظار کرنے لگا۔ اخباروں والے ویسے تو دور دور کی خبریں حاصل کرنے میں مشتاق ہوتے ہیں لیکن آج کے اخبار میں اس ہوشربا واقعہ کا کہیں ذکر نہ تھا کہ آج اللہ تعالیٰ پہلی مرتبہ بنفسِ نفیس دنیا میں تشریف لا کر بچشم خود یہاں کے حالات کو ملاحظہ فرمانے والا ہے۔ اسٹیشن پر نہ کچھ دھوم دھام تھی نہ سرخ بانات پلیٹ فارم پر بچھائی گئی تھی، نہ باجا تھا نہ گارڈ آف آنر۔ میرے دل میں خیال آ رہا تھا کہ اگر ان تمام لوگوں کو علم ہوتا جو اسٹیشن پر اپنے عزیزوں یا دوستوں کے استقبال کو آئے ہوئے ہیں تو وہ کس شوق سے اپنے بنانے والے کو دیکھنے کے لئے دوڑتے

یکایک سیٹی کی آواز آئی میں باہر نکلا۔ ٹرین آتی دکھائی دے رہی تھی۔ انجن زور زور سے ہانپتا اور سیاہ دھوئیں کے بادل منہ سے نکالتا باوقار انداز سے اسٹیشن میں داخل ہوا۔ ٹرین ٹھہر گئی۔ دروازے کھلے میں جوش سے آگے بڑھا کہ اب اُسے دیکھوں گا۔ بہت سے لوگ اتر رہے تھے۔ کچھ سوار ہو رہے تھے۔ یک لخت مجھے ایک خیال آیا اور میں گویا سرد ہو گیا۔ اسے پہچانوں گا۔ کیوں کر؟ —— اسے دیکھے ہوئے ایک زمانہ گذر چکا تھا اور مجھے صورت یاد نہ تھی —— لیکن میں نے حوصلہ کرنے کی کوشش کی —— وہ تو مجھے پہچان لیگا —— اور مسکرا کر میری طرف بڑھے گا تو ——

لیکن میری طرف کوئی نہ بڑھا۔ زیادہ تر مسافر دروازے کی طرف جا رہے تھے میں نے ایک طویل قامت بارعب آدمی کو دیکھا جو گویا کسی کی تلاش میں ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور آہستہ آہستہ چل رہا تھا —— یہی ہوگا —— میں اس کے پیچھے بھاگا اور قریب پہنچ کر غریبانہ سی مسکراہٹ سے اسے مخاطب کیا "معافی چاہتا ہوں۔ کیا تو خدائے ذوالجلال ہے؟"
~~~~~~~~

"کیا بکتے ہو؟" اس نے تیوری چڑھا کر کہا۔ اور دروازے میں سے باہر نکل گیا میں اس کی پشت کو تکتا رہ گیا۔

جب مجھے قدرے ہوش آیا تو جیب میں سے نکال کر جبرئیل کا آخری خط دیکھا۔ ظالم اس قدر بدخط ہے کہ کہا نہیں جاسکتا۔ ایک ٹائپ رائٹر ہی خرید لیا ہوتا جس سے معمولی انسان تک اپنا عیب چھپا لیتے ہیں ــــ لفظ سالزبری کے بعد ایک مری ہوئی چیونٹی سی بنی تھی میں اسے حرف S سمجھ کر سٹیشن کو چلا آیا۔ حالانکہ شاید اس نے P لکھا تھا جس سے پلین یا میدان مراد تھی۔ میں نے جلدی سے کرائے کی موٹر لی اور چند منٹ میں سالزبری پلین پہنچ گیا۔

تھوڑی دیر میں دور سے ایک ہوائی جہاز آتا دکھائی دیا۔ پرانے سے نمونے کا جہاز تھا اور اترنے میں اس کی حرکت اس طرح تھی گویا چلانے والا کافی مشاق نہیں ہے اور وہ اترا بھی جہاں چاہیئے تھا اس سے کافی فاصلے پر۔ میں دوڑا لیکن میرے وہاں پہنچنے سے پہلے قادرِ مطلق باہر آچکا تھا۔ ڈرائیور کی جگہ وہی چمڑے کی ٹوپی کوٹ پہنے اور بڑی سی عینک لگائے ایک شخص بیٹھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر کچھ نیم فخریہ انداز سے مسکرایا، اس بچے کی طرح جو اپنے باپ کی موٹر میں پہیا پکڑ کر بیٹھ گیا ہو۔ میں نے پہچان کر پوچھا۔

"سائوپطرس کیا حال ہے؟"

کہنے لگا۔ "تم تو اچھے ہو؟"

اور میں جلدی سے قادرِ مطلق کی طرف چلا جو تیز تیز قدم اٹھائے اس غیر آباد مکان کی طرف چلا جا رہا تھا جہاں میں نے اپنی مشین لگا رکھی تھی۔ اس نے سیاہی مائل بہت لمبا اوورکوٹ پہن رکھا تھا اور ٹوپی کو سامنے کی طرف جھکا رکھا تھا۔ وہ بغیر اوورکوٹ اتارے جس طرح کسی کو جلدی واپس جانا ہوتا ہے مکان کے بڑے کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر بیٹھ گیا ــــ میرے دماغ کی حالت عجیب تھی۔ اتنے عرصے کے بعد ملاقات ہونے کے باوجود معلوم ہوتا تھا گویا ابھی کل کی بات ہے کہ میں اس کے یہاں رہتا تھا۔ اب وہاں اندھیرے میں صرف وہ اور میں دونوں تھے اور مجھ پر کچھ بے تکلفی اور کچھ ہیبت کا سا احساس طاری تھا جسے میں بیان نہیں کرسکتا۔

فلم شروع ہوا۔ دنیا کی پیدائش کے دن سے آج تک کوئی حرکت یا کوئی آواز ایسی نہ تھی جو اس میں نہ ہو۔ اور گو خدا کے نزدیک اس وقت سے لے کر جب یہ بندر درختوں کی شاخوں پر بیٹھ کر شور مچاتے تھے اس وقت تک جب مشینوں کے ذریعے سے اپنے لاکھوں ہم جنسوں کو قتل کرنے کے بعد دوسرائی میں بیٹھے ایک مہذب ترین بندر کی سرکردگی میں اپنے دیوانہ پن کے نتائج پر غور کر رہے ہیں۔ یہ طویل زمانہ ایک دن سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ تاہم مجھے یہ فکر دامنگیر تھی کہ ایسا نہ ہو اس کروڑوں میل لمبے فلم کو دیکھتے دیکھتے

قادرِ مطلق اکتا جائے۔ اس لئے میں نے یہ تجویز کی کہ فلم کی رفتار کو بدلتے رہنا چاہیئے یعنی ان صدیوں کو بہت جلدی گذار دینے کی ضرورت ہے جن میں کوئی خاص واقعہ نہیں ہے اور قابلِ دید واقعات کو بہت ہلکی رفتار (سلو موشن in Slow [illegible]) میں دکھانا چاہیئے۔ اس میں خاص بات یہ بھی ہوگی کہ انسانی جدوجہد اور قربانیاں جن مقاصد کے حصول کے لئے کی گئی تھیں ان کی اہمیت کا اظہار ہوگا۔ ورنہ ویسے تو تاریخ کے زمانۂ دراز میں ان کی اہمیت خود ہی مٹ جاتی ہے اور کل تک وہ و بیکار معلوم ہوتی ہے۔

اب ہم دونوں تاریکی میں قریب قریب بیٹھے ہیں اور پردے پر سیاہ وسفید دھبوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ آخر قادرِ مطلق نے کہا "کیا آفت ہے ؟"

میں نے عرض کیا کہ دنیا پر جس قدر عرصہ سے کچھ ہونے لگا ہے اس سے بہت زیادہ عرصہ تک پہلے کچھ نہ تھا ——کچھ نہیں ——ابھی کچھ نہیں۔ بےصبری کی ہلکی سی کھانسی سنائی دی اور میں نے معافی طلب کرتے ہوئے فلم کی رفتار کو اور تیز کر دیا —— بہت تیز —— لیکن پردے پر جو کچھ تھا وہ گویا کچھ نہ تھا —— اب دیکھئے۔ ایک دلدل سی نظر آنے لگی اور اس میں حرکت پیدا ہوئی —— کیچڑ میں سے سانپ اور بچھو نکل رہے ہیں —— پانی دور ہوگیا۔ بڑے بڑے عجیب شکل کے جانور ظاہر ہونے لگے ان سے اپنی ٹانگوں پر کھڑا نہیں ہُوا جاتا۔ —— دودھ پلانے والے جانور پیدا ہو گئے —— مُعظیم الشان قد وجثہ کے ہاتھی۔ ویل مچھلیاں۔ بھینسے۔ لنگور چل پھر رہے ہیں —— ایک کونے میں چند لمبے بالوں والے بڑے بڑے بندر نما انسانوں کا گروہ آپس میں لڑتا دکھائی دیا —— اور وہ دیکھو ابراہیم اپنی پہلی اولاد کو رشوت ستاں خدا کے حضور میں نذر دینے کے لئے قربان کر رہا ہے ——

"خوب! یہ رفتار ٹھیک ہے"۔

"ہاں خداوندِ عالم۔ انسان کے شروع کے حالات میں جلدی جلدی دکھا رہا ہوں تاکہ ابتدا سے سب امور کا اندازہ رہے"۔

مصریوں کے مظالم سے یہودی نکلے جا رہے ہیں۔ موسٰے اپنی بارہ باغی اقوام کو موعودہ سرزمین کی طرف لے جا رہا ہے۔ یہ لو انہوں نے شہر جیریکو تباہ کرنے کے بعد کنعانیوں کو تہ تیغ کرنا شروع کر دیا ——

"کیوں ایسا کر رہے ہیں ؟"

"تیرے نام پر خداوند"۔

فلم چل رہا ہے —— —— —— ——

"یہ سفید سفید چمکتے ہوئے ٹکڑے سے پردے پر کیا گذر رہے ہیں ؟"

"یہ صدیاں ہیں خداوند۔ میں تاریخ کے بعض حصے انتہائی رفتار سے یہ ظاہر کرنے کے لئے پیش کر رہا ہوں کہ انسان کی ان بلند پروازیوں اولوالعزمیوں اور تمنّاؤں کا کیا نتیجہ ہوتا ہے جن کے حصول کی کوشش کو اپنی زندگی کا مقصدِ اولیٰ قرار دیکر

وہ مصائب برداشت کرتا ہے اپنے ہم جنسوں کو قتل کرتا ہے اور خود مرجاتا ہے "۔

اور روشن و تاریک نشانات پردے پر ظاہر ہوئے اور غائب ہو گئے۔ صدیاں بارش کے قطرات کی طرح آئیں اور گذر گئیں اب مسیح اپنے بارہ حواریوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا ہے۔

"یہ انسانوں کو سبق دے رہا ہے اے مالکِ کون و مکاں کہ تمام مرد عورت خدائے بزرگ کے پیارے بچوں کی طرح ہیں ۔۔۔۔ اور یہاں بنی نوعِ انسان سے محبت کرنے کے جرم میں وہ پھانسی پر لٹکایا جا رہا ہے ۔۔۔۔"

پہلے پہلے عیسائی شہید زندہ جلائے جانے سے قبل روما کے شہنشاہ نیرو کی تفریح گاہ میں چاندنی طرف دوڑائے جا رہے ہیں ۔۔۔۔ اور یہ دیکھئے ابھی سے ان کے روحانی ورثا یعنی پاپائے اعظم روما اور قسطنطنیہ اور اسکندریہ کے اسقفائے اعظم اس مسئلہ کے اختلاف پر آپس میں ایک دوسرے پر لعنت بھیج رہے ہیں کہ روح القدس صرف باپ سے پیدا ہوا تھا یا باپ اور بیٹے دونوں سے ۔۔۔۔

"یہ ڈاڑھی والا عرب کون ہے جس کے اعضا سڈول اور خوبصورت ہیں؟"

"محمدؐ۔ خداوند۔ یہ ایک مجدد ہے جو موسٰے کے کام کو از سرِ نو ترتیب دے رہا ہے یعنی اس کی مشین کے پرزوں کی صفائی اور مرمت کرکے فٹ کر رہا ہے یہ کہتا ہے کہ جب کوئی مذہب فرسودہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایک پیغمبر بھیج دیتا ہے جو اسے درست کر دے۔ گویا عوام کی زبان میں تیل وغیرہ دے کر پھر چالو کر دے یہ خود کو موسٰے اور مسیح وغیرہ کا جانشین بتاتا ہے اور اپنے مریدوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وقت پڑے تو مسیحیوں کی ہر طرح امداد کریں ۔۔۔۔"

یہ عرب سوار ہیں جنھوں نے شمالی افریقہ کی جانب باگیں اٹھا دی ہیں ۔۔۔۔ اور ایک تیے میں چار سو چالیس عیسائی علاقوں (Bishoprics) کو مٹا دیا ہے ۔۔۔۔

"یہ محمدؐ اب کیا کر رہا ہے؟"

پہاڑ پر اپنی مشہور تقریر کر رہا ہے جس میں مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اور سمجھا رہا ہے اے قادرِ مطلق کہ تمام اہلِ اسلام گویا تیری سرکردگی میں ایک برادری کے افراد ہیں ۔۔۔۔"

اب ایک نہایت شاندار دعوت دکھائی دیتی ہے۔ مہمان جن سب کی رگوں میں مرحوم پیغمبر کا خون حرکت کر رہا ہے۔ دسترخوان پر بیٹھے ہیں۔ یکایک میزبان اُٹھتے ہیں اور سب مہمانوں کو جو تعداد میں تقریباً پچاس ہیں قتل کرکے ان کی نعشوں پر ایک قالین پھیلا دیتے ہیں۔ اور اسی جگہ دعوت پھر شروع ہو جاتی ہے۔

"یہ کیوں؟"

خداوند یہ مہمان و میزبان سب محمدؐ کے ورثا ہیں جو اس بات کا آپس میں فیصلہ کر رہے ہیں کہ برادری کو پیغمبر کے قدم بہ قدم لے چلنے کے لئے رہبر کون ہو گا“ ——— ——— ——— ———

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”یہ بھی مسلمان ہیں پروردگار جو عیسائی ہسپانیہ پر حملہ کر رہے ہیں“۔

”حملہ؟“

”ایک عیسائی گورنر کی دعوت پر جو مشکلات میں گرفتار ہو گیا تھا ——— اور یہ قرطبہ کے مسیحی علاقے خلیفہ الحاکم کے حکم سے لوٹے جلائے اور تباہ و برباد کئے جا رہے ہیں“۔

”کس لئے؟“

”تیرے نام پر قادرِ مطلق“۔

”لیکن تم نے تو کہا تھا کہ محمدؐ مسیح کا جانشین تھا؟“

”بیشک۔ لیکن نماز کے وقت عیسائی مسجدوں میں داخل ہو کر پیغمبر کو برا بھلا کہنے لگے اور مسلمان بچوں نے پادریوں پر پتھر پھینکے“۔

”کیوں؟“

”تیرے ہی نام پر رب العزت“۔

فلم چل رہا ہے ——— ——— ——— ——— ———

”یہ شاندار لمبی ڈاڑھی والا بڈھا کون ہے؟“

”شارلمان خداوند۔ اہلِ فرانس کے جرمن آباو اجداد کا بادشاہ۔ پوپ نے اسے روما میں مدعو کیا ہے، اسے اہلِ روما کا لباس پہنا دیا گیا ہے۔ اس کے سر پر تاج رکھ کر اسے متبرک سلطنتِ روما کا شہنشاہ قرار دے دیا گیا ہے ———“

یہ آئرین ہے۔ روما کی اصلی ملکہ۔ اس کا دارالحکومت قسطنطنیہ ہے۔ بہت نیک۔ مذہب کی سختی سے پابند اور نہایت مستقل مزاج خاتون ہے ———

ملاحظہ فرمایئے اس کے بیٹے نوجوان شہنشاہ کی آنکھیں نکالی جا رہی ہیں۔

”یہ کیوں؟“

”اس کی نیک دل مذہبی ماں کے حکم سے۔ کیونکہ مسیح کی متبرک تصویر کے گھر میں رکھے جانے کی ضرورت پر یہ نوجوان

اعتقاد نہیں رکھتا ــــــــ اس زمانے کے ایک پادری نے لکھا ہے کہ اس عورت کے کارنامے ستاروں کی طرح چمکیں گے ــــ

~~~~~~~~~~

دریائے فرات کے کنارے خلفائے اسلام کا نیا دارالخلافہ بغداد تعمیر ہو رہا ہے ــــــــ اور یہ مشرقی فرمانروا ایک جوان عورت کو زندہ بکس میں بند کرا کے خندق میں پھکوا رہا ہے ــــــــ

"یہ عورت کون ہے ؟"

"اس کی بہن خداوند۔"

"اس کی خطا ؟"

"اس کے بطن سے اپنے خاوند کی اولاد بھائی کی مرضی کے خلاف کیوں پیدا ہوئی۔"

بچوں کو بلایا جاتا ہے جو دو موتیوں کی طرح پاک اور صاف معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ کچھ دیر سوچتا ہے اور پھر ان کو بھی اسی خندق میں پھکوا کر جس میں ان کی ماں ڈالی گئی تھی خندق کو مٹی سے بھروا دیتا ہے

"یہ بادشاہ کون ہے ؟"

"ہارون رشید خداوند جس کا نام انصاف کے لئے مشہور ہے۔"

فلم چل رہا ہے ــــــــ ــــــــ ــــــــ

سابق پوپ فارموسس کی تین سال پرانی لاش پر مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ اسے اپنے عہدے کا تمام لباس پہنا کر تخت پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے کارڈینل اور بشپ جمع ہیں۔ سرکاری وکیل آگے بڑھ کر فارموسس پر الزامات عائد کرتا ہے۔ زندہ پوپ غضبناک ہو کر اپنے پیشرو کی لاش سے سوال کرتا ہے "تو نے کیوں ذاتی اغراض سے پوپ کی متبرک گدی پر قبضہ کیا ؟"

مدعا علیہ کا وکیل کانپتے کانپتے جواب دینے کی کوشش کرتا ہے ــــ لاش پر جرم ثابت کر کے ججوں کی کونسل اسے تخت سے اتار دیئے جانے کی سزا دیتی ہے۔ اس کے لباسِ فاخرہ کو پھاڑ ڈالا جاتا ہے۔ اس کے مقرر کئے ہوئے سب عہدہ داروں کا تقرر از سرِ نو کیا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ کی تین انگلیوں کو جن سے گنہگاروں کے قصور معاف کئے جاتے تھے کاٹ دیا جاتا ہے اور لاش کو دریا میں پھینک دیا جاتا ہے ــــــــ

دوسرا سین۔ پوپ فارموسس کی لاش دریا میں سے ایک ماہی گیر نکال لایا ہے اسے نہایت عزت و احترام سے دفن کیا جاتا ہے۔ نئی مذہبی کونسل پرانی کونسل کے فیصلہ کو رد کر کے مردہ پوپ کے جملہ احکام کو صحیح قرار دیتی ہے ــــــــ
~~~~~~~~~~

راہب پیٹر (Peter the Hermit) گدھے پر سوار ہو کر تمام عیسائیوں کو دعوت دے رہا ہے کہ وہ اس کی سرکردگی میں بیت المقدس کو ترکوں سے چھین لینے کے لئے جہاد کریں۔ ایک بیقاعدہ انبوہ کثیر مشرق کی طرف روانہ ہوتا ہے اور راستے میں علاوہ اور بیشمار مظالم کے دس ہزار یہودیوں کو تہ تیغ کر دیتا ہے۔ پوپ اس جنگ میں حصہ لینے والوں کے سب گناہ معاف کر دیتا ہے۔ تمام عیسائی ممالک کے بہادر نائٹ اپنا اثاثہ فروخت کر کر کے زاد راہ جمع کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض جو زیادہ عقلمند ہیں بجائے جنگ میں جانے کے اس روپیہ سے پوپ کو اپنے گناہوں کا کفارہ نقد ادا کرتے ہیں۔ ہر طرف جوش پھیلا ہوا ہے۔ بچوں کی ایک کثیر تعداد جہازوں کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ ان کا رہبر راہب کے لباس میں ایک ترک ہے۔ وہ ان سب کو جہازمیں بٹھا کر ترکی روانہ کر دیتا ہے ۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ جہاد ۔۔۔۔۔۔ اور پھر جہاد ۔۔۔۔۔۔

"لیکن کیوں؟"

"بیت المقدس کو ترکوں سے چھین لینے کے لئے باری تعالےٰ!"

"لیکن بیت المقدس میں کیا ایسی خاص بات تھی؟"

"مسیح کی یادگار خداوند۔ حالانکہ اس سرزمین نے مسیح کے ساتھ کوئی نیکی کا سلوک نہ کیا تھا۔"

"عیسائیوں کو اس جنگ سے اپنا مقصد حاصل بھی ہوا یا نہیں؟"

"آخر میں 'نہیں' قادر مطلق۔ بجائے اس کے ترک یورپ میں دور تک چلے گئے۔"

"تو فائدہ کیا ہوا؟" ۔۔۔۔۔۔

"اُن کے اپنے گھر میں بھی تو جہاد شروع ہونے والا تھا۔"

فلم چل رہا ہے ۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔

پوپ انوسنٹ (معصوم) فرانس کے صوبہ پراونیس کے خلاف جہاد کا اعلان کر رہا ہے اس کا فرستادہ قائم مقام متعدد مفلس اور حاجتمند بیفکروں کی سرکردگی میں چل کھڑا ہوتا ہے اور ان کے یہ دریافت کرنے پر کہ ہم کس طرح کافروں اور ایمانداروں میں تمیز کریں جواب دیتا ہے کہ امتیاز کی کوئی ضرورت نہیں۔ خدا اپنے بندوں کو خود بچا لے گا۔۔۔۔۔۔ بوڑھے اور نوجوان مرد عورت تلوار کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں۔ بچے اپنی ماؤں کی گود سے چھین کر گرجا کی چھت سے نیچے فوج کے نیزوں پر پھینکے جاتے ہیں۔ حاملہ عورتوں کے حمل جبراً گرا دیئے جاتے ہیں ۔۔۔۔۔۔

"یہ کیوں؟"

"چند اعتقادی مسائل میں اختلاف کی بنا پر خداوند" ـــــــــ ـــــــــ

کرامویل اپنے خاندان اور احباب کے ساتھ جہاز پر سوار ہے تاکہ امریکہ جاکر آزادی سے اپنے طریق پر مذہبی عبادت کرسکے لیکن شاہِ انگلستان کا کمشنر اسے روانہ ہونے سے روک دیتا ہے۔ کرامویل بادشاہ کو بے شمار گناہوں کا ملزم ٹھیرا کر علمِ بغاوت بلند کردیتا ہے اور اس کے خدا پرست سوار بادشاہ کے گنہگار طرفداروں پر بلا بول دیتے ہیں۔

شہر ڈراگیڈا ان خدا پرستوں کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اس لئے وہاں قتلِ عام کا حکم دے دیا جاتا ہے اور گرجا میں پناہ گزیں شہریوں کو مع گرجا کے بارود سے اُڑا دیا جاتا ہے۔ ہزاروں آدمی قتل ہوجاتے ہیں اور ہزاروں غلام بنا کر جزائر غرب الہند کی طرف بھیج دیئے جاتے ہیں۔

"یہ اس قدر ظلم کس لئے ہو رہا ہے؟"

"خدائے بزرگ و برتر کے نام پر پروردگار۔"

یہ دیکھیے ایک بشپ منسٹر کے شہر پر گولہ باری میں اپنے ہاتھ سے مدد دے رہا ہے۔ گولے بارش کی طرح شہر میں گرتے ہیں ـــــــ دھائیں ـــــــ اڑا ڑا دھم ـــــــ

بشپ چلاتا ہے "توپوں کے منہ ہسپتالوں اور مذہبی فرودگاہوں کی طرف پھیر دو!" ایک پادری شہر کی دیوار پر نظر آتا ہے "وہ ہے تمہارا نشانہ!" وہ اوندھا ہو کر گر جاتا ہے ـــــــ

"یہ کیا کرنا چاہتا ہے؟"

"یہ اسی شہر منسٹر کا بشپ ہے پروردگار۔ اس نے خاص اپنے لئے ایک فوجی گارد خلافِ قانون مقرر کر رکھا تھا۔ اس پر شہر والوں نے اعتراضات کئے۔ اب یہ شہر کے دشمنوں کے ساتھ مل کر انہیں گستاخی کی سزا دے رہا ہے ـــــــ

"کیا فضولیات دکھا رہے ہو؟"

"فضولیات خداوند؟"

"فضولیات نہیں تو اور کیا ہے؟ کچھ اور دکھاؤ۔"

"یہ تو سب تصویر کی رفتار پر منحصر ہے قادرِ مطلق۔ اب یہ ایک گھوڑ دوڑ ہے۔ تیز رفتار میں۔ تیزی کی وجہ سے ان کی ٹانگیں نظر نہیں آتیں لیکن مقصود صاف دکھائی دیتا ہے ـــــــ

یہ اسی نظارے کو نہایت ہلکی رفتار (Slow motion) میں دکھایا ہے۔ ہر گھوڑا زمین پر سے نہایت خوبصورت انداز میں اٹھتا ہے اور اسی خوبصورت انداز میں گھاس کی بنی ہوئی ٹٹی کی دوسری طرف آہستہ آہستہ زمین

پر آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹٹی پر سے کودنے میں گھوڑے کی ٹانگیں کن مخصوص حرکات کی حامل ہوتی ہیں لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کیوں ـــــ

"انسانی تاریخ کو میں نے ایسا ہی پایا پروردگار۔ منزلِ مقصود ایک فضول سے مطمحِ نظر کے سوا کچھ نہیں۔ اور کوشش حد درجہ سخت محنت طلب۔ اور کرب انگیز، لیکن فرداً فرداً ہر حرکت کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک خاص اندازِ حسن سے خالی نہیں "ملاحظہ ہو۔ قادرِ مطلق۔ دنیا میں تیرا خود ساختہ۔ والسلام۔ اور اس کے کارکن۔ کل مخلوق سے دلی محبت رکھنے والے آسمانی باپ کی حقیقت کس شد و مد سے اس کی مخلوق کو تسلیم کرا رہے ہیں۔ تقدس مآب پوپ انوسنٹ ثالث نے یہ محکمہ ایجاد کیا ہے۔ اس کا نام انکوی زیشن یا محکمۂ تفتیش ہے ـــــ"

ایک آدمی مقدس عدالت کے اجلاس میں حاضر کیا جاتا ہے ـــــ

حاکمِ اجلاس۔ "اے میرے نورِ نظر۔ خدا نے رحمِ بے پایاں کی بنا پر تجھے یہاں بھیجا ہے تاکہ تو ان فروگزاشتوں کا اقبال کرے جو ممکن ہے تجھ سے سرزد ہوئی ہوں۔ اس لئے بے خوف ہو کر بیان کر کیونکہ ہم اپنے خدا مسیح کے نام پر صرف رحم کرنے کے لئے یہاں بیٹھے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ تو اپنی متبرک مادرِ کلیسا کے آغوش میں واپس آجائے"۔

وہ آدمی کچھ جواب نہیں دیتا۔ اس لئے 'کفر' کے اشتباہ میں اسے حراست میں لے لیا جاتا ہے۔

"یہ لوگ اس سے کس بات کا اقبال کرانا چاہتے ہیں؟"

"یہی خلاقِ عالم کہ اس کو تجھ سے کسی بے قاعدہ طرح کی محبت ہے۔ جب یہ صورت ہوتی ہے تو اسے 'کفر' کہا جاتا ہے"

"لیکن میں نے تو انسان کو آزاد و مختار بنایا تھا؟"

"بیشک پروردگار لیکن وہ اپنے کمزور ہمجنسوں پر زور آزمائی کرنے کے لئے بھی تو آزاد و مختار ہے۔ یورپ کے عاملانِ قضا و قدر نے تیری پرستش کا ایک خاص طریقہ مقرر کر دیا تھا۔ عوام الناس پر قوانین کی پابندی لازم ہے۔ خصوصاً جب یہ کہا جائے کہ عدمِ تعمیل کی حالت میں وہ موت کے بعد دائمی عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ انہیں یہاں دنیا ہی میں اُس عذاب کی چند اقسام سے روشناس کر کے درست کر دیا جائے ـــــ

ایک عیسائی جس پر 'کفر' کا الزام ہے زمین دوز کمرے میں لایا جاتا ہے جس میں موم بتیوں کی روشنی ہو رہی ہے۔

افسرِ تفتیش۔ "اے میرے بیٹے خدائے بزرگ اور بابرکت کی والدہ کنواری مریم کے نام سے جو رحیم ہے۔ جو کچھ تمہیں معلوم ہے بتادو۔ تمہارے علاوہ اور کن کن لوگوں نے اس کفر آمیز کتاب کا مطالعہ کر کے اس کے زہر کو اپنی روح

میں جذب ہونے دیا ہے ؟"

"مجھے علم نہیں حضور"

"اس کے کپڑے اتار دو!"

اسے برہنہ کر کے شکنجے پر چت لٹا دیا جاتا ہے۔ ہاتھ پیر رسیوں سے مضبوط باندھ دیئے جاتے ہیں۔ جلاد آہستہ آہستہ پہیا گھماتا ہے۔ درد سے کراہنے کی آواز آتی ہے ـــــ "میں کچھ نہیں جانتا" ـــــ پہیا اور گھومتا ہے ـــــ "آپ مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہیں ؟" ـــــ

"بیٹے سچ سچ کہ دو!"

پہیئے کو ایک چکر اور دیا جاتا ہے۔ جوڑ کھنچ کر ٹوٹتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ـــــ وہ چلاتا ہے ـــــ "فرنینڈو گونزیلے" ـــــ جلاد رک جاتا ہے ـــــ پھر تھوڑا اور گھماتا ہے ـــــ "کارلو ڈی سیسو ـــــ انٹونیو ماریٹنی ـــــ بس! ـــــ بس!! ـــــ چیخوں کی آواز ـــــ آپ کیا کہلوانا چاہتے ہیں ـــــ ؟"

"یہ لوگ اسے بتا کیوں نہیں دیتے ؟"

"خلافِ قانون ہے خداوند۔ عذاب دیتے وقت ملزم کو کچھ بتا کر اس کا رستہ آسان کر دینے کی اجازت نہیں ہے کیونکہ پریشانی میں ممکن ہے وہ کوئی نئی بات کہ دے"۔

ملزم شکنجے پر سے اتار دیا جاتا ہے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا جیلر کے پیچھے پیچھے قیدخانہ کی کوٹھڑیوں کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ راستے میں نائب افسرِ تفتیش سے ملاقات ہوتی ہے جو قیدیوں کے کمروں میں جا کر ان کے بیان لیتا پھر رہا ہے۔ وہ سوال کرتا ہے

"کیا حال ہے میرے بیٹے ؟"

ملزم جواب دیتا ہے "ملاحظہ فرمایئے حضور۔ صرف بدن کے جوڑ ذرا ڈھیلے ہو گئے ہیں اور کچھ نہیں۔ مجھے سبق دیا گیا ہے کہ مسیح کا قانون ہمدردی اور رحم کی بنا پر قائم ہے ـــــ"

"بیشک میرے فرزند، مقدس عدالت قانونِ مسیح اور رحم ہی پر کاربند ہے۔ اور گو تمہارے ایسے لوگوں کے لئے ہمیں بیشمار تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے پھر بھی تمہارے ساتھ ہم محض بھلائی کا سلوک روا رکھتے ہیں"۔

'کافروں کے غول کے غول گدھوں پر بٹھا کر شہر سے باہر لائے جا رہے ہیں۔ بادشاہ کے سامنے میدان میں سب کو جمع کر کے پادری ان کے جرائم کی فہرست پڑھتا ہے اور وہ سزا کے لئے رحم کی سفارش کے ساتھ صیغۂ انتظامی کے سپرد کر دیتے جاتے ہیں ـــــ

"یہ اُن کے حوالے کیوں کر دیئے گئے؟"

"کیونکہ مذہبی جماعت اپنی رحمدلی کے باعث انہیں خود سزا نہیں دے سکتی"۔

"تو کیا رحم کی سفارش کا لحاظ کیا جائے گا؟"

"نہیں قادرِ مطلق، کیونکہ صیغۂ انتظامی کو مذہبی جماعت کی عدول حکمی کا اتنا ڈر نہیں جتنا اس بات کا ہے کہ کہیں مذہبی جماعت کا رحم اس کی ذات پر بھی نازل نہ ہونے لگے ــــــ

"رات ہو گئی ــــــ میدان میں دھواں اُٹھ رہا ہے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں اور لاتعداد کافر، اے پروردگار تیرا نام لیتے ہوئے جل جل کر راکھ ہوتے جا رہے ہیں"۔

سین بدلتا ہے اور اب اسپین کی جگہ فرانس ہے، اور پیرس کے نواح۔ لوئی چہاردہم دنیا کا سب سے رنگیلا بادشاہ اپنے رنگیلے لیکن بہادر مصاحبوں اور بیباک لیکن حسین سہیلیوں کے ساتھ فونٹین بلو کے آراستہ و پیراستہ جنگل میں عیش کا شکار کھیلتا پھر رہا ہے ــــــ

اور یہ اس کا لڑکا لوئی پانزدہم اور اس کی ملکہ میری انتوانیت مقدس گلوٹین (Guillotine) کی چمکدار اور تیز دھار کے نیچے سر کٹوا کر اپنے آباؤاجداد کے عیش و عشرت کی قیمت عوام کو ادا کر رہے ہیں ــــــ

انقلابِ فرانس ــــــ سینکڑوں صاحبِ حیثیت مردوں، عورتوں کا قتل۔ آزادی کے نام پر ہزاروں بیگناہوں کی قربانی۔ دنیاوی حکمران کے ساتھ آسمانی فرمانروا کو بھی تختِ حکومت سے اتار دیا جاتا ہے۔ گرجے تباہ کر دیئے جاتے ہیں۔ پادری ملک سے نکال دیئے جاتے ہیں ــــــ

"یہ عورت کون ہے جو تخت پر بیٹھی ہے؟"

"پیرس کی حسین ترین مخلوق۔ اے خالقِ دوجہاں جسے عقل کی دیوی قرار دے کر تیرے بجائے پرستش کے لئے مقرر کیا گیا ہے ــــــ"

فلم چل رہا ہے ــــــ ــــــ ــــــ ــــــ

نپولین اعظم دریا کے دوسرے کنارے مورچہ بند چالیس ہزار آسٹروی فوج کے سامنے لودی کے پُل پر سب سے آگے قدم رکھتا ہے اور دشمن کے مقابلہ میں صرف ایک چوتھائی فوج اپنے عقب میں لئے ہوئے آسٹریا کے سب توپخانوں سے بارش کی طرح برستے گولوں میں سینہ سپر کئے پار ہو جاتا ہے۔ آسٹروی فوج اپنا کل سامان میدان میں چھوڑ کر خوف سے

بھاگ جاتی ہے ——

وہی نپولین سینٹ ہیلنا میں بستر مرگ پر پڑا ہے اور فرانس کی سرزمین کو ایک آخری نگاہ دیکھ لینے کی آرزو اس کے ساتھ قبر میں چلی جاتی ہے ——

قادرِ مطلق نے بے صبری سے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ میں نے گھبرا کر عرض کیا۔

"صرف ایک نظارہ اور دکھانا چاہتا ہوں باری تعالےٰ ——"

اس نے تھکے ہوئے انداز میں ایک لمبی سانس لی اور کہا

"اچھا —— لیکن جلدی کرو مجھے دیر ہو رہی ہے"۔

ایک صدی کا وقفہ تھا۔ میں نے ایک سکنڈ میں گزار دیا اور پھر رفتار ہلکی کر دی۔ یورپ کا محاذِ جنگ نظر آنے لگا۔ چاروں طرف فضا دھواں دھار ہے۔ کوئی چیز صاف نظر نہیں آتی۔ صرف آگ کے چھوٹے بڑے شعلے مختلف فاصلوں پر دکھائی دیتے ہیں اور غائب ہو جاتے ہیں مشین گنوں کی چنے بھننے کی سی تڑ تڑ تڑ تڑ۔ تڑ تڑ کے ساتھ بڑی توپوں کی دھائیں دھائیں اور گولوں کے سیٹی کی آواز سے ہوا میں سے گزرنے اور گر کر پھٹنے کا شور اس قدر ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی ——

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"بزعم خود تہذیب یافتہ انسان کی جسے اپنی دماغی قابلیت پر اس قدر ناز ہے سب سے تازہ اور سب سے بڑی حماقت۔ لاکھوں برس کے تجربہ کے بعد اس مغرور ہستی کے علم اور عقل کی حقیقت کا اظہار۔ وہ جنگِ عظیم جس میں دنیا کے مہذب ترین باشندوں نے اپنے لاکھوں ہم جنسوں کو اپنے ہی دماغ سے اختراع کردہ ذرائع سے نابود کر دیا ——"

"لیکن کیوں؟"

"اس بات کا کچھ صاف اظہار نہیں ہوتا پروردگار۔ ہر قوم کا دعوےٰ ہے کہ ہم راستی پر ہیں اور خدا ہمارے ساتھ ہے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حسبِ معمول باہمی حسد اس عالمگیر کشت و خون کا باعث ہے ان میں سے جب بھی کسی فرد یا کسی قوم کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ اپنے دوسرے ہم جنسوں کو زندہ دیکھ نہیں سکتی اور یہ سب اس امر میں بالکل ایسے ہی ہیں جیسے ان کے مورثانِ اعلیٰ تھے جو درختوں پر رہتے تھے"۔

"لاحول ولا قوۃ!"

یہ کہ کر قادرِ مطلق اُٹھا اور مشین کو دیکھ کر کہنے لگا "ہے تو مزے کی ایجاد"۔ اور اس کے دستے کو پکڑ کر خود گھمانا شروع

کر دیا۔ لیکن اُلٹی طرف۔

پردے پر سب ممالک کی افواج اپنے اپنے ملک کو واپس روانہ ہونے لگیں۔ دنیا پر امن ہوگیا۔ نپولین قبر میں سے نکل آیا۔ لوئی پانزدہم پھر فرانس کے تخت پر آ بیٹھا۔ اسپین کے "کافر" آگ میں سے نکل نکل کر اپنے گھروں کو چل دیئے۔ روما کی سلطنت پھر قائم ہوگئی مسیح کو سولی پر سے اتار لیا گیا۔ انسان نے اپنے قدیم عادات واطوار کو اختیار کر لیا۔ حوا نے ممنوع پھل آدم سے لے کر درخت پر لٹکا دیا۔ بارش کے قطرات زمین سے اُٹھ کر بادلوں میں مل گئے۔ بادل فضا میں تحلیل ہوگئے۔ سطح زمین کو برف کی سفید چادر نے ڈھانپ لیا۔ پھر برف کی سفیدی بھی خلا میں غائب ہوگئی ——

"بس ختم ہوگیا پروردگار!"

"میرے خیال میں تو یہ اس طرح زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔"

"تو مالک ہے قادر مطلق"۔

"آ ڈپطرس" اس نے آواز دی۔

میں نے عرض کیا "تو مجھے حکم دیا جائیگا باری تعالیٰ جب اس کارخانہ کو الٹا چلانا منظور ہوگا؟"

اس نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا ۔ —— "دیکھا جائیگا"

"تو کیا فی الحال اس کو اسی طرح چلنے دیا جائے؟"

جواب ملا "دیکھا جائے گا"

اس اثنا میں ہم ہوائی جہاز تک پہنچ گئے تھے پطرس نے آگے بڑھ کر پروپلر کو گھمایا۔ قادر مطلق اندر بیٹھ گیا۔ ہوائی جہاز ایک جھٹکا دے کر آگے بڑھا۔ میں نے تسلیم نیاز میں سر جھکایا۔ قادر مطلق نے ایک انگلی ٹوپی کی طرف اٹھائی —— مشین ہوا میں اُٹھنے لگی اور میرے گلے میں کوئی چیز اٹکتی ہوئی محسوس ہوئی ——

یہ جہاز میرے وطن کو جا رہا تھا۔ ''''''

آزاد ترجمہ —— عطا الرحمٰن

زخمی کیوپڈ

(چھٹی صدی قبلِ مسیح کی ایک یونانی نظم)

اُس طفلِ محبت کیوپڈ کو (مغرب کے کنھیا[1] کو گویا

زنبورِ عسل نے کاٹ لیا اِک روز جو پھولوں میں سویا

تکلیف ہوئی تو چونک پڑا اور غصے سے بیتاب ہُوا

رویا چیخا اور ماں سے کہا "ماں میں تو مرا! ماں میں تو مرا"

وہ بولی "پیارے بچے کیوں کیا بات ہوئی کیوں روتے ہو؟"

مُنہ اپنا پھلا کے، بسور کے پھر کیوپڈ نے کہا "ماں دیکھو تو!

اِک اڑنے والے سانپ نے مجھ کو کاٹ لیا (اب کیا ہوگا!)

وہ سانپ جسے سب کہتے ہیں زنبور (وہ بھن بھن اُڑتا تھا)"

یہ سُن کے ہنسی کیوپڈ کی ماں اور بچے کے لب چوم لئے

پھر گیسوئے مشکیں سے اُس کے رخسار سے آنسو پونچھ دیئے

اک گہری سانس پھر اُس نے بھری اور کیوپڈ سے اس طرح کہا

"اے میرے ننھے سے شیطاں اب مجھ کو ذرا یہ بھی تو بتا

گر یہ تکلیف ہے ایسی کچھ، تو اس کی تھاہ کی کیا کہیئے

انسان کے دل میں ہوتی ہے تکلیف جو تیرے تیروں سے!

(ترجمہ از انگریزی) ۔۔۔۔۔ سید مقبول حسین

[1] ہندی زبان میں کیوپڈ کو کام دیو کہتے ہیں مگر یونکہ گنھیا جی بھی محبت کے دیوتا سمجھے جاتے ہیں اس لئے یہ مطابقت غیر مناسب نہیں



جلال ساڑھے چار بجے دفتر سے نکلا۔ باہر آکر جوتا اتارا، اسے پاؤں ہی سے جھاڑ کر پہنا۔ پگڑی درست کی۔ اور ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے باہر چلا آیا۔ ڈاڑھی کے بال سخت ہونے کی وجہ سے یہ عادت پرانی ہی نہیں غیر اختیاری بھی ہوگئی تھی۔ اس کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی مگر بدن میں کاٹھی مضبوط ہونے کے باوجود تنومند نہیں رہا تھا۔ وہ دفتر سے ملا ہوا خاکی زین کا لمبا چھ بٹنوں والا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ تنگ پائنچوں کی میلی سی شلوار تھی، اور اسی رنگ کی سرسری طور پر لپیٹی ہوئی پگڑی سر پر تھی۔

جلال اسی دفتر میں بائیس سال سے چپراسی تھا۔ وہ بہت سے افسر دیکھ چکا تھا اور بہت سے بابو اس کی نظر سے گزر چکے تھے۔ اسی لئے شاید اس کی آنکھوں میں تجربہ کاری کی جھلک پیدا ہوگئی تھی وہ صبح پورے نو بجے دفتر آجاتا تھا اور دروازہ کھول، جھاڑ پونچھ کے، گرمیوں میں پانی صراحی کی بھر کے سردیوں میں کوئلے انگیٹھی میں دہکا کے، خود برآمدے میں اپنے بنچ پر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ دن بھر ادھر چٹھی لے جاتا، ادھر سے لاتا۔ پانی پلاتا، کسی کو ضرورت ہوتی تو دوپہر کے وقت دکان سے کچھ کھانے کو لادیتا۔ یہی کام کرتے کرتے سہ پہر ہوجاتی تھی۔ چار بجے، سوا چار بجے سب چیزیں اپنی اپنی جگہ رکھ، دفتری کا ہاتھ بٹا کے کمرے بند کر، اپنی اسی بے خودی کی چال میں واپس چلا آتا۔

راستے میں بازاروں سے گزرتا، ان کی رونق دیکھتا، معلوم ہوتا کہ کسی عمیق خیال میں مستغرق چلا جارہا ہے۔ مگر اس کی زندگی میں خیالات کی گہرائیوں کی کوئی جگہ نہ تھی۔ دن بھر کے کام سے تھک کر اس کے دل میں فقط گھر جانے کی آرزو رہ جاتی تھی اور یہ آرزو حقہ کی ایک دو چلموں کے خیال سے کسی قدر رنگین ہوجایا کرتی تھی۔ شہر کے جس محلہ میں اس کا مکان تھا اس میں بیشمار لوگ رہتے تھے۔ بازار کی ایک تنگ و تاریک بغلی گلی اندر کی طرف ہٹتی ہوئی ایک گنجان سے کٹڑے میں ختم ہوجاتی تھی۔ اس میں سائیس، مزدور، کارخانوں کے مستری، بڑھئی، کنجڑے وغیرہ اسی قماش کے دوسرے لوگ رہتے تھے۔ جلال کو یہاں رہتے ہوئے پندرہ سال گزر گئے تھے اس کے پاس نچلی منزل میں ایک مختصر کا سا مکان تھا جس میں دو کوٹھڑیاں اور ایک برآمدہ تھا، یہ برآمدہ، باورچی خانہ، غسل خانہ، بیٹھک سبھی کچھ تھا۔ سردیوں میں وہ اور اس

کے اہل وعیال کوٹھڑیوں میں بھینچ بھنچا کے سونے کا انتظام کرلیا کرتے تھے اور گرمیوں میں کٹڑے کے دوسرے نچلی منزل کے سکینوں کی طرح ، کٹڑے کے صحن میں ، اپنی مخصوص جگہ پر نل کے پاس سویا کرتے تھے۔ جلال کی پہلی شادی اس کے ماں باپ نے سترہ سال کی عمر ہی میں کردی تھی۔ مگر پہلی بیوی سے دس سال تک کوئی اولاد نہ ہوئی اور اس کے بعد وہ مرگئی۔ اس کی وفات کے بعد پانچ چھ سال تک اس نے شادی نہ کی ، پھر لوگوں کے کہنے سننے سے اور اپنی تنہائی سے تنگ آکر اس نے دوبارہ شادی کرلی ، اس بیوی سے اس کی چار لڑکیاں اور تین لڑکے پیدا ہوئے جن میں سے اب چار لڑکیاں اور ایک لڑکا زندہ تھا۔

جلال کی تنخواہ اب ۳۲ روپے تھی ، لاہور کی زندگی ، مکان کا کرایہ ، اپنے بیوی بچوں کے کپڑے ، رشتہ داروں کی شادی غمی ، تیج تہوار ، بیماری وغیرہ کے مصارف کی وجہ سے اس کا گزارہ مشکل سے ہوتا تھا۔ لڑکیاں جوان ہونے کو آتی تھیں ، ان کا فکر تھا۔ ماں باپ مرچکے تھے۔ گاؤں میں وہ زمین ٹھیکے پرلے کر کاشت کیا کرتے تھے ، وہاں کیا جائداد ہوتی۔ جلال جوانی میں لاہور چلا آیا تھا ، گاؤں میں تین جماعتوں تک تعلیم حاصل کرلی تھی۔ اپنے گاؤں کے چودھری کا لڑکا یہاں لاٹ صاحب کے دفتر میں نوکر تھا۔ اس نے چپراسی کرادیا تھا۔ بس ساری عمر یہیں ، اسی محلے میں ، اسی کٹڑے میں گزری تھی۔ محلہ کے دودھ بیچنے والے ، کنجڑے ، تمباکو فروش اور رنگریز سے اس کی سلام آداب ہوتے ہوتے آشنائی اور پھر پڑوسی ہونے کے باعث دوستی ہوگئی تھی۔ دفتر سے آتا تو دو دو ، چار چار ، منٹ ہر ایک کے پاس ٹھہرتا یا گھر جاکے کوٹ پگڑی اتار کے پھر آدھ ایک گھنٹے کے لئے کسی ایک دکان پہ آبیٹھتا۔ بعض دفعہ باتوں ہی باتوں میں کئی کئی گھنٹے گزر جاتے۔ پھر اُٹھ کے گھر چلا جاتا۔ سردیوں میں اپنے برآمدے میں بیٹھتا۔ پاس ہی چولھا بھی ہوتا۔ برآمدہ دھوئیں سے بھرا ہوتا۔ بچوں سے چلم بھروا کے چارپائی پر کمر ٹکا باتوں میں وقت گزار دیتا۔ ہر سال اپنے پڑوسیوں کے ہمراہ چراغاں کا میلہ ضرور دیکھنے جاتا۔ اپنے چھ سال کے لڑکے کو دو ایک سال سے ساتھ لے جاتا۔ دن وہاں گزار کے ، سب لڑکیوں کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور خرید کر شام کو لوٹ آتا۔

تین سال قبل ایک چپراسی دوست کے ہمراہ اپنے منجھلے لڑکے کو لے کر جو گزشتہ سال چیچک سے مرگیا تھا یہ پہلی دفعہ چڑیا گھر گیا تھا۔ جب سے لاہور آیا تھا ایک دفعہ شاہدرے اور ایک دفعہ نہر پر گیا تھا۔ مدت ہوئی ، دو تین مرتبہ اپنی پہلی بیوی کے مرنے کے بعد ، تجرد کے زمانے میں ایک دوست کے ساتھ لارنس باغ بھی دیکھنے گیا تھا۔ مگر عام طور پر وہ ٹھنڈی سڑک پر سے بھی کم ہی گزرتا تھا۔ ایک تو وہ اس کے گھر کے راستے میں نہیں پڑتی تھی ، دوسرے دفتر وغیرہ کے کام کے لئے اور کہیں سے جانا ہوتو بھی ٹھنڈی سڑک پر اسے بہت کم جانا ہوتا تھا۔

آج جس وقت وہ دفتر سے نکلا تو اسے محسوس ہوا کہ ہوا میں خنکی کچھ کم ہے۔ مارچ کے آخری دن تھے۔ گزشتہ چند دنوں سے خفیف سی بارش اور ہوا کے چلنے کے باعث سردی پھر پلٹ آئی تھی۔ مگر آج پھر ہوا کی تازگی بہار کا پیغام دے رہی تھی۔ جلال چلا آتا تھا اور آس پاس کی کوٹھیوں سے خوشبو کی لپٹ کبھی کبھی اس کے چہرے سے مس کرتی ہوئی گزر جاتی تھی۔ سوچ رہا تھا کہ بیوی تو بچوں سمیت دو ایک ہفتہ کے لئے اپنے بھانجے کی شادی پر اپنے میکے چلی گئی ہے اب گھر جاؤں گا تو کیا کروں گا۔ آج غلام دودھ والے کی دکان پر بیٹھوں گا۔ مگر پھر خیال آتا کہ بغیر کچھ کھائے پئے کتنی دیر تک بیٹھا رہوں گا۔ اور پھر جب اپنے مکان پر جاؤں گا تو پھر؟ گھر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا۔ بیوی صبح کی گاڑی سے چلی گئی تھی۔ لڑکیوں اور بچے کو بھی ساتھ لے گئی تھی۔ صبح دفتر آتے وقت جب گھر سے نکلا تھا تو وہاں وہ بے سروسامانی برس رہی تھی کہ اب پاؤں جلدی اٹھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ سوچتا کہ آج فضل دین دفتری کے گھر چلیں، سنا ہے اس کے لڑکے کا ختنہ ہوا ہے، خبر ہی نہیں پوچھی۔ دس سال دفتر میں ساتھ کام کیا ہے۔ کیا کہیگا۔ پھر خیال آتا کہ اس کا گھر مستی دروازہ میں ہے، اتنی دور جاؤں اس وقت شام کو اور پھر آؤں گا کب؟ اور پھر آؤنگا بھی تو گھر پر نہ بیوی ہوگی نہ بچے۔ کھانا پڑوسی پکا ہی دینگے۔ میں شام کو گھر پہنچ ہی جاؤں گا۔ مگر اب اکیلے گھر میں بیٹھنے سے خاک لطف آئیگا؟ اچھا آج دین کی دکان سے اچھا سا ایک پاؤ تمباکو لے کے دو ایک چلمیں تو آرام سے پیونگا۔ دس قدم تو اس اعلیٰ تمباکو کے خیال سے طبیعت خوش رہی مگر پھر سوچا کہ مہینہ کا آخیر ہے، جو کچھ پیسہ دھیلہ تھا وہ بیوی لے گئی اب باقی کا ایک آدھ روپیہ اس طرح نکل گیا تو تنخواہ آنے تک کیا کروں گا؟ اس لئے تمباکو کا ارادہ بھی طوعاً وکرہاً چھوڑ دیا۔ پھر خیال کیا کہ رحیم کنجڑے کی دوکان پر بیٹھیں گے۔ مزے مزے کی باتیں ہونگی، ایک آدھ کیلا ہی کھائیں گے شاید کچھ اور بھی ہاتھ لگ جائے مگر پھر کچھ دیر چلتے رہنے کے بعد یہ خیال بھی تسکین کا باعث نہ ہو سکا۔ رحیم یار دوست تو تھا مگر اس کا مذاق ذرا گندا سا تھا۔ طبیعت کی موجودہ حالت میں کچھ لطف نہیں پیدا کر سکے گا۔ اور پھر اس کا ٹیپ کا مذاق کہ "جلال اب تو گھر سے چھٹی ہے آؤ تمہیں ذرا لے چلیں، آج رات ذرا گانا وانا سنا لائیں۔ ذرا ایک رات تو عیش ہو جائے!"

جلال کی طبیعت، جوں جوں دفتر پیچھے رہتا جاتا تھا، زیادہ افسردہ ہوتی جاتی تھی۔ اس نے دین، جمال تمباکو والے رحیم اور باقی دوستوں کو ایک ایک نظر پرکھا۔ آج کسی کی طرف بھی اسے رغبت نہ ہوئی۔ کٹڑے میں، باہر صحن میں سونے کے دن ابھی نہیں آئے تھے نہیں تو سر شام ہی چارپائی ڈال لیتا، حقہ تازہ کر کے کمر سیدھی کر لیتا باقی بھی رفتہ رفتہ آجاتے۔ مگر ابھی رات کو سردی ہوتی تھی۔ سوچا کہ بیوی کو بھانجے کا چاؤ بھی کیسے وقت آیا۔ اب

میں لاہور میں کہاں جاؤں! مدت ہوئی کبھی شاہدرہ جانا نہیں ہوا مگر شاہدرہ تو ہے ہی بہت دور ریل سے جایا جائے تو اسٹیشن دو میل! کون وہاں تک پہنچے اور پھر اس وقت! سورج ڈوبنے میں بس سوا ڈیڑھ گھنٹہ ہوگا۔

اس کا گھر ٹِل روڈ پر تھا۔ سرکاری دفاتر سے وہاں تک بھی کافی فاصلہ تھا۔ گول باغ جو ٹاؤن ہال کے سامنے ہے اس میں سے گزر کر نیلے گنبد سے ہو کر وہ اپنے گھر واپس آیا کرتا تھا۔ جب زمزمہ کے پاس پہنچا تو اس کے پاس سے دو خوش پوش لڑکے باتیں کرتے ہوئے گزرے، ایک دوسرے سے کہ رہا تھا "یار آج لارنس باغ چڑیا گھر سے ہوتے ہوئے جائیں گے، مدت ہوئی ہے ادھر نہیں گئے اور پھر اس میں بھی تو رنگ رنگ کے جلوے نظر آجاتے ہیں" چونکہ وہ جلال کے قریب سے گزرے تھے ان کی باتوں نے جلال کا سلسلۂ خیال توڑ دیا۔

اب وہ ٹھنڈی سڑک پر تھا، آس پاس، پیچھے اور آگے بہت سے اور لڑکے باتیں کرتے، بلند قہقہے لگاتے آگے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ اِدھر اُدھر سے عورتیں بھی ساڑھیوں اور شلواروں میں ملبوس دھیمی دھیمی گفتگو کے لامتناہی رشتہ میں باہم منسلک چلی جا رہی تھیں۔ وہ بھی پٹڑی پر چل رہا تھا۔ لحظہ بہ لحظہ اس کے پاس سے ایک آدھ ٹولی گزر جاتی، بے فکر، خوش باش، ہنستی ہوئی۔ لبوں سے، چہروں سے، ہاتھوں سے باتیں کرتے، باتوں پر زور دیتے، ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے گروہ در گروہ گزرتے جاتے تھے۔ جلال کی عمر اب پینتالیس سال کی تھی۔ اس نے بہت دنیا دیکھی تھی، قسم قسم کے لوگ دیکھے تھے، ایسے لڑکے بھی اکثر اس کی نظر سے گزرے تھے۔ مگر آج اسے محسوس ہوتا تھا کہ شاید میں نے ایسے لڑکے کبھی نہیں دیکھے۔ ہنستے جا رہے ہیں، باتیں کرتے جا رہے ہیں، کبھی پٹڑی پر ہیں کبھی سڑک پر ہیں، سامنے سے موٹر آجاتی ہے تو ایک دوسرے کو گھسیٹ کے ایک طرف کر دیتے ہیں۔ جہاں ہیں، باتوں میں منہمک گرد و پیش سے بے خبر چلے جا رہے ہیں۔

ایک ٹولی گزر جاتی ہے تو پشت پر سے قہقہوں کی آواز سنائی دیتی ہے، جلال یہ تو اپنی متانت کے خلاف سمجھتا ہے کہ گردن موڑ کر دیکھے البتہ جب وہ قہقہے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے رنگوں کے لطیف غبار میں تبدیل ہوگئے تو اس نے دیکھا کہ تین نوجوان لڑکیاں ہنستی کھیلتی غالباً انگریزی میں باتیں کرتی جا رہی ہیں۔ جلال کو اپنی تنہائی کا اور بھی احساس ہوا۔ اک موہوم طور پر اسے یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ رنگینی یہ انبساط یہ محویت اسے کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ یہ لڑکیاں گزر گئیں، اور لڑکیاں آئیں اور گزر گئیں۔ لڑکے چھوٹے، بڑے، جوان سوٹ والے۔ شلوار والے دائیں بائیں سے گزرتے گئے اور جلال کا اپنا والان مع اپنے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے ٹاٹ کے اس کی آنکھوں میں پھرنے لگا۔ صبح کے وقت کی ویرانی یاد آئی۔ اپنا کٹڑہ یاد آیا۔ اس کی نالیاں اور اس کا صحن سامنے آگیا۔ رحیم کنجڑے

کی بیوی جس کے بدن پر اس نے اپنی ہوش میں کبھی سفید کپڑا نہیں دیکھا تھا، اس کے غلیظ بچے جن کی آنکھیں کبھی دھلی ہوئی معلوم ہی نہ ہوتی تھیں، دین کی بھینس جس نے سارے کٹڑے کی فضا متعفن کر رکھی تھی، سب یاد آگئے۔

مارچ کے آخری دن تھے، سورج ٹاؤن ہال کی چھت کے برابر آگیا تھا، جلال کی پشت پر جو گول باغ کے درخت تھے ان کے لمبے لمبے سائے ٹھنڈی سڑک پر بچھے ہوئے تھے۔ ہوا میں کہیں کہیں سے اُڑی ہوئی پھولوں کی بوباس تیرتی پھرتی تھی، یونیورسٹی ہال کے سامنے والے قطعے کے گرد کا ایک آدھ درخت زرد زرد پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ دائیں طرف عجائب گھر کے خوشنما گنبد تھے، سامنے فراخ سڑک تھی جس پر بیسیوں لوگ بعض جلد جلد اور بعض سُستی سے ٹہلتے ہوئے کچھ ہنستے مذاق کرتے ہوئے، جاتے نظر آرہے تھے۔ لوگوں کے لباس مختلف رنگوں کے تھے۔ لڑکوں کے سوٹ، ان کے کوٹ بھی گہرے ہلکے، سفید، فاختئی، بادامی رنگ کے تھے۔ لڑکیاں اور عورتیں بھی ساڑھیوں میں، شلواروں میں رنگوں کا عجیب ہفت رنگی مرقع پیش کر رہی تھیں۔ جلال کے دل پر آج نامعلوم طور پر ان سب باتوں کا خاموش اثر ہوتا جا رہا تھا۔ ایک طرف اسے گھر سُونا معلوم ہو رہا تھا، دوسری طرف شام کی نرم نرم دھوپ اور خوشبو سے لبریز ہوا، سامنے یہ بشاشت، یہ بے پرواخوشی، یہ انہماک، ساری فضا اس کے دل کو بیقرار کر رہی تھی۔ سوچتا کہ گھر میں اس وقت کیا دھرا ہوگا اور کوئی جگہ بھی جانے کی کونسی ہے؟ کہاں جاؤں؟ کہ دفعتہً کسی کی آواز اس نے سنی "کیوں یار سیر کو چلو گے آج لارنس باغ میں چلتے ہیں شاید بینڈ بھی ہوگا" جلال ایک ساعت ٹھہر سا گیا۔ مگر دیکھا کہ دو لڑکے انارکلی کے موڑ پر کھڑے کسی اور کو بلند آواز سے سیر کی دعوت دے رہے ہیں۔

اس نے سوچا مدت ہوگئی، کبھی لارنس باغ ہی نہیں گیا، آج ادھر ہی سہی، بھوک بھی کوئی ایسی نہیں لگی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کہیں بیٹھ کے مغرب کے بعد آجاؤں گا۔ چنانچہ وہ انارکلی کی طرف مڑنے کے بجائے سیدھا مال روڈ ہی پر ہولیا۔ موٹریں، ٹمٹمیں، بند، چمکتی ہوئی تیزی سے پاس سے گزر جاتی تھیں۔ ٹانگوں کا بھی کوئی شمار نہ تھا۔ پیدل بھی لوگ بہتیرے تھے۔ جلال اپنی گہری آنکھوں سے اسی سج دھج کو دیکھتا، رونق سے متاثر ہوتا، بڑی بڑی عمارات سے بچوں کی طرح مرعوب ہوتا چلا گیا۔ مقابل سے لوگ آتے میمیں بھی آتیں، گورے بھی آتے۔ جلال ان کو دیکھ کر سڑک کے ایک طرف ہو جاتا۔ ساڑھی والیاں گزر جاتیں، سامنے سے آجاتیں۔ لڑکیوں کے جھنڈ کے جھنڈ چہکتے لہکتے گزر جاتے جلال بھی آہستہ آہستہ سیر کرتا گزرتا گیا۔

اونچی اونچی عمارات گزر گئیں، سفید، بادامی، زرد، سُرخ سب ہی رنگ تھے۔ باہر موٹریں کھڑی ہوتیں جن میں سفید چینی کی مورتیں بیٹھی ہوتیں، یا نیلے موتیا، تربوزی، فیروزی رنگ کے ریشمی غبار ہوتے۔ پٹڑی پہ چلتے ہوئے

جلال کو شاید ہی کوئی تکتا، وہ خود اپنی متین دھنسی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا۔ اسے شک ہوتا کہ شاید آج کوئی تقریب ہے کہ اتنی مخلوق، اتنی موٹریں، اتنے ٹانگے یوں اُمڈے چلے آتے ہیں مگر پھر خود ہی سوچتا کہ نہیں کوئی تیج تہوار ہوتا تو اس کا یہاں شہر سے دور ٹھنڈی سڑک سے کیا تعلق ہوتا۔ مگر ان سب تاثرات نے اس کے دماغ میں اک عجیب حیرانی سی پیدا کر دی تھی۔ اور وہ لاشعوری طور پر ہی اس حیرت زا سمے سے مغموم ہوتا گیا۔

لارنس باغ آگیا۔ سامنے چڑیا گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ کبھی دو ایک اور کے ساتھ داخل ہو گیا۔ جدھر نظر اٹھتی پھولوں کی چھوٹی چھوٹی کیاریاں ہوتیں، سرسبز اور گھنے درخت ہوتے، ننھے ننھے اور صاف اور خوش پوش بچے طرارے بھرتے، ناچتے، کودتے، قلقاریاں مارتے پھرتے تھے۔ کہیں پرندوں کے بڑے جالی دار گھر کے پاس کوئی پکارتا "ابا وہ دیکھنا، وہ ننھا سا لال، وہ زرد سا پرندہ، وہ اڑا، وہ، دیکھنا" کبھی پاس ہی سے آواز آتی۔ "آپا یہ دیکھا یہ، بیا ہے بیا"۔ "نہیں تو یہ بیا کہاں یہ تو شاید شاما ہے" کبھی کسی کی تیز ہنسی فضا میں ایک دلپذیر ارتعاش پیدا کر دیتی۔ لوگ پنجروں اور کٹہروں کے سامنے کھڑے ہو کر اطمینان سے بےفکری سے، کمال توجہ سے اندر جانوروں کو دیکھتے پھر پرجوش لہجوں میں بلند آوازوں میں چڑیا گھر کے مکینوں کے متعلق رائے زنی کرتے جلال کے پاس سے گزر جاتے۔ جب کسی ٹولی کے افراد اس کی موجودگی کو فراموش کئے اس کے قریب کھڑے ہو کر پرندوں کے پروں، ان کے حسن اور ان کے نغموں سے مسرور ہو کر، اپنی جوان، بشاش اور پرشوق آوازوں میں گفتگو کرتے تو ان کے اس استغنا سے، اس خوشی سے جلال کو کچھ گھبراہٹ اور تکلیف سی ہوتی۔ اسے محسوس ہوتا۔ کہ اس ہنستی کھیلتی دنیا میں میری کوئی جگہ نہیں میری کوئی ضرورت نہیں۔

چڑیا گھر بھی ختم ہو گیا۔ جلال وہاں سے نکل کے لارنس باغ کے وسط کی جانب ہو لیا سڑکیں آنے جانے والوں سے بھری ہوئی تھیں۔ بائیں طرف پھول باغ کی جانب سے ہوا کے معطر جھونکے آتے تھے، دائیں بائیں بلند، قد آور درخت سڑک پر چھت بنائے ہوئے تھے۔ مگر جلال کو پھولوں کی دلفریبی یا سبزے کی جاذبیت کوئی چیز متاثر نہ کر رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ گویا وہ دنیا میں اکیلا ہے اور کسی شخص کا کسی چیز کا اس سے تعلق نہیں۔ تمام لوگ اجنبی اور غیر معلوم ہوتے۔ جب پہاڑی کے پاس سے ہوتا ہوا باغ کے وسطی حصہ میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بیسیوں لوگ مختلف قطعات میں بیٹھے ہیں یا لیٹے ہوئے ہیں، دائیں طرف کے قطعہ میں گلابی، کاسنی اور زرد پھولوں کے تختوں کے تختے لگے تھے۔ اسے کئی سال ہو گئے تھے یہاں آئے ہوئے کو۔ ان دنوں یہاں کچھ پھولدار درخت بھی ہوا کرتے تھے اب صاف میدان تھا جس میں پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ سامنے کے گول قطعے میں لوگ بنچوں پہ بیٹھے تھے بیس

اک توپ بھی پڑی تھی۔ جس پر بچے بیٹھے کھیل رہے تھے۔

درجنوں موٹریں کھڑی تھیں۔ لوگ ادھر اُدھر ہر طرف ٹہلتے نظر آتے۔ جوان، لمبے، اونچے بابو سوٹ پہنے ادھر سے اُدھر نکل جاتے۔ پانچ پانچ، چھ چھ لڑکیاں اپنی ساڑھیوں کے رنگوں سے اپنی رقصاں چال سے اس کی پریشانیاں بڑھاتی ہوئی گزر جاتیں۔ آوازیں اٹھتیں، باتوں کی گونج اس کے کانوں تک آتی، قہقہوں کی برق پاشیاں ہوا میں لرزتی ہوئی گزر جاتیں، اسے محسوس ہوتا گویا کہیں صحرا میں اکیلا بیٹھا ہے۔ اپنی بے مائگی اور لوگوں کا استغنا، سیر کرنے والوں کی از خود رفتگی اور سب چیزوں کی بے پروائی اور بے تعلقی، اتنی کشادہ جگہ اور اتنی گھما گھمی کے باوجود اس کے دل کو مسوس رہی تھی۔ سوچتا یہ پھول، یہ باغ، یہ لوگ، یہ لباس یہ آوازیں روز یہیں ہوتی ہوں گی اور اگر میں روز یہاں آؤں، تو ایسے ہی پھول ہوں، ایسے ہی باغ ہوں، یہی لوگ ہوں، سب اپنے آپ میں اپنے ساتھیوں میں اسی طرح منہمک، اور میں یونہی پردیسی بنا بیٹھا رہوں۔

سورج غروب ہونے لگا مگر لوگ ہنستے رہے، باتیں کرتے رہے، سیر کرتے رہے، مغرب کا وقت ہو گیا اور سیر کرنے والے خراماں خراماں اِس راستے سے اُس راستے سے واپس جانے لگے۔ روشنی ہو گئی، موٹریں ایک ایک کرکے رخصت ہونے لگیں، بچے کھیلنے سے اُکتا گئے، باغ پر خاموشی طاری ہونے لگی گروہ کے گروہ اپنی باتوں، اپنے خیالوں، اپنے ہمراہیوں میں محو باغ سے نکلتے گئے۔ اب ایک گھنٹہ ہوا سورج غروب ہو چکا تھا، کہیں کہیں کوئی بنچ پر بیٹھا شام کے سکوت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پھولوں والے قطعے میں ایک دوسرے سے دُور دو ایک شخص بیٹھے تھے، ان میں سے ایک کی گردن اپنے سینہ پر جھکی ہوئی تھی:

فیاض محمود

وسعت

نغمۂ خاموش کی وسعت کو دیکھا ہے ہم نے
میں زمیں پر پھول میں تم، آسمانوں پر بھی ہیں

نازشِ بزم ہیں کبھی ہیں آپ اپنے دل کی حسرتیں
خیمۂ خورشید میں ہیں پردۂ انجم میں بھی ہیں

ناصر عسکری

محبّت

تو رازِ ہستی سے بے خبر ہے تری نظر حق نگر نہیں ہے
دگر نہ وہ رات کونسی ہے جو غیرتِ صد سحر نہیں ہے

حقیر ذرات کی جبینیں شعاعِ رفعت سے ضوفگن ہیں
تجلّیوں کی کشاکشیں ہیں طلسمِ رقصِ شرر نہیں ہے

یہ برق کا اضطرابِ پیہم، یہ نبضِ خس کی دھمک کا عالم
حقیقت آمیز ہیں مناظر فریبِ ہوش و نظر نہیں ہے

یہ آگ پانی کا میل باہم، یہ اتحادِ نظامِ برہم
تری نظر دیکھتی ہے سب کچھ یقین تجھ کو مگر نہیں ہے

نہ دیکھ ذروں کو بے رُخی سے سمجھ کہ کیا ان میں ضوفشاں ہے؟
تو جسم کا صرف ہے پُجاری تری نظر روح پر نہیں ہے

بہارِ گلشن کی کوششوں کا مآل کچھ خشک پتیاں ہیں
شباب پر آگئی ہے ظلمت طلوعِ نورِ سحر نہیں ہے

نہیں نفس پر مدارِ ہستی یہ وہم ہے اک جنوں پرستی
فضا محبت کی سرمدی ہے یہاں فنا کا گزر نہیں ہے

ہوس پرستی کا پرتوا ہے خیال یہ فرقِ مرتبت کا
مگر یہ وہ سطح ہے جہاں پر ذلیل کوئی بشر نہیں ہے

خدا کے فضل و کرم سے ماہر ہیں اس نتیجہ پر آگیا ہوں
بجز محبت کے دردِ دل کا یہاں کوئی چارہ گر نہیں ہے

(منظور حسین ماہر القادری)

سوبھا

(ٹیگور کا ایک افسانہ)

جب لڑکی کا نام سوبھاشنی رکھا گیا تو کسے خیال تھا کہ وہ بڑی ہو کر گونگی ہوگی - اس کی دو بڑی بہنوں کے نام سکشنی اور سہاشنی تھے اس لئے اس کے باپ نے ناموں کی مناسبت کے لئے اپنی سب سے چھوٹی لڑکی کا نام سوبھاشنی رکھ دیا - سوبھا اس کا مختصر نام تھا -

اس کی دونوں بڑی بہنیں تمام ان پریشانیوں کے بعد جو بر کی تلاش اور جہیز کے تیار کرنے میں اکثر اُٹھانی پڑتی ہیں بیاہ دی گئی تھیں اور اب چھوٹی لڑکی سُوبھا ماں باپ کے دل پر ایک ساکن بوجھ کی طرح پڑی تھی - لوگ سمجھتے تھے کہ چونکہ وہ بول نہیں سکتی اس لئے وہ محسوس بھی کچھ نہ کر سکتی ہوگی یہی وجہ تھی کہ وہ اُس کے مستقبل کے متعلق اس کی موجودگی میں بھی اپنی پریشانیوں کے اظہار سے نہ جھجکتے تھے - سوبھا بچپن ہی سے جان گئی تھی کہ وہ پرماتما کی طرف سے اپنے والدین کے گھر پر ایک لعنت کی طرح نازل کی گئی ہے' اس لئے وہ ہمیشہ دوسروں سے الگ الگ ہی رہنے کی کوشش کیا کرتی تھی - اگر لوگ اُسے بھول جاتے تو وہ اُسے خوشی سے برداشت کر لیتی لیکن دکھ کو کوئی کب تک بھول سکتا ہے - دن رات اس کے والدین کے دل اس کے لئے کڑھا کرتے تھے - خاص کر اس کی ماں کا دل جو اُسے نہایت ہی بدصورت تصور کیا کرتی تھی - بیٹی بہ نسبت بیٹے کے اپنی ماں کے وجود کا قریبی حصہ سمجھی جاتی ہے - اس لئے اُس کا ہر نقص ماں کے لئے خاص شرم کا باعث ہوتا ہے - سوبھا کا باپ بنی کنٹھ اُسے اپنی دوسری لڑکیوں سے کچھ زیادہ ہی چاہتا تھا لیکن برعکس اس کے اس کی ماں اُسے اپنے لئے موجب عار خیال کرتی اور اس سے ہمیشہ بیزار رہتی تھی -

اگر سوبھا قوتِ گویائی سے محروم تھی تو کیا ہوا وہ لمبی لمبی پلکوں سے ڈھکی ہوئی دو سیاہ آنکھوں سے محروم نہ تھی - اُس کے ہونٹ اس کے دلی خیالات کے جوش سے ایک پتے کی طرح کانپ جایا کرتے تھے -

جب ہم اپنے خیال کو الفاظ کی شکل میں بیان کرنا چاہتے ہیں تو بعض اوقات اظہارِ مقصد کے لئے ہمیں مناسب ذریعہ نہیں سوجھتا - جذبات کی ترجمانی کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور ہوتا ہے مگر گاہے گاہے یہ ٹھیک نہیں اُترتا اور اس طرح ہم غلطی کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن سیاہ آنکھوں کو کسی ترجمانی کی ضرورت نہیں دِل خود اُن پر اپنا پرتو ڈالتا ہے - ان میں خیالات پیدا

ہوتے یا غائب ہو جاتے ہیں چمک اُٹھتے ہیں یا تاریکی میں گم ہو جاتے ہیں۔ ڈوبتے چاند کی طرح ساکن ہوتے ہیں یا بیقرار
بجلی کی طرح جو آسمان کے گوشہ گوشہ کو منور کر دیتی ہے روشن ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو بچپن ہی سے ہونٹوں کی کپکپاہٹ
کے علاوہ کسی قسم کی گویائی نہیں رکھتے کم ازکم آنکھوں کی اس زبان کو ضرور سمجھ جاتے ہیں جو لامحدود سمندر کی طرح گہری اور آسمان
کی طرح مصفا و مجلّیٰ ہوتی ہے اور جس میں طلوع و غروب کے نظارے اور سیاہی و سفیدی کی کیفیتیں ہر وقت نظر آتی
رہتی ہے۔ گونگے لوگ بھی فطرت ہی کی طرح تنہا ہوتے ہیں۔ بچے سوبھا سے خوف کھاتے اور اس کے ساتھ نہ کھیلتے
تھے۔ غریب سوبھا دوپہر کی ہوا کی طرح تنہا اور اداس تھی۔

وہ چنڈی پور نامی ایک معمولی سے گاؤں میں رہتی تھی۔ ندی جس کے کنارے یہ گاؤں واقع تھا بنگال کی دوسری ندیوں
کی طرح چھوٹی سی تھی اور ایک متوسط حال گھرانے کی لڑکی کی طرح اپنے پاؤں اپنی حیثیت سے زیادہ نہ پھیلاتی تھی۔
یہ ہمیشہ بہنے والی ندی اپنے کناروں سے کبھی اوپر نہ اچھلتی تھی بلکہ اپنے فرائض کو اس خوبی سے انجام دیتی تھی کہ
وہ گاؤں کے ہر قبیلہ کی سچی خیرخواہ معلوم ہوتی تھی اس کے دونوں بلند کناروں پر درختوں سے گھرے ہوئے مکان نظر آتے
تھے یہ دریا کی دیوی اپنی راج گدی سے خراماں خراماں اترتی ہوئی ہر گھر کے لئے موجب صد رحمت بن گئی تھی اور اپنی
ہستی کو بھول کر اپنے احسانات کا لامتناہی سلسلہ ہر کسی کے لئے جاری رکھے ہوئے تھی۔

بنی کنٹھ کا گھر ندی سے بخوبی نظر آتا تھا بلکہ گاؤں کی ہر جھونپڑی اور ہر ٹیلا ملاح لوگ گزرتی کشتیوں سے صاف طور
پر دیکھ سکتے تھے۔ میں نہیں جانتا کہ کوئی شخص دنیا کی ان لذتوں کے درمیان اُس چھوٹی لڑکی کو ایک نظر دیکھ سکتا ہو
جو اپنے کام کے اختتام پر لوگوں کی نگاہوں سے بچتی بچاتی آہستہ آہستہ ندی کے کنارے کھسک جاتی تھی، جہاں فطرت اُس
کے لئے آپ بول اٹھتی تھی اور اس کے نہ بولنے کی تلافی کر دیتی تھی۔ ندی کے آہستہ آہستہ بہنے کی آواز دیہاتیوں کا غل،
ملاحوں کے گیت، پرندوں کی چیخ پکار اور درختوں کے پتوں کا شور ایسی باتیں تھیں جو اُس کے دل کا ایک جزو بن کر رہ گئی
تھیں یہ تمام آوازیں مجتمع ہو کر آواز کی ایک زبردست لہر کی صورت میں اس کی بیقرار روح سے ٹکرایا کرتیں۔ ندی کے دھیمے
دھیمے نغمے اور قدرت کی یہ کارروائیاں گونگی لڑکی کی زبان تھیں۔ اُس کی وہ سیاہ آنکھیں جو لمبی لمبی پلکوں میں مستور تھیں،
ہنگامہ زار دنیا کے لئے قوتِ گویائی کا کام دیتی تھیں۔ اُن درختوں سے لے کر جہاں جھینگر چیختے تھے خاموش تاروں کی دنیا
تک اُسے رونے اور آہیں بھرنے کی علامات کے سوا اور کچھ محسوس نہ ہوتا۔ اور گرمیوں کو عین دوپہر کے وقت جب ملاح اور
ماہی گیر کھانا کھانے چلے جاتے، جب دیہاتی لوگ اپنے اپنے گھروں میں سو جاتے۔ جب پرندے اپنے اپنے گھونسلوں
میں پڑے پڑے آرام کرتے اُس وقت وسیع آسمان کے نیچے صرف فطرت اور ایک گونگی لڑکی ہی رہ جاتی ـــ سورج کی جلتی

ہوئی تو اور ایک چھوٹے سے درخت کے سائے میں لیکن سوبھا بالکل ہی بے یار و مددگار نہ تھی۔ طویلے میں سربھاشنی اور رنگولی دو گائیں اس کی بہت گہری سہیلیاں تھیں۔ انہوں نے سوبھا کی زبان سے اپنے ناموں کو پکارے جاتے کبھی نہ سُنا تھا لیکن وہ اُسے قدموں کی چاپ ہی سے پہچان جاتیں۔ اگرچہ سوبھا کی زبان سے کوئی لفظ ادا نہ ہو سکتا لیکن وہ منہ ہی منہ میں بڑے پیار سے گنگنایا کرتی اور گائیں اس کی اس پیاری گنگناہٹ کو کسی اور بات کے مقابلہ میں بہتر سمجھتیں۔ جب کبھی وہ ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتی جھڑکتی یا پچکارتی تو وہ اس کے ان اندازوں کو دوسرے لوگوں کی بہ نسبت زیادہ واضح طور پر سمجھ لیتیں۔ سوبھا طویلے میں روزانہ آتی اور اپنی باہیں سربھاشنی کے گلے میں حائل کر دیتی۔ وہ اپنے گال اس کے گالوں سے مس کیا کرتی اور رنگولی اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو پھیرے اس کے چہرے کو چاٹا کرتی۔ سوبھا دن میں تین بار اُن کے پاس جاتی اور بعض متفرق وقتوں میں بھی اُن کے پاس جانے سے دریغ نہ کرتی۔ جب کبھی وہ کسی کے ایسے الفاظ سنتی جو اس کے دل کو صدمہ پہنچاتے تو وہ اپنی اِن گونگی سہیلیوں کے پاس چلی جایا کرتی خواہ کیسا ہی نامناسب وقت کیوں نہ ہو۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گائیں سوبھا کی روحانی تکلیف کا اندازہ اُس کی غمگین نظر ہی سے کر لیا کرتیں۔ جب وہ اُن کے قریب آتی تو وہ اپنے سینگوں کو بڑے پیار سے اس کی کلائیوں کے ساتھ ملا دیا کرتیں۔ اپنے خاموش انداز سے بےچینی کا اظہار کرتیں اور اسے تسکین پہنچانے کی کوشش کیا کرتیں۔ اس کے علاوہ اس طویلے میں چند بھیڑیں اور ایک بلی بھی تھی۔ لیکن سوبھا انہیں گایوں سے زیادہ نہ چاہتی تھی حالانکہ وہ جاندار بھی اُس سے ویسی ہی محبت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ بلی دن یا رات کو جب کبھی موقع پاتی اُس کی گود میں جا سوار ہوتی اور وہاں سونے کی نیت سے لیٹ جاتی۔ اور جب سُوبھا اپنی نرم نرم انگلیوں کو اس کی پیٹھ اور گردن پر پھیرتی تو بلی اس خواب آور آرام کو دل ہی دل میں سراہتی۔

اس کے علاوہ سوبھا اشرف المخلوقات میں سے بھی ایک دوست رکھتی تھی اور یہ بتانا ذرا مشکل ہے کہ اس سے سوبھا کا کس طرح لگاؤ ممکن ہو گیا تھا کیونکہ قوتِ گویائی کا وہ نادر تحفہ جس سے وہ مستفید تھا سوبھا کے پاس نہ تھا اس لئے وہ دونوں ایک دوسرے کی بات سمجھنے کی خاطر کسی خاص زبان سے محروم تھے۔ اُس کا نام پرتاپ تھا اور وہ گوسائیوں کا سب سے چھوٹا اور کاہل لڑکا تھا، اس کے والدین اپنی انتہائی جدوجہد کے بعد اس اُمید سے دست بردار ہو گئے تھے کہ کبھی وہ اپنا پیٹ پالنے کی خاطر کچھ کما سکے گا۔ عام طور پر کاہل اور آوارہ گرد لڑکے جنہیں اپنے عزیز و اقارب نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں دوسرے لوگوں میں بڑے ہر دل عزیز بن جاتے ہیں۔ چونکہ اُن کے لئے کوئی دوسرا شغلہ نہیں ہوتا اس لئے وہ لوگوں کی تفریح کا سامان بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ شہری لوگ اپنی بستی میں کوئی ایسا کھلا اور ہموار میدان چاہتے ہیں جہاں وہ سب مل کر آزادی سے سانس لے سکیں اُسی طرح دیہاتی لوگ بھی چند ایسے بیکار نوجوان چاہتے ہیں جو اُن کے دل فرصت کے اوقات میں بہلائیں

اگر ہم سُست ہیں تو ایسے دوست ہمیں ہر وقت میسر ہو سکتے ہیں۔ پرتاپ مچھلیاں پکڑنے کا بڑا شوقین تھا وہ اپنا بہت سا وقت اسی شغل میں گزارا کرتا اور تقریباً ہر دوپہر کو اسی کام میں مصروف نظر آتا۔ اس سبب سے اُسے سُوبھا سے بھی ملنے کا اتفاق ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے ہر شغل میں ایک ساتھی کی معیت کا بڑا خواہشمند تھا اور جب کوئی شخص مچھلیاں پکڑ رہا ہو تو اسے ایک خاموش ساتھی بہت بھلا معلوم ہوتا ہے یہی وجہ تھی کہ وہ سوبھا کی بڑی عزت کرتا تھا۔ ہر شخص اُسے سُوبھا کے نام سے پکارا کرتا لیکن پرتاپ اُسے "سُو" کے نام سے مخاطب کر کے اپنی محبت کا اظہار کیا کرتا۔ سوبھا ایک املی کے درخت کے نیچے بیٹھا کرتی اور پرتاپ اس سے چند قدم دور اپنا کانٹا ڈالا کرتا۔ پرتاپ اپنے ساتھ پاندان لے جاتا اور سوبھا اُسے گلوریاں بنا بنا کر دیا کرتی۔ اُس کی یہ بڑی آرزو تھی کہ وہ پرتاپ کی کچھ نہ کچھ مدد ضرور کیا کرے تاکہ وہ جان جائے کہ یہ گونگی لڑکی دنیا میں محض ایک بیکار ہستی نہیں لیکن افسوس کہ اس کی یہ تمنا کبھی پوری نہ ہوتی اور وہ مایوس ہو کر بارگاہِ حقیقی میں جھک جاتی اس دعا کے لئے کہ کسی غیبی معجزے سے اس میں ایسی طاقت پیدا ہو جائے جس سے باخبر ہو کر پرتاپ چلا اُٹھے "مجھے بالکل امید نہ تھی کہ سُو یہ کر سکے"۔

اگر سُوبھا سمندری پری ہوتی تو وہ سطح بحر سے آہستہ آہستہ اُبھرتی ہوئی سانپ کے تاج کا قیمتی ہیرا نکال لاتی۔ اور پرتاپ اپنے مرغوب مشغلے کو چھوڑ کر سمندر کی تہ میں غوطہ لگا جاتا اور وہاں ایک چاندی کے محل میں سنہری بستر پر سوبھا، ہاں بنی کنٹھ کی بیٹی سُوبھا کو جو لے کاش جواہرات کی وادی کے فرمانروا کی بیٹی ہوتی دیکھ کر حیران ہی رہ جاتا۔ لیکن یہ کس طرح ہو سکتا یہ ناممکن تھا! اگرچہ کوئی چیز حقیقتہً ناممکن نہیں مگر سوبھا پاتال پور کے شاہی خاندان میں پیدا نہ ہوئی تھی بلکہ بنی کنٹھ کے گھر میں اس لئے وہ کسی خاص بات سے پرتاپ کو متحیر کرنے کے قابل نہ ہو سکی۔

وہ جوان ہو گئی اور آہستہ آہستہ نئے محسوسات اس کے دل میں پیدا ہونے لگے۔ اب اُسے ایک ناقابلِ تشریح لہر ــــ اس موج کی طرح جو چاند کی راتوں کو سمندر کے درمیان سے اُٹھتی ہے اپنے دل میں اُٹھتی ہوئی معلوم ہوتی۔ اُس نے اپنے آپ کو ٹٹولا۔ اپنے دل سے اُس کا سبب پوچھا مگر بے سود۔ اُسے کوئی ایسا جواب نہ ملا جس سے وہ یہ راز سمجھ سکتی۔

چاند کی چودھویں شب کو جبکہ رات بہت جا چکی تھی اُس نے ہولے سے دروازہ کھولا اور جھجکتے ہوئے باہر جھانکا۔ فطرت خود اس چاندنی رات میں اکیلی سُوبھا کی طرح سوتی دنیا پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔ سُوبھا کا مضبوط اور جوان دل دھڑکنے لگا اور غم و نشاط کی متضاد کیفیتیں اس پر طاری ہو گئیں۔ یوں تو پہلے ہی وہ ایک ناقابلِ بیان تنہائی محسوس کرتی تھی مگر اس وقت اُس کا احساسِ تنہائی انتہائی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اُس کا دل بھاری تھا اور وہ کسی طرح بات

نہ کرسکتی تھی۔ خاموش دستم زدہ مادرِ دنیا کے دامن میں ایک غمزدہ خاموش لڑکی کھڑی تھی۔

اُس کی شادی کے خیال نے اُس کے والدین کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ لوگ اُن کی اس غفلت پر انہیں الزام دیتے اور کبھی دفعہ برادری سے نکال دینے کی دھمکی بھی دیا کرتے۔ بنی کنٹھ خوشحال آدمی تھا۔ اُس کے دسترخوان پر دونوں وقت مچھلی ہی دیکھنے میں آتی تھی اسی لئے اُسے دشمنوں کی بھی کمی نہ تھی۔ رفتہ رفتہ عورتیں بھی دخل دینے لگیں اور بنی کنٹھ چند دنوں کے لئے گھر سے چلا گیا، لیکن جلد ہی واپس آگیا۔ اور بولا "ہم کلکتہ جائیں گے"۔

اس کے گھر کے تمام افراد اس عجیب غریب شہر کو جانے کے لئے تیار ہوگئے۔ سُوبھا کا دل ایک کہر آلی صبح کی طرح آنسوؤں سے بھیگ گیا اس نے اپنے والدین کو ایک بے معنی اندیشہ کے باعث جو اسے چند دن سے لاحق ہو رہا تھا دل ہی دل میں ایک گونگے جانور کی طرح کوسا۔ اُس نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے والدین کے چہروں کو جانچا۔ جیسے وہ اُن کی پیشانی سے کچھ جاننا چاہتی تھی۔ لیکن انہوں نے اس کے شک کے متعلق کوئی لفظ بھی زبان سے نہ نکالا۔

ایک دوپہر کو انہی ہنگاموں کے درمیان پرتاپ مچھلیاں پکڑتے ہوئے سُوبھا سے بولا "اچھی سُو تمہارے والدین نے تمہارے لئے دولھا تلاش کر لیا ہے اور اب تم بیاہ دی جاؤ گی لیکن سُوبھا یاد رکھنا مجھے بھول نہ جانا" یہ کہ کر اُس نے اپنی نگاہیں پھر کانٹے پر جما دیں۔ سُوبھا نے اُس زخمی ہرنی کی طرح جو اپنی حسرت بھری آنکھوں کو وا کئے شکاری سے یہ پوچھ رہی ہو کہ "آہ اے ظالم میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا" پرتاپ کو دیکھا۔ اُس دن وہ املی کے درخت کے نیچے زیادہ دیر نہ ٹھہری۔ بنی کنٹھ دوپہر کی نیند سے بیدار ہو کر اپنے کمرے میں حقہ پی رہا تھا کہ سُوبھا داخل ہوئی اور اس کے قدموں میں گر کر اس کے چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھے زار و قطار رونے لگی۔ بنی کنٹھ نے اُسے دلاسا دینے کی کوشش کی اور اس کوشش میں اُس کی اپنی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔

یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ وہ دوسرے دن کلکتہ چلے جائیں گے۔ اس لئے سُوبھا طویلے میں گایوں کو الوداع کہنے کے لئے گئی۔ اس نے انہیں گلے سے لگایا۔ اپنے ہاتھ سے چارہ دیا اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جو اس کے خیالات کا صحیح آئینہ تھیں۔ رو پڑی۔ چاند کی یہ دسویں رات تھی، سُوبھا اپنے کمرے سے نکلی اور گھاس کے نرم نرم فرش پر اس ندی کے کنارے جسے وہ بہت ہی پیار کرتی تھی، بیخود ہو کر گر پڑی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ پتھریلی اور بے حس زمین کو اپنی چھاتی سے بھینچتے ہوئے یہ کہہ رہی تھی۔ "ماتا مجھے نہ جانے دو۔ میری طرح اپنی باہیں میری کمر کے گرد ڈال دو اور مجھے اپنے کلیجہ ہی سے لگائے رکھو"۔

ایک دن کلکتہ کے کسی گھر میں سُوبھا کی ماں نے اُسے بڑی احتیاط سے لباس پہنایا اور اس کی پریشان لٹوں کو پیچ در پیچ قید کر کے انہیں ایک فیتہ سے گرہ دے دی۔ اس نے اُسے زیوروں سے بھر دیا اور اس طرح اس کی قدرتی

خوبصورتی کو بگاڑنے کے لئے کئی طرح کی مصنوعی آرائشیں کیں۔ سوبھا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس کی ماں نے اس ڈر سے کہ کہیں روتے روتے اس کی آنکھیں سُوج نہ جائیں اُسے جھڑکا۔ لیکن سُوبھا کے آنسوؤں کی جھڑی نہ تھمی۔ دولھا ایک دوست کے ساتھ دلھن کو دیکھنے کے لئے آیا۔ اُس کے والدین کے دل دیوتا کو قربانی کے لئے ایک بے زبان جانور کا انتخاب کرنے کے لئے آتے دیکھ کر فکر و تردد سے ملول ہو گئے۔ سُوبھا کی ماں پردے کے پیچھے اُسے جھنجلا جھنجلا کر نصیحتیں کر رہی تھی لیکن پیشتر اس کے کہ وہ اُسے پسند کرنے والوں کے روبرو پیش کرے۔ سُوبھا کی آنکھوں میں بہت بڑا سیلاب آچکا تھا۔ دولھا کے دوست نے سُوبھا کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر یہ رائے قائم کی کہ "خیر اچھی ہی ہے"۔ اس نے اُس کے آنسوؤں پر خاص توجہ دیتے ہوئے یہ اندازہ لگایا کہ وہ ایک نازک دل رکھتی ہے اور اس کا وہ دل جو آج والدین کی جدائی کے خیال سے پریشاں ہے مستقبل میں ایک بہت مفید شے ثابت ہو گا۔ گھونگے کے موتیوں کی طرح لڑکی کے آنسوؤں نے اُس کی قدر و منزلت بڑھا دی تھی۔

جنتری کو دیکھنے کے بعد ایک مبارک دن اُس کی شادی کی رسوم ادا کرنے کے لئے مقرر ہوا اور آخر سُوبھا کے والدین اپنی گونگی لڑکی ایک اجنبی شخص کو سونپ کر خود واپس گھر آگئے۔ انہوں نے اپنی روحوں کو اس دنیا اور اگلی دنیا میں محفوظ پا کر اور اپنی نجات کو یقینی خیال کر کے بھاتما کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ دولھا کا کاروبار کسی مغربی علاقے میں تھا اور شادی کے چند دنوں بعد وہ سوبھا کو اپنے ساتھ لے گیا۔ دس ہی دنوں کے اندر اندر ہر شخص جان گیا کہ دلھن گونگی ہے۔ اگر کسی نے اس کا گونگا پن معلوم کر لیا تو اس میں سُوبھا کا کیا قصور تھا۔ اُس نے کسی کو بھی دھوکا نہ دیا تھا۔ اس کی آنکھیں انہیں سب کچھ بتا دیتی تھیں خواہ وہ اُسے سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ وہ بولنے کی بڑی کوشش کیا کرتی لیکن غریب کو کچھ نہ سوجھتا تھا۔ بچپن کے وہ ہمراہی جو اُس کی گونگی زبان کو سمجھ جاتے تھے اُس کی آنکھوں سے غائب تھے۔ اُس کے خاموش دل میں ایک لامحدود اور بے آواز رونے کی صدا گونجتی تھی جو صرف دلوں کا حال جاننے والا ہی سمجھ سکتا ہے۔

نور الٰہی

تاریخ کے استاد نے سوال کیا "۱۴۸۳ء میں کونسا واقعہ پیش آیا"

ایک لڑکے نے جواب دیا "لوتھر پیدا ہوا"۔

استاد۔ "درست! اچھا بتاؤ ۱۴۸۷ء میں کون سا واقعہ پیش آیا"

لڑکا۔ "کچھ تامل کے بعد" لوتھر چار سال کا ہو گیا"

غزلیات

نشتر جالندھری

عجب ایک راز ہیں ہم، کوئی جانتا کہاں ہے
مری ابتدا کہاں ہے، تری انتہا کہاں ہے

چلے دورِ جامِ ساقی! مئے غم رُبا کہاں ہے
یہ تو کوثر اُڑ رہا ہے، یہ گھٹا گھٹا کہاں ہے

شبِ انتظار تیری ہے نویدِ صبحِ عشرت
یہ تو جانِ زندگی ہے، یہ بلا بلا کہاں ہے

یہ ہے قلزمِ محبت، نہ کنارہ ہے نہ کشتی
تو ہے ناخدا کا بندہ، ارے ناخدا کہاں ہے

جو ہے زندگی کا طالب، تو شہیدِ دوست ہو جا
رہِ منزلِ بقا ہے، یہ فنا فنا کہاں ہے

یہ ہے شیوۂ تغافل، یہ نظر کا ہے کرشمہ
یہ بلا بلا کہاں ہے، یہ قضا قضا کہاں ہے

یہ جہاں سے کون اُٹھا، کہ ہے نوحہ خیز صحرا
وہ کدھر ہے چاکِ داماں، وہ برہنہ پا کہاں ہے

تجھے خارزارِ وحشت میں سُبک روی مبارک
یہ ہے خضرِ راہ نشتر! ترا نقشِ پا کہاں ہے

روش صدیقی

غمِ محبت کا ذکر ہی کیا غمِ محبت میں شاد ہوں میں
یہی ہے جب خود مراد میری تو آہ کیوں نامراد ہوں میں

دیئے ہیں پیغام دل کو کیا کیا تری فراموشگاریوں نے
نوازشیں اس پہ لاکھ صدقے ترے تغافل کو یاد ہوں میں

شکست ہی سازگار ہے جس کو میں وہ سازِ سکوں فزا ہوں
گداز ہی جس کی زندگی ہو وہ شمعِ حسرت نہاد ہوں میں

تلافیِ بیکسی اگر ہے تو خود مری شانِ بے کسی ہے
کسی سے کیوں داد کی ہو حسرت جو خود اپنی حسرت کی داد ہوں میں

نہ حسرتِ لطفِ دید مجھ کو نہ رنجِ فصلِ بعید مجھ کو
نہ فکرِ یاس و امید مجھ کو کہ عشق سے بامراد ہوں میں

مجذوب

اب بھی مجذوب جو محرم پذیرائی ہے
کیا جنوں میں ابھی آمیزشِ دانائی ہے

میں ہی محروم ہوں اک خلق تماشائی ہے
کیا غضب ہائے یہ اے ذوقِ جبیں سائی ہے

کس کے آنے کی خبر نزع میں سُن پائی ہے
جان رگ رگ سے جو آنکھوں میں سمٹ آئی ہے

دل ازل سے ہے کوئی آج کا شیدائی ہے
تھی جو اک چوٹ پرانی وہ اُبھر آئی ہے

ایک مدت ہوئی توبہ کئے پھر بھی ہے یہ حال
آنکھ ساغر کو ہی دیکھ کے بھر آئی ہے

ساری دنیا کی نگاہوں سے گرا ہے مجذوب
تب کہیں جا کے ترے دل میں جگہ پائی ہے

راز بنگش کوہاٹی

دل صرفِ نشاطِ بے خبری پژمردۂ کیفِ عشق نظر!
کیا چیز ہے عہدِ جوانی بھی اک موجۂ مستی سرتاسر

یہ عالمِ اُلفت کچھ بھی نہیں اور حسن کی کچھ وقعت نہیں!
ہے خوابِ جوانی اے غافل! نیرنگِ نگاہِ حسن نگر

پھر گم ہوں آج تخیل کی اک حسن فزا گہرائی میں!
بیٹھا ہوں تصور میں اُن کے پھیلائے ہوئے دامانِ نظر!

ہمت ہے اگر تو دنیا میں خود جادۂ منزل پیدا کر!
تا چند کرے گی راہبری بے تابیٔ خاکِ رہگذر

شاید کہ پیامِ موسمِ گل لائی ہے سبک رو موجِ صبا
اے راز یہ کیوں پھر تازہ ہوا ہر زخمِ دروں ہر داغِ جگر

شاد عارفی

جب حشر میں جوشِ رحمت کو اظہار اپنا مطلوب ہوا
ہر لفظ فردِ ہستی اک نیکی میں محسوب ہوا

تلقینِ صبر و تحمل کا پیرایہ کتنا عمدہ ہے
آہیں بھی پسند آئیں اُن کو نالہ بھی انہیں مرغوب ہوا

اک کیفِ مدہوشی پایا اک جلوۂ بے رنگی دیکھا
یہ کہہ کر "اٹھو تو پردۂ" کس درجہ میں محجوب ہوا

اے شاد تصور میں اُن کے جب اپنی ہستی بھولا تھا
اُس وجد کے عالم میں میں نے جو شعر کہا وہ خوب ہوا

نربدا پرشاد عاصی

سر خم ہے سبکدوش کرو تیغ کہاں ہے
یہ بوجھ تو کاندھے پہ مرے بارِ گراں ہے

کچھ آنکھوں ہی آنکھوں سے یہ کہہ جاتی ہے ورنہ
گونگی ہے محبت۔ نہ دہن ہے نہ زباں ہے

دیوانہ سمجھتی ہے اِدھر قیس کو دنیا
اور قیس سمجھتا ہے کہ دیوانہ جہاں ہے

دیکھے تو کوئی میری امیدوں کا تماشا
ہر گام پہ آسائشِ منزل کا گماں ہے

حفیظ ہوشیارپوری

داغِ حسرت کو نرا نقشِ وفا سمجھا تھا میں
زندگی بھر کی محبت کا صلہ سمجھا تھا میں

کیا خبر تھی کیا اسے سمجھیں گے اربابِ ہوس
اپنی خاموشی کو عرضِ مدعا سمجھا تھا میں

ایک آہِ سرد میں نیند آ گئی ہنگامِ نزع
بیخودی میں تیرے دامن کی ہوا سمجھا تھا میں

عینِ گردابِ بلا میں بھی نہ تھا لب پر گلا
جوشِ طوفاں کو ادائے ناخدا سمجھا تھا میں

کر دیا رمز آشنائے زیست اُلفت نے حفیظ
زندگی کو بے نیازِ مدعا سمجھا تھا میں

محفلِ ادب

شاعرِ عظیم

خدائے عزوجل شاعرِ عظیم ہے

کائنات اس کی نظموں کی غیر محدود کتاب ہے۔

فسانۂ ارتقاء اس کی پر شوکت اور حیرت انگیز رزمیہ نظم ہے۔

تاریخِ اقوام اس کے شاندار ڈرامے ہیں۔

طبقات الارض کے انکشافات یعنی چٹانوں کے بیان کئے ہوئے گزشتہ زمانوں کے قصے اس کے مقدس مرثیے ہیں۔

بہار، خصوصاً عظیم الشان سر بفلک پہاڑوں کے سلسلے اس کی بلند ترین نظمیں ہیں بڑے بڑے تناور درخت اس کے مسبعات (Sonnets) ہیں۔

آفتاب کے طلوع اس کی حمد و ثنا کے قصائد، اور غروب اس کی عظمت، عبادت اور پوجا کے پرسکون نغمے ہیں۔

ہواؤں کے قہقہے اور نالہ و فریاد گھنے جنگلوں اور صحراؤں میں، اس کے غم اور مسرت کے ترانے ہیں۔

سینکڑوں ریتلے ساحلوں پر سمندر کی نرم آہیں اور سسکیاں اس کے نوحے ہیں، رعد و برق کے طوفان، دریاؤں کے تیز رو سیلاب گہرے کناروں اور پتھریلے ساحلوں پر بحرِ بے پایاں کی امواج کا شورِ تلاطم اس کے پر سطوت گانے ہیں۔

آبشار اس کے قطعات ہیں۔

لہرانے والے چشمے اس کے بزمیہ اشعار ہیں۔

کنجوں میں چہچہانے والی چڑیاں اس کے دوہے ہیں۔

برِ اعظموں اور سمندروں میں پرندوں کا حیرت انگیز سلسلۂ مسافرت (ہجرت) اس کی منظوم داستانیں ہیں۔

دنوں اور راتوں کا تغیر پذیر، غیر منقطع اور مخفی سلسلہ اور موسموں کی مسلسل آمد و رفت اس کے منظوم ناٹک اور بزمیہ ڈرامے ہیں۔

پھول جو ہر جگہ زمین کو خوبصورت اور شاداب بناتے ہیں، اس کے سحر انگیز نغمہ ہائے بے الفاظ ہیں۔

چشموں میں پانی کا ہنسنا اور لہریں لینا، چھپروں پر مینہ کی جھڑیوں کی بوچھاڑ،